حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ
اور اُنکے معاصر اُردو شعرا

• ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کیلئے مقالہ •

غلام احمد لطف اللہ بدوی

بی۔ اے (آنرز)۔ ایم۔ اے

پروفیسر گورنمنٹ کالج شکارپور۔ سندھ

•

زیر نگرانی

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب

ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی۔، پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی۔ لِٹ۔

پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو سندھ یونیورسٹی جامشورہ

سندھ یونیورسٹی جامشورہ۔

سنہ ۱۹۷۵ء

GHULAM AHMED BADVI

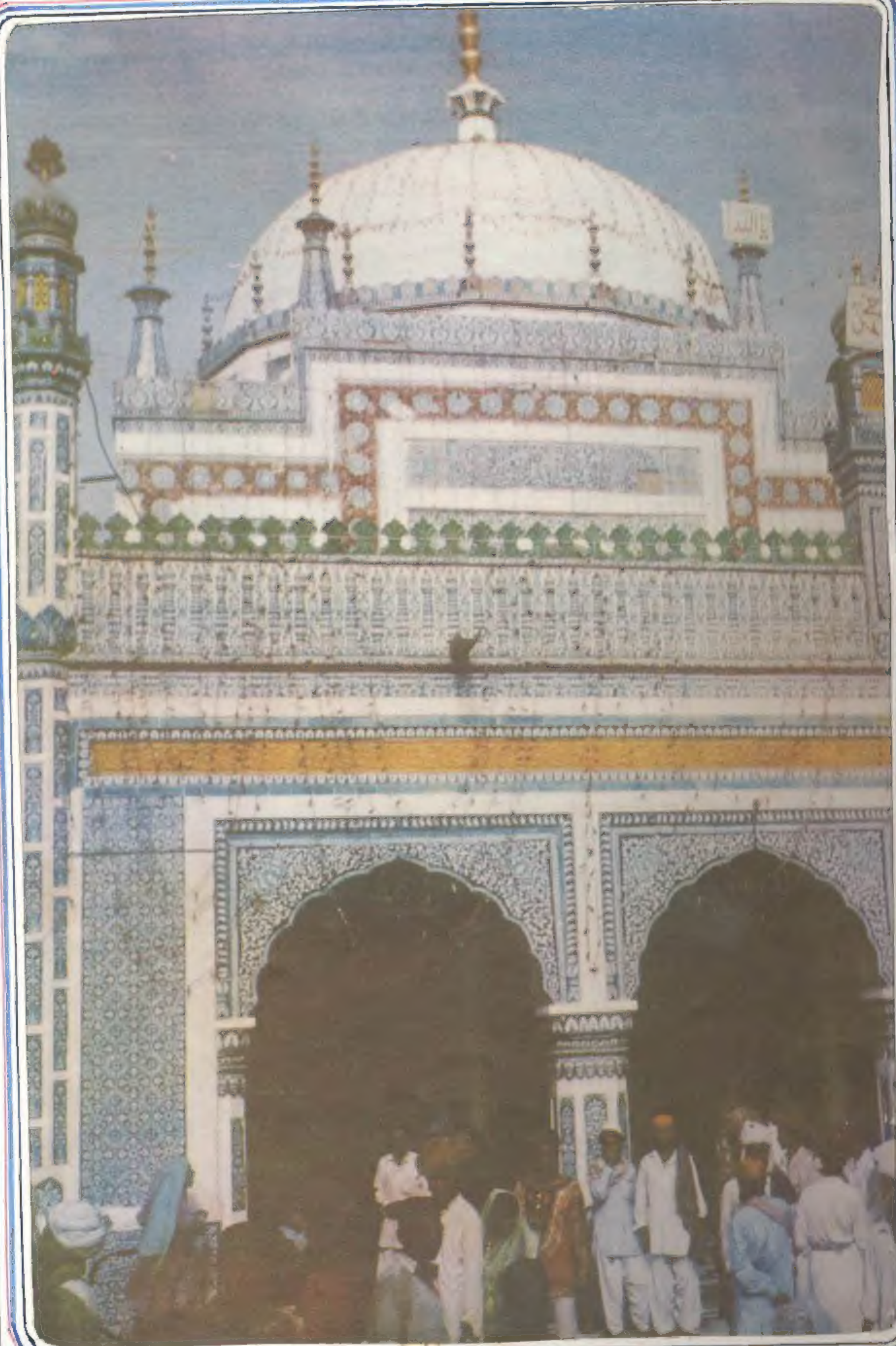

فہرست مضامین

سلسلہ شمار	عنوان	صفحہ
	گزارش	
	حصۂ اوّل	
۱۔ باب اوّل	سترھویں صدی عیسوی میں سندھ کی سیاسی سماجی۔ تمدنی اور معاشی حالت	
"	سندھ کی سیاسی سماجی اور معاشی حالت ..	
"	مرزا غازی بیگ۔ نکولاس وزنگتن۔ فرے سباستین مانریقہ۔ کلہوڑہ امیروں کی بتدریج ترقی	
"	میاں آدم شاہ۔ میاں نصیر محمد۔ میاں دین محمد۔ میاں یار محمد۔ الیگزنڈر ہملٹن سندھ میں ۱۶۹۹ء	
۲۔ باب دوم	ایک دلگداز واقعہ ..	
۳۔ باب سوم	نور محمد خان کلہوڑہ ۱۷۱۸ء۔ ۱۷۵۵ء	
"	شکارپور کی تعمیر۔ شکارپور پر حملے۔ نادر شاہ کا حملہ۔ احمد شاہ ابدالی سندھ میں	
۴۔ باب چہارم	سوانح حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائی رحمۃ اللہ	
"	خاندان۔ حضرت شاہ عبد الکریم بلڑیؒ۔ سید شاہ حبیبؒ۔ شاہ لطیف کا بچپن	
"	محبت کی اولین تجلی۔ سیر و سیاحت	
۵۔ باب پنجم	مرزا مغل بیگ کی شہادت اور شاہ لطیف کی شادی	
"	بھٹ شاہ کی تعمیر۔ حضرت شاہ حبیب کی وفات۔ حضرت شاہ لطیفؒ اور نور محمد کلہورہ	
۶۔ باب ششم	شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کی وفات	
۶۔ باب ششم	شاہ عبد اللطیف بھٹائی کی شخصیت۔ صورت۔ سیرت۔ مذہب	
	شاہ بھٹائیؒ کے مرید	
	حصۂ دوم	
۷۔ باب اوّل	اسلامی تصوف (تصوف کی تاریخ)	
"	حضرت خواجہ حسن بصریؒ۔ حضرت بی بی رابعہ عدویہ۔ حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ	
"	حضرت شیخ جنید بغدادیؒ۔ حسین بن منصور حلاج۔ حضرت ذوالنون مصریؒ امام ابوالقاسم القشیریؒ	
"	سیدنا حضرت شیخ عبد القادر گیلانیؒ۔ حضرت امام محمد الغزالیؒ۔ حضرت محی الدین ابن عربیؒ	
۸۔ باب دوم	پاک و ہند میں تصوف — پاک و ہند میں تصوف کی ابتدا۔ (طریقے)	

سلسلہ شمار	عنوان	صفحہ

۹۔ باب دوم	حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجریؒ۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ۔ حضرت شیخ بہاء الدین ذکریاؒ۔ حضرت شیخ فرید الدین	
" "	مسعودؒ۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ۔ حضرت بوعلی قلندرؒ۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔ سرمد شہید	
۱۰۔ باب سوم	**سندھ میں تصوف کی ابتدا۔**	
" "	حضرت ابوعلی سندھیؒ۔ شیخ الشیوخ حضرت نوح بکریؒ۔ شیخ صدر الدین سیوستانیؒ۔ مخدوم آدم نقشبندیؒ۔ حضرت مخدوم ابوالقاسم	
" "	نقشبندیؒ۔ حضرت عثمان مروندی لعل شہباز قلندرؒ۔ حضرت مخدوم نوح ہالائیؒ۔ مخدوم عربی دیانیؒ۔ حضرت شاہ خیر الدین	
" "	جیلانیؒ۔ قاضی قادنؒ۔	
۱۱۔ باب چہارم	**تصوف اور حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ**	
۱۲۔ باب پنجم	**حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ اور حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ**	
	حصہ سوم	
۱۳۔ باب اول	**شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کی شاعری۔** (شاعری کا ارتقا)	
" "	دوہیرے اور وائی۔	
۱۴۔ باب دوم	**شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کا کلام**	
۱۵۔ باب سوم	**شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے کلام میں تضمینات**	
۱۶۔ باب چہارم	**شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کا رسالہ اور اُس کی تدوین**	
" "	رسالے کے نسخے، گنج۔ بھٹ شاہ کا نسخہ۔ لنواری شریف۔ میر نور محمد۔ سیہون شریف۔ میر مراد علی خان تالپر والا	
" "	نسخہ۔ مخدوم ہالا۔ حافظ احمد جت۔ علامہ داؤد پوتہ والا نسخہ۔ مطبوعہ رسالے:۔ ارنیسٹ ٹرمپ ۱۸۶۶ء۔ قاضی محمد ابراہیم	
" "	کریمی رسالہ۔ محکمہ تعلیم۔ مرزا قلیچ بیگ۔ ڈاکٹر گربخشانی۔ غلام محمد شاہوانی۔ محمد عثمان ڈیپلائی۔ مولانا	
" "	غلام مصطفیٰ قاسمی۔ علامہ آوآ قاضی۔ کلیان آڈوانی۔ برٹش میوزیم۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ۔	
" "	رسالۂ شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ (منظوم اُردو ترجمہ) شیخ مبارک علی ایاز صاحب۔	
۱۷۔ باب پنجم	**شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ اور سندھ کے بزرگ شعراء کرام جن سے متاثر تھے۔**	
" "	مخدوم شاہ عنایت اللہ صوفی شہید۔ میون شاہ عنایت اللہ رضوی۔ میون عیسیٰ۔ حضرت شاہ فقیر اللہ علویؒ	
" "	حضرت محمد معین ٹھٹویؒ۔ مخدوم ضیاء الدین۔ حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹویؒ۔ حضرت خواجہ محمد زمان لنواری شریف	
" "	فقیر صاحبڈنو ناروقی۔ مخدوم عبد الرحیم گرھوڑی۔ سیّد میر علی شیر نافع۔ مخدوم محمد محسن ٹھٹوی۔ میاں سرفراز خان	
" "	حضرت بقا شاہ راشدی شہید۔ احسان لانگاہ۔ صوفی مدن بھگت۔ مخدوم ابوالحسن سندھی۔ مخدوم عبد الرؤف بھٹی۔	
" "	شیخ عمر۔ عطایو فقیر۔	

سلسلہ شمار	عنوان	صفحہ

حصۂ چہارم

۱۸۔ باب اوّل۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور سندھ کے معاصر اُردو شعرا

" " شاہ بھٹائیؒ کا دور۔ سندھی زبان۔ سندھ میں اردو زبان۔ سندھ کے اُردو شعرا

" " ملا عبدالحکیم عطا ٹھٹوی۔ میر حیدر الدین ابوتراب۔ میر محمود صابر رضوی۔ میر حفیظ الدین علی۔ رومل

" " فقیر۔ حضرت حاجی فقیر اللہ شاہ علویؒ۔ بھگوت گیتا۔ مراد فقیر۔ حضرت سچل سرمست۔

۱۹۔ باب دوم اُردو زبان کی ابتدائی نشوونما۔

" " امیر خسرو۔ دکن میں اُردو۔ وجہی۔ قاضی محمود بحری۔ وجیہ الدین وجدی۔ بنگال و ہند میں اُردو شاعری کا آغاز

۲۰ باب سوم۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شاعرانہ خصوصیات

" " سندھی۔ اردو الفاظ میں مشترک مشابہ۔ وطن کی زبان سے محبت۔

۲۱ باب چہارم سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی مختصر سیاسی اور معاشی حالات۔

" " نادر شاہ کا دہلی پر حملہ۔ احمد شاہ ابدالی کا حملہ۔ دہلی کی معاشی حالت۔ دکن کے اردو شعرا

پیرزادہ روحی۔ شیخ داؤد ضعیفی۔ سید شاہ حسین ذوقی۔ بلبل۔ عبدالعلی۔ راجی۔ دریا۔ وجدی

شاہ عبداللہ عاشق۔ سید اشرف شاہ۔ محمد فیاض۔ ولی اورنگ آبادی۔ میر جعفر زٹلی۔ فتح۔ ولی دکنی۔

۲۲۔ باب پنجم حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور معاصر اُردو کے شعرا۔

" " دہلی کے ہمعصر شعرا۔ (مماثلت)

" " ولی دکنی۔ شاہ ظہور الدین حاتم۔ سراج الدین آرزو۔ اشرف علی خان فغاں۔ شیخ شرف الدین مضمون

" " غلام مصطفیٰ خان یکرنگ۔ مرزا مظہر جان جاناں۔ شیخ محمد قائم۔ میر عبدالحی تاباں۔

" " مرزا محمد رفیع سودا۔ میر تقی میر۔ سید میر سوز۔ خواجہ میر درد۔ ضیاء الدین ضیا۔

" " انعام اللہ خان یقین۔ خواجہ محمد میر اثر۔ شیخ بقا اللہ بقا۔ سید سراج الدین سراج۔ سید میر حسن

" " اُردو کے متاخرین شعرا (مماثلت)

" " غلام ہمدانی مصحفی۔ نظیر اکبر آبادی۔ انشاء اللہ خان انشا۔ یحییٰ امان جرأت۔ سعادت یار رنگین

" " شیخ امام بخش ناسخ۔ حیدر علی آتش۔ سید نظیر الدین نظیر۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق

" " حکیم محمد خان مومن۔ بہادر شاہ ظفر۔ مرزا اسد اللہ غالب

۲۳ باب ششم۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور اُردو شعرا کے کلام کا تقابلی موازنہ

سلسلہ شمار	عنوان	صفحہ

ضمیمہ

۲۴ شاہ عبد اللطیف بھٹائی کے سوانح نگار۔ مترجم اور اُنکی تصنیفات۔

تاریخ تحفۃ الکرام (فارسی) میر علی شیر قانع۔ مرغوب احباب (فارسی) نظر علی بلوچ

احوال شاہ عبد اللطیف (انگریزی۔ سندھی) مرزا قلیچ بیگ۔ لطائف لطیفی (فارسی)

میر عبد الحسین خان سانگی۔ سندھ اور وادی مہران میں بسنے والی قومیں (انگریزی)

سر رچرڈ برٹن۔ احوال شاہ عبد اللطیف (انگریزی) سر بارٹل فریئر۔

شاہ لطیف (انگریزی) دیوان لیلا رام لالوانی۔ شاہ عبد اللطیف اف بھٹ

ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے۔ کیڈرو (انگریزی) سومدت۔ بی۔ گاجریہ۔ رسالہ شاہ عبد اللطیف (انگریزی)

مرحوم ایلسا قاضی۔ رسالہ شاہ عبد اللطیف (انگریزی) آغا محمد یعقوب خان شکارپوری

لطیف اور جدید دنیا (انگریزی) محمد اکرم انصاری

شاہ لطیف کے کلام کا فارسی زبان میں ترجمہ۔ ہدایت اللہ ہالائی۔ فارسی منظوم ترجمہ نیاز ہمایونی

شاعرن جو سرتاج (سندھی) مرتبہ بیگم خدیجہ داؤدپوتہ۔ کلمی جو کلام۔ پروفیسر جمشید بھاونانی

شاہ عبد اللطیف اور اُنکا کلام و فکر۔ عبد الغفار بلوچ۔ شاہ لطیف کی برسی۔ سندھی ادبی مرکزی

بورڈ۔ شاہ جون سورمیون۔ نارائنداس۔ شاہانہ کلام۔ مولانا عبد الکریم چشتی مرحوم شکارپور

کارنی۔ سرور علی۔ روح رعاٹ۔ ڈاکٹر گربخشانی۔ فرائیڈ اور شاہ۔ عبد الکریم لغاری

کنز لطیف۔ شاہ کا پیغام۔ سندھ کی ادبی تاریخ مرحوم محمد صدیق میمن۔

سندھی جریدہ۔ اردو جریدہ

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے شارح:۔

مرحوم ڈاکٹر عمر بن محمد داؤدپوتہ۔ سید میران محمد شاہ۔ دیوان بھیرو مل آڈوانی۔

مرحوم محمد بخش واصف۔ مولانا دین محمد وفائی مرحوم۔ مرحوم عثمان علی انصاری۔

مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی۔ مرحوم تاج محمد خان۔ مرحوم رشید احمد لاشاری

۲۵۔ اختتامیہ:۔

ماخذات (کتابیات)

گزارش

بیا و دید گر این جا بود زبان دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

۱۹۴۷ء کے شروع زمانہ میں، میں گورنمینٹ ہائی اسکول شکارپور سندھ میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس وقت سندھ کے ناظم تعلیمات مرحوم شمس العلماء ڈاکٹر عربی محمد داؤد پوتہ صاحب اسکول میں تشریف فرما تھے۔ طالب علموں کو اسکول کے ہال میں جمع کیا گیا تھا۔ اس لئے کہ علامہ موصوف طلبا کو چند باتیں کرنا اور ہدایات دینا چاہتے تھے۔ علامہ صاحب کی بزرگانہ و عالمانہ شخصیت اور اُن کی تقریر نے نوجوان طالب علموں پر بڑا اثر کیا۔ علامہ صاحب نے حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کی شخصیت اور پیغام پر باتیں بتائیں۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے کا ذکر بڑے سنجیدہ اور پر درد لہجے میں کیا۔ فرمایا "ایک مستشرق انگلنڈ سے آکر سندھ کے عظیم صوفی شاعر و بزرگ حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے سوانح اور کلام پر تحقیق کرکے ایک مقالہ لکھ کر اکسفورڈ یونیورسٹی لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن یہ کتنی افسوس کی بات ہے کہ ہم میں سے ایسا کوئی بھی فرد نہیں ہے جو صحت سے کام لیکر شاہ لطیف بھٹائیؒ پر تحقیق کر سکے۔" یہ جملے جن میں گویا جادو کا اثر تھا۔ میرے دل پر بڑا اثر کیا۔ اس دن سے میری یہ تمنا رہی کہ میں بڑا ہو کر حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ پر تحقیق کرونگا۔

ان دنوں میں میرے والد بزرگوار مخدومی پروفیسر لطف اللہ بدوی مرحوم و مغفور۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے شکارپور چھٹیوں پر آئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی دل کی مدعا آپ سے کہدی۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کی تقریر اور حضرت شاہ لطیف بھٹائیؒ، ڈاکٹر سورلے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے سوالات کیئے۔ والد بزرگوار نے میرے عزم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ہدایت دیکر دعا فرمائی۔ کاش! وہ آج میرے ساتھ ہوتے اور میری یہ محنت دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔

وقت اپنی رفتار سے گذرتا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میری زندگی میں بھی عجیب انقلابات آئے لیکن شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے کلام کو پڑھنا اور سمجھنا میرا معمول بن گیا۔ ۱۹۵۸ء میں، ایم۔ اے۔ سندھی ادب کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ مجھے شاہ بھٹائیؒ کے رسالہ کا پھر سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا جس سے میری گذری ہوئی تمنا کی یاد تازہ ہوگئی۔ ۲۱ نومبر ۱۹۶۵ء کو میرے محسن و مربی بھائی پروفیسر احسان احمد بدوی کی کراچی میں شہادت ہوئی اور ۱۹ نومبر ۱۹۶۸ء کو میرے والد بزرگوار کی ناگہانی وفات کے بعد زیادہ تر میرا رجحان ادب کی طرف ہوا۔ میں نے اپنے بھائی مرحوم اور والد بزرگوار کے چھوڑے ہوئے ضروری ادبی کام مکمل کیئے جن میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کے لئے دو حصے "کلہوڑا خاندان کا زوال اور تالپوری حکومت کا آغاز" مکمل کرکے دیا۔ جو ۱۹۷۱ء میں شایع ہوا۔ چنانچہ اُردو زبان سے میری دلچسپی کی وجہ سے مجھے شاہ بھٹائیؒ پر تحقیق کرنے اور اُردو زبان میں لکھنے کا خیال ہوا۔ اس طرح میری دل کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ میں سندھ یونیورسٹی جاکر گرانقدر ذی شان استاد جناب پروفیسر غلام مصطفیٰ خانصاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خان صاحب نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی اور میرے لئے یہ موضوع تجویز فرمایا اور دعائیں کی آج میں اس لائق ہوں کہ جامع الصفات "حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ سندھی زبان کے عظیم شاعر اور انکے معاصر اردو شعرا" پر اپنی تحقیق مکمل کر سکا ہوں اس طرح اللہ پاک نے میری یہ آرزو پوری کی۔

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ پر سندھی زبان میں کافی سے بھی زیادہ لکھا گیا ہے اور مزید لکھا جائے گا۔ اس طرح اُردو زبان میں بھی اچھا خاصا مواد جمع ہو چکا ہے لیکن ابھی تک اس میں تشنگی باقی ہے۔ شاہ لطیفؒ کی نسبت وہ تمام باتیں اور انکے کلام و شخصیت کو سمجھنے، اس وقت اور

ماحول کی عکاسی کرنے کے لئے اب تک کوئی ایسی مربوط کتاب اردو زبان میں نظر نہیں آتی، جس میں "یاد لطیف" کے متعلق تمام باتیں یک جا کردی گئی ہو۔ یا اُن کے فن شاعری، بزرگی اور سوانح کو جدید تنقیدی اصولوں کی روشنی میں تفصیل سے بحث کی گئی ہو۔ خاص طور پر اُردو داں حضرات کو شاہ عبداللطیف بھٹائی کو متعارف کرانے کے لئے یہ کوشش کی گئی ہے اس سلسلے میں پرانے وسائل سے بعض مواد کے ذریعے وضاحت سے کام لے کر جگہ جگہ نفسیاتی تجزیہ کرکے۔ ان مسائل کو واضح کیا گیا ہے۔ تاکہ شاہ بھٹائیؒ کے صحیح مرتبے کا تعین کیا جا سکے۔ اور آنے والی نسلوں پر شاہ لطیف بھٹائیؒ کے افادیت کے اثرات کو پیش کیا جائے اس لئے میں بھی "حضرت یوسف نبی علیہ وسلام کے خریداروں میں شمار ہوکر" شاہ لطیف بھٹائیؒ کے سوانح، کلام اور دیگر اوصاف کو لکھنے کا قصد کیا۔ اگر قبول ہو جائے تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔"

ہر زبان کو اپنی تہذیب، ثقافت، وطن اور اپنا مزاج ہوتا ہے قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ سے زبان اور ادب کے عروج وزوال کی داستان وابستہ ہوتی ہے، ہم اگر کسی زبان کے ادب کی تاریخ پر نظر کرینگے تو اس کے ساتھ ملک اور قوم کے ادب اور ثقافت کی تاریخ کو بھی ضرور دھرائینگے۔ ہر ملک کے ادب کا آغاز شاعری سے ہوا ہے۔ اس مہذب ملک اور قوم میں قدرت کی طرف سے ایک دَرِ بےبہا نمودار ہوتا ہے جو اس قوم کے مذہب، مزاج، تاریخ، ادب، ثقافت اور تہذیب پر چھایا رہتا ہے۔

سندھی زبان کو بھی اپنا ایک خاص مزاج ہے اور اسکے مزاج میں اسلامی تمدن اور مسلمانوں کی خصوصیات کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ اس اسلامی اثرات سے متاثر وہ دُرِ بےبہا شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی صورت میں نمودار ہوا۔ شاہ بھٹائیؒ وہ واحد عظیم المرتبت شخصیت ہے جس کی شان میں ہر ذکر کرنے والے نے گلہائے عقیدت پیش کئے ہیں۔ سبھی معصر مورخوں نے اس حقیقت کو نمایاں طور پر لکھا ہے کہ وہ باکمال بزرگوں میں سے تھے۔ اُنکے سینۂ دل پر انوار الٰہی کی تجلی نے وہ نور پیدا کیا تھا، جو ایک پیغام کی صورت میں انکے قلب کی گہرائیوں سے نکلے اور زندہ دوام کے مرتبے پر پہنچے۔ مادی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی ترقی کو بھی پیش نظر رکھیں سندھ کے غیر فانی شاعر بین الاقوامی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان جیسی ہستیاں دنیا میں نہایت دیر سے آتی ہیں۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ سے کم و بیش پانچ سو سال اور امیر خسرو سے ساڑھے تین سو سال بعد سندھ میں یہ باکمال مفکر پیدا ہوئے جسکے بعد اس سرزمین کو پھر کوئی ایسی شخصیت مل نہ سکی۔ علامہ اقبالؒ نے سچ فرمایا ہے:

نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں میں
وہی آب و گل ایران وہی تبریز ہے ساقی۔

یہ ہی حال سندھ کی سرزمین کا ہے جہاں صدیوں سے دریا بھرانی موجیں مارتے ہوئے رواں دواں ہے وہی ریت کے ٹیلے، وہ سندھ کی پاک زمین لیکن شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ جیسی شخصیت پھر پیدا نہ ہوئی۔

جو لوگ سندھی زبان سے واقف ہیں اور شاہ لطیف بھٹائیؒ کے کلام کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ حضرات شاہ بھٹائیؒ کے ہر شعر پر تصویر حیرت بن جاتے ہیں اور مدت تک اس کے مزے لے کر وجد کی کیفیت میں رہتے ہیں۔ شاہ بھٹائیؒ کا کلام معجز نظام ہے جو ملک کے بچے بچے کی زبان پر ہے ہر شخص اپنی استعداد اور مزاج کے مطابق شاہ بھٹائیؒ کے کلام سے روحانی اور معنوی فیض حاصل کرتا ہے۔

آج اس دنیا کے دور میں انسانیت کا فقدان ہے۔ ہر طرف معاشرہ میں نفرت بدمزگی، بدامنی کی فضا کا دور دورہ ہے، دلوں میں بغض و نفاق پیدا ہوگیا ہے۔ ہم لوگ قدیم بزرگوں کے روایات کو بھول گئے ہیں۔ اب یہی وقت ہے کہ ہم اس بات کو محسوس کریں اور بزرگان قدماء کے پیغام کو گھر گھر پہنچائیں تاکہ نفرت محبت میں بدل جائے۔ شاہ لطیف بھٹائیؒ کا پیغام اس مقصد کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوگا۔ اس بات کا بیان ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ شاہ لطیفؒ کے کلام اور شخصیت سے عشق بچپن ہی سے میرے دل میں رہا ہے جو کہ میری ذہنی کیفیات کا جز رہا ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

کتاب کی ترتیب کا اندازہ فہرست سے لگایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر شاہ لطیف بھٹائیؒ اور اُردو کے متقدمین، معاصر اور متاخرین شعرا کے کلام کو شاہ لطیف بھٹائیؒ کے کلام سے مقابلہ کر کے ان کے قریب لایا گیا ہے۔ اس طرح اردو کے اور شعرا کے کلام سے موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے انکی مکمل یادداشت خاتمہ کتاب پر شامل کر دی گئی ہے۔

انسان سراپا خطا کا مجسمہ ہے کمال ہے تو صرف اللہ کی ذات اقدس کو ہے۔ میں اہل زبان ہوں نہ میری مادری زبان ہے تو اُردو ہے نہ ہی پنجابی لیکن ان زبانوں سے واقف ضرور ہے۔ لازماً بہت سے خامیاں اور سقم رہ گئے ہونگے۔ خصوصاً مذکر و مانث، ابتلا اور زبان کی صحت میں۔ میری علماء بزرگان کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ خامیاں میری خطاؤں کو عفو و درگذر فرما کر اصلاح فرمائیں اور اس ناچیز کو ممنون اپنے نیک مشوروں سے نوازتے رہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب اہل علم حضرات کی خدمت میں شرف قبولیت حاصل کریگی۔

میں اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی سمجھونگا۔ اگر میں اپنے مشفق استاد واجب الاحترام جناب پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب صدر شعبہ اُردو، سندھ یونیورسٹی حیدرآباد کا خصوصی شکریہ ادا نہ کروں۔ جنہوں نے میری تحقیق کے لئے یہ موضوع تجویز فرمایا اور میری ہمت افزائی فرما کر اپنی نگرانی میں اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازتے رہے۔

میرے مہربان دوست جناب شیخ تجمل حسین لیکچرر اردو ادب گورنمنٹ کالج سکارپور کی کرم فرمائی شامل حال نہ ہوتی تو شاید اس کتاب کی تکمیل میں بڑی تعویق ہوتی۔ میں انکا بڑا شکر گذار ہوں۔

میں اپنے محسن جناب پروفیسر مولوی محمد سلیم صاحب، اسسٹنٹ پروفیسر عربی ادب گورنمنٹ کالج سکارپور سندھ کا بیحد ممنون ہوں۔ انہوں نے میری کتاب کا مسودہ اپنی غائر نظر سے دیکھا اور بعض قیمتی مشورے دیئے۔ اس کے علاوہ جناب علی احمد رندی لیکچرر اُردو ادب گورنمنٹ کالج حیدرآباد جناب حسن احسن لیکچرر اردو ادب گورنمنٹ کالج روہری۔ جناب اویس عبداللہ عباسی ایم۔اے (اسلامیات و نفسیات) سکھر۔ بدر احمد پٹھان لیکچرر انگریزی ادب گورنمنٹ کالج سکارپور۔ ڈاکٹر کریم الدین احمد۔ ایم۔پی۔ایچ۔ڈی لیکچرر اردو ادب گورنمنٹ کالج سکارپور۔ برادرم نور احمد بدوی ایم۔اے۔بی۔ٹی۔ ہیڈ اسسٹنٹ گورنمنٹ ہائی اسکول سکارپور سندھ۔ جناب بدر احمد سومرو لائبریرین گورنمنٹ کالج سکارپور سندھ کے دل کے گہرائیوں سے مشکور ہوں ان حضرات نے میری بڑی مدد کی ہے اگر میں ان تمام حضرات نے جس لطف و کرم اور تعاون کا اظہار کیا ہے ان کے لئے میں ارحد ممنون ہوں

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ

خادم علم

غلام احمد لطف اللہ بدوی

سکارپور سندھ

۱۲ جولائی ۱۹۷۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصۂ اوّل

باب اوّل

سترھویں صدی عیسوی میں سندھ کی سیاسی حالت

سولھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں سندھ کے کامیاب حکمران شاہ حسن ارغون کی وفات کے بعد سندھ کی حکومت دو حصوں میں منقسم ہوگئی ایک بکھر اور دوسرا ٹھٹہ چونکہ شاہ حسن کو کوئی اولاد نہ تھی اس لئے بکھر پر اس کا ایک سردار سلطان محمود قابض ہوگیا، اور ٹھٹہ پر دوسرا سردار مرزا عیسیٰ خان ترخان، اگرچہ یہ دونوں سردار سلطان کے دیرینہ ملازم تھے، لیکن حکومت حاصل کرتے ہی، باہم قدیم تنازعہ کی باعث دائمی خانہ جنگی میں مبتلا ہوگئے۔ اس اثنا کا بعد بالآخر دونوں ریاستوں کی تباہی پر منتج ہوا۔

اس آئے دن کے جنگ وجدل سے تنگ آکر، ایک دن مرزا محمود نے بکھر، اکبر اعظم کی تحویل میں دے دیا، مرزا عیسیٰ کی وفات کے بعد جب اس کا بیٹا مرزا محمد باقی تخت نشین ہوا، تو یہ اقتدار کی جنگ، محمود اور محمد باقی کے درمیان بھی قائم رہی۔ اگرچہ محمد باقی اکبری سلطنت سے آزاد تھا، تاہم ہند کے اس باجبروت شہنشاہ کی طاقت سے خائف ضرور تھا۔ محمد باقی کی متعدد روشیں اور مخالفانہ کارنامے، اکثر مغل اعظم کو اشتعال دلاتے رہتے، مگر اکبر وہ حکمران نہ تھا، جو معمولی چنگاری کی طرح ذرا سی ہوا سے بھڑک اٹھے۔ اس کی پیچیدہ سیاست بڑی دوراندیشانہ تھی وہ بڑے تحمل سے محمد باقی کی حرکتوں کو ٹالتا رہا۔ کیونکہ وہ ہندوستان میں بساط سیاست پر اپنے حریفوں سے بہادرانہ بازی کھیل رہا تھا۔ ایسے پرآشوب زمانہ میں ایک دور دراز ملک میں نئے فتنہ کا دروازہ کھولنا وہ ایک غیر دانشمندانہ حرکت سمجھتا تھا۔

بالآخر سلطان محمود بڑی عمر میں چل بسا۔ اور بکھر کا علاقہ براہ راست قلمرو اکبری میں داخل ہوگیا۔ شہنشاہ نے اپنی نئی ریاست کے انتظام کیلئے اپنے کارندے مقرر کردئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد محمد باقی نے بھی اپنی طالمانہ زندگی کا اچھے ہاتھوں خاتمہ کردیا[1]۔ اس مالی اور شجاع پوتا، مرزا جانی بیگ بڑی خونریزی کے بعد تخت نشین ہوا اس جانی بیگ سے اکبر اعظم کا نزاع ہوا۔ شہنشاہ نے اپنے سالار فوج عبدالرحیم خانخاناں کو بڑی فوج دے کر مرزا جانی کے مقابلہ کیلئے روانہ کیا۔ مرزا جانی نے بڑی دلیری سے مقابلہ کیا مگر اکبری اقبال کے سامنے اس کے بخت کا ستارہ غروب ہوگیا۔ جانی بیگ، جنگی قیدی کی حیثیت میں دہلی پہنچا اور سندھ کا مغلیہ سلطنت سے مکمل الحاق ہوگیا، اکبر نے مرزا جانی بیگ کی بہادری کی قدر کی۔ اسے پنج ہزاری کا منصب عطا ہوا، لیکن اسے لوٹ کر اپنے وطن مالوف کا دوبارہ نصیب نہ ہوا۔ اکبر نے دوراندیشی سے کام لے کر اس کے کمسن بیٹے مرزا غازی بیگ کو سندھ کا پہلا صوبیدار مقرر کردیا۔ اکبر کی وفات کے بعد مرزا جانی بیگ بھی جلد ہی چل بسا۔ اور اس کا لاش دہلی سے لاکر ٹھٹہ کے نزدیک کوہ مکلی پر دفن کیا گیا۔

اکبر کی وفات کے بعد اس کے جانشین شہنشاہ جہانگیر نے بھی مرزا غازی بیگ کو سندھ کا حاکم تسلیم کرلیا۔ اور بعد میں قندھار بھی اس کی تحویل میں دے دیا مرزا موصوف نے سندھ میں اپنے معتمد خاص خسرو خاں چرکس کو نائب مقرر کیا، اور خود قندھار میں رہنے لگا۔ جہاں اس سخی اور لائق حکمران کو ایک نمک حرام غلام نے عین

---

[1] اکثر مورخین لکھتے ہیں کہ مرزا محمد باقی، اپنی آخیر عمر میں کسی مہلک مرض میں مبتلا ہوگیا تھا، شدت مرض سے تنگ آکر خودکشی کرلی تھی یہ واقعہ سال ۱۵۸۴ء کا ہے

[2] بیگلرنامہ میں مرزا غازی بیگ کا سال شہادت ۱۰۱۲ھ دکھایا ہے۔ مرزا غازی بیگ عالم، سخن شناس اور باکمال سخن گو تھے۔ ملا عبدالنبی فخرالزمانی نے اپنی تصنیف میخانہ میں مرزا غازی کی ہنرمندی کی تعریف اس طرح کی ہے۔ "برائی او ہنرمندان وضمیر صفا گستر خردمندان پوشیدہ نماند کہ میرزائی مرحوم جامع الفضائل والکمالات بودہ شعرش کم از شعرای این جزو زمان نیست چنانچہ زین دو سہ بیت معلوم می توان کرد۔" ابیات متفرقہ مرزا غازی (میخانہ باعتناء مولوی محمد شفیع صفحہ ۲۲۷)

در بھو تو ما را ہمہ با غیر خطاب است ــــ سر پنجۂ مژگان و گریبان عتاب است

ــــ شاخ مژہ ام سبز شد و غنچہ خون کرد ــــ این با ہمہ از تربیت چشم پر آب است

عالم شباب میں زہریلا جام پلا کر شہید کر دیا۔ مرزا غازی بیگ سندھ کے آزاد حکمرانوں کی آخری نشانی تھے۔ اس موت نے ارغون اور ترخان خاندانوں

مرزا غازی بیگ

کی جھلملاتی ہوئی شمع کو ہمیشہ کے لئے بجھا دیا۔ آپ سندھ کے حکمران براہ راست دہلی سے مقرر ہوا کرتے تھے، یہ سلسلہ سلطنت مغلیہ کے انحطاط تک قائم رہا۔ مرزا غازی بیگ بڑے عالم اور شاعر تھے، شعر میں "وقاری" تخلص کرتے تھے۔ ایران کا مشہور شاعر طالب کلیم اس کا درباری شاعر تھا۔ مصحف آتشکدہ نے ایک پر اثر ساقی نامہ اس سے منسوب کیا ہے۔

مغلیہ دور میں سندھ کی انتظامی حالات اطمینان بخش نہ تھے۔ نواب اگرچہ دہلی کی مرکزی حکومت کے سامنے جواب دہ تھے مگر پھر بھی ان کے حالات غیر یقینی تھے، اور طاقت بے حد محدود تھی۔ وہ ملکی اور جنگی دونوں اختیارات رکھتے تھے، چونکہ سندھ ان کا آبائی وطن نہ تھا، اس لئے وہ ملکی اور جنگی بہبودی کے لئے جتنا پروا بھی نہ کرتے تھے۔ اکثر نوابوں کی یہی حالت تھی مگر ان میں کچھ نوابوں نے شہروں نے سندھ کی آبادی اور ترقی کے لئے بہت کچھ کام کیا۔ اس وقت کے ملکی حالات پر ایک فرنگی سیاح نکولاس وزنگتن

نکولاس وزنگتن ۱۶۱۳ - ۱۶۱۴ء

نے بہت کچھ لکھا ہے۔ شاید یہ پہلا سفید فام فرنگی تھا، جس نے سندھ کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، یہ سیاح خشکی کی راہ سے گجرات سے ٹھٹھہ آیا تھا، جہاں اس کو مشہور انگریز سفیر رالف فچ سے مل کر ایران جانا تھا، مگر بدقسمتی سے جو راہ اس نے اختیار کی تھی، وہ مصائب اور مشکلات سے بھری ہوئی تھی۔ کچھ کے ریگزار کو طے کرنے کے بعد جب وہ نگر پارکر کے شہر میں پہنچے تو راستے میں اس ڈاکوؤں کے مسلح گروہ سے دوچار ہونا پڑا، مالی نقصان کے بعد اس کو گجرات واپس جانا پڑا اور ٹھٹھہ تک اسے آنا نصیب نہ ہوا۔ یہ فرنگی مسافر ان حالات کے باوجود مغل حکومت کے انتظام کا بہت شکی نظر آتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے سفر کے لئے وہ مخدوش راہ اختیار کی تھی، جس پر مغلیہ شہنشاہیت کے زمانے میں بھی پیادہ پا سفر کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔

فرے سباستین مانریقہ

نکولاس وزنگتن کے بعد فرے سباستین مانریقہ ۱۶۲۱ء میں دوسرا مغربی سیاح ڈاکو سندھ میں آیا، وہ اپورٹو سدر (پرتگال) کے رہنے والے تھے، بنگال اگشتین متن ہگلی کا واعظ تھا۔ عیسائی کی تبلیغ کے لئے اس کو اراکان (برما) بھیجا گیا تھا، اسی تبلیغ کے سلسلے میں اسے سندھ میں بھی آنا ہوا۔ یہ مغل شہنشاہ شاہجہاں کا زمانہ تھا۔ وہ اپنے کوائف میں لکھتے ہیں:

"اپنے دوستوں کی مہربانی سے مجھے موقع حاصل ہوا کہ میں شاہی پروانہ کے ذریعہ سندھ کا سفر کر سکا یہ سفر میں نے اس لئے اختیار کیا تھا، کہ وہ گرجے جو شہنشاہ خرم کے حکم سے منہدم کر دئے گئے تھے، ان کی از سر نو تعمیر کی جائے شہزادہ آصف خان سے جو اس وقت سندھ اور ملتان کے والی تھے، خاص احکامات حاصل کرنے میں عازم سفر ہوا شہنشاہ کے پروانہ اور آصف خان کے احکامات کارآمد ہوا کہ مجھے راہ میں کسی چوکیدار کے تشدد کا سامنا کرنا نہیں پڑا اور میرے اسباب اور اشیاء محصول سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔"

مانریقہ دریائے سندھ کے راستے سے لاہور روانہ ہو کر ٹھٹھہ پہنچے اور پھر جیسلمیر کی راہ سے واپس دہلی پہنچے، مانریقہ کے حالات سندھ وزنگتن سے بہت مختلف ہیں۔ لاہور سے آگرہ تک اپنے حالات سفر اس طرح بیان کرتے ہیں

ہم نے اطمینان سے اپنے بیڑے کو دریا پر چھوڑ دیا، اب رات کو ہم اس کی پاسبانی کرتے جاتے تھے، راستے میں ہم جہاں لنگر انداز ہوتے، تو ہمیں بڑے آنار میں غلہ میسر ہوتا تھا، اکثر جگہوں پر پانی نایاب ہوتا تھا، پھر بڑے بڑے تعداد میں

Some notable travellers in Sind in Seventeenth Century Shah Abdul Latif of Bhit by Dr. H.T. Sorley. page. 68-

سلطان احمد کے بعد داؤد پوترہ اور کلہوڑہ سندھ کی سرزمین پر مدت تک حکومت کرتے رہے۔ داؤد پوترہ خاندان نے شکارپور[1] شہر
آباد رکھکر اُسے اپنی ریاست کا صدر گاہ بنایا۔ اور کلہوڑہ خاندان نے خدا آباد کا سنگ بنیاد رکھکر اُسے اپنی ریاست کا تخت گاہ
بنایا۔ کلہوڑہ خاندان اس طرح اپنی طاقت کو بڑھا کر پوری سندھ کے حاکم ہوئے۔

ہمارے قومی شاعر حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائی رح کا کلہوڑہ خاندان کے دور حکومت کے ابتدائی ایام سے تعلق ہے
اس لئے ہم کلہوڑہ خاندان کے عروج کا ذکر وضاحت سے بیان کرینگے۔ تاکہ حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائی کی سوانح اور
بزرگی، پڑھنے والے پر واضح ہو جائے۔ اور اس زمانے میں سندھ کے سیاسی حالات کیسے تھے۔ یہ اس حالات سے نشانہ نہ رہی

کلہوڑے امیروں کی بتدریج ترقی

سندھ کے تذکرہ نویسوں میں میر علی شیر قانع ٹھٹوی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس کی تصنیف تاریخ تحفۃ الکرام بہترین تاریخی یادگار ہے
مشہور شاعر اور مورخ کلہوڑہ عہد میں پیدا ہوئے۔ اس نے مشہور کلہوڑہ حاکم غلام شاہ کے عہد تک مفصل واقعات اپنے تذکرہ میں درج
کئے ہیں۔ چونکہ وہ کلہوڑہ دور کی پیداوار تھے۔ اس لئے اس مورخ کے مورخانہ کوائف بڑی حد تک صحیح اور مستند نظر آتے ہیں۔ ہم اسی
تذکرہ کی مدد سے انگریزی مورخین کے دیئے ہوئے حالات پر حاشیہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہینگے۔ کیونکہ انگریز مورخین نے سیاسی ضرورتوں
نے ماضی کے صحیح نقوش کو صورت ہی مسخ کر ڈالی ہے۔ مورخانہ تحقیق سے گزر کر تعصب کے نوٹ انگریزی میں جا پہنچے ہیں۔ ہم ان حالات
میں محقق کی یادداشت کو چھوڑ کر دروغ بیانی پر اعتبار نہیں کر سکتے۔

میاں آدم شاہ سلطان احمد عباسی کی اولاد میں اوصانہ کے بعد آدم شاہ نامی ایک بڑے عارف پیدا ہوئے۔ جن کے فیض باطنی سے
بہت سے لوگ خدا رسیدہ بن گئے۔ وہ سید میران محمد جونپوری بانی فرقہ "مہدویہ" کے مریدان باصفا میں سے تھے۔ میاں آدم شاہ نے سندھ
کی سیر و سیاحت کے بعد چانڈوکہ[2] پرگنہ کی ایک ستی ھٹڑی کے نزدیک مستقل طور پر رہائش اختیار کرلی۔ بتدریج ان کے مریدوں کا
حلقہ وسیع ہوتا گیا۔ اس زمانے میں نواب عبد الرحیم خانخاناں، اکبر فوج لے کر مرزا جانی بیگ کے مقابلہ کیلئے سندھ میں آئے۔ جان
معصوم نے میاں آدم شاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر ہونے والی جنگ کیلئے دعائے نصرت کی درخواست کی۔ جب وہ تائید ایزدی
سے مظفر اور منصور ہوکر دہلی واپس جانے لگے تو میاں آدم شاہ نے چانڈوکہ کا علاقہ بطور جاگیر نذر کرنا چاہا۔ علاقہ پہلے چانڈیہ
طوچ قوم کے اختیار میں تھا۔ اس قوم کے نام سے یہ علاقہ چانڈوکہ کہلاتا تھا۔

چند سال کے بعد میاں آدم شاہ نے لاہور کے ایک باخدا صوفی لال حسن سے ملنے کے لئے ملتان کا سفر اختیار کیا جہاں ان کے ارادتمند
کا بڑا اجتماع ہو رہا تھا۔ انہوں نے اپنے شیخ کے لئے وہی دولتی سکونت کا بندوبست کیا۔ اور بڑی اراضی اس غرض کیلئے منتخب بھی کرلی
مگر ملتان کے حاکم نواب نے میاں کے بڑھتی ہوئی طاقت اور رسوخ کو دیکھکر، اس درویش بے صدر کو شہید کرادیا۔ آقا محمد کوتوال آپ کے
مرید نے مسند و متبنیٰ آپ کی نعش کو سکھر سندھ لایا۔ اور ایک پہاڑی پر دفن کردیا۔ جس کو اس بزرگ مقبول کے نام سے آدم شاہ کی
پہاڑی کہتے ہیں

---

[1] شکارپور کا شہر شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں آباد ہوا (سنہ ۹۷۷ھ - سنہ ۱۰۲۷ھ) اس کی تاریخ بنیاد سنہ ۱۰۲۹ھ ہجری ہے جو لفظ "شوک" سے
برآمد ہوتی ہے: یہ کتبہ مسجد حاجی فقیر اللہ صاحب علوی قدس سرہ واقع سندھ والی روڑ پر مرقوم ہے

[2] سندھ گزیٹیر لاڑکانہ، والیوم ۵۔ صفحہ ۳۔ مرتب مسٹر ڈی۔ ایم۔ سینیڈ، طبع ۱۹۱۴ء صفحہ ۱۱۔ چانڈوکہ موجودہ لاڑکانہ ہے

میاں آدم شاہ کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا داؤد خان مسند نشین ہوا اور ہٹڑی میں مستقل رہائش اختیار کی داؤد شاہ جنگی زندگی سے بیزار رہا، اور گوشہ نشینی میں زندگی بسر کرکے عالم جاودانی کو سدھارے۔ داؤد کے بعد اس کا صاحبزادہ الیاس شاہ مسند نشین ہوئے، اُس کے مریدوں کی تعداد جو اکثر کا شغل تھا، روز بروز بڑھتی رہی۔ ان کے باہمی امداد سے لاڑکانہ کی نزدیکی میں نارہ کی نہر کھودی گئی، نارہ کے دونوں کناروں پر اس کے مریدوں میں سے ساگی اور اڑھ قوموں نے مختلف زمین کے قطعات پر قبضہ کرلیا۔ شاہ محمد کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو دیکھکر خود اُن کے مریدوں میں رشک پیدا ہوا چونکہ شاہ علی عرف شاہ محمد، اپنے بڑے بھائی الیاس کے بعد مسند نشین ہوا تھا، جو کہ خدا رسیدہ بزرگ تھا، جس کے بڑھتے رسوخ کو رشک سے دیکھا گیا، آخر بکھر کے گورنر سے ساز باز کرکے، ان شقی القلب مریدوں نے موقعہ پاکر اپنے شیخ کو شہید کردیا یہ واقعہ ۱۰۰۸ھ مطابق ۱۶۹۶ء کا ہے۔

میاں نصیر محمد | میاں شاہ محمد کی شہادت کے بعد اس کا بیٹا نصیر محمد مسند نشین ہوا میاں نصیر محمد نے مخالفت کو بڑھتا ہوا دیکھکر اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہکر ریگستان میں جا بسا، چند سالوں کی غریب الوطنی کے بعد پھر لوٹ کر آبائی وطن آگیا، مگر بکھر کے نواب نے چالبازی سے فوج بھیجی اور اُسے گرفتار کرکے شہنشاہ اورنگزیب کے حضور میں بھیج دیا، میاں نصیر محمد عالمگیری فوج کی چھاؤنی سے کسی نہ کسی طرح بھاگ کر سندھ میں آگیا، اور اپنے مریدوں کی فوج جمع کرکے بکھر کے نواب، میر یعقوب کے مقابلہ کے لئے بڑھا، ایک خونریز جنگ کے بعد میاں نصیر محمد کو فتح حاصل ہوئی اور یعقوب خان بھاگ کر جان بچائی، یعقوب خان کی شکست کی خبر سن کر سبّی کے مغلیہ نواب مرزا خان افغان کو بڑا غصہ آیا، میاں نصیر محمد کا تسلط بیہوں سے بکھر تک ہوگیا، نواب مرزا خان نے میاں نصیر محمد کو سزا دینے کیلئے لاڑکانہ پر حملہ آور ہوا لیکن خفیف مقابلہ کے بعد وہ سبّی چلا گیا، ان فتوحات کے بعد میاں نصیر محمد نے چند نئے شہر آباد کئے، جن میں نوشہرہ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ میاں نصیر محمد نے سندھ میں کلہوڑہ خاندان کی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔

میاں دین محمد | میاں دین محمد، اپنے والد نصیر محمد کے بعد اُن کا جانشین ہوا، اس زمانے میں پنہور قوم کا رئیس میر بہرام خان، کلہوڑہ سجادہ نشین سے سائل ہوکر مغلیہ دربار میں فریاد لے کر حاضر ہوا، اس وقت دہلی کے تخت پر اورنگزیب کا بیٹا شاہ عالم متمکن تھا، بادشاہ نے امیر شیخ جہان کو حکومت نصب ہوئی، اللہ یار خان تو میدان سے بھاگ کر بھاگ نکلا مگر میں اُسوقت قنبر خان بروہی نے جو شاہی فوج کی مدد کے لئے سبّی سے آرہا تھا، موقعہ پر پہنچ کر اچانک فقیروں پر حملہ کردیا اس ناگہانی حملہ سے فقیروں کی فوج کا بڑا نقصان ہوا، مگر پھر بھی میدان سے جان بچا کر بھاگ نکلا مگر پھر بھی میدان کلہوڑہ فوج نے جیت لیا، شیخ جہان نے میاں دین محمد کی اطاعت قبول کرلی اور ہمیشہ کے لئے اُن کی باجگذار رعیت بن گئے۔

امیر شیخ جہان کی شکست نے مغل شہزادہ معزالدین جہاندار شاہ کو بڑا فروختہ کردیا، جو اس وقت ملتان اور لاہور کا صوبدار تھا، ایک بڑی فوج لیکر بذات خود بکھر پہنچے، میاں دین محمد کو جب شہزادہ کے آمد کی اطلاع ہوئی تو اپنے بھائی میر محمد کو اُن کی خدمت میں اظہار عقیدت کیلئے بھیجدیا۔ شہزادہ نے میاں کی گذارش، خطاؤں سے درگذر کیا، اور کسی معاہدہ کے بغیر لاہور چل دیا مگر جلد ہی میاں دین محمد کے ایک مرید مقصود نے اُچ (ریاست بہاولپور) پر حملہ کردیا، اور کشت و خون کے بعد اُچ پر قبضہ کرتے امن پسند شہریوں پر بڑے بڑے مظالم توڑے، شہزادہ معزالدین، وزیر مقصود کی جانب سے اور سندھ کے حالات سکر بہت مشتعل ہوئے، اور ایک دفعہ پھر میاں پر غضبناک ہوکر چڑھ آئے مقابلہ مقصود نے اس تیز و تند طوفان کے ایک جھونکے کی بھی تاب نہ لاسکا، میاں دین محمد تاب مقاومت نہ لاکر سیہوں کے نزدیک شہزادہ کی خدمت میں حاضر ہوکر اطاعت کی مگر فقیروں نے اطاعت کرنے کے بجائے بڑی فوج جمع کرلی، ٹاج نہر کے نزدیک شاہی فوج اور فقیروں کے درمیان سخت مقابلہ ہوا فقیر سپہداروں نے بڑی بیجگری سے

مقابلہ کیا، اور ہزاروں لڑتے ہوئے کھیت رہے اگرچہ میدان جنگ شہزادہ کے ہاتھ رہی تھی، مگر مغلیہ سلطنت کے دعائم کے شاہی فوج کا حد سے زیادہ نقصان کیا۔ شہزادہ میاں دین محمد کو اپنے ساتھ لے گیا جس نے بقیہ زندگی ملتان میں قیدی کی حیثیت سے گذاری

میاں یار محمد دین محمد کے بھائی، میاں یار محمد نے شہزادہ کے ہوتے ہوئے ملتان میں جاکر پناہ لی تھی عرصے کرانے کے بعد الٰہ خان مروی کے کمک سے خروج کیا، اور آبائی علاقہ پر چڑھ آیا، فتح پور کے قلعے کو فتح کرلیا، اس کی آمد کی خبر سن کر بھی مغلیہ اس کے گرد جمع ہونے لگے، اس کی مدد سے اٹک کا قلعہ فتح کیا، مختیار خان جو مغل حکومت کی طرف سے اس حصہ کا حاکم تھا میاں کے عقیدتمندوں سے تنگ آکر شہزادہ معز الدین جہاندار شاہ کی خدمت میں کمک کا طالب ہوا، مگر جید و جوہات کے باعث شہزادہ موصوف سندھ میں آ نہ سکا، اب حالات نے پلٹا کھایا شہزادہ مختیار خان کی مدعوانیوں سے آزردہ ہو کر سندھ میں آیا، مختیار خان مارا گیا، اور کوہستان کی حکومت بتدریج میاں یار محمد کو سپرد ہوئی، شہزادہ کے دربار سے میاں کو خدایار خان کا لقب عطا ہوا، اسی اثنا میں ڈیرہ غازی خان میں بغاوت نمودار ہوئی، میاں نے اپنی ایک فوج کے سردار ٹالپور خاندان کے مورث اعلیٰ میر شہداد خان کی خدمات شہزادہ کیلئے وقف کردیں، میر صاحب نے بڑی مستعدی سے بغاوت کو فرو کرکے شہزادہ کا اعتبار حاصل کرلیا، اس کے صلہ میں میر کو پٹ باران کی جاگیر تفویض ہوئی، اور میاں یار محمد پر عنایات شاہانہ کی بارش ہونے لگی میاں یار محمد کے آخری نو سال صلح اور آرام میں گذرے اس نے خدا آباد (دادو ضلع) کو حکومت کا مرکز بنایا، اور سبی سے لیکر سیہون تک اس کا حکم چلنے لگا۔

الیگزنڈر ہملٹن سندھ میں ۱۶۹۹ء

کپتان الیگزنڈر ہملٹن[1] اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے، وہ سیاح اور پیشہ ور تاجر تھے، اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ۱۶۸۸ء سے ۱۷۲۳ء تک دنیا کے مختلف حصوں میں سیر و سیاحت میں بسر کیا، وہ تعلیم یافتہ اور زیرک تھا، اس کا سفرنامہ جو ۱۷۲۳ء میں شایع ہوا بڑا ہی دلچسپ ہے۔

یہ سیاح ۱۶۹۹ء میں لاہری بندر میں آیا تھا، کچھ وقت ٹھٹہ میں رہ کر اپنے وطن مالوف واپس ہوا اس کے سفر کا زمانہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے زمانے سے قریب تر تھا، ہمارے قومی شاعر اس وقت بہ مشکل آٹھ یا نو برس کے تھے اس لئے الیگزنڈر کے مشاہدات متعلقہ سندھ اور اس زمانے کے ملکی حالات کے پرکھنے کے لئے بہت کارآمد ثابت ہونگے۔

کپتان کو سفر کرتے ہوئے راہ میں جو دقتیں پیش آئیں، اُن کا ذکر بڑی وضاحت سے کرتا ہے، وہ اپنے سفرنامہ میں سندھ کی بدانتظامی، ڈاکہ زنی اور بے قاعدگی کی بڑی شکایت کرتا ہے، مگر خول ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے مصنف "شاہ عبداللطیف بھٹائی" اس وقت انگلستان میں یہی حالات تھے، سندھ میں سفری مصائب کے باعث مصنف مغل حکومت کی کمزوری بتاتا ہے اس میں شک نہیں کہ مغل نواب اکثر غیر سندھی تھے، سندھ کے ملکی حالات سے قطعی بے خبر تھے، اس لئے اُن سے وقتاً فوقتاً ملکی انتظام میں اہم غلطیاں سرزد ہوجاتی تھیں جن کے باعث ملک میں بدانتظامی پھیل جاتی تھی، ہملٹن لاہری بندر کو دریائے سندھ کی ایک شاخ بتاتا ہے جو سمندر سے چار یا پانچ فرسخ دور تھی۔ بندر اتنا وسیع تھا، کہ ۲۰۰۰ ہزار ٹن کا وزنی جہاز آسانی سے آسکتا تھا، مگر شہر اُسے بلکل پسند نہ آیا لکھتا ہے:۔

---

[1] کیپٹن الیگزینڈر ہملٹن، سکاچ تھے، اور اس سے اپنی ملکی جہاز تجارت میں گزارا، وہ عمدہ جہاز ران تھا کیپ آف گڈ ہوپ (آذربیجان) سے لے کر جہاں تک سفر کیا اس کا ذکر کیا ہے۔ ۱۶۹۹ء میں سندھ میں آیا تھا، کچھ وقت کے لئے ٹھٹہ میں بھی مقیم رہا۔ لاہری اور ٹھٹہ کے متعلق جو کچھ اپنی تصنیف "New Account of the East Indies" میں لکھا ہے وہ نہایت دلچسپ ہے ہملٹن کا زمانہ کلہوڑہ دور حکومت کا شروعاتی دور تھا اس لئے اُس دور کے سیاسی اور معاشی حالات کے سمجھنے کے لئے اِن کی تصنیف سے کافی مدد ملتی ہے

شہر میں بہ مشکل سو گھر تھے، جن کی چھتیں مٹی اور لکڑی کی بنی ہوئی تھیں، مگر اس کے گرد پتھر کا ایک مضبوط قلعہ تھا، جس کے فصیل پر چار یا پانچ توپیں نصب تھیں، جن سے باہر کے آنے والے مال کی حفاظت کی جاتی تھی، کیونکہ بندر پر اکثر بلوچ اور مکرانیوں کے حملے کا خوف رہتا تھا۔ یہ قوس اپنی لوٹ مار کے باعث، اس وقت بدنام تھیں، جو ہمیشہ شکار کی تاک میں رہتے تھے۔ یہ ڈاکو و جرائم پیشہ لوگ ندی کے کنارے گھنے جنگل میں چھپے رہتے تھے۔ اکثر حملے اپنی حفاظت کیلئے سو یا دو سو مسلح سواروں کا دستہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اکثر اور بعض اوقات یہ حفاظتی دستہ ڈاکوؤں سے مل جاتا تھا، اور قافلے والوں کو لٹیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔

۱۶۹۹ء میں ہملٹن ایک بدنصیب قافلے کی بربادی کا ذکر کرتا ہے۔ جس میں ۲۵ سوار اور پانچ سو قافلے والوں کا ڈاکوؤں کے ہاتھوں خاتمہ ہو گیا تھا، ہملٹن نے تھٹہ کا مفصل احوال بیان کرتا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"شہر تین میل طول اور ڈیڑھ میل عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ لاہری بندر سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ شہر کے مغرب میں ایک بڑا قلعہ ہے جس میں پانچ سو سپاہی آسانی سے رہ سکتے ہیں۔ نواب کا محلات بھی اس قلعہ میں ہے۔ ملک کا بہت سا حصہ گنجان جنگلوں سے گھرا ہوا ہے۔ جن کے باعث راستہ کا سفر ناممکن ہے۔ گاڑیاں اکثر بیل کھینچتے اور ان کی رفتار بہت دھیمی ہوتی ہے۔"

ہملٹن ملبار سے لاہری بندر تک ایک تجارتی کشتی میں آئے تھے، جس میں قریباً دس ہزار پاؤنڈ کا تجارتی سامان لدا ہوا تھا، مگر امن و امان کے مفقود ہونے کے باعث کسی سوداگر نے اس کے مال سے سودا کرنا نہ چاہا۔ جب وہ ٹھٹہ میں آیا، تو ہر طرف سے سوداگروں کی بھیڑ لگ گئی۔ ہملٹن کا قافلہ بڑے ساز و سامان سے لاہری بندر سے روانہ ہوا قریباً ایک ہزار پانچ سو جانور اور اتنے ہی مسافر موجود تھے، ان کے علاوہ دو سو سواروں کا دستہ بھی قافلہ میں شریک تھا، جب یہ قافلہ سولہ میل سفر طے کر چکا تو خبر ملی کہ بلوچ اور مکرانی ڈاکوؤں کا ایک مسلح دستہ قافلہ پر حملہ کرنے کیلئے تیار بیٹھا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی ہملٹن اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ جو بڑے نشانہ باز تھے ڈاکوؤں کے مقابلے کیلئے تیار ہو گیا۔ انہوں نے ڈاکوؤں کو ڈرانے کیلئے دو چار بندوقیں داغ دیں اس طرح قافلہ نفسِ راہ طے کرنے کے بعد ایک قافلہ سرائے میں اترا، جس کے گرد مٹی کا ایک مضبوط قلعہ تھا، یہ قافلہ والوں کے لئے شب باشی کا مقام تھا، جس میں ایک وسیع میدان اور لاتعداد چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ قلعے کے گرد قریباً بیس نام مکان موجود تھے جہاں کے رہنے والے قافلے والوں کو مرغیاں بکریاں اور بھیڑیں فروخت کرتے تھے، یہ مختصر آبادی تھی جو ان کو ٹھٹہ اور لاہری بندر کے درمیان نظر آئی۔

ٹھٹہ میں ہملٹن کو رہنے کیلئے بڑی شاندار جگہ ملی، نواب جو اس وقت پانچ ہزار سواروں کے ساتھ ڈاکوؤں کے قلع و قمع کیلئے راہ میں ٹھہرا ہوا تھا، فرنگی قافلہ سالار کے آنے کی اطلاع پاکر اسے بہت سے اشیاء خوردنی روانہ کی دوسرے دن ہملٹن نے بھی دلکش تحائف اس کی خدمت میں پیش کئے، ہملٹن نواب کی بہت تعریف کرتا ہے، اس نے فرنگی تاجر کو بڑی رعایتیں دیدی تھیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اسے قرض وصول کرنے کیلئے خاص اختیارات دئے گئے تھے، جن کے باعث اسے دارالقضا میں جانے کی ضرورت نہ رہی۔ ہملٹن دریائے سندھ پر کشتیوں کی آمد و رفت سے بڑا متاثر نظر آتا ہے وہ کشتیوں کی ساخت کی بڑی تعریف کرتا ہے، لکھتا ہے:۔

"بعض ان میں سے ۲۰۰ ٹن اٹھانے کے متحمل ہیں، اکثر ان کی سطح ہموار ہوتی ہے اور ان میں چھوٹے کمرے (CABINS) بھی ہوتے ہیں"

وہ لکھتا ہے کہ اس ساخت کی کشتیاں اسے کہیں نظر نہ آئیں، ہملٹن شہروں کی تجارت کی خوش حالی، عوام کی آسودگی، اور فصلوں کی افراط کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ مغل حکومت کے انتظام کا شاکی ہے، لیکن ملک کی فارغ البالی کا ہر جگہ اعتراف کرتا ہے، اس آسودگی سے متاثر ہو کر ہمارے قومی شاعر حضرت شاہ عبداللطیفؒ نے فرمایا ہے

سائین سدائیں ھریں مٹي سندي سکار (سرسارنگ)

آقا ہمیشہ سندھ پر ارزانی کر۔

ہملٹن کی تصنیف کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سندھ کا ملک سترھویں صدی عیسوی میں اپنی خوشحالی کے باعث بہت ہی آسودہ اور خوش نصیب تھا۔

باب دوم
ایک دلگداز واقعہ

مغلیہ حکومت کے سایہ میں میاں یار محمد کی زندگی بڑے آرام سے گذرتی تھی، مگر آخر عمر میں اس کے ہاتھوں ایسی خونریزی ہوئی جس کو تاریخ سندھ میں قتل ناحق سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حضرت شاہ عنایت اللہ صوفی کی شہادت کا سانحہ اور جھوک میرانپور کا واقعہ سنہ ۱۱۳۰ھ مطابق سنہ ۱۷۱۸ء کا ہے۔ سندھ پر اگرچہ مغل حکومت کا برائے نام تسلط تھا، مگر ملک کے طول و عرض میں بدنظمی اور طوائف الملوکی کا دور تھا۔ اگر شمال سندھ میں داؤد پوتہ دور پکڑ رہے تھے، تو بکھر اور ٹھٹہ میں علیحدہ علیحدہ نواب حکومت کر رہے تھے۔ وسط سندھ میں میاں یار محمد کا طوطی بول رہا تھا، غرض یہ کہ ملک کا اختیار شہزادہ منتشر ہو چکا تھا، فتنہ اور فساد کی آگ ہر طرف بھڑک رہی تھی۔ ایسے دور میں جب معمولی ہوا سے چنگاری شعلہ بن سکتی تھی، تو ہولناک طوفان میں ایسے نار نمرود بننے میں کون سی شے مانع تھی، پھر یہ تو ہمیشہ ہوتا ہی رہا ہے کہ چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی لڑتا ہی رہا ہے زمانے نے ایک بار پھر دیکھ لیا کہ شاہ شہید پر اس وقت کے کوفی اٹھ کر آئے، اور جھوک میرانپور کو کربلائے ثانی بنا دیا۔ مخدوم عنایت اللہ کے والد کا نام مخدوم فضل اللہ تھا، جو مخدوم صدھو لانگاہ کی اولاد سے تھے[1]۔ مخدوم موصوف کو مشائخ کبار میں شمار کیا جاتا ہے۔ ملا اجب ولد مخدوم صدھو لانگاہ، اہل اللہ میں سے تھے۔ صاحب تحفۃ الکرام[2] سے روایت ہے کہ ایک بار ملا اجب دریا کے گھاٹ پر پہنچے۔ لیکن اسے کوئی کشتی نظر نہ آئی موسم سرما کی شام تھی، سردی بڑے آب و تاب سے بڑھتی جا رہی تھی، خادم نے عرض کیا رات گھر لوٹ کر گذاریں اور صبح آکر دریا کو عبور کریں لیکن ملا اجب نے انکار کر دیا، جب رات کی زلفیں دراز ہو گئیں تو، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے دریا پایاب ہو گیا اور ندا آئی "اے شیخ اگر ارادہ عبور دریا ہو تو چلے آئیے"۔ شیخ نے یہ سنکر جواب دیا "ہم خدا پر توکل رکھتے ہیں، کسی غیر کے محتاج نہیں ہیں" رات دریا کے کنارے پر بسر کی اور صبح کے وقت کشتی میں سوار ہو کر دریا عبور کیا۔ شاہ شہید کے والد بزرگوار مخدوم فضل اللہ کا شمار بھی اہل اللہ میں ہوتا تھا۔

شاہ عنایت اللہ صوفی بچپن میں ہی صراط المستقیم کی طرف متوجہ تھے۔ اکثر خلوت و شغل کرتے رہتے تھے، جوانی میں تحقیق حق کا شوق دامنگیر ہوا، اور سیر و سیاحت کرتے ہوئے حیدرآباد دکن پہنچے، وہاں آپ کو ایک خدا رسیدہ بزرگ شاہ عبدالملک کی صحبت نصیب ہوئی، جب ارشاد پیر تحصیل علوم ظاہری کے لئے جہان آباد میں شاہ غلام محمد کے پاس پہنچے، شاہ غلام محمد سے ظاہری علوم تو حاصل کر لئے، مگر انوار الٰہی کی چمک چھپنے والی نہ تھی، استاد شاگرد کی خدمت میں اپنی تشنہ لبی بجھانے کیلئے جھکا، اور مریدان باصفا میں داخل ہو گیا جب شاہ صوفی نے جہان آباد کو الوداع کہا تو، شاہ غلام محمد نے بھی اپنے وطن مالوف کو خیر باد کہکر جھوک میرانپور چلے آئے، شاہ صوفی کی خدمت میں بڑے مجمع سے حاضر ہوتے تھے، علماء کو جب مرشد اور مرید کے اس ظاہری سلوک کا حال معلوم ہوا تو بہت بگڑے اور شریعت کے احترام کے لئے، غلام محمد شاہ کو تعزیر شرعی کے لئے بلایا گیا، علماء ظاہر کی بار بار اذیت کے باعث بالآخر غلام محمد کو جھوک میرانپور چھوڑنا پڑا اور باقی زندگی جہان آباد میں یاد الٰہی میں بسر کی۔

اس زمانہ میں شاہ صوفی کے فیض اور رشد کا غلغلہ سندھ کے گوشہ گوشہ میں جا پہنچا تھا، تشنگان فیض الٰہی جوق در جوق شاہ صوفی کے چشمہ فیض سے سیراب ہونے کیلئے جمع ہونے لگے، یہ جاہ و جلال دیکھکر گرد و نواح کے حاسد زمیندار اور پیران خود پرست کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔

---

[1] لانگاہ قوم نے بڑی مدت تک ملتان پر حکومت کی مرزا شاہ حسین ارغون نے ملتان فتح کرکے لانگاہ حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

[2] تاریخ تحفۃ الکرام مصنف میر علی شیر قانع صفحہ ۲۲۰

وہ خود تو شیخ کے مقابل نہ ہوئے، مگر درپردہ حکومت سے ساز باز کرتے رہے۔ ٹھٹہ کے مقلید نواب میر لطف علی، اور نواب محمد اعظم خاں نے شیخ کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو حکومت کے حق میں مضر سمجھا۔ ٹھٹہ کے نواب میر لطف علی معیر سومرے سمیجے، نور محمد ولد صنبو پلیجو جو ابوجہل کی اولاد سے تھے، اور پلیجہ قوم کے بڑے زمیندار تھے۔ اجازت دی کہ شیخ عنایت اللہ پر حملہ کردے۔ نور محمد نے پہاڑی لوگوں اور بلڑی والوں کی مدد سے بیشمار لشکر جمع کرکے اچانک فقیروں پر حملہ کردیا، جس کی وجہ بہت سے بیگناہ فقیروں نے اپنے مرشد حضرت شیخ صوفی پر نثار ہوکر شہادت کا جام نوش کیا۔ شہیدوں کے وارثوں نے دہلی جاکر بادشاہ فرخ سیر کی بارگاہ میں فریاد کی اور ظالموں کے لئے قصاص کا حکم لے کر واپس آئے۔ اس وقت کے قانون کے مطابق قاتلوں کی پوری زمین خون بہا کے بدلے شہیدوں کے وارثوں کو دی گئی۔

جت قوم کا ایک شخص عمل[1] بن لاکھو جت جو فقیروں کے گروہ کا دشمن تھا، ان کے خلاف اپنے ہم خیال لوگوں کو جمع کرنے لگے۔ ادھر حق اور وحدت توحید کا نعرہ بلند ہوا دن بہ دن فقیروں اور طلبگاروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اس دوران، نواب میر لطف علی معزول ہوا اور اس کی جگہ اعظم خاں صوبہ ٹھٹہ کا نواب مقرر ہوا۔ اعظم خاں[2] نے آتے ہی معافی زمینوں سے لگان کا تقاضا کیا، جس پر فقیروں نے بادشاہ کا حکم دکھا کر لگان دینے سے انکار کردیا۔ اس پر اعظم خاں بہت برہم ہوا۔ اور بادشاہ فرخ سیر کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ فقیروں نے بادشاہت چھیننے کا منصوبہ تیار کیا ہے بادشاہ کی طرف سے حکم ہوا کہ فقیروں کو سختی سے سمجھایا جائے بس اس حکم کی دیر تھی، نواب اعظم خاں پہلے سے تیار تھے۔ میاں یار محمد کلہوڑو کی مدد سے بھوک میرانپور کا گھیراؤ کیا۔ شاہ صوفی نے نواب کی ان زیادتیوں کو دیکھکر ایک رقعہ دہلی میں بادشاہ فرخ سیر کو لکھا، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، اور نواب نے حملہ شروع کردیا جس کی وجہ سے تین سو فقیر شہید ہوگئے۔ شاہ صوفی کے ایک مرید جان اللہ شاہ رضوی نے اجازت چاہی کہ ہم بھی مقابلہ کریں، لیکن شاہ صوفی نے لڑنے سے منع فرمایا۔ یہ گھیراؤ چھ مہینے تک جاری رہا۔ آخر میاں محمد خاں بن یار محمد کلہوڑو اور میر شہداد خان تالپور نے دغا سے قرآن پاک بیچ میں لاکر شاہ صوفی کو مصالحت کے بہانے نواب اعظم خاں کے دربار میں لے آئے۔ نواب نے شاہ صوفی کو دربار میں دیکھا تو بیحد برہم ہوا اور گرفتاری کا حکم دیا۔

اعظم خاں نے یار محمد کلہوڑو کو اس خون ناحق کے بدلے بہانے دھوت دی، یار محمد جو معزول حکومت کے نازشوں سے اب خطایار بن گیا تھا، اپنے آقاؤں کے بار احسان سے سکدوش ہونے کیلئے نواب سے ملا بڑے کروفر سے افواج لیکر فقیروں پر حملہ آور ہوا شاہ صوفی نے مرید نواب کی خدمت میں ہونے الزامات سے بریت کا اظہار فرمایا، مگر نواب جس پر سیاسی اور بشدت طاقت سوار تھا، اپنی ضد پر اڑا رہا شاہ صوفی کو بظاہر مصالحت اور گفت و شنید کے بہانے نواب کے دربار میں لایا تھا سیاست کے داؤ پیچ سے سادہ ذہن درویش اب ایک عالم سفاک اور وعدہ فراموش انسانوں کے قبضے میں تھا، اعظم خاں کے بگڑے ہوئے تیور کو دیکھکر میر شہداد کو سندھی زبان میں یہ فقرہ سنا کر وعدہ یاد دلایا۔

"ڈونگی ڈي ڏاڙهي، ڪره ڪتي جو پيچ"

"بہادر نے داڑھی پکڑی (وعدہ کیا) لیکن وہ کتے کی دم ثابت ہوئی۔"

نواب نے شیخ صوفی سے چند سوالات کئے، جس کے جواب میں شاہ صوفی نے حافظ شیرازی، مولانا جامی اور دیگر شعراء کے ابیات میں جواب دیا جس میں چند سوالات اور جوابات پیش کئے جاتے ہیں۔ نواب نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا:-

---

[1] مثلاً شاہ عنایت شہید کی سوانح کے ماخذ" مقالہ نگار پیر حسام الدین شاہ راشدی رسالہ "نئی زندگی" ماہ مئی ۱۹۷۰ء

[2] اعظم خاں بن صالح خاں بن ودائی خاں، سال ۱۱۲۸ھ ہجری میں ٹھٹہ کا نواب مقرر ہوا تھا۔

[3] حضرت جان اللہ شاہ رضوی امیر محمد مکی کی اولاد میں سے تھے، روحانی فیض شاہ عنایت صوفی شہید سے حاصل کیا، ان کی وفات روہری میں ۱۱۶۷ھ میں ہوئی (تذکرہ لطفی حصہ دوم)

سوال :- تو نے یہ شور و غل کیوں کر پیدا کیا ہے ؟

شاہ صوفی نے جواب دیا :- آنروئی کہ تو سفی فلک زین کردند آرائش مہر و ماہ و پروین کردند

این بود نصیب از دیوان قضا مارا چہ گناہ قسمت ما این کردند

جب آسمان کے گھوڑے پر زین رکھی گئی اور سورج، چاند، ستارے سجائے گئے۔ قضا کے حاکم نے

ہمیں یہی ملا۔ ہمارا گناہ کیا۔ ہماری قسمت ہی ایسی بنائی گئی ہے۔

نواب :- اپنے آپ کو کیوں بدنام کرکے بلا کے تیر کا نشانہ بننا چاہتے ہو ؟

شاہ صوفی :- عاشق چہ کند گر نکشد بار ملامت ہیچ دلدوز سر پر از قضا نیست

عاشق کیا کرے ملامت کا بوجھ نہ اٹھا سکے گا، کوئی بھی مصیبت میں مبتلا سر قضا سے خالی نہیں ہے۔

نواب :- اب جو تم قتل کئے جاؤ گے پھر یہ تمہاری طویل عمر کیوں کر رہے گی ؟

شاہ صوفی :- ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

جو عشق کے طفیل زندہ ہوا وہ کبھی نہیں مرتا، اس جہان کے دستاویز پر ہمارا نام ہمیشہ کے لئے ثبت رہے گا۔

نواب :- اولی الامر کی اطاعت کیوں نہیں قبول کرتے ؟

شاہ صوفی :- ما مرید بسوئی کعبہ چون آریم رو بسوئی خانۂ خمار دارد پیر ما

ہم مرید کعبہ کی طرف رخ کیوں کریں، جب ہمارے مرشد کا رخ میخانہ کی طرف ہے۔

نواب :- آبیفضا کے تکمیل نہ ہونے کا کوئی تجھے غم ہے ؟

شاہ صوفی :- من ہمان دم کہ وضو ساختم، از چشمۂ عشق

چہار تکبیر زدم ہر چہ کہ ہست۔

میں اس وقت ہی عشق کے چشمے سے وضو کر لیا اور چار تکبیریں لگا دیں۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہے سو ہے۔

اس مقالہ کے بعد نواب کے دل کا غبار اور بڑھا، اسے کیا معلوم کہ شاہ صوفی کی گفتگو میں کون سی حقیقت ہے۔ حقیقت پسندی سے آنکھیں بند کرکے ایک راست گو اور خدا آگاہ شخصیت کے لئے موت کا فتویٰ دیدیا۔

آب دیر نہ تھی، جلاد کو حکم دیا گیا۔ شاہ صوفی نے بڑے صبر و اطمینان سے اپنا سر جھکا لیا۔ اعظم خان کے اشارہ سے اس بیگناہ، مرد با خدا کا سر تن سے جدا کردیا۔ کہتے ہیں کہ جب نوک شمشیر اس سرشار عشق حقیقی کے نزدیک لائی گئی تو فرمایا

رہائیدی مرا از قید ہستی۔ جزاک اللہ فی العارین خیرا۔

زندگی کے شور و غل سے آپ نے مجھے چھڑایا۔ خدا تعالیٰ اس کے بدلے تجھے دونوں جہانوں کی بھلائی عطا فرمائیگا۔

بعد میں اس غواص بحر حقیقت کے سر مبارک کو ٹھٹھہ کی گلیوں میں تشہیر کیا گیا، یہ خون ناحق رنگ لایا، نہ یار محمد کلہوڑہ رہے اور نہ سندھ میں مغلیہ حکومت کا تسلط باقی رہا، یہ خون معمولی خون نہ تھا، یہ خونی واقعہ ۱۱۳۰ھ مطابق ۱۷۱۸ء میں ہوا۔

لہ تذکرہ لطفی (تاریخ ادبیات سندھ) جلد اول تیسرا ایڈیشن مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۲۶۳۔

تاریخ تحفۃ الکرام میں آپ کی تاریخ وفات اس طرح دی ہے۔ [1]

کلک تابع خادم خدام۔ ذوالمجد والصمد

بود قطب عصر خویش ادبہ سال وصلش زد رقم

حضرت قادر بخش بیدل روہڑوی نے اس قیامت خیز واقعہ کا ذکر اپنے اشعار میں اس طرح کیا ہے۔ [2]

عشق چندین جملہ بر عشاق خست می نمود

بر رخ عاشقان صدرہ درحمت کشود

سو یمی صفرا قیامت در ہزار دس عدد

سر بریدن صوفیٔ بیخود کمالش را فزود

شاہ صوفی کی شہادت کو عرصہ گذرا لیکن اس خون ناحق کی سرخ لکیریں تاریخ کے اوراق سے اب تک خشک نہ ہو سکیں

یہ تھے اس وقت کے سیاسی حالات۔

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را

چندان امان نداد کہ شب را سحر کند۔

---

[1] تاریخ تحفۃ الکرام مصنف میر علی شیر قانع صفحہ ۱۳۲

[2] تذکرہ لطفی جلد اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۲۶۴

باب سوم

نور محمد کلہوڑہ

(۱۷۱۸ء ـــ ۱۷۵۵ء)

میاں یار محمد کلہوڑہ کی وفات کے بعد اس کا نوجوان اور ہونہار بیٹا میاں نور محمد کلہوڑہ جانشین ہوا۔ اس کلہوڑہ امیر نے سندھ میں اپنے خاندان کی حکومت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کی۔ اُس کا چھوٹا بھائی داؤد اگرچہ اس سے کچھ عرصہ کبیدہ خاطر رہا، مگر بعد میں راہ راست پر آگیا۔ میاں نور محمد کو اپنی حکومت کی توسیع کیلئے، سندھ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے مقابلہ کرنا پڑا چونکہ وہ ملکی تدبر اور سیاست میں بڑے ہوشیار تھے، اکثر اکثر ریاستیں لڑ بھڑ کر اپنی حکومت میں شامل کرلیں صرف شکارپور کی ریاست رہ گئی تھی، جس کے داؤد پوترہ حکمران کسی بھی صورت میں متابعت کیلئے تیار نہ تھے

داؤد پوتروں کے متعلق ہم نے اس سے پہلے ہی مختصر ذکر کیا ہے۔ چونکہ نور محمد اور داؤد پوترہ کے درمیان بہت عرصے سے کشت و خون کا بازار گرم رہا، اس لئے یہ ذکر تفصیل سے کرنا ضروری سمجھتا ہوں :-

شکارپور کی تعمیر یار محمد کلہوڑہ کے آخری ایام میں داؤد پوتروں کا قبیلہ زور پکڑنے لگا۔ اس قوم کے ایک سردار بہادر خان کو نواب مرزا خان جو مغلیہ حکومت کے خان بہادر تھے اور ڈھاڈھر کے نواب تھے، اپنے علاقہ میں سے ایک حصہ بطور جاگیر دیا، جس کے ایک طرف دریاء سندھ اور دوسری طرف جھکل تھا۔ اس علاقہ کے حدود پر ایک طرف خانپور اور بخت یار پور، اور دوسری طرف لکھی کے مضبوط قلعے تھے۔ امیر بہادر خان اس گھنے جھنگل کو صاف کرا کے ایک نئے شہر شکارپور کی بنیاد رکھی۔ گزیٹر سندھ میں یہ روایت موجود ہے۔ مرزا مطالحہ[2] نے روزنامچے میں اس روایت کو اس طرح لکھتے ہیں :-

"داؤد پوترہ اپنے پہلے وطن سے نکلے تو جس جگہ بعد میں شکارپور آباد ہوا وہ مویشی چرانے اور شکار گاہ تھی۔ اس نواح کے باشندے کا صدر مقام لکھی تھا، اور تب خان بھر حاکم تھے۔ داؤد پوترہ امیر بھی شکار کھیلا کرتے تھے۔ بھر زمینداروں کو یہ روش پسند نہ آئی اور ان سے حسد کرنے لگے۔ بھروں کے روزمرہ کی چھیڑ چھاڑ اور کشمکش سے تنگ آکر عباسیوں نے اپنے پیر کو کہا تاکہ وہ بھروں کو سمجھائے کہ وہ ان کے مال مویشی کی مزاحمت نہ کریں اور شکار میں خلل انداز نہ ہو۔ بھر بھی ان کے عقیدتمند تھے مگر انہوں نے اپنے مرشد کی سفارش کو ٹالدیا۔ آخر امیر بہادر خان اپنی شجاعت اور بڑی طاقت سے بھروں کے بارہ ہزار لشکر کو صرف چار سو آدمیوں سے جو بڑی جنگ کے بعد شکست دی۔ اس فتح کی خوشی میں لکھی شہر سے ۹ نو میل دور شمال میں شہر آباد کیا، جسکا نام شکارپور مرشد پیر سلطان محمد ابراہیم نے رکھا[3]، اور شکارپور شہر کے قلعے کا بنیاد سال ۱۰۲۶ھ مطابق ۱۶۱۷ء میں رکھا۔" اس بابرکت بزرگ کی دعا سے شکارپور ہمیشہ آباد رہا، حالانکہ بارہا اُجڑ کر آباد ہوتا رہا۔ امیر بہادر خان نے شہر کی حفاظت کے لئے ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا، جو انگریزوں کے ابتدائی دور ۱۸۴۵ء تک بالکل محفوظ تھا، بعد میں مرور ایام سے شکستہ ہو کر برباد ہوگیا"

امیر بہادر کا اقتدار دن بدن بڑھتا گیا، نواب مرزا خان اعظم کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا بختیار خان باپ کی جگہ پر مسند نشین ہوا تو داؤد پوترہ نے خانپور کے قلعے پر بھی قبضہ کرلیا، جو شکارپور شہر کے مشرق میں آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ اب خانپور کا چھوٹا سا شہر آباد ہے۔ بختیار خان جب

---

[1] شکارپور تاریخ کی روشنی میں مقالہ نگار راقم الحروف۔ پلیٹینم جبلی گورنمنٹ ہائی اسکول شکارپور سندھ سپٹمبر 1973 - 1973

[2] فوائد معارک منشی مطالحہ شکارپوری ـ انجمن سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد

[3] حضرت محمد ابراہیم عرف آچ ملتان کے گیلانی بزرگوں کے مرید تھے۔ آپ لکھی کے نزدیک آکر مقیم ہوئے۔ حضرت موصوف کی مزار مبارک لکھی کے نزدیک ایک بستی وزیر آباد میں موجود ہے۔ مقالہ (شکارپور تاریخ کی روشنی میں) (راقم الحروف)

شہزادہ معز دین جہاندار شاہ کے ہاتھوں مارا گیا تو امیر صادق خان کے بعد اس کا بیٹا امیر مبارک خان حاکم بنا۔ اس امیر سے یار محمد اور نور محمد کلہوڑہ کے سیاسی چپقلش شروع ہوئی۔ یار محمد اور مبارک خان کے مابین ایک مختصر جھڑپ بھی ہوگئی۔ مگر جلد ہی آپس میں صلح ہوگئی۔

شکارپور پر حملہ

میاں نور محمد نے، جو سندھ پر مطلق العنانی کا متمنی تھا، مبارک خان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کچلنا چاہا، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر امیر مبارک خان کا اثر بڑھتا رہا تو وہ مسند پر اطمینان سے حکومت نہ کر سکے گا۔ اس لئے وہ موقع کا منتظر رہا۔ جلد ہی میاں نور محمد کو ایسا موقع ملا۔ ملا ملا صبغت اللہ[1] جو نوشہرہ ابڑو کا ایک چالاک رئیس تھا، امیر مبارک سے بگڑ بیٹھا۔ اس نے میاں نور محمد کو جا کر کہنے اور اندر اسے بھڑکے ہوئے افغانوں سے ملا۔ وہ اس سے ملکر لشکر جمع کرنے اور شکارپور پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ داؤد پوتہ سے بھی شکارپور اور خانپور کے قلعے کو زیادہ مستحکم کرنا اس موقع پر امیر مبارک خان نے وقت کی نزاکت دیکھتے ہوئے اپنے بڑے بیٹے امیر محمد صادق خان کی رسم دستار بندی کی عظیم الشان محفل منعقد کی۔ میاں نور محمد اس تک میں مصروف ڈالے ایک بڑی فوج لیکر شکارپور پر چڑھ آیا۔ لیکن مبارک خان نے داؤد پوتوں کی جمعیت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ قلعے کا محاصرہ تو برابر جاری رہا لیکن کامیابی کی امید نظر نہ آئی۔ امیر مبارک بھی کچھ مقابلے کے بعد بے رباری سے کام لیتا رہا، جس سے میاں محمد وہ وقتی فرار ہو گیا۔ بظاہر صلح و صفائی سے کام لیکر مدد آباد کو واپس ہوا۔ اب امیر مبارک نے میاں کی لسانی فریب سے فریب کھایا اس پر اعتماد کرتے ہوئے رائل جمعیت کو منتشر کر دیا۔ جب جاسوس نے میاں کو امیر مبارک کی دفاعی جنگ سے کم ہونے کی اطلاع پہنچائی تو اس نے اپنے تمام وعدوں کو بالائے طاق رکھکر لشکر کثیر لیکر شکارپور پر دوبارہ حملہ کر دیا۔ چھ ماہ متواتر مقابلہ ہوتا رہا، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ بالآخر اس طویل محاصرہ سے تنگ آکر میاں کی اس نے مصالحانہ کارروائی کی۔ کسی نے محاصرہ اٹھانے کا مشورہ دیا۔ ایک بار پھر صلح ہو گئی، اور میاں نے فوجیں ہٹانے پر مجبور ہوا۔ ناکامی کا داغ میاں کے دل پر رہ گیا۔ اس پر آشوب زمانے میں امیر مبارک خان کا انتقال ہو گیا، اور ریاست کا نظم و نسق رائل امیر صادق محمد کے ہاتھ آیا۔ اسے پھر میاں سے دل میں شکارپور پر حملہ کرنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ امیر صادق کی ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھانے کیلئے شکارپور پر بڑی فوج اور ساز و سامان سے حملہ کر دیا۔ امیر صادق محمد تاب مقاومت نہ لاکر شکارپور کو خالی کر دیا، اور حاصور میں پناہ لی۔ میاں نے شکارپور کا قبضہ حاصل کرنے خانپور کے سمت کی رخ کر دیا۔ امیر صادق محمد نے خانپور کا قلعہ بھی خالی کر دیا۔ اور بیٹ دہلی (علاقہ دیہ عارف خان) کے طرف چلا گیا۔ اسے میاں کی حکومت سبتی تک وسیع ہو گئی اور شکارپور سے مراجعت کرتے ہوئے گندر اور بکھر پر بھی قبضہ کر کے مل والوں کی زمام نام حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ امیر صادق محمد کا تعاقب میر پور ماتیلہ تک تیزی سے کیا، مگر شکارپور واپس آیا۔ تھوڑے عرصہ میں میاں کا عبداللہ خان والی قلات سے تنازعہ ہو گیا۔ اور عبداللہ خان بروہی فوج لیکر میاں کے مقابلے کے لئے سندھ کی سرحد عبور کر کے لاڑکانہ تک چلا آیا۔ میاں اس وقت

عبداللہ خان والی قلات سے مقابلہ

دھاریجہ قوم کے مقابلہ کے لئے کلکرال کے سرحدی لشکر آنداز تھے۔ یہ خبر سنکر طوفان کی طرح اٹھا۔ طرفین میں سخت مقابلہ ہوا مگر بروہی قوم کے نامور سردار نے میاں سے شکست کھا کر بڑے ذلیل شرائط پر جان چھڑالی۔ کامیابی حاصل کرنے کے بعد میاں کی حکومت بہت مضبوط ہو گئی۔ ٹھٹھہ جو آج تک مغل نوابوں کے قبضہ میں چلا آیا تھا، بعد میں مغل شہنشاہ محمد شاہ نے میاں کے حوالے میں دے دیا۔ اب وہ سندھ کے واحد حکمران تھے اور اس کی حکومت دن بہ دن مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔

نادر شاہ کا حملہ

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے دہلی کو فتح کر لیا تھا۔ محمد شاہ سے صلح کرنے کے بعد ابتدا کے سے ماہ فاتح لاہور پہنچے، تو میاں نور محمد اس خبر وحشت اثر کو سنکر بہت ہراساں ہوئے اور اپنے اہل و عیال اور خزینۂ شاہی کو لے کر ملہار[3] بھیجدیا اور خود عمرکوٹ

---

[1] نوشہرو ابڑو اب گڑھی یاسین تعلقہ (ضلع سکھر) میں ایک چھوٹی سی بستی رہ گئی ہے۔

[2] صبح صادق طبع ثانی۔ مصنف مولانا عزیز الرحمان صاحب بہاولپوری صفحہ ۷۰ [3] تھار دیہ آباد سندھ کے ضلع میں ایک چھوٹا شہر ہے۔

مار چکا، نادر شاہ نے دہلی کی فتح کے بعد سندھ میں آ گئے۔ اس حالت کو دیکھ کر غصہ میں آ کر مختصر فوج سے عمرکوٹ کی طرف بلغار کی ریگستانی علاقوں سے گزر کر عمرکوٹ کے قریب جا پہنچے۔ ایک صبح کو جب میاں نبند سے جاگا تو اسے اطلاع ملی کہ نادر شاہ فیصل تلہ کے سامنے پہنچ چکے ہیں۔ اب نور محمد کی حالت مصداق "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" تھی۔ مجبوراً خصاک مانج کے ساتھ پہنچ کر پریشان حالی میں حاضر ہوا۔ نادر شاہ کو اس کی زبوں حالی پر ترس آیا، اور اسے لاڑکانہ ساتھ لائے۔ ایک کروڑ روپیہ لیکر شاہ ولی کا مطالبہ دبا، اور حکومت بحال کر دی۔ مگر شکارپور کا علاقہ داؤد پوتروں کو اور سبی کا علاقہ خان قلات کو لوٹا دیئے گئے۔ نادر شاہ کی یلغار کے بعد، میاں نے بتدریج پھر سندھ کے مختلف حصوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ نادر شاہ کے قتل ہونے تک اس کی جارحانہ کارروائی رکی رہی۔ لیکن اس کی شہادت کے بعد بالکل آزاد اور مطلق العنان ہو گیا، پھر داؤد پوتروں سے جنگ اور شکارپور واپس لینے کا مصمم ارادہ کر لیا ۱۷۴۲ء کے شروع میں بڑی فوج لیکر اچانک حملہ کر دیا۔ نواب محمد صادق خان نے اپنے فرزند بہاول خان کو جو اس وقت بہاولپور کے نزدیک بیت دبلی[1] کی جاگیر میں مقیم تھا، فوری کمک کیلئے لکھا۔ مگر امدادی فوجوں کو پہنچنے سے پیشتر میاں نے شکارپور کے قلعہ کے اٹھوں[2] دروازوں پر مضبوط نگران قائم کر دی نواب محمد صادق خان نے جب معاملہ دگرگوں دیکھا، تو "راضی بہ قضا" ہو کر سب جرموں کو حفظ ناموس کے خاطر قتل کر کے کفن سر سے باندھ کر شمشیر بدست، بمعہ جان نثاروں کے باہر نکل آیا۔ اور بہت دلاوری سے مقابلہ کیا، پرسے کے پرسے شاہ شہ، مگر بالآخر لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ سورج غروب ہوتے ہی اس غیور بہادر شخصیت کے اقبال کا آفتاب بھی ہمیشہ کیلئے ڈھل گیا[3]، ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔ بقیۃ السیف فوج بھاگ کر بہاول خان کے پاس اس المناک واقعہ کی خبر دی۔ اس کشت و خون کے بعد کامل سالار میاں نور محمد نے حکومت کی۔

احمد شاہ ابدالی اور میاں

نادر شاہ کی شہادت کے بعد جب احمد شاہ ابدالی نے افغانستان میں اپنی وسیع سلطنت کی بنیاد رکھی تو، ۱۷۴۸ء میں میاں نور محمد کو سندھ کے نواب کی سند اور شاہنواز کا لقب عطا فرمایا۔ ۱۷۵۵ء میں جب یہ نامور سلطان پنجاب اور دہلی پر حملہ کرنے کے لئے سندھ میں آیا تو میاں نور محمد اس اطلاع سے مدہوش ہو کر جیسلمیر کی طرف بھاگ گیا۔ ابدالی تاجدار میاں کے فرار ہونے کی خبر سنکر بڑا فروختہ ہوا مگر اس کے سفیر دیوان گدومل نے شاہ کے دل سے گرد و غبار دور کیا۔ احمد شاہ نے میاں کو بحال کرتا ہوا پنجاب روانہ ہوا، مگر میاں کو سندھ کی سرزمین دیکھنے کو نصیب نہ ہوئی، وہ جیسلمیر اور عمرکوٹ کی راہ میں وفات پا گئے۔

اس میں کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں کہ میاں نور محمد، کلہوڑہ خاندان کے زبردست اور دوراندیش حکمران تھے، اس نے اپنے تدبر سے اپنی قوت بازو سے تمام سندھ پر کلہوڑہ حکومت قائم کر دی تھی۔ خود بھی بڑے جاہ و جلال سے حکومت کی۔ اس کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوتی رہی مگر محمد مراد یاب کی معزولی کے بعد میاں غلام شاہ تخت و تاج حاصل کر کے کھوئی ہوئی طاقت کو پھر سے بحال کر دیا اور بڑے جاہ و جلال سے حکومت کی، چونکہ اس کتاب میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے زمانے تک سندھ کے سیاسی، تمدنی اور معاشی حالات دکھانا مقصود تھا۔

---

[1] بیت دبلی، ریاست بہاولپور میں ایک مقام ہے۔ صبح صادق مصنف عزیز الرحمان بہاولپوری۔

[2] شکارپور کے قلعہ کو آٹھ دروازے اور ایک کھڑکی تھی، جن کے نام مختلف شہروں کی طرف جانے کے لئے رکھے گئے تھے۔ آج بھی اس نام سے مشہور ہیں۔ ۱۔ لکھی دروازہ ۲۔ بلزادہ دروازہ، ۳۔ بہاتی دروازہ، ۴۔ فانپوری دروازہ ۵۔ سیوی دروازہ ۶۔ فوشہرہ دروازہ ۷۔ واگنہ دروازہ ۸۔ کرن دروازہ ۹۔ صدیق ماڑی۔

[3] سندھ گزیٹیئر رقمطراز ہے کہ داؤد پوترہ نواب صادق محمد نے اپنی مستورات کو قتل کر کے ان کے نعش کو ایک کنوئیں میں ڈال دیا تھا، وہ کنواں آج بھی محلہ ماہو میں موجود ہے۔ "ماہو کی معنیٰ قتل عام ہے" شاید اس خونی واقعہ کی یاد میں اس محلہ پر ماہو نام مشہور ہو گیا ہو۔

[4] آپ کا مزار شکارپور میں اسٹیشن گنج ٹھیکرائی بزار کی مسجد کے ساتھ کورستان میں ہے۔

[5] سندھ گزیٹیئر میں اس واقعہ کو بری طرح مسخ کر دیا ہے۔ اس مشہور محاصرہ کو افغانستان کی طرف سے منسوب کیا ہے جو غلط ہے ——— سندھ گزیٹیئر صفحہ ۱۰۔

شاہ عبدالکریم بلڑی[1] عوام شاہ کریم ہی کہتے ہیں، آپ اپنے وقت کے مشائخ میں بلند درجہ رکھتے تھے، سید موصوف ۹۴۴ھ ہجری میں تولد ہوئے بچپن میں ہی آپ کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا، آپ کی پرورش آپ کی مہربان والدہ ماجدہ نے نہایت عمدہ طور پر کی، تعلیم و تربیت کا بھی اچھا بندوبست کیا، لیکن ظاہر علوم سے کبھی دل بستگی پیدا نہ ہوئی نام کچھ کچھ حاصل کرلیا، عہد طفلی میں آپ سے اکثر ایسی باتیں ظہور میں آتی تھیں جو دیکھکر صاحب حال بزرگ آپ کی روحانیت کے قائل ہو جاتے تھے۔

شاہ صاحب نے اپنی جوانی بڑی محنت اور مشقت سے بسر کی، یاد الٰہی میں ان کے دن اور راتیں کٹ جاتی تھیں، یہی ایک دھن ان کو لگی رہتی تھی، اگرچہ محنت اور مزدوری بھی محنت کرتے تھے تاہم ایک رات بھی عبادت الٰہی سے غافل نہ رہتے تھے، اتفاقاً ان دنوں ایک بزرگ سلطان ابراہیم بہاری جو مشائخ ہند میں سے تھے، شاہ عبدالکریم رح کے گاؤں کی مسجد میں آکر مقیم ہوئے، شاہ کریم ان کی صحبت کے بعد ان کے گرویدہ ہوگئے، اور بڑی خلوص دلی سے ان کی خدمت کی، اس بزرگ سے ہی شاہ کریم میں شوق خدا شناسی پیدا کی، شیخ طریقت کے اچانک جانے کا بڑا خلق ہوا، کیونکہ شیخ طریقت شاہ کریم کے یہاں چھ ماہ مہمان رہکر غائب ہوگئے تھے، شاہ کریم ان کی تلاش میں بہت پریشان اور سرگرداں پھرتے رہتے، بالآخر بڑی تلاش کے بعد ان کو ٹھٹھہ کے ایک بزرگ سید[2] میران شاہ یوسف بکھری کے یہاں پالیا چونکہ سلطان ابراہیم کو سفر کا شوق تھا، اس لئے شاہ کریم کو تسلی دیکر پھر رخصت ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد شاہ کریم اپنی زندگی کے ایام لمحات، ذکر و فکر میں بسر کرنے لگے، اس وقت کے بڑے بڑے بزرگان دین مثلاً حضرت مخدوم نوح رح میران سید یوسف بکھری اور مخدوم آدم ہمیجو کی صحبتوں میں ہی رہے اور انہوں نے بہت کچھ حاصل کرلیا ان بزرگوں کے اشاروں سے ہوتے ہوتے بلڑی[3] میں جاکر مقیم ہوئے، جہاں اس کے چشمہ فیض و رشد ہدایت سے ہزاروں پیاسے سیراب ہوتے رہے۔ آپ کی زندگی کے آخری لمحات خدا کی خلق کی خدمت میں گذرے، یہ برگزیدہ اور حاضر ہستی ۱۰۳۲ھ ہجری میں اٹھاسی برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح[4] آپ کی اولاد میں سے تھے

---

[1] تاریخ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۱۰۳ ۔ ۱۰۴

[2] ٹھٹھہ شہر کی آبادی کے لئے تاریخ طاہری اور تاریخ تحفۃ الکرام میں ذکر ملتا ہے، جب سید محمد مکی اس مقام میں داخل ہوئے تو، کچھ خادموں نے پوچھا منزل کس جگہ کریں، آپ نے فرمایا ص جگہ صبح کے وقت نعرہ (گانے) کی آواز سنو اس وقت منزل کرنا، جب صبح کے وقت آپ وہاں پہنچے تو نعرہ کی آواز سنی، اور وہاں ٹھہر گئے۔ اس نعرہ سے مدرسہ نام ٹھہر ہوگیا۔ تاریخ تحفۃ الکرام صفحہ ۱۳۴ جلد سوم

[3] بلڑی حیدرآباد میں ایک گاؤں ہے، جو شاہ کریم کے نام سے مشہور ہے۔

[4] اسم نام حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح اس طرح ہے۔ حضرت مرشد زماں و سید دوراں سرخیل عارفاں، افتخار عابداں سید عبداللطیف بھٹائی رح بن سید حبیب شاہ، بن سید کامل شاہ، بن سید کبیر شاہ، بن سید عبدالرشید شاہ، بن سید عبدالقدوس، بن سید جمال شاہ، بن حضرت شاہ عبدالکریم بلڑی قدس سرہ، بن سید لعل شاہ، بن سید عبدالمومن شاہ، بن سید ہاشم شاہ، بن سید حامی شاہ، بن سید جلال محمد شاہ، بن سید شرف الدین شاہ، بن سید میر شاہ، بن سید حیدر شاہ، بن سید میر علی شاہ بن سید محمد شاہ، بن سید حسین شاہ بن سید علی شاہ بن سید یوسف شاہ، بن سید حسن، بن سید ابراہیم شاہ، بن سید علی جواری شاہ، بن سید الاکبری، بن سید جعفر ثانی شاہ بن امام ولاہم حضرت موسیٰ کاظم بن امام المسلمین حضرت جعفر صادق بن حضرت امام محمد باقر بن امیر المسلمین سید الساجدین امام زین العابدین علیہ السلام بن سید الشہداء شہید کربلا زین دارین حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ بن امیر المومنین شیر خدا حضرت علی اسد اللہ کرم اللہ وجہہ

شاہ عبدالکریم اپنے وقت کے بلند پایہ شاعر اور مفکر تھے۔ آپ کے اشعار سندھی ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کے کلام میں کل چھانوے[1] ابیات ہیں۔ شعر کی نزاکت اور زبان کی شیرینی اور چستگی کے علاوہ پورا کلام تصوف کے باریک نکتوں سے بھرپور ہے۔ تذکرہ لطفی کے مصنف کی رائے کے مطابق آپ کے کلام میں تصوف خالص وہ ہے جو عراق کے بزرگوں حضرت بایزید بسطامی، حضرت سری سقطی، حضرت جنید بغدادی اور معروف کرخی کا ہے۔ آپ کا نظریہ اسلامی تصوف ہے۔

شاہ عبدالکریم بلڑی کے آٹھ فرزند تھے جن میں سے سید جمال شاہ کی پشت سے سندھ کے مشہور عالم حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی[2] پیدا ہوئے۔ کسی شاعر نے شاہ عبدالکریم کی تاریخ وفات اور سال وصال اس طرح معلوم کیا ہے[3]

شاہ عبدالکریم سیّد ما — بود از ہادیان راہ خدا
از نبی و علی نژادش دان — وز حسین و بتول اصلش
بود از اولاد حیدر صفدر — زادہ شد اولاً بمصطفوی
سال نہصد و چہار دگر — بود از ہجرت شفیع بشر
چونکہ سی و دو ہزار گذشت — شد لقائش نصیب و وصلش گشت
شہر ذی قعدہ ہفتمین از ماہ — شب یکشنبہ ان خدا آگاہ
وقت شام از جہان برضوان رفت — قد بلغ، نیست در حساب
سال تاریخش از رہ ابجد — جو بلغ نیست در حساب فرد
رحمت حق براو و بر دانش — وز خدا باد عفو و غفرانش

آپ کا مزار مبارک، آپ کی گاؤں "ستہ پور" بلڑی تحصیل کاماریار کے دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے جہاں ہر ماہ کے پہلے دو ہفتہ پر عرس ہوتا ہے، جہاں پر اولیاء بزرگ، مرید، خادم جمع ہو کر حاضری کرتے ہیں۔

سیّد حبیب شاہ قدس سرہ

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی[2] کے والد بزرگوار کا اسم گرامی سیّد حبیب شاہ ہے۔ آپ حضرت پیر سیّد عبدالکریم بلڑی[2] کے فرزند سیّد جمال شاہ کی اولاد میں سے تھے۔ سیّد حبیب شاہ کے والد کا نام سیّد عبدالقدوس شاہ تھا۔ سیّد جمال شاہ بھی اپنے دور کے صالحین میں سے تھے۔ میر علی شیر قانع تاریخ تحفۃ الکرام میں اس طرح آپ کی تعریف میں لکھتے ہیں:-

عابد روزگار آمدہ

آپ اپنے والد کی زندگی میں ہالا کے قریب ڈاکوؤں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ صاحب تحفۃ الکرام[3] سیّد حبیب شاہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"حبیب شاہ از نبائر اظہر سیّد عبدالکریم است، صحیفہ صاحب حال و وجد بودہ و استغراق کمال داشت و تکلم نمودی ی فرمود کہ کسی؟ و چون دے میفرمود کہ غلام حضرت ایشان عبداللطیف است، فرمودے شنیدم"

---

[1] تذکرہ لطفی "تاریخ ادبیات سندھ" مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی جلد اول

[2] شاہ عبدالکریم بلڑی والے کا کلام مرتب ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ صفحہ ۱۸ [3] تاریخ تحفۃ الکرام صفحہ ۱۷۳ جلد سوم

ترجمہ:- سیّد حبیب شاہ سیّد عبدالکرام کی پاک اولاد میں سے ہیں، وہ ہمیشہ حال اور وجد کا صاحب تھا، اور نہایت استغراق کی حالت میں رہتا تھا، کہتے ہیں کہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ آپ کا نامی حسن شاہ فرزند سیّد عبداللطیف جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر باتیں کیا کرتا تھا، تو آپ فرماتے تھے، تو کون ہے شاہ عبداللطیف جواب میں کہتے تھے آپ کا غلام عبداللطیف ہوں آپ فرماتے تھے میں نہیں سنا

سیّد حبیب شاہ بقول صاحب تحفۃ الکرام اپنے زمانے کے اہل اللہ میں سے تھے، عین جوانی میں وقت ناسازگاری اور عزیز و اقارب کی بے مہری کے بلاوی سے نقل سکونت کر کے حالا حویلی[1] میں جا کر مقیم ہوئے، چونکہ نرینہ اولاد سے محروم تھے اس لئے [illegible] رہتے تھے روایت ہے کہ سیّد حبیب شاہ اس مایوسی کی عالم میں کسی درویش[2] کی خدمت میں جا کر اپنا درد سنایا، اس خدا اندیش بزرگ نے آپ کو تسلی دی اور فرمایا کہ آپ کے ایک فرزند تولد ہوگا، جو اپنے زمانہ کا غوث اور قطب، ساتھ ساتھ یہ بھی وصیت کی کہ اس بچہ کا نام عبداللطیف رکھا جائے کچھ عرصے کے بعد سیّد حبیب شاہ کے یہاں ایک فرزند تولد ہوا سیّد حبیب شاہ نے اس کامل ولی کی وصیت کے مطابق اپنے فرزند کا نام عبداللطیف رکھا، لیکن یہ بچہ چھوٹی عمر میں چل بسا، اس کے بعد سیّد صاحب کو دوسری حرم سے ایک فرزند تولد ہوا، جس کا نام جمال شاہ رکھا، جس کی اولاد آج تک ٹھٹہ کی مسند مقرر پر حاضر ہوتے رہتے ہیں جمال شاہ کی ولادت کے بعد سیّد حبیب شاہ کو پھر پہلی بیوی سے ایک فرزند تولد ہوا، جس کا اسم گرامی عبداللطیف رکھا، یہ بچہ حضرت مرشد زمان و سیّد دوراں سرخیل عارفان سردار عشاقان، سرتاج شعراء حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کی دعائے سخن سے سندھ کا ذرہ ذرہ گونج اٹھا، جس طرح عموماً مشاہیر زمانہ کی سال ولادت یا سن ارتحال میں اختلاف و روایت چلتا رہا ہے، اس طرح حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی[3] کے سن پیدائش میں بھی اختلاف ہے، ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی[4] نے اپنی تصنیف میں اس پر بحث کی ہے اور تاریخ ولادت ۱۱۰۲ھ مطابق ۱۶۸۹ء، ۱۶۹۰ء بتلائی ہے، خیر ۱۱۸۱ھ مرزا قلیچ بیگ[5] نیز اپنی تصنیف میں ڈاکٹر گربخشانی کی تائید کرتا ہے، لیکن ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ[6] جس کو شاہ بھٹائی کے کلام جمع کرنے اور اس کی اولین طباعت کا شرف حاصل ہے، شاہ صاحب کا سال ولادت ۱۱۸۰ھ بتایا ہے، لیکن بیرونی شہادتیں میسر ہوئی ہیں، انکی رو سے ڈاکٹر ٹرمپ کا دیا ہوا سال ولادت اعتبار سے گرا ہوا نظر آتا ہے

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ولادت کا سنہ ۱۱۰۲ھ مطابق ۱۶۸۹ء ہے شاہ صاحب کی والدہ مخدوم عربی دھیانی[7] نے شاہ دھیانی کو تحفۃ الکرام میں مخدوم عربی دھیانی لکھا ہے، کیونکہ ان کے آباء و اجداد عرب سے ہجرت کر کے سندھ میں آکر بسے تھے، مخدوم عربی دھیانی کے روحانی حالات یاد کر کے معاملہ پر آئیں۔

---

[1] حالا حویلی تعلقہ حالا ضلع حیدرآباد سندھ میں ایک چھوٹی سی بستی تھی، اب ویران ہو گئی ہے ٹھٹہ شاہ سے لوبیل کے فاصلے پر ہے

[2] احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی، مصنف شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ صفحہ ۲۰

[3] ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی تحقیق کے مطابق، شاہ صاحب نے درویش سید ہاشم شاہ (مدفون مٹیاری) کو اولاد نرینہ کے لئے دعا کے واسطے عرض کی تھی (نبی رنگی ۵۷)

[4] مقدمہ رسالہ شاہ عبداللطیف مصنف ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی صفحہ ۱۷

[5] احوال شاہ عبداللطیف مصنف شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ صفحہ ۱۱

[6] Dr: Ernst Trump, had collected and prepared the Shah-Jo Risalo, which was published in 1866 A.D. It was first time that this master piece of Sindhi Literature was published in Germany no Sindhi has forgotten this great service rendered by the German Scholar.

[7] ڈاکٹر گربخشانی نے اپنی تصنیف مقدمہ (صفحہ ۱۷) شاہ بھٹائی کی والدہ کو مخدوم عربی کی دختر لکھا ہے، لیکن یہ رائے صریحاً غلط ہے مخدوم عربی دھیانی کا سن وفات ۹۸۰ھ ہے، اور شاہ بھٹائی کی ولادت ۱۱۰۲ھ ہے اس لحاظ سے ڈاکٹر گربخشانی کی یہ روایت قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ولادت کے بعد، سید حبیب شاہ نے ہالا حویلی کو چھوڑ کر کوٹڑی کے ایک چھوٹی سی بستی میں جا کر بسیرا کیا۔ شاہ حبیب نے کن وجوہات کی بنا پر ہالا حویلی سے ہجرت کی تھی، اس کا حال کسی تذکرہ سے معلوم نہیں ہو سکتا، لیکن ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی تحقیق کے مطابق[1] جب تیسری بار پہلے حرم سے بچہ ہوا تو تولد ہونے سے پہلے شاہ حبیب کو اس درویش کے کہنے پر ہالا حویلی سے ہجرت کر کے آنے، یہ شرف ہالا حویلی کو ہوا جو کہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ وہیں تولد ہوئے۔ جہاں سے شاہ حبیب چند دنوں کے بعد ہجرت کر کے علی محمد ڈیری کے گاؤں میں جا کر بسے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا بچپن :-

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے بچپن کے متعلق قدیم روایتوں سے جس قدر معلوم ہو سکا ہے وہ خوش اعتقادی کی باتیں ہی نظر آتی ہیں، جو روایتیں شاہ بھٹائیؒ کے بچپن سے منسوب ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مادر زاد ولی تھے بچپن کے کھیل والے ساتھیوں سے جب وہ الٰہیات کے نکتے بیان کرتے تھے، تو بڑی عمر کے سننے والے بھی حیران رہ جاتے تھے۔ اس ہونہار بچہ کی پیشانی سے کرامت اور صداقت ٹپکتی تھی۔

بالائی سرش ز ہوشمندی — می تافت ستارۂ بلندی

جب اُس کے ساتھی کھیل کود میں مشغول ہوتے تھے، تو آپ کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ کر غور و فکر میں ڈوب جاتے تھے کھیل بند ہو جاتا تھا کھیلنے والے اپنے گھروں کو پہنچ جاتے تھے، لیکن ان کو اپنے ساتھی کے متعلق کچھ خبر نہیں تھی، یہ استغراق اور محویت ان پر پوری زندگی طاری رہی روایت ہے کہ ایک بار شاہ عبداللطیف، بستی کے چند لڑکوں کے ساتھ شہر دور ریت کے ٹیلوں کی طرف جا نکلے لڑکے تو کھیلنے میں مشغول تھے لیکن شاہ بھٹائی اپنے ٹیلہ کے سایہ میں تنہا کسی فکر میں ڈوب گئے شام ہو گئی۔ لڑکے تو اپنے گھر چلے گئے مگر شاہ لطیفؒ پر محویت اتنی چھائی ہوئی تھی، کہ آپ کو متعلق خبر نہ ہوئی، کہ ان کے ساتھی، اپنا کھیل ختم کر کے اپنے گھروں کو چلے گئے، شاہ بھٹائیؒ اپنے گھر نہ آئے۔ آپ کے والد کو بڑی تشویش ہوئی، وہ ڈھونڈھتے ہوئے ایک ٹیلہ سے دوسرے ٹیلہ پر چڑھتے رہے، رات کی تاریکی میں بھی پتہ سوچتا تھا، مگر پدری محبت کے مارے ریگستان میں دوڑتے رہے، جب وہ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گئے، تو عالم مایوسی میں ان کی زبان سے بے اختیار یہ فقرہ نکلا:-

لگی لگی واءُ ویا۔ اگڑا لٹی

افسوس ارمان نے اُڑ کر نازک جسم کو ڈھانپ لیا۔

کہتے ہیں کہ باپ کا یہ فقرہ جب بیٹے کے کان پر پڑا، تو آپ نے فی البدیہہ جواب میں کہا

پٹی کٹی پساہ، پسٹ عارف پرین جی۔

دوست کے دیدار کے لئے، ابتک پڑا دم لے رہا ہے۔

جب شاہ بھٹائی سات برس کے ہوئے تو ان کے والد نے ان کو مکتب میں داخل کر دیا آخوند محمد رحمٰن اس وقت کے معلم تھے، جس سے درس میں ان کو بٹھایا گیا تھا، اس وقت کے بہترین اساتذہ میں شمار ہوتے تھے آخوند صاحب ذات کے بھٹی تھے اور والی کے رہنے والے تھے۔ طویل مدت سے درس و تدریس کا مشغلہ رکھتے تھے۔ آپ کے درس سے بہت لوگ فیضیاب ہو کر نکلے تھے، کہتے ہیں کہ جب شاہ صاحب کو آخوند صاحب نے لوح پر قرآن

---

[1] تاریخ بھٹ الکلام صفحہ ۱۵۰ [2] کوٹڑی کی بستی بھٹ شاہ سے چار میل کے فاصلے پر ہے اور آج کل ویران ہے۔

[3] حیات شاہ حبیب کا خاتمہ مقالہ نگار ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، رسالہ نئی زندگی ماہ نومبر ۱۹۵۷ء

[4] والی یہ بستی اسٹیشن لاڑکانہ (حیدرآباد ضلع) سے دو کوس کے فاصلے پر ہے۔

میں دیکر الف کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کیا، تو آپ نے فوراً "الف" کہدیا، مگر آخوند صاحب "ب" پر آئے تو چھوٹے بچے نے ادب سے عرض کیا، استاد یہ "ب" کیوں، میرے لئے "الف" کافی ہے "ب" کی نہ ضرورت ہے نہ ضرورت، آخوند صاحب "ب" کا تقاضا مکرار کرتے رہے، مگر یہ بچہ اپنی بات پر اڑا رہا، تنگ آکر آخوند صاحب نے بچہ کو ہاتھ لیا، اور شاہ صاحب کی خدمت میں آئے، ورکدرا ہوا واقعہ لفظ بلفظ دھرایا، سید حبیب شاہ بچے کو تسلی دیکر تائید کی اور ساتھ ہی نصیحت فرمائی کہ علوم ظاہری کیلئے "ب" کا پڑھنا بھی لازمی ہے[1]

شاہ عٹائی کی تعلیم کے متعلق مورخین کی مختلف رائیں ہیں، متقدمین اس بات پر متفق ہیں کہ شاہ عٹائی اُمی تھے، مگر متاخرین نے اپنی تاویلات سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ شاہ صاحب تعلیم یافتہ تھے؟ شاہ صاحب کی سوانح حیات لکھنے والوں نے جداگانہ رائیں لکھکر اپنے اپنے خیالات پیش کئے ہیں، مندرجہ ذیل مصنفین کے نام قابل توجہ ہیں:-

۱۔ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ۔ ۲۔ ارنسٹ ٹرمپ ۳۔ ڈاکٹر موتچند مولچند گربخشانی۔

۴۔ ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے ۔ ۵۔ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤدپوتہ۔ ۶۔ لیلارام سنگھ وطن مل۔

ان مصنفین کے دلائل کو ہم تاریخ کی روشنی میں دیکھتے ہیں تاکہ اندازہ لگایا جا سکے، سب سے پہلے ہم تاریخ تحفۃ الکرام کی شہادت کو پیش کرتے ہیں

"آثار کرامت و اخبار خوارقاتش اظہر من الشمس دریں مختصر چہ قدر گنجایش پذیرد

تا کہ اُمی بود۔ حق تعالیٰ تمام علوم بر لوح سینہ اش مثبت داشتند"

تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف نے اپنی مختصر تحریر میں دو اہم باتوں کا اعادہ کیا ہے (۱) شاہ صاحب صاحب کرامات تھے۔

۲۔ ان کی کرامتوں میں اُن کا اُمی ہونا نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے، اپنی تصنیف شاہ عبداللطیف بھٹائی میں ایک جگہ رقمطراز ہے[2]

"شاہ صاحب کی زندگی کے متعلق حافظ والوں میں مرزا قلیچ بیگ کا رسالہ محققین میں سے ہیں اور اُس کی تحقیقات بھی کسی درجے پر ہے، وہ خوش نصیب ہے کہ جو روایتیں اس تک سینہ بہ سینہ پہنچی ہیں، وہ شاہ عٹائی کے زمانے تک جا پہنچتی ہیں، اور ان آدمیوں سے جا ملتی ہیں جنہوں نے خود شاہ عٹائی کو دیکھا تھا، مگر آج وہ سلسلہ منقطع ہے۔

ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے نے یہ حقیقت مرزا صاحب کی مندرجہ تصنیف "احوال شاہ عٹائی"[3] سے مستعار لی ہے، مرزا صاحب لکھتے ہیں،

"یہ اطلاعات اُس کے اراتمندوں اور دوسرے متعلقین سے ہاتھ آئے مگر افسانوی صورت میں"

یہ تعجب کا مقام ہے کہ ڈاکٹر سورلے صاحب آگے چل کر مرزا صاحب کی ان سینہ بہ سینہ روایات سے شدید اختلاف کرتا ہے، لکھتا ہے

"ایک محقق کے لئے یہ طفلانہ باتیں صحیح حقائق کے دھرانے کے بجائے یہ صدیوں روایات علم النفس کے ماہرین والوں کیلئے فقط زبانی روایات ہی رہ جاتی ہیں جن پر اس حقیقت کے انکشاف سے میرا مقصد ہے تاریخ کا طالب علم کسی طرح اعتبار نہیں کرتا ہے"

---

[1] احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی" مرتب مرزا قلیچ بیگ مرحوم صفحہ ۱۱۰ تاریخ تحفۃ الکرام میر علی شیر قانع۔

[2] ایضاً " " "

برا مقصد ہے ۔

۱۔ مرزا صاحب اور دوسرے مصنفین نے محض زبانی روایات پر اپنی علمی تحقیقات کی بنیاد قائم کی ہے

۲۔ سینہ بہ سینہ روایات نقول ڈاکٹر بلوچ، مرزا صاحب پر ختم ہو گئی ہیں، افسوس ہے کہ ڈاکٹر بلوچ نے مرزا صاحب کی تصنیف "شاہ لطیف کی حالات" کی تصدیق سے متاثر ہو کر ایک غلط رائے قائم کر رکھی ہے، اور سینہ بہ سینہ روایات کے ملنے سے قطعی نا امید ہو چکے تھے، ورنہ اُنہیں ایک جداگانہ تصنیف مرتب ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر بلوچ کی اس علمی لغزش نے اُنہیں قیمتی معلومات سے محروم رکھا، یہ بالکل غلط ہے کہ یہ صدری روایات مرزا قلیچ بیگ صاحب پر ختم ہو گئی تھیں، کتنی روایتیں ایسی بھی موجود ہیں کہ وہ مرزا صاحب تک نہ پہنچ سکی ہیں۔ جیسے ایک سماع کی محفل میں دیکھا کہ ایک سندھی آزاد نظم میں شاہ صاحب کی شاعرانہ نوک جھونک کا ذکر نہایت دلکش انداز میں بیان کر رہے تھے، مثلاً صابر شاعر اور شاہ بھٹائی کے شاعرانہ سوال جواب بیان کر رہا تھا، صابر شاعر نے شاہ صاحب کو کہلا بھیجا ؎

نالوں نے بہہ کر دریا کو دبا لیا ہے۔

اس سے شاعر کا شاعرانہ تعلی مقصود تھی، اور شاہ بھٹائی کی شاعری پر چوٹ کرنا چاہتا تھا، لیکن شاہ صاحب نے صابر کو یہ معقول جواب دیکر خاموش کیا۔

نالے بہہ کر کس طرح دریا کو دُبا سکتے ہیں۔

جب دریا میں موج آئے، تو ان سے راستہ بنالے گا

اور وہ ایک ناچیز نالی کس طرح بہہ کر خاموش ہو جائیگی۔

ایسی روایات شمال اور جنوب سندھ میں کثرت سے سننے میں آتی ہیں۔ اگر اُن کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ متاخرین نے اپنی تعبیر کی بنیاد زبانی روایات پر رکھی ہیں تو ہم ایک تاریخی تحقیقات کی اہمیت کو کیوں متزلزل ہونے دیں۔ خدا جانے ڈاکٹر گرجتانی نے کس سند پر تحفۃ الکرام کی روایت کی تکذیب کی ہے۔ اس نے دلائل پیش کئے ہیں، وہ غیر تاریخی اور تاویلات پر مبنی ہیں، ہم فرداً فرداً یہاں اُن کا ذکر کریں گے۔

یہ واضح حقیقت ہے کہ تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف سید میر علی شیر قانع ٹھٹہ کے رہنے والے تھے، اور اُنہوں نے یہ اپنی تصنیف میاں غلام شاہ کلہوڑہ کے ایام حکومت میں لکھکر ختم کی تھی۔ یعنی شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کی وفات سے پندرہ سال بعد ۱۱۸۱ھ میں اس حقیقت سے معلوم ہوتا ہے کہ میر علی شیر قانع، شاہ صاحب کی آخری عمر میں جوان سال تھے، اس کو اگر شاہ صاحب کا معاصر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ہم اس کی روایت پر تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔

حضرت مخدوم محمد معین ٹھٹوی جن سے شاہ بھٹائی کے گہرے تعلقات تھے، میر علی شیر قانع کے استاد مخدوم نعمت اللہ سے دوستانہ تعلقات تھے میر علی شیر قانع اپنے استاد کے ساتھ مخدوم محمد معین کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ میر علی شیر قانع کی اپنی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ

---

۱ صابر کا سندھی میں شعر اس طرح ہے۔ واءڙ ويا وصي ۾ ٻانهي درياهه کي (الخ)

شاہ بھٹائی کا جواب ۔ واءڙ وصي چاه ۾ ٻانهين درياهه کي

اينديو موج مهراڻ کي هنديو گس گهي۔

هي جان هي، ويندا مڙيئي ماڻ ٿي۔ "شاه اي تي يا خواندہ" مضمون نگار مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی (شاعرہ جو سرتاج)

مخدوم محمد معین رح کی وفات کے وقت شاہ صاحب اُن کے سرہانے موجود تھے مخدوم کی وفات کے بعد آپ نے فرمایا تھا [1]

مخدوم صاحب کی ملاقات کیلئے ہی ہم ٹھٹھہ آتے تھے۔ اب جبکہ آپ نے
رحلت فرمائی ہے۔ ٹھٹھہ میں اب ہمارا آنا موقوف ہوگیا۔

مخدوم معین رح کی وفات کے وقت میر علی شیر قانع وہاں تھے۔ شاہ بھٹائی رح اور مخدوم صاحب کے تعلقات کو وہ نجی طور پر جانتے تھے۔ ایسے حالات میں ایک باکمال مورخ ایک غلط روایت کو کیسے پیش کر سکتا ہے۔ اگر ہم قانع کی اس روایت کی تکذیب کرینگے، تو پھر تاریخ تحفۃ الکرام کی اور روایات کس طرح معتبر ہو سکتی ہیں۔ یہ کتنا کسی تاریخ کے طالب علم سے پوچھا جائے۔ ڈاکٹر گربخشانی نے شمس العلماء مرزا قلیچ مرحوم کی ایک زبانی روایت پر اپنی تحقیقات کی بنیاد رکھی ہے وہ روایت اسطرح ہے [2]

میاں نور محمد کلہوڑہ نے شاہ بھٹائی کو ایک موقعہ پر مثنوی مولانا روم کا ایک نسخہ تحفتاً دیا تھا جس سے ڈاکٹر صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر شاہ صاحب علوم راشجہ پر حاوی ہوتے تو میاں نور محمد کلہوڑہ کیوں کر اُنہیں مثنوی کا نسخہ دیتے۔ لیکن یہ روایت زبان ہوتے ہوئے بھی مرزا صاحب نے صاف لکھدیا ہے کہ اُسی مثنوی کے نسخہ پر بطور یادداشت جو کچھ لکھا گیا ہے وہ آپ کے بھتیجے کے بیٹے سید جمال شاہ کے دستخط تھے۔ مرزا صاحب نے اس حقیقت کا انکشاف بڑے سادہ طور پر کیا ہے اس پر اپنی رائے نہیں دی لیکن اس قصہ سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اگر شاہ صاحب اُمی نہ ہوتے تو جمال شاہ کے ہاتھ بود سارے لکھنے

محبت کی اولین تجلی:-

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کے اکثر سوانح نگاروں نے اُن کے ایام شباب کے ایک مشہور رومان کا ذکر کیا ہے۔ روایت یوں ہے کہ کوٹڑی کے نزدیک ارغون خاندان کے چند امیر رہتے تھے۔ مرزا مغل بیگ ان میں بلند اقتدار رکھتے تھے اور قبیلے کے رئیس تھے۔ اکثر سندھی ہیر اور رہیدار مرزا موصوف کے رو اور طاقت سے مرعوب رہتے تھے شاہ بھٹائی کے والد بزرگوار سید حبیب شاہ سے مرزا مغل بیگ اور ان کے قبیلہ کے بہت سے لوگ بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ شاہ صاحب اکثر اُن کے حرم سرا میں آتے جاتے تھے۔ سدھارتھ یا کسی ناگہانی مشکلات میں وہ وہاں دعا اور نقش کے لئے لائے جاتے تھے۔

ایک مرتبہ مرزا مغل بیگ کی چہیتی بیٹی سیدہ بیگم بیمار ہوگئی اور اس کی حالت غیر ہوگئی، مرزا موصوف نے حبیب شاہ کو حسب دستور طلب کیا اتفاقاً شاہ حبیب خود ہی بیمار تھے گھر سے باہر نکلنے کے قابل نہ تھے۔ وہ اپنے باپ کے بجائے بیٹے کو ساتھ لیا۔ شاہ بھٹائی رح نے مرزا کے حرم سرا میں داخل ہوتے ہی وہاں سے ایک لڑکی کو کپڑوں میں لپٹا ہوا بستر پر دیکھا۔ اس عجیب نظارہ نے شاہ صاحب کو بیحد متاثر کیا لڑکی کی انگلی اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا

"جس کی انگلی سید کے ہاتھ میں ہو اس کو نہ کوئی خوف نہ خطرہ۔" [3]

میر مغل اس سادہ معجزہ کو سمجھ سکا اور بہت سکڑا۔ اس کو اپنی زبان ہمت سمجھا گیا۔ "ہم نے اس کا علاج کیا" اس وقت تو شاہ بھٹائی کو عزت سے رخصت کردیا، مگر بعد میں اس کے سینہ میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی، شاہ حبیب کو یہاں اپنا مہمان کر دیا اور [illegible] عقیدت اور محبت عداوت اور نفرت میں تبدیل ہوگئی۔ ہمسایہ زمیندار اور رئیس کی مغل بیگ کے [illegible]

---

[1] تحفۃ الکرام حصہ اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۲۷۸۔

[2] شاہ اُمی تھے یا خواندہ مقالہ نگار مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی۔ تاریخ جو سراج [illegible] کلیم حبیب [illegible] بوتہ۔

[3] مقدمہ "شاہ کا رسالہ" مرتب ڈاکٹر گربخشانی صفحہ ۱۸۔

لگے یہ حالت دیکھ کر شاہ صاحب نے مجبوراً کوٹڑی سے ہجرت کرنا ہی مناسب سمجھا اور کوٹڑی کے شمال کی طرف کچھ فاصلہ پر جا بسے۔

یہ ہے مختصر حقیقت شاہ عبداللطیفؒ کے عشقیہ رومان کی، جس کے متعلق مختلف مضمون نگاروں نے اپنے مضامین میں افسانہ نویسی کا رنگ بھر دیا ہے۔ صحیح حقائق کو اگر ہم سامنے رکھکر دیکھیں گے تو شاہ عبداللطیف نے اس عصمت مآب لڑکی کو کبھی دیکھا تک نہ تھا، نہ ہی اس واقعہ کے بعد کسی راہ رسم کے پیدا کرنے کی کوشش کی، ان کا سادہ سا مفرجی سے ارعون رئیس بگڑ اُٹھا تھا، وہ محض ایک دعائیہ کلمہ تھا، جس کو وہ سیلا نوجوان رئیس سمجھ نہ سکا اور اس کے بیہودہ غصہ نے ایک معمولی سے واقعہ کو افسانہ بنا دیا۔

یہ عجیب حقیقت ہے کہ شاہ صاحب نے ایام شباب میں کسی لیلیٰ کے محمل کی گرد کو اپنے آنکھوں کا سرمہ بنایا تھا، خواہ حافظ شیرازیؒ اور شاخ نبات کی وہی داستان کی طرح ہمارے شاہ صاحب کو بھی رنگین مزاج بنا کر باروں نے زبردستی میدان تعشق میں لا ڈالے تھے، ورنہ ایک مادر زاد مست الست کو ان چیزوں سے کیا نسبت۔ شاہ صاحب نے پوری زندگی بے داغ گذاری۔ خود فرماتے ہیں:—

کاک بھی صادق خدا پرستوں کو روک نہ سکی

نہ ہی دنیا و عیال و دولت اپنی فریب میں مبتلا کر سکے

اگرچہ آزاد ماہ سیمائوں نے بہتیری کوشش کی

لیکن وہ لاہوتی، آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ نے بھی ایسے خدا آگاہ گروہ کی محبت اور عشق پر تبصرہ فرمایا ہے، جس کو پڑھکر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان ارباب حق کے یہاں عشق محبت سے کیا مراد ہے۔

ملت عشق از ہمہ دینہا جدا ست

عاشقاں را مذہب و ملت خدا ست۔

محبت الٰہی کی چنگاری جس دل میں شعلہ ریز ہوتی ہے، وہ مادی دنیا کے حسن اور صورت پر فریفتہ ہو نہیں سکتا، اس کی محبت کی اصل منبع تجلیات الٰہی کا رونق ہوتا ہے، شاہ کے فرضی داستان کے ہیرو خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں:—

خرد اگر بیشگاہ حقیقت شود پدید

شرمندہ رہروی کہ نظر بر مجاز کرد

مجاز اسرار الٰہی کے جاننے والوں کیلئے ایک زینہ شکار ہے، وہ ہستی جو اپنی عہد طفلی میں رموز حق پرست کے نکتوں کو سمجھ سکتی ہیں شباب میں اگر اس محبت علمی کو سر راہ لٹا دے یہ ایک حق پرست کا قیاس، اس کو تحول نہیں کر سکتا بہرحال، ایک عظیم الشان شخصیت کے متعلق ایسی لایعنی باتوں کا اظہار رکھنا دنیا کا قدیم رواج ہے، اس لئے ہمارے شاہ بھٹائیؒ کے گرد بھی ایسی روایتوں کا حلقہ بن جائے تو یہ چنداں تعجب خیز نہیں۔

رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ میں اسطرح شعر آتا ہے:۔

ھاءِ نہ ھلیا ھا پڑی، مرھیا ھنس نہ مال

شوہ پوءِ سجھائی دیا، بیٹھا جنین جال

جو چوئین ٹا چال، تب لاھوتی لنگھی دیا

کاک سندھ کے جنوبی حصہ قریب ایک مکان تھا جہاں میندھرہ (رانی) کی محبوبہ موصل سکونت رکھتی تھی، سندھ میں یہ المیہ افسانہ مشہور ہے، شاہ بھٹائیؒ کے عظیم کا یہ مشہور حصہ ہے۔

شاہ بھٹائی ؒ کی سیر و سیاحت

شاہ بھٹائی ؒ کے بچپن کی تنہا پسندی آخر رنگ لائی۔ کچھ مغلوں کی بڑھتی ہوئی عداوت سے تنگ آکر، کچھ فطری اور طبعی رجحان کے باعث اپنے وطن عزیز کو الوداع کہکر، سیر و سیاحت کیلئے نکل پڑے۔ راہ میں انہیں ہندو جوگی فقیروں کا ایک گشتی گروہ مل گیا۔ اُن کی صحبت میں وہ سندھ اور بیرونِ سندھ کے مختلف شہروں میں پھرتے رہے۔ سندھ کے مشہور ادیب آنجہانی بھیرومل مہرچند آڈوانی نے شاہ بھٹائی کی سیر و سیاحت پر ایک دلچسپ مستقل کتاب لکھی ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق آپ نے اپنے وطن کو خیرباد کہکر، جوگیوں کی صحبت میں اول گنجے پہاڑ (حیدرآباد) گئے۔ اس سفر کا ذکر آپ اپنے ابیات کے ذریعہ سرکھاڑی میں تفصیل سے کیا ہے۔

گنجے پہاڑ پر جن جوگی فقیروں سے ملاقات ہوئی تھی، انکو ہر وقت "نانی (منگلاج) کی طرف نظر تھی، اس طرف جانے کے لئے بیتاب تھے، کیونکہ شاہ صاحب کو فطری سیر و سفر کا شوق دامنگیر تھا، اور جوگیوں کے اصرار پر منگلاج کا سفر اختیار کیا، کیونکہ یہ آسان سفر نہ تھا، پھر بھی شاہ صاحب ان جوگیوں کی صحبت میں منزل بہ منزل سفر جاری رکھا۔ راستہ میں کینجھر جھیل سے ہوکر ٹھٹہ پہنچے۔ کینجھر جھیل کا علاقہ سندھ کے مشہور حاکم جام تماچی اور نوری کا داستان سے مشہور ہے۔ ٹھٹہ سے ہوکر نصر بھنبھور میں پہنچے تھے۔ اس شہر میں سسئی پنہوں کی مشہور داستان ہوکر گذری ہیں۔ سسئی اپنے محبوب پنہوں کو ڈھونڈنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا تھا، اُسی راستے سے شاہ صاحب کراچی کی طرف گئے تھے۔ اس زمانہ میں کراچی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ جب ندی کراچی سے سات میل مغرب کی طرف ہے منگلاج جانے کے لئے اس ندی کو عبور کرنا پڑتا ہے، جہاں سے بلکل تنگ راستوں سے گذرنا پڑتا ہے، وندر کے ساتھ ماڑھو جبل (پہاڑ) سے گذر کر منگلاج پہنچے۔ منگلاج سے واپسی پر جوگیوں کے ساتھ لس بیلہ کی راہ لکھپت (کچھ) اور گرنار (ریاست جونا گڑھ) تک گئے۔ جہاں سے واپس ہوکر جیسلمیر سے ہوتے ہوئے تھر پہنچے۔ تھر میں بھالوا بستی میں مارئی کے آبائی وطن کو دیکھا۔ شاہ صاحب نے مارئی کے متعلق جو ابیات "نظم" لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تھر کی جغرافیائی حالات اور وہاں کے رہنے والوں کی رسم و رواج سے بخوبی واقف تھے۔ تھر سے اپنے آبائی وطن واپس ہوئے، لیکن، لیکن تھوڑے عرصے کے بعد پھر گھر سے نکلے اور ہالار جبل کے کوہستانی سلسلہ عبور کرکے لاہوت، منگلاج اور لس بیلہ، پیر سخی کے تاریخی مقامات کی زیارت کی ایک ضعیف روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کابل اور قندھار بھی گئے تھے، لیکن جس طرح یہ روایت پیش کی گئی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روایت عقیدتمندوں کی اختراع اور ایجاد ہے۔ منگلاج کے مقام پر آپ اپنے ساتھی جوگیوں سے نارائن ہوکر کیچ مکران کی راہ سے کراچی کی طرف روانہ ہوئے۔ روایت ہے کہ اس سفر میں جب آپ ہالار کے پہاڑوں کو طے کر رہے تھے، ایک جگہ المناک آواز سنی سراسیمہ ہوکر اس صدائے دردناک کی طرف روانہ ہوئے، چند قدموں کے فاصلے پر آپ کو ایک تنگ و تاریک غار میں ایک شخص، متحرک مصرع دہرا رہے تھے،

"جیکلا فیہ جیل، پوءِ بندس پنھوں تی"

اس دفعہ پنہوں کے طرف تنہا ہی چلونگی۔

آپ اس درد مند انسان کی طرف بڑھے خاطر اور مدارات کے بعد پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے، اس غمزدہ شخص نے جواب دیا کہ میں ذات کا جت ہوں میں اور میرے دو رفیق اُونٹوں پر تجارت کا سامان لاد کر جا رہے تھے، جب ہالار کے نزدیک آئے تو ایک مقام پر سماع کی محفل منعقد تھی گانے والے بڑے سوز سے یہی مصرعہ گا کر دہرا رہے تھے، مجھے یہ مصرعہ اتنا پسند آیا، اور اپنا کل اسباب چھوڑ کر اور تارک بنکر وہی مصرعہ گاتا ہوا یہاں

۱؎ اس زمانہ میں حیدرآباد کو "نیرن کوٹ" کہتے تھے جسکو ۱۷۶۸ء میں میاں غلام شاہ نے بنوایا تھا، شاہ صاحب نے ۱۷۵۲ء میں وفات کی تھی۔

۲؎ کراچی شہر، سیٹھ ناؤمل پوجوان نے اپنی تواریخ میں لکھا ہے کہ ۱۷۲۹ء میں آباد ہوا اور شاہ صاحب کی ولادت ۱۶۸۹ء میں ہوئی تھی۔

پہچانا ہوں ۔ شاہ بھٹائی نے فریبہ سے معلوم کیا کہ وہ شاید محبت کی چوٹ کھائے ہوئے ہیں ۔ اس نے کہا کہ اگر تیری خواہش ہو تو اس مصرعہ کو میں بیت کی صورت میں مکمل کردوں ۔ بہت اس بات پر بہت خوش ہوا ۔ اور شاہ صاحب سے عرض کیا اس مصرعہ کو مکمل کردیجئے شاہ بھٹائی نے جنت کی بیتابی کی قدر کی اور فرمایا ۔

"آڈا ڈونگر ڈاکڑا ، سوري سجن سيل"

میرے سامنے ، جبل اور دقیق راستے ، سولی اور کانٹے نظر آرہے ہیں

شاہ بھٹائی کے اس مصرعہ کو سنتے ہی ، جنت پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی ۔ اور شاہ صاحب کو منت کی کہ شعر کو جلد ختم کردیجئے شاہ بھٹائی نے فرمایا

تہ ڪر پيلي آهن پيل ، سور پريان جا سائڻ مون ۔

تو حبیب کے دیئے ہوئے رنج و عتاب ہی میرے رفیق اور غمگسار ہیں ۔

شاہ بھٹائی کے بیت ختم کرتے ہی جنت بیہوش ہوکر گر پڑا شاہ صاحب اس کی حالت سے بہت متعجب ہوئے آگے بڑھ کر جو دیکھا تو وہ کشتہ حسن خان خان آفرین کے سپرد کر چکا تھا ۔ آپ نے وہیں اسے دفن کیا ۔ اور اکثر فرماتے تھے کہ اس جیسا صادق اور سوختہ دل انسان میں نے کبھی نہیں دیکھا ۔ اس کشتہ محبت کی قبر آج بھی صنگلاح اور ٹھٹہ کی راہ پر چلنے والوں کو دور سے نظر آتی ہے

اس قسم کی روایات بعض عرب کے مشہور تذکروں میں افراط سے ملتی ہیں ۔ ڈاکٹر زکی المبارک نے اپنی تصنیف "التصوف الاسلامی" میں اس کا علیحدہ باب قائم کیا ہے اس قبیل کی ایک حکایت وہ عرب کے ایک مشہور ادیب اور نقاد اصمعی سے یوں منسوب کرتا ہے

بصرہ اور کوفہ کے درمیان ایک شہر آباد ہے ۔ اس شہر میں ایک صوفی کسی مکان کے نیچے سے گذر رہا تھا ۔ جب وہ وہاں سے گزرا تو انہیں اس شعر کو بڑے سوز سے گاتے ہوئے سنا تو ٹھہر کر رہ گیا ۔

كل يوم تتلون غذابك احسن

كل يوم تتحول غير غذابك اجمل

تو ہر روز رنگ بدلتا ہے ، اور اس سے تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے ۔

تو ہر دن بھی تبدیل ہوتا ہے ، اور اس کے سوا بھی تو مجھے بہت خوب لگتا ہے ۔

دیکھا تو یہ مکان ایک امیر کا ہے اور اس کی لونڈی گا کر اپنے آقا کو خوش کر رہی تھی ۔ درویش نے اس کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہا تجھے خدا کی قسم ، اس شعر کو پھر سے سادہ اور مشاق طریقہ پر جب اس نے تین چار مرتبہ اس کی تکرار کی تو درویش مست ہوکر رقص کرنے لگا ۔ ناگہاں بلند آواز سے ایک نعرہ لگایا اور جاں بحق تسلیم ہوا ۔

شاہ اس سیر و سیاحت میں کم و بیش سات سال اپنے گھر سے باہر رہے اس سیاحت کے زمانہ میں آپ نے نہ صرف صوفیوں ، فقیروں کے راہ و رسم سے حاصل کئے بلکہ سندھ اور اس کے متعلقہ علاقوں کے قصے اور کہانیوں ، معاشرہ اور دیگر روایات کا بھی غور مطالعہ کیا جس سے آپ کی معلومات کا دائرہ وسیع ہوگیا جس سے اپنے کلام میں وہ نقش نگاری کی ہے جس کا نظیر دنیا کے شعراء نے پیش نہیں کیا ہے ۔ ایک مشاہدہ نگار کی طرح کسی معمولی سے بات کا ذکر کیا ہے تو اس میں وہ رنگ بھر دیا ہے جو رسالہ اس حقیقت افروز معلومات اور مشاہدات کا ایک غیر فانی مجموعہ ہے ۔

شاہ بھٹائی کی جدائی میں آپ کے والد بزرگوار سید حبیب شاہ کی حالت پریشانی اور بیقراری حد سے تجاوز کر گئی تھی ، روزانہ حالا تشریف لے جاتے تھے ، اور حضرت نوح روت اللہ علیہ کی درگاہ پر اپنے یوسف کے لوٹ آنے کی دعائیں مانگتے تھے ، آخر آپ کی دعائیں مستجاب ہوئیں اور ایک دن شاہ عبداللطیف اچانک گھر پہنچ گئے ۔ آپ کے والد نے اپنے بیٹے کو صحیح و سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوئے ۔

باب پنجم

مرزا مغل بیگ کی شہادت اور شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شادی

شاہ صاحب سفر سے واپس آکر اپنے چھوٹے سے گاؤں میں دستور کے مطابق عبادت الٰہی اور والدین کی خدمت میں آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے بظاہر مرزا مغل بیگ کی دشمنی کم ہوگئی تھی، اگرچہ ٹوٹے ہوئے تعلقات میں پھر استواری نہ آسکی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرزا مغل بیگ میں وہ جوش اور غضب باقی نہ رہا تھا روایت ہے کہ ایک دن جب مرزا موصوف اپنے گھر سے باہر کسی ضروری کام کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اُن کی غیر حاضری میں "دَل" قوم کے چند لٹیرے آپ کی حویلی میں گھس آئے۔ مستورات میں وہ طاقت نہ تھی، کہ لٹیروں کا مقابلہ کر سکیں، وہ اپنی دل جمعی سے نقد، زیورات اور اسباب جو کچھ وہاں ہاتھ آیا لوٹ کر روانہ ہوگئے، مرزا جب گھر واپس لوٹے تو ان کو اس سانحہ کی خبر ملی تو بہت غصے میں آگئے اور اپنے مددگاروں اور ملازمین کا ایک جم غفیر لے کر ان لٹیروں کے پیچھے روانہ ہوئے شاہ صاحب کو بھی اس واقعے کی خبر ملی، آپ بھی اپنے فقیروں کو ساتھ لے کر اُن کی امداد کے لئے روانہ ہوئے۔ شاہ بھٹائیؒ کو بھی مرزا راہ میں ملے، غرور مرزا نے شاہ بھٹائیؒ کی امداد کو ٹھکرا دیا، شاہ صاحب نے اگرچہ بہت سمجھایا اپنی بزرگی کی صفائی پیش کردی، اور عیسائیگی کے واقعات کو یاد دلایا، لیکن مغرور مرزا نے ان کی ہر بات کو مسترد کیا، شاہ صاحب مرزا کے اس رویہ پر بڑے رنجیدہ ہوئے اور آپ نے جلال میں آکر فرمایا:۔

بیگ تنھنجي بيگي ۽ ڪوٽريءَ ۾ سان
آخر آهي الله ۾، دَل مارينِي مان

بیگ یہ تیری بیگی کوٹڑی میں باقی نہ رہیگی
امید مجھے اللہ میں دَل تجھ کو مارینگے کہیں۔

یہ پہلی اور آخری بددعا تھی جو ہمارے عظیم شاعر کی زبان سے نکلی۔ شاید یہ القائے فطرت تھا۔ لٹیرے بڑے آرام سے جا رہے تھے، لنجھ میں بیگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُن کے سر پر جا پہنچے، شدت مقابلہ ہوا، مغل بیگ اور اس کے ساتھی بڑی بہادری سے لڑے، قضائے کار مرزا دشمن کے زد میں آگئے اور شہید ہوگئے مرزا کے شہید ہوتے ہی لٹیرے فاتحانہ نکل گئے۔ عوام نے مرزا کی شہادت کی اطلاع پاکر، شاہ بھٹائیؒ کی بددعا کو بڑی اہمیت دی اور خود حرم کی مستورات بھی بڑی حد تک متاثر ہوگئیں۔ شاہ صاحب کے ارادتمندوں سے کسی نے شہید مرزا کے شہادت کا مادۂ تاریخ کہا "بود حبیب" شاہ صاحب نے فوراً بہ تبادل تاریخ پیش کی فرمایا "یک مغل بہ بود" ایک اُمی کے زبان سے یہ مادۂ تاریخ سجیع شعر کی صورت میں آنا ایک غیر معمولی اعجاز شمار کیا جاتا ہے۔[1]

سندھ کے اکثر مصنفین نے شاہ لطیفؒ کے اس فی البدیہہ مادۂ تاریخ کے کہنے کو ان کے فارسی دان پر محمول کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرتا ہے کہ اس مختصر مادہ تاریخ کے علاوہ شاہ لطیف کے کلام میں اور فارسی شعر نظر نہیں آتا۔ اگرچہ اپنی فارسی زبان پر واقعی عبور ہوتا تو آپ کی طبع فارسی شاعری کی طرف ضرور رجوع ہوتی، تاہم دیکھتے ہیں کہ آپ کے محبوب دوست مخدوم محمد معین ٹھٹوی، سندھی اور فارسی شاعری کے باکمال شاعر تھے کم از کم مخدوم موصوف کی [illegible] سے کچھ نہ کچھ فارسی زبان میں اپنی یادگار چھوڑ جاتے۔ البتہ ایک فارسی مصرعہ جو کہ شاہ عنایت صوفی شہید کی ایک فارسی غزل سے اپنے کلام میں تضمین کی طور پر استعمال کیا ہے۔ جو اسطرح ہے ــــــ

---

[1] میر علی شیر قانع اپنی تصنیف تحفۃ الکرام میں اس مادۂ کے متعلق اسطرح لکھتے ہیں۔
بود حبیب آن عارف کامل شنیدہ بربدیہہ فرمود چنین نباید گفت کہ "یک مغل بہ بودہ" چوں حساب کردند درست تاریخ بہمان سال دہست آمد الحق از شخص امی وقوع این حال جز خوارق نیست۔ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۱۵۳ ــــــ

"سر در قدم یار فدا شد چہ بجا شد، وصل اِھوئی ونگ" [1]

لیکن ان سب باتوں کے باوجود شاہ لطیف کو اپنی زبان اور ثقافت زیادہ عزیز تھی، جس کی وجہ سے سندھی زبان میں اپنا کلام پیش کیا تھا، واللہ اعلم بالصواب

مرزا مغل بیگ کی شہادت کے حادثہ کے بعد، اُس کا ایک صغیر سن لڑکا مرزا گولو حاویلی میں باقی رہ گیا تھا، مرزا موصوف کی مشہورات نے اپنے خاندان کی تباہی کو شاہ لطیف کی ناراضگی اور بددعا کا نتیجہ سمجھتے ہوئے گذشتہ روئداد کے کفارہ کے لئے، شاہ لطیف کو مرزا کی پاکدامن صاحبزادی سیّدہ بیگم کے ساتھ شادی کی دعوت دی، شاہ صاحب نے بطیبِ خاطر، اس پیش کش کو قبول فرمایا، شاہ جہانی کا نکاح مرحومہ سے ہوگیا، اور یہی سیّدہ بیگم اپنے چھوٹے بھائی مرزا گولو کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں، مرزا گولو شاہ لطیف کی یہاں بڑے آرام سے رہا، لیکن موت نے اس کو زیادہ جینے کی مہلت نہ دی، اور چھوٹی عمر میں ہی داعی اجل کو لبیک کہا، شاہ صاحب کے بعض سوانح نگاروں نے مرزا کے بیوقت وفات کے واقعہ پر لکھتے کہ شاہ لطیف نے اس وقت فرمایا تھا، "مئو گولو لئو پولو" یعنی "گولا مرگیا اور خطرہ ٹل گیا"

شاہ لطیف جیسے بلند اخلاق اور عدا، سیدہ بزرگ سے ایک معصوم بچہ کے موت پر اس قسم کے کلمہ کی توقع رکھنا، آپ کے عالی اخلاق کے منافی ہے حیرت ہے کہ ان سوانح نگار حضرات نے کبھی اس حقیقت پر بھی غور کیا ہے کہ آخر مرزا گولو نے وہ کونسا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں شاہ لطیف سنجیدہ بزرگ اس قسم کا کلمہ ارشاد فرمائیں، بغض وعناد تو شاہ صاحب کو مرزا مغل بیگ سے بھی نہ تھا، ان کی حسن حیات میں بھی مرزا موصوف کی دلجوئی کی کوشش کرتے رہے، آپ جب کہ اسکا صغیر سن لڑکا آپ کی آغوش میں پرورش پا رہا تھا، اس کے المناک موت پر ایک فقرہ کہکر اپنے اعتبار کا اظہار کرنا کہاں کی اسلامیت اور سنجیدگی ہے، حقیقت میں ان غلط واقعات کا ازالہ آپ خود اپنے کلام میں صوفی کے مذہب عالی کے متعلق فرماتے ہیں،

صوفی لا عوفی، عین پا شین صبر

جنین سان ویر، شئی، تنین جو ظاہر

فرقہ بندی سے پرے صوفی کی ہے یہ زندگی۔ [2]

دشمنوں کے ساتھ بھی، ان کی عیاں ہو دوستی۔

ایک اور باکمال صوفی شاعر نے نیز اس طرح فرمایا ہے۔

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن

آئین ما محبت است بر آئینہ در شتن۔

بہرحال شاہ لطیف کے غلط گو سوانح نگاروں نے صوفیانہ اور عاشقانہ باتوں کو بھی بلا کسی استدلال کے اپنی تصنیفات میں داخل کردیا ہے، اور اس طرح جس نے سندھ کے اس مفکر کی پاکیزہ حیات کو داغدار بنا دیا ہے، شادی کے بعد شاہ صاحب کی زندگی بہت خوشگوار بن گئی، جناب سیّدہ بیگم، جس کو عقیدتمند "تاج المخدرات" کے لقب سے یاد کرتے ہیں بڑی عابدہ اور صالح تھی، عبادالٰہی میں وہ اپنے پاکباز شوہر سے کسی طرح کم نہ تھی، تلاوت

---

[1] رسالہ شاہ جہانی کے سُر حسینی کی داستان اول کا گیارھواں بیت ہے۔ گھڑی گھڑو ہت کری، بھونرن بھاری ہنگ

سر در قدم یار فدا شد چہ بجا شد، وصل اِھوئی ونگ۔

رات منین جو رنگ الاہی اُکاریین

شہید عنایت صوفی کا پورا شعر اسطرح ہے۔ سر در قدم یار فدا شد چہ بجا شد۔ این بار گران بود ادا شد چہ بجا شد۔

[2] مترجم مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی

زاں پاک ان کا خاص مشغلہ تھا، اور گھر کے سب کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیا کرتی تھیں شاہ لطیفؒ کو کوئی اولاد نہ ہوئی، روایت ہے کہ جب بی بی صاحبہ حامد ہوئی، تو ایک دن پلّہ (سندھی روایتی مچھلی) کے کھانے کی خواہش ظاہر کی ایک عقیدتمند مرید نے بی بی صاحبہ کی خواہش کی تکمیل کیلئے دور دراز فاصلہ پر پلّہ کی جستجو کے لئے روانہ ہوا، پلّہ کے حاصل کرنے کے بعد وہ دوڑتا اور ہانپتا ہوا منزل مقصود کے قریب پہنچ گیا، اتفاقاً شاہ بھٹائیؒ کی نظر اس مرید پر پڑ گئی، آپ نے اس سے اس پریشانی اور عجلت کا سبب پوچھا مرید نے سادگی سے بی بی صاحبہ کی پلّہ کھانے کے لئے خواہش کی حقیقت بیان کی آپ نے یہ سنکر بہت رنجیدہ ہوئے اور فرمایا "خدا مجھے وہ اولاد ہی نہ دے جس سے میرے فقیروں کو رنج پہنچے میرے لئے یہ فقیر کافی ہیں"

شاہ بھٹائی کی یہ دعا مستجاب ہوئی۔ اور بی بی صاحبہ کا حمل ساقط ہوگیا، اور پھر کبھی حاملہ نہ ہوئی، اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ نہ کرنا چاہئے کہ شاہ صاحب کو اپنے حرم سے کوئی دلبستگی نہ تھی، چونکہ وہ ایک عالی خاندان کی لڑکی تھی، شاہ بھٹائی صاحب اس کی عزت کرتے تھے، اُن کے ناز اُٹھاتے اور بڑی خاطر و مدارت کرتے تھے، بی بی صاحبہ کی زندگی بڑے سکون سے گذری۔ بی بی صاحبہ نے شاہ صاحب کی زندگی میں ہی وفات کی، آپ کی وفات کے بعد شاہ صاحب نے دوسری شادی نہ کی اور بقیہ حیات تجرد کی حالت میں بسر کی۔

بھٹ شاہ کی تعمیر :-

اکثر مورخین کی یہ رائے ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بڑھتے ہوئے روحانی اقتدار کو دیکھکر ہمسایہ پیر آپ سے رشک کرنے لگے تھے، اُن حضرات میں سید عبدالواسع سجادہ نشین درگاہ شاہ عبدالکریم بلڑیؒ اور پیر محمد سجادہ نشین درگاہ حضرت مخدوم نوحؒ جن کو پیر پنج پاک اور پیر پیر بھی کہتے ہیں ملتان بزرگوں کی عداوت سے شاہ صاحب کو نقل مکانی کی ضرورت پڑی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اپنے مورث اعلیٰ شاہ عبدالکریمؒ کی مزار پر ایک عالی شان قبہ کی تعمیر کا کام اپنے ذمہ لے لیا، قبہ کے لئے جو کچھ صرف ہو رہا تھا، شاہ صاحب نے اپنے جیب سے کر رہے تھے، شاہ صاحب کاشی کی اینٹوں (TILES) کے خریدنے کیلئے خود ملتان تشریف لے گئے تھے اور قبہ کی تعمیر خوبی سے سرانجام ہوگئی، کام کی تکمیل کے بعد شاہ بھٹائی نے گنبد کے ایک کونے پر "لطیف" کے نام ایک اینٹ یادگار کے طور پر لگادی، اس اینٹ کو دیکھکر سجادہ نشین صاحب بہت بگڑے اور اینٹ کو دیوار سے علیحدہ کردیا، شاہ صاحب کو جب یہ خبر ہوئی تو فرمایا "لطیف" تو اللہ کا پیارا نام ہے، اس واقعہ سے ہم آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ شاہ صاحب سے اس زمانے کے اکثر صاحب اقتدار لوگوں کا اختلاف رہتا تھا، اس حسد کا سبب فقط آپ کی بڑھتی ہوئی شہرت تھی، یہی حالت پیر پنج پاک کی تھی، ان حضرات کے علاوہ متعلوی (مٹیاری) کے سیّد بھی آپ کے کم مخالف نہ تھے، اس مخالفت کی بنا پر شاہ صاحب نے مجبوراً کوٹڑی سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا، رشد و ہدایت کا یہ مرکز اب کوٹڑی سے منتقل ہوکر بھٹ کے تودوں میں آنے والا تھا، یہ بھی ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے آباؤ اجداد متعلوی (مٹیاری) کے رہنے والے تھے، آپ کے مورث اعلیٰ حضرت شاہ عبدالکریم مٹیاری سے ہجرت فرماکر بلڑی میں جاکر مقیم ہوئے تھے شاہ صاحب کے والد بزرگوار زمانہ کی ستم ظریفیوں سے پہلے ہالہ پور اور بعد میں کوٹڑی میں جاکر بسے۔ اس نقل مکانی کی روایت کو زندہ رکھنے کیلئے شاید شاہ بھٹائی نے بھی کوٹڑی سے بھٹ پر آنے کا فیصلہ کیا ہو بہرحال آپ نے اپنے سیر و سیاحت کے دوران کوٹڑی سے بھٹ پر آنے کے لئے کوٹڑی سے کچھ فاصلہ پر ہالا سے چار میل دور ایک خاموش جگہ کو عبادت اور ریاضت کے لئے انتخاب کی، جس کے گرد ایک گھنا جنگل تھا، جہاں بعد اور ببول کے لاتعداد جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ ریت کے بڑے ٹیلے تھے، ان ریت کے ٹیلوں کے قریب ایک چھوٹی جھیل تھی جس کو شاہ صاحب نے اپنے کلام میں کراڑ کے نام سے یاد فرمایا ہے، اُسی ریت کے ٹیلوں کو "بھٹ" کہا جاتا ہے اور بھٹ کی معنی سندھی زبان میں ریت کا ٹیلہ ہے۔ شاہ بھٹائی نے اس منتخب شدہ زمین کو آئندہ اپنی سکونت کیلئے انتخاب کیا۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ بھٹائی کے دادا حضرت شاہ عبدالکریم بلڑی، اور حضرت مخدوم نوحؒ کے مابین دوستانہ تعلقات تھے شاہ عبدالکریم اکثر مخدوم موصوف کی ملاقات کے لئے ہالا جاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کا اُسی بھٹ کے زمین سے گذر ہوا آپ

یہاں اُتر پڑے، اس جگہ پر کچھ وقت قیام فرمایا۔ اور اپنے خدام کو کہا کہ اس زمین کو خار و خس سے پاک کردیں۔ جب وہ زمین صاف ہوگئی تو آپ نے وہاں نماز ادا کی اور دعا فرمائی۔ ارادتمندوں کے استفسار پر فرمایا کہ میری اولاد سے ایک مرد خدا پیدا ہوگا۔ اور ان کا قیام یہاں ہوگا بہرحال یہ اس بزرگ کی دعا کا اثر ہے۔ شاہ بشاق نے بڑے اشتیاق سے "بھٹ" کے علاقے کا ارادہ کیا۔ اس عزم کے پختہ ہونے کے بعد، آپ اپنے ارادتمندوں اور خدام کو لے کر ریت کے ٹیلے کو ہموار کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ دور دور سے آپ کے خدام اور ہمنفس مٹی کی ٹوکریاں لے کر ریت پر ڈال کر خالی کر رہے تھے۔ یہ بہت مشکل کام تھا لیکن

بہر کارکہ ہمت بستہ گردد اگر خار ہے بود گلدستہ گردد۔

روایت ہے کہ ایک دن شاہ لطیف" اور آپ کے مرید حسب معمول کام میں مشغول تھے، تو مخدوم بہر بیگ پاکھو وہاں سے گزرے اس عجیب منظر کو دیکھ کر طنزاً کہا "پٹ ڈیندی تت" یعنی "بھٹ گوز دے گی" شاہ صاحب نے اطلاع پاکر فرمایا کہ پیر صاحب دعا فرما گئے ہیں، گور تو کھے نہیں دیتے، پیٹ بھر کر کھانے والے ہی دیتے ہیں۔

جب بھٹ کی رت ختم ہوگئی تو آپ نے اپنے ارادتمندوں کو رہنے کیلئے جگہ تقسیم کی اور اپنے لئے مختصر سی جھونپڑی بنادی۔ اس جھونپڑی کے نزدیک آپ نے ایک مسجد کے بنانے کا اہتمام کیا۔ روایت ہے کہ ایک دن آپ مسجد کی زمین کو ہموار کر رہے تھے اور ایک کلہاڑی سے پتھر توڑ رہے تھے، تو دور کا ایک مرید آپ کی خدمت میں آیا اور ایک پتھر ہدیہ کی طور پر پیش کیا آپ نے مرید سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا چیز ہے؟ مرید نے عرض کی کہ حضور یہ پارس پتھر ہے۔ آپ اُس پتھر کو بغور دیکھ رہے تھے کہ پتھر گر کر آپ کی کلہاڑی پر جا لگا، اور وہ سونا بن گیا۔ شاہ صاحب کو اس تبدیلی پر تعجب ہوا اور آپ اپنے کام میں لگ گئے کلہاڑی سونے کے باعث کام کی نہ رہی، شاہ صاحب کو بہت غصہ آیا، پتھر اور کلہاڑی کو مسجد کے کونے میں پھینک کر فرمایا کہ دنیا کے لوگ مدد کرنے کے بجائے ہمارے کام میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ وہ مرید شرمندہ ہوکر، پتھر اور کلہاڑی لے کر واپس چلا گیا۔ بھٹ پر تعمیر کا کام جاری تھا، کہ ایک عظیم حادثہ نے آپ کو پریشان کردیا۔

حضرت شاہ حبیب کی وفات :-

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی" بھٹ کے تعبیر میں جمہ تن مصروف تھے، تعمیر کا کام خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا کہ ایک دن اچانک آپ کے والد بزرگوار سید حبیب شاہ کی طرف سے ایک قاصد یہ پیغام لایا کہ بڑے سائیں (شاہ صاحب) بہت علیل ہوگئے ہیں۔ شاہ لطیف کو آپ کی علالت کا پیغام اس شعر کی صورت میں ملا:-

ڈکنمن جنمن نیم ڈکنداہ۔ ھي مون واجھائيندي نہ وري

جيڪي مٿي ڈکنداہ۔ موجانب ڪرئي جيئري

کسی شوق نے آپ کو پابند کیا، کہ تم دیکھنے بھی نہ آئے۔

دوست! جو کچھ مرنے کے بعد کرنا چاہتے ہو، وہ جیتے جی آکر کرو۔

شاہ لطیف" کو جب یہ پیغام ملا تو اُسے بہت ملال ہوا۔ اپنے مرشد اور والد محترم کے جدا ہونے سے بہت رنجیدہ ہوئے اور آپ نے اپنا جواب قاصد کو اس طرح دیا:-

ٿان ٿيئن ملور۔ ھي آڳاھون آھيان۔

تنھن جي ڪري ڏور۔ حد ٻنھي جي ھيڪڙي۔

آپ غمگین نہ ہوں کہ میں آپ سے دور ہوں

دیکھنے میں تو دوری ہے۔ لیکن منزل دونوں کی ایک ہے۔

عاشد کو مزید یہ بھی کہا کہ میں اپنے مرشد اور والد کی وفات کا یہ المیہ اپنی آنکھوں سے کس طرح دیکھ سکوں گا، کیونکہ میں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا ہے کہ مصیبت کے وقت میں ہر حیثیت کو صبر و تحمل سے برداشت کرونگا، اگر میں والد صاحب کے سامنے جاؤنگا تو اُن کی جدائی کے غم کو برداشت نہ کر سکوں گا، میرا وہ وعدہ ٹوٹ جائے گا، والد محترم کو کہنا کہ آپ کی اور میری منزل وہی ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور آپ کے پیچھے آ رہا ہوں، ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ والد صاحب کو غسل دے کر محمود فقیر کے سرہانے دفن کرنے کے لئے لحد بنائی جائے۔ اور میری جگہ محمود فقیر کے پاؤں کی طرف ہوگی۔

شاہ لطیف کے ایک عقیدتمند مخدوم صادق نقشبندی نے آپ کے والد سید حبیب شاہ کی تاریخ لکھی ہے جو اس مصرعہ سے نکلتی ہے۔

" اَلْمَوْتُ جِسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلٰی لِقَاءِ الْحَبِیْبِ "

موت ایک پل ہے، جو ایک دوست کو دوسرے کی لقاء تک پہنچا دیتی ہے۔

اس مصرعہ سے ابجد کے حساب سے آپ کی تاریخ وفات ۱۱۵۵ھ ہجری مطابق ۱۷۴۲ء نکلتی ہے۔ شاہ لطیف اپنے والد بزرگوار کا جسد مبارک کوٹڑی سے لاکر بھٹ شاہ میں دفن کیا اور ایک مدت تک اپنے والد محترم کے غم میں سیاہ پوش رہے۔ اس دوران اپنے خاندان کے دیگر افراد کو لے کر بھٹ پر مستقل رہائش اختیار کی۔ شاہ صاحب کی باقی ماندہ زندگی بڑے سکون سے ریت کے ٹیلوں اور گرار جھیل کی فضا میں گذری۔ آپ کی زندگی میں یہ ایک بڑا حادثہ گذرا۔ اپنے والد کی مزار مبارک کو شاہ صاحب نے محمود فقیر کے سرہانے سما دیا۔ یہ کہ شاہ صاحب کی قبر کے سرہانے جنوب کی طرف واقع ہے، اور مزار پر ایک خوبصورت چبوترہ بنا ہوا ہے۔

سندھ ملک اس وقت عجیب انقلابوں سے گذر رہا تھا۔ لیکن آپ کی گوشہ نشینی اور پرسکون زندگی پر ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور میاں نور محمد کلہوڑہ:-

شاہ بھٹائی نے اپنے خاندان کے ساتھ جب مستقل طور پر کوٹڑی سے ہجرت کرکے بھٹ پر سکونت اختیار کی تو دور دراز جگہوں سے بہت سے لوگ آپ کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہونے لگے اس بستی کے گرد و نواح میں عرصہ دراز سے پیر اور دیگر خاندان رہتے تھے، میاں نور محمد خان کلہوڑہ سندھ کا حاکم تھا، اسکا دارالحکومت خدا آباد تھا، یہ خاندان پیری مریدی سے ہی اس منزل پر پہنچا تھا، اور یہ لوگ سہروردی طریقہ کے مرشد تھے مریدوں کے متعدد طاقت سے حکومت قائم کی تھی یہ خاندان اپنے نزدیک کسی اور پیر یا فقیر کو طاقت ور بننے نہیں دیتے تھے، جس کی مثال شاہ عنایت صوفی شہید کی شہادت ایک تھی، یہ حکومت کی چال تھی، جو کہ ان کی طرف سے عمل میں آئی تھی۔ اس لئے شاہ صاحب کو چاروں طرف سے مخالفین گھیرے ہوئے تھے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی اپنے جد امجد حضرت شاہ عبدالکریم بلڑی کی مزار مبارک وقتاً فوقتاً زیارت کے لئے جایا کرتے تھے، اپنے مورث اعلیٰ کے مزار کا از سر نو تعمیر کا کام اپنے ذمہ لیا تھا، اس لئے کاشی کی اینٹوں کے خریدنے کیلئے خود ملتان تشریف لے گئے تھے۔ سب سامان خریدنے کے بعد دریائے سندھ کے راستہ کشتیوں میں پورا سامان لاکر وطن واپس ہوئے۔ جب سندھ میں دارالحکومت خدا آباد میں پہنچے تو سستانے کے لئے آپ نے اپنی کشتی کو وہیں روکا، شہریوں کو جب شاہ لطیف کی آمد کا علم ہوا تو بڑے خلوص سے جوق در جوق زیارت کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ میاں نور محمد کو جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو اس نے اپنے خدام کے ہاتھوں ایک ڈبیا موتیوں کے معموں کی آپ کی خدمت میں نذرانہ کی طور پر بھجوادی

---

۱ محمود فقیر بڑا زمیندار اور امیر شخص تھا، شاہ صاحب کی صحبت اور فیض کی بدولت اپنی پوری دولت، مال ملکیت کو چھوڑ کر صرف ایک کوزا پانی کا ساتھ لیکر شاہ لطیف کے حلقہ عقیدت میں داخل ہوکر بڑا فیض حاصل کیا اور اپنے دور کا بڑا کامل درویش بنا، شاہ لطیفؒ اس بزرگ مرید کی بڑی عزت کرتے تھے، محمود فقیر شاہ بھٹائیؒ کی زندگی میں ہی بھٹ شاہ میں وفات پاگئے تھے، اور وہیں دفن کئے گئے۔ ـــــ ۲ تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف نے لکھا ہے

فرمودی نشیندم تاریخ واقعہ این متکلم مخدوم محمد صادق نقشبندی این حدیث است۔ "الموت جسر یوصل الحبیب الی لقاء الحبیب"

شاہ لطیفؒ نے یہ تحفہ شکریہ کے ساتھ قبول فرمایا۔ اور ڈبی ناخدا کے ہاتھ میں دیکر فرمایا، اس کو دریا میں پھینک دو، میاں کے آدمیوں نے حیران ہوکر کہا، "آپ نے ایک سے بھلا اور مفید چیز کو اس طرح دریا میں کیوں پھنکوا دیا" کہتے ہیں کہ جس کسی بدنصیب انسان نے وہاں سے پان پیا وہ وہیں مرگیا یا زندگی بھر بیماری میں مبتلا رہا۔ دراصل یہ معجون ایک قاتل زہر تھی، جو کہ میاں نے شاہ صاحب کو مہمان پہچانے کے لئے بھیجی تھی۔ شاہ لطیف نے جاتے سے میاں نورمحمد کو یہ کہلا کے بھیجا کہ میاں صاحب کو میرے سلام کہنے کے بعد کہیئے گا۔ "آپ کا بھیجا ہوا تحفہ ملا، وہ صرف میرے کھانے سے مجھے ماندہ ہونا لیکن آپ تو میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے میرے سب لوگ منشیخ ہو جائیں"[1]

دوسری روایت یہ ہے، ایک دن میاں نورمحمد کلہوڑہ نے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے ملاقات کرنے کا شوق ظاہر کیا اور شاہ صاحب کو دعوت پر مدعو کیا۔ شاہ لطیف نے دعوت قبول کرلی مقررہ دن پر میاں نے آپ کو بلوایا، کھانے کے اہتمام کے بعد جب شاہ بھٹائی رخصت لینے لگے تو میاں سے دل میں دعا کیئے ہوئے، ایک سرکش اور طاقتور گھوڑی شاہ لطیف کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کی تاکہ شاہ لطیفؒ کو دولتیاں مار کر، یا ڈال کر تکلیف پہنچائے۔ شاہ صاحب نے اس کی چال کو اچھی طرح سمجھا، اور تحفہ قبول کرکے گھوڑی پر سوار ہوگئے۔ کیونکہ یہی نورمحمد خان کی منشا تھی۔ شاہ بھٹائی نے اس سرکش گھوڑی پر سوار ہوکر لگام کو بھی چھوڑ دیا گھوڑی چونکہ تیز رفتار تھی، ایک پلک جھپکنے میں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ بہت سے آدمی اُن کے پیچھے دوڑے لیکن وہ اس وقت تک نکل چکی تھی۔ ایک ساعت کے بعد شاہ بھٹائی گھوڑی پر سلامتی سے نورمحمد خان کے آگے آکر رُکے، یہ ماجرا دیکھکر میاں بہت شرمندہ ہوئے، اور شاہ بھٹائیؒ سے معافی مانگ لی۔ میاں نے یہ دریافت کرنا چاہا کہ اس سرکش گھوڑی پر بغیر کسی جھجک کے سوار ہوئے اور لگام کو بھی چھوڑ دیا شاہ صاحب نے فرمایا آپ نہیں سمجھے جب کہ میری توکل رب پر ہے، اور میری زندگی کی باگ خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، تب مجھے یہ مناسب نہ معلوم ہوا کہ گھوڑی کی باگ کو تھام لوں، اس کو بھی اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا۔ اس واقعہ کے بعد میاں نورمحمد کلہوڑہ سے دشمنی چھوڑ کر دوست بن گیا[2]

دشمن چو کند چو مہربان باشد دوست۔

روایت ہے کہ میاں نورمحمد کلہوڑہ کے بیٹے میاں غلام شاہ کلہوڑہ شاہ لطیفؒ کی دعا سے پیدا ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ شاہ صاحب کی خدمت میں ایک حسین و جمیل نوجوان طوائف دعا کے لئے حاضر ہوئی تھی، اور شاہ بھٹائیؒ سے کہہ رہی تھی، کہ میرے لئے اللہ تعالیٰ کی درگاہ عالی میں دعا فرمائیں کہ میری زندگی خیر و عزت سے گذرے، اس طوائف نے شاہ بھٹائیؒ کی محفل کو اپنی خوش الحانی سے بے خود بنا دیا تھا۔ شاہ صاحب اس سے بہت خوش ہوئے تھے، "کلاں" نے اس موقعے کو غنیمت جان کر شاہ بھٹائیؒ کی خدمت میں دعا کے لئے عرض کر رہی تھی۔ "اس غلط کاروبار سے جان چھوٹے اور حلال کی روزی نصیب ہو اور باقی زندگی آرام و سکون سے کٹ جائے" شاہ لطیف نے فرمایا، "تیری شادی سندھ کے بادشاہ سے ہوگی اور تیرے بطن سے ایک ایسا بیٹا پیدا ہوگا جو سندھ کا حکمران اور مدبر بادشاہ بنے گا اور اپنے والد سے زیادہ نیک نام ثابت ہوگا۔ اس محفل کا کسی منافق آدمی نے جاکر میاں کو شکایت کی اور کہا ایک طرف شاہ لطیف اپنے آپ کو درویش کہتا ہے، تو دوسری طرف طوائفوں سے سماع کی محفلیں گرم کرتا ہے۔ یہ باتیں صوفیوں اور درویشوں کے شایان شان نہیں۔ میاں نورمحمد خان نے فوراً یہ حکم دیا کہ اگر ایسی حالت ہے تو اس کو دیکھا جائے اور اپنے آدمی کو شاہ بھٹائیؒ کی طرف بھیج دیا، اور کہا اگر ایسی کوئی عورت موجود ہو تو، اسے زبردستی یہاں لے آؤ قضا اور قدرت کو یہی منظور تھا، اس وقت "کلاں" شاہ صاحب سے رخصت لے رہی تھی، تو شاہ بھٹائیؒ نے اسے فرمایا تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ تیرا کام ہو رہا ہے۔ اس گفتگو کے دوران

---

[1] تاریخ ادبیات سندھ (تذکرہ اللطیف) جلد اول تیسری ایڈیشن۔ مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۲۹۵۔

[2] شاہ کا رسالہ مقدمہ مصنف انجانی پروفیسر موتچند مولچند گربخشانی صفحہ ۲۱

[3] احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی مصنف مرحوم مرزا قلیچ بیگ صفحہ ۲۳

[4] ایضاً " " " صفحہ ۲۵

میاں کے آدمی وہاں پہنچ گئے، اور گلاں کو وہاں موجود دیکھ کر اسے زبردستی گھسیٹ کر میاں کے آگے پیش کیا۔ میاں گلاں کے حسن اور جوانی، گلفامی اور نازک اندامی کو دیکھ کر فریفتہ ہو گئے۔ گلاں نے میاں سے کہا، اگر آپ مجھے اپنے نکاح میں لیں گے تو میں آپ کی ہو جاؤں گی۔ ایک مقبر نکاح کے پھاٹک بھی لگانے نہ دوں گی۔ میاں نے عشق کی آتش سے مجبور ہو کر قاضی کو بلوا کر نکاح پڑھوایا۔ اسی گلاں سے ایک فرزند تولد ہوا جس کا نام غلام شاہ رکھا، جو سندھ کا بڑا مدبر اور مشہور بادشاہ بنا۔ غلام شاہ کلہوڑہ بھی شاہ لطیف بھٹائی رح کے خاص عقیدتمندوں میں سے ایک تھا۔ شاہ بھٹائی رح کی وفات کے بعد میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے شاہ صاحب کی مزار مبارک پر موجودہ شاندار مقبرہ تعمیر کرایا۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی وفات

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے والد بزرگوار کی وفات کے بعد، آپ کی زندگی عجیب کیفیت اور استغراق کی حالت میں گذرتی تھی، آپ کی زندگی نے اس دور میں سندھ عجیب انقلابات سے گذر رہا تھا، لیکن آپ کی گوشہ نشینی اور بے مثل زندگی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ تخت دہلی میں حکومت اختیار کرنے کے بعد دنیا کے چھوٹے بڑے کو ترک کر کے دنیا سے کنارہ کش کر یاد الٰہی اور قناعت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس اثناء میں آپ کا نام دور دراز شہروں تک مشہور ہو گیا۔ اس مرنجاں مرنج شخصیت اور شریفانہ زندگی نے آخر عوام کو ان کا گرویدہ بنا دیا۔ ان کی ہر دلعزیزی روز بروز ترقی پر رہی۔ آپ کی خدا ترسی اور پاکیزہ سفاحت نے عقیدتمندوں کا ایک گروہ آپ کے گرد جمع کر دیا۔ شاہ صاحب کا باطنی تصرف تھا یا قدرتی امر تھا، کہ شاہ صاحب کی نیچی امامت گاہ اس حسن سے مالا مال تھا، کہ مریدوں کے گروہ کے گروہ وہاں آ کر بیٹھے آپ کے امرد حسن سے فیض یاب ہوتے تھے۔

اب شاہ بھٹائیؒ کی زندگی عبادت الٰہی کے شغل میں بسر ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ آپ کی زندگی کے آخری دن آ پہنچے، ایک دن آپ کی مجلس میں حضرت امام حسین شہداء کربلا رضی اللہ تعالیٰ کا ذکر مبارک ہو رہا تھا۔ اس وقت سے شہداء کرام کی محبت کا اتنا غلبہ طاری ہوا کہ آپ کو کربلا معلیٰ کی زیارت کا شوق دامنگیر ہوا، اور کربلا کے سفر کے لئے ٹھٹھ سے گجرات کے بندرگاہ جانے کے لئے روانہ ہوئے، جس کے لئے آپ کو بیابان کچھ کو پار کرنا تھا۔ راستہ میں آپ ونگ والر کے ایک گاؤں میں منزل انداز ہوئے۔ جہاں آپ کے قریبی عزیز رہتے تھے۔ خصوصاً آپ کے بھتیجے کے بیٹے سید جمال شاہ نے بڑی خلوص سے خدمت کی۔ شاہ صاحب اس سے اتنے خوش ہوئے کہ ان کو اشارتاً فرمایا تھوڑی بعد تم ہی میرے جانشین ہو گے۔ شاہ صاحب اس سے بڑی شفقت سے پیش آئے اور فرمایا بیٹے جس طرح آج ہم یہاں آئے ہیں اسی طرح آخری جگہ میں بھی آئیں گے۔

شاہ بھٹائیؒ نے وہ رات وہیں بسر کی اور صبح کو مرل کی طرف کوچ فرمایا۔ راستہ میں آپ کو ایک خاص مرید ملاحوں سے سفری دھجہ دریافت کی آپ نے کربلا معلیٰ جانے کا ارادہ بتایا۔ اس مرید نے عرض کیا قبلہ آپ کا ارشاد تھا کہ آپ کا مدفن ٹھٹھ پر ہوگا۔ آپ اپنی آخری عمر میں ایک دور دراز سفر فرما رہے ہیں۔ شاہ صاحب پر ان الفاظ کا بڑا اثر ہوا اور آپ اسی مقام سے لوٹ کر واپس ٹھٹھ پہنچے وہاں آ کر آپ نے حضرت امام حسین رضی کی یاد میں ابیات موزوں فرمائے جو کہ آپ کے رسالے میں "سر کیڈارو" کے موضوع سے موجود ہے۔ جو کہ آپ کا آخری کلام ہے۔

روایت ہے کہ آپ اکیس دن خلوت میں رہے اور یاد الٰہی میں گذارے۔ اس دوران آپ نے نہ کسی سے ملاقات کی اور نہ ہی اتنا کھایا۔ بائیسویں دن آپ نے غسل فرمایا، اور چادر اوڑھ کر مراقبہ میں بیٹھ گئے۔ فقیروں نے بدستور سماع کیا۔ کہتے ہیں کہ تین دن سماع ہوتا رہا۔ ایک عجیب اداسی کا عالم چھایا ہوا تھا۔ آخر کار جب سماع ختم ہوا۔ اور مریدوں نے شاہ صاحب کے نزدیک جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اس طرح ایک کامل ولی، عظیم انسان، سحر بیان شاعر اور مفکر اس فانی جہاں سے رحلت فرما گئے۔

ہر کہ زاد بنا چار بایدش نوشید۔

زجام دہر کل من علیہا فان

آپ کی وفات تاریخ چودھویں صفر ۱۱۶۵ھ مطابق ۲۔ جنوری ۱۷۵۲ء کے دن کو ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک ۶۳ سال کی تھی۔

آپ کے وصال پر ایک مرید جو اپنے دور کے فارسی زبان کے بڑے شاعر محمد پناہ رجا ٹھٹوی نے تاریخ وفات ابجد کے حساب سے اس طرح لکھی ہے۔

گفت این رجا مرید، سنہ ارتحال پیر

گردیدہ محو عشق، وجود لطیف میر

اس شعر کی دوسری مصرعہ سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ آپ کی درگاہ کے اندرونی دروازہ کی طرف ایک اور شعر لکھا ہوا نظر آتا ہے جس سے بھی آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے جو غالباً محمد پناہ رجا کے موزوں کئے ہوئے ہیں:-

زد نعرہ در فراق و دگر کردہ سینہ چاک

شد محو در مراقبہ جسم لطیف پاک - ۱۱۶۵ھ

ایک اور قطعہ روضہ کے جنوب میں مسجد کی دیوار پر کندہ ہے جس سے بھی آپ کی تاریخ وصال ۱۱۶۵ ہجری نکلتی ہے جو قطعہ کے آخر میں دو حروف "زوال حق" سے نکلتی ہے۔

شاہ صاحب ذوالمناقب سید عبداللطیف

آنکہ قطب وقت خود بوداست در مردان حق

چون ز جام از جوئی غفور نوش وصل شد،

گفت ملہم غیب سال رحلتش رضوان حق

۱۱۶۵ ہجری

آپ کے ایک معتقد شاعر شیریں کلام مرحوم سید غلام محمد شاہ گدا نے آپ کی تاریخ ولادت اس طرح موزوں کی ہے

گدا سال تولید سلطان "بھٹ"

شنیدم ز ہاتف عنایت شعار

۱۱۰۲ ہجری

آپ کے جسم مبارک کو آپ کی وصیت کے مطابق "بھٹ" پر دفنایا گیا۔ یہ مقام متصل کے شہر مرجع عام و خاص بن گیا۔ آپ نے سچ فرمایا ہے

ساري رات سبحان جاڳيو جن ياد ڪيو،

اُن ۾ عبداللطيف چئي مٿي لڏو مان،

ڪوٽڙين ڪن سلام آڻيو آسڻ اُن جي.

ساری رات جاگے اور سبحان رکھا جنہوں نے سانس میں

اُن کی مٹی عبداللطیف سمجھ پایا عزو شان

آکر کرے سلام صدہا ان مقام پر

۱؎ تذکرہ لطیفی "تاریخ ادبیات سندھ" مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی جلد اول صفحہ ۲۹۴۔

۲؎ شاہ لطیف (انگریزی) مصنف لیلارام وطن مل لالواڻي۔ صفحہ ۲ پر لکھتے ہیں۔

Over the same door, side by side with the above Couplet, there is another Couplet.

۳؎ مامی ابراہیم جلالی "لطائف لطیف" (فارسی) مصنف میر عبدالحسین خان سانگی صفحہ ۲۵ اور تاریخ تحفۃ الکرام مصنف میر علی شیر قانع صفحہ ۱۵۳

۴؎ "لطائف لطیف" مصنف میر عبدالحسین خان سانگی، صفحہ ۲۴۔ جناب کرامت مآب سید عبداللطیف نور اللہ ولادت مکان قریہ بھٹ پور ۱۱۰۲ ہجری مطابق ۱۶۹۰ء

آپ کی وفات پر صاحب تحفۃ الکرام نے لکھا ہے

روزے کہ ازیں سرا نقل فرمودہ در ماتمش جمعی از مریدان خاں داد رد مزار منیر کہ اس بران بہشت محبیب خاں با روح
و صفا است گنبد عالی بر فبرش بنا یافتہ و راجہ جیسلمیر نوبت بدر نمودہ صبح و شام درگاہش محبیب روح و سرور ح
و غریب صفا و حضور دارد اکنون سید جمال شاہ قائم مقام مخصوص بکرامات حق و جلی است و سلسلہ فقرا جد خلفا نامدار دارد ۔

"جس روز شاہ صاحب نے اس دنیا سے رحلت فرمائی، اُس دن اس عظیم سانحہ کے ماتم میں کئی مریدوں نے جانیں دے دیں۔ آپ کے مزار مبارک پر عالیشان گنبد بنایا گیا ہے۔ آپ کی مرقد مبارک معبرک اور محبوب مگدیہ روح و صفا سے معمور ہے۔ راجہ جیسلمیر نے بھی نذر کئے تھے جو صبح و شام بجائے جاتے ہیں۔ آپ کی درگاہ پر صبح و شام محبیب و دیرو رکیب رہتی ہے۔ اب سید جمال شاہ کرامات ولی کے سجادہ نشین ہیں شاہ صاحب کے سلسلہ فقراء میں چند نامور خلفا بھی ہیں"

آپ کے درگاہ کی عمارت اور قبہ، میاں غلام شاہ کلہوڑہ والی سندھ کے حکم سے ۱۱۵۴ھ میں تعمیر کی گئی۔ للالرام دلی مل اپنی تصنیف "شاہ لطیف" میں درگاہ کی عمارت کے مکمل ہونے کی تاریخ کتبہ کی صورت میں لکھی ہے جس سے ابجد کے حساب سے تاریخ ۱۱۶۷ھ برابر ۱۷۵۴ء نکلتی ہے۔ "IDAN" عیدن نامی کاریگر نے اس عالیشان قبہ پر کام کیا تھا، جو سید جمال شاہ سجادہ نشین کے زیر نگرانی تعمیر ہوا۔

سندھ کے بادشاہ غلام شاہ کلہوڑہ نے قبہ کو اتنا بلند بنوایا تھا، جو اپنے مرشد کے قبہ کا دیدار دور سے اپنی تخت گاہ سے کر سکیں۔ اس قبہ پر کاشی کی اینٹوں اور سنگمرمر سے کام کیا ہوا ہے۔ اس کے اندر عالیشان مسجد بھی بنائی گئی، جس پر بھی قبہ کی طرح خوبصورت کاشی اور سنگمرمر کا کام کیا ہوا ہے۔ قبہ کے مکمل ہونے کی تاریخ کا کتبہ اس طرح ہے۔

چون زدست حضرت سید جمال
شد بنائی روضۂ شاہ لطیف ۔
زائر آنجا جلوۂ حق دید و گفت
مرقد پر نور درگاہ لطیف ۔

تالپروں کے دور حکومت میں میر صاحبان نے بھی شاہ صاحب کی مزار مبارک کی مزید توسیع کرادی، خصوصاً میر نصیر محمد خان نے قبہ اور مسجد کی مرمت اپنے زیر نظر کرادی تھی۔ آپ کا ارادہ تھا، کہ مزار کے چاروں طرف پکی دیواریں بنائی جائیں، اور چاروں کونوں پر مینار بنوائے جائیں۔ لیکن یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ میر نور محمد خان تالپر نے قبہ کے سامنے ایک کنواں پانی کی فراوانی کے لئے بنایا۔ آپ کے چچازاد بھائی میر محمد خان نے درگاہ کا اندرونی دروازہ چاندی کا بنوایا، جو آج تک موجود ہے۔ دروازہ پر بہت سے فارسی اشعار کندہ کئے گئے ہیں۔

تاریخ تحفۃ الکرام مصنف میر علی شیر قانع صفحہ ۱۵۳ جلد سوم ۔

A well Known mason named "Idan" whose name appears there in legible character
"SHAH LATIF" by Lilaram Lalwani Page - 3.

کلہوڑہ کے دارالسلطنت مراد آباد تھی، لیکن دریائے سندھ کے گھیرے سے یہ شہر برباد ہو گیا۔ غلام شاہ نے محمد آباد نام دیکر آباد کیا۔ تاریخ سندھ مرتب غلام رسول مہر صفحہ ۵۳

شاہ لطیف مرتب لیلا رام لالوانی ۔

باب ششم

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شخصیت

(صورت ۔ سیرت اور مذہب)

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی باکیزہ زندگی پر نظر ڈالنے سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف باکمال شاعر اور مفکر تھے بلکہ ایک اعلیٰ انسان بھی تھے۔ آپ کا ہر فعل آپ کے قول کے مطابق تھا۔ آپ کے کلام میں جو ذرہ بھی موجود ہیں۔ اُن کے ہر جلوہ سے انسانیت کی برتری عیاں ہوتی ہے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ ایک شاعر کا کلام اُس کی زندگی کی تفسیر ہے تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ شاہ لطیفؒ انسانی زندگی کے اعلیٰ شارح تھے۔ آپ کے عظیم کردار کا اہم پہلو انسانیت کا احترام تھا۔

شاہ لطیفؒ کے بعض معاصر مورخ، اس حقیقت کو نمایاں طور پر لکھتے ہیں کہ وہ اپنے دور کے باکمال انسان تھے۔ آپ کے دل پر انوار الٰہی نے وہ نور پیدا کیا تھا جو ایک پیغام کی صورت میں آپ کے قلب کی گہرائیوں سے نکلا اور اُنہیں زندہ جاوید بناتا گیا۔ انسانیت کا احترام کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جيئن سودو سچ جي، ڏکر وطايو،
پرو لهر البشرا جي، اُنجن ۾ آيو
تن کي لاڻ لنگهايو، سانڍو سمونڊ جو
سردا سلڻ سچ کا، جنهون سنڌ ڀاڳا تهي۔
لهم البشرا، اُن کي حاصل حال هوا
محبوب ملي گيا، پار سمنڊ جو اُن کي۔

شاہ صاحب کے نزدیک انسانیت کا احترام مقصد اولین ہے۔ آپ نے حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی طرح بنی نوع انسان کو تصوف کی شاہراہ پر لے جانا چاہا۔ جو انسان کو امن و سلامتی، عشق اور محبت، دلسوزی اور جذبہ اصلاح کے کمال پر پہنچا دیتا ہے۔ اُنہوں نے انسانی تخلیق سے مراد، اپنے خالق سے وابستگی کو لیا ہے اور اس میں بے حد پختگی سے فرماتے ہیں:

اي نہ مارن مريت، جئين سيٺ مٽائين سون ۾۔
اچي عمر ڪوٽ ۾ ڪنڌس هاڻ هريت
پڪن جي پريت، ماڙين سين نہ مٽيان۔

یہ میرے عزیزوں کا رواج نہیں ہے کہ وہ اپنوں کو سونے پر بیچ دیں
اے عمر میں عمر کوٹ میں آکر یہ گندہ رواج قائم کرنا نہیں چاہتی۔
میں اپنی آبائی جھونپڑی کو تمہارے محل سے نہیں بدلوں گی۔

شاہ بھٹائیؒ نے ماڑی کی تمثیل میں اس دنیا کی افتادگی کو نہایت عارفانہ انداز میں بیان فرمایا ہے۔ عمر کوٹ کو اس دنیا سے مشابہت دی ہے جہاں ماڑی قید ہے۔ عارفوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ یہ دنیا "سجن المومنین" ہے۔ دنیا کے اندر آکر اپنے خالق کی بخشی ہوئی زینت و زیب کو مٹانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس حقیقت کا بار بار اعادہ کرتا رہتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ انسان کے حقیقی حسن کو اس طرح عبرتناک الفاظ میں بیان فرماتے ہیں

سوڻ وڃايم سومرا، ڀيرو منهن ٿيوم

ڏيئ تت پيوم ، جت هلڻ ناهه هُن ري

سومرو ، جهان جيئن اپڻ هن کو پامال کيا هه ، ڀيرڪ صورت بگڙ گئي ،

هه تو اس جگه جانا هه جهان ، هن کے بغير چلنا مشکل هه ،

قرآن پاک کا بهي يهي ارشاد عالي هه "لقد خلقنا الانسان في احسن تقويم ، ثم رددناه اسفل السافلين" هم نے انسان کو نهايت عمده طريقه سے خلق فرمايا هه ليکن وه انصاف ديني مين جاگرا" حضرت شاه عبد اللطيف بهٹائي نے بهي انسانيت کي اس حقيقت کو پيش کيا هه ، جس مين ان کي شخصيت نمايان طور پر ظاهر هوتي هه ، يه حقيقت کتني عجيب هه که جهان هن کے بغير چلنا مشکل هه ، اور ايک انسان کو نيک اعمال کے بغير کوئي چاره کار نهين ، وهان گندي صورت کے ساتهه ماڻهو بڑي محبوب جانتے هين ، دنيا مين وه انسان کامياب هه جس کي عاقبت بالخير هو جائے ، اس دوران زندگي کے لئے عمل کي ضرورت هه ، اس عمل کي تلقين اور مکارم کے ذکر سے پورا رسالہ بهرا پڑا هه ، فرماتے هين ،

هيڏانئا هيني تو نه قبنديون ڳالهيون

سهيون لڙيون سمجهين ، پو مُکان ڏيئي

ميان ڀيني ، پار پهتنه ۽ خبرون :

اے ناخدا تجهه يه دونوں باتيں کہاں نصيب هوگئيں که پتوار (مکان)

کے نزديک پوري رات آرام سے سوئيں اور کنارے پر سلامتي سے پهنچنے کي اميد

رکهيں ، جب تک تم بيدار نهين هوگے تب تک تمهارا مرکز پر پهنچنا مشکل هے ،

علامه اقبال نے بهي اس عمل مين فرمايا هه ،

عمل سے زندگي بنتي هه ، جنت بهي جهنم بهي ،

يه خاکي اپني فطرت سے ، نه نوري هه نه ناري هه ،

وه انسانيت سے پيار کرنے والے تهے صلح کل کا پيغام ديتے تهے ، اور دشمن سے بهي نيکي کرنے کي ترغيب ديتے تهے ، فرماتے هين ،

هڏ چوي تون نه چوڻ ، ڏاتون ڏاڙي ،

اڳه اگرائي ڪري ، خطا سو ڪاڻي

پاڻ ڏي پاڻي ، ڏيو ڪينه وارو ڪينڪي ،

اگر کوئي تجهه برا کہے تو اس کے بدلے مين تو برا نه کہه

جو شرو مات کرے گا ، وهي خطا کهائے گا

جس کے دل مين کبر و کينه هوگا ، اس کا وجود نه هوگا ،

کتني عمل تعليم هه ، يهي عملي اسباق اس بے مثل مخلوق سے حاصل هوتے هين ، آپ کے کلام مين واردات قلبي کا ذکر بکثرت موجود هے ، جن مين انسان احترام بڑي سادگي سے پيش کيا هه ، يه حقيقت هه که آپ کے کلام کا مطالعه کرنے والا آپ کے روحاني فيضان مين گم هو جاتا هے ، ايک جگه فرماتے هين ،

روزا ۽ نماز ، اي پڻ چگو حکم

تو هو ڀيو فهم ، جنهن سان پڻ برڻ کي ،

یہ ابنائے آدم بنی نوع انسانیت کا احترام ہے۔ اس کے حاصل ہونے سے انسان قرب الٰہی کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ علم الاخلاق کے رہبروں نے انسانیت کے لافانی کردار کو دیکھا ہے۔ شیخ سعدی رحمت اللہ علیہ نے سچ فرمایا ہے:۔

عبادت بجز خدمت خلق نیست

بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

یہ وہ زندہ جاوید پیغام ہے جس کے باعث شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اس زمین کے ہر باشندہ کے دل و دماغ پر ملائکی مذہبی تعریف و امتیاز کے بھائے ہوئے ہیں اور ہمیشہ چھائے رہیں گے، جب کسی کے دل میں احترام انسانی جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس میں وہ سب صلاحیتیں خود بخود آ جاتی ہیں، جو ایک صالح معاشرہ کے لئے ضروری ہے۔ یہ شخص صالح بن جاتا ہے یہی خصوصیتیں شاہ لطیف بھٹائیؒ کے عظیم کردار میں غالب نظر آتی ہیں فرماتے ہیں:۔

کم کمندن کیتو جاڑیو جوڑن،

چکیونا چوندن، جوجو ساءُ صبر جو۔

صبر کرنے والا جیتا، اور جلد باز نے ہارا

اور وہ صبر کی لذت سے واقف نہ ہو سکا۔

انسان کو انسان سے نفرت اور حقارت کو دیکھ کر اس طرح تلقین فرماتا ہے:۔

دگر ھیو وتن، پرت نہ چھنن پاڻ ۾۔

پسو پکھیڑن، ماڻھوان ھیٺ گھڻو۔

پرندوں کی محبت کو دیکھو، وہ کس طرح آپس میں محبت سے رہتے ہیں

ان میں انسانوں سے زیادہ محبت پائی جاتی ہیں۔

اپنے اشعار اور شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں نصیحتیں موجود ہیں وہ خود صالح تھے اور خود اس پر عامل تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اس دنیا کے رہنے والوں کو حرص کے پرخار وادیوں سے نکال کر امن و سلامتی کی راہ پر لے جائیں جو اسلام کا زریں اصول ہے، وہ وقت دور ہیں کہ شاہ صاحب کی نصیحت کا لافانی اثر پوری دنیا کو اپنے آغوش میں لے لیگا۔ حافظ شیرازیؒ سچ فرماتے ہیں:۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

آپ کی زندگی کا پورا کردار اپنے آپ کے اخلاق کا بیان دیتا ہے۔ تواضع اور انکساری اگرچہ دیکھنے میں نہایت کمزور ہے اور برداشت کرنے کے قابل ہیں لیکن ایک سچے مردِ مومن کے مردانگی کی یہ نشانیاں ہیں۔ یہی سبب ہے کہ شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں انابت کی تعریف کا پیغام ملتا ہے جو کہ آپ کی زندگی کا پورا آئینہ ہے فرماتے ہیں:۔

اندر آئینو کری، پرین سو پیچ۔

اِنھیءَ راہ رہیچ، تہ شاھدو ماڻیئن۔

اندر آئینہ کی مانند کر تو اس محبوب کا دیدار ہو۔

اس راہ پر چلو گے تو ان کا مشاہدہ پاؤ گے۔

شاہ صاحب کی زندگی بیحد سادگی سے گذری۔ ان کی نشست و برخاست بھی سادہ تھی۔ خدا تعالیٰ کی عبادت و ریاضت آپکی زندگی کا خاص مشغلہ تھا۔

شاہ بھٹائیؒ ایک پاکباز اور عبادت گذار انسان تھے، مردانہ حسن کے پیکر، موزوں قد کے شکیل، جمیل شخصیت کے مالک تھے، پاکبازی

اور ریاضت سے اُن کے جسم میں حقانی جلوہ کا نور شامل ہوگیا تھا۔ قوت اور ہمت والے تھے، خلیق نرم دل، پرمحبت و شیریں گفتار تھے۔ آپ کی آنکھیں عشق الٰہی کے نشے سے سرشار اور مخمور رہتی تھیں۔ آپ کی پیشانی ہر وقت درخشاں رہتی تھی۔ ہر کشادہ تھی۔ جس پر خدا نما نور تھی۔ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کسی عمیق خیالات میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور جس سے عظمت و فضیلت کی مرغوب کن کیفیت، جو برگزیدہ انسانوں میں ہوتی ہے۔ وہ نمایاں تھی۔ خلق خدا کے ساتھ ہر وقت پیش آتے تھے۔ کبھی کسی کو کوئی کدورت نہ پہنچائی۔ آپ کے مزاج میں سوز و گداز تھا۔ دکھی اور غمزدہ انسان کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے تھے کسی کی تکلیف کو برداشت نہ کرتے تھے۔ جاہ و جلال شان و شوکت سے دور رہتے تھے۔ بلکہ اس سے نفرت کرتے تھے۔ سراسا میں اس کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں۔

سرمو سیاهیٔ چو تهنوں کی سرهاء
کاپی کاڑائی جی، مڑی تی ڈی پاء
اکیں جی انکهاء، لالائی لالن جی،

سُرمہ کی سیاہی، عورتوں کی انکھوں میں جچتی ہے
مرد ہو کر انکھوں میں، سرمہ کی کالی سلائی مت لگا
اپنی انکھوں میں حقیقی محبوب کی صرف پیدا کر۔

آپ کا سینہ کشادہ اور بازو مضبوط تھے۔ ریش مبارک تراشیدہ اور بھری ہوئی تھی۔ جسم مبارک ہمیشہ ذکر خدا سے گرم رہتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت۔ اکثر اوقات گیروئے رنگ کی کفنی پہنتے تھے۔ سر پر صوفیانہ وضع کی اُلٹی لمبی ٹوپی اوڑھتے تھے۔ ہاتھ میں عصا رہتا تھا۔ آپ کے پاس ایک موٹی دانوں والی تسبیح ہوا کرتی تھی۔ جس سے ذکر خدا میں مشغول رہتے تھے۔ فقیروں کی نشانی ایک کشکول بھی تھا۔ یہ سب چیزیں اب بھی بھٹ شاہ میں محفوظ ہیں جو "گنج" کہتے ہیں۔ آپ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ زہد و تقویٰ آپ کی زندگی کا عین مقصد تھا۔ دراصل شاہ لطیف کو بچپن سے ہی ایسا ماحول میسر ہوا تھا۔ اور اپنے حال میں مستغرق رہتے تھے۔ دوسرے بچوں کے برعکس کھیل کود سے کنارہ کش رہتے تھے۔ شاہ "ثانی" کی شخصیت اور فکر پر اس ماحول کا بڑا اثر ہوا تھا۔ بزرگی، عزت اور عظمت آپ کے خاندان سے ہی حصہ میں تھی۔ عظیم المرتبت خاندان سادات کے رکن تھے۔ آپ کے جد امجد حضرت شاہ عبدالکریم بلڑی سندھ کی شاعری کے علم بردار تھے۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت شاہ حبیب ایک صوفی درویش تھے۔ فارغ البال ہونے کے باوجود کفر نفس مزاج رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ بڑی نیک سیرت تھی۔ وہ سندھ کے ایک برگزیدہ چشتی مخدوم عربی دہانی کے خاندان میں سے تھی۔ مخدوم عربی دہانی بقول مصنف "الف اللائی" حضرت مخدوم نوح کے استاد اور ہمعصر تھے۔ آپکا مزار حالا میں واقع ہے۔ شاہ لطیف" کا بچپن اپنی والدہ ماجدہ کی پر شفقت آغوش میں اپنے گاؤں میں گزرا۔ آپ کو والدہ کی نیک صحبت سے اخلاق اور نیکی علم و تحمل، عزت و شرافت، حب الوطنی، اور خلق خدا سے ہمدردی کے پاکیزہ اسباق ملے جس کی وجہ سے آپ کی شخصیت کو انسانیت کے معراج پر پہنچایا۔ شاہ لطیف کا کلام آپ کی سیرت کا آئینہ ہے۔ آپ اپنے کلام کے مجسم تھے۔ آپ کا اصول ہر حال میں تواضع و انکساری تھا۔ فرماتے ہیں۔

سو نہ کنس شئ میں، جیکی منجی تراب

جو کچھ خاک میں موجود ہے، وہ کسی اور چیز میں نہیں ہے۔

شاہ صاحب نہ صرف خود سادگی سے رہتے تھے بلکہ اپنے عقیدتمند دوست اور مریدوں کو بھی سادگی سے زندگی بسر کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ خدا کی ذات اقدس اور اس کی حقیقت کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لئے جس راہ عمل کو اپنایا۔ اس میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ اپنی فقیرانہ زندگی میں وہ کچھ حاصل کیا جو اس وقت بادشاہوں کو حاصل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ آج صدیاں گزرنے کے بعد بھی لوگ اُنکے نام سے عقیدت رکھتے ہیں۔

اور ریاضت سے اُن کے جسم میں خدائی جلوہ کا نور شامل ہوگیا تھا۔ قوت اور ہمت والے تھے، خلیق نرم دل، شیریں گفتار تھے۔ آپ کی آنکھیں عشق الٰہی کے نشے سے سرشار اور مخمور رہتی تھیں۔ آپ کی پیشانی ہر وقت درخشاں رہتی تھی۔ ہر کشادہ تھی۔ جس پر ضمانت تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی عمیق خیالات میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور جس سے عظمت و فضیلت کی مرغوب کن کیفیت، جو برگزیدہ انسانوں میں ہوتی ہے۔ وہ نمایاں تھی۔ خلق خدا کے ساتھ ہر وقت ہمدرد رہتے تھے۔ کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی۔ آپ کے مزاج میں سوز و گداز تھا۔ دکھی اور غمزدہ انسان کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے تھے کسی کی تکلیف کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ جاہ و جلال شان و شوکت سے دور رہتے تھے۔ بلکہ اس سے نفرت کرتے تھے۔ سراسامی، اس کا دل دنیا سے فرماتے ہیں۔

سرمو سیاھی جو زنن کی سرھاء

کاپی کاپائی جیب مژمن تی ھئ پاء

اکیس جہ انکھاء لالائی لان جی۔

سُرمہ کی سیاہی، عورتوں کی آنکھوں میں جچتی ہے

مرد ہو کر آنکھوں میں، سرمہ کی کالی سلائی مت لگا

اپنی آنکھوں میں حقیقی محبوب کی سرخی پیدا کر۔

آپ کا سینہ کشادہ اور بازو سڈول اور مضبوط تھے۔ ریش مبارک تراشیدہ اور بھری ہوئی تھی۔ جسم مبارک ہمیشہ خوف خدا سے لرزتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت، اکثر اوقات گیروے رنگ کی کفنی پہنتے تھے۔ سر پر موفیانہ وضع کی اُونچی ٹوپی اوڑھتے تھے۔ ہاتھ میں عصا رہتا تھا۔ آپ کے پاس گندھے موتی دانوں والی تسبیح ہوا کرتی تھی۔ جس سے ذکر خدا میں مشغول رہتے تھے۔ فقیروں کی شان ایک کشکول ہی تھا یہ سب چیزیں اب بھی بھٹ شاہ میں محفوظ ہیں جو کہ گنج کہتے ہیں۔ آپ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ زہد و تقویٰ آپ کی زندگی کا عین مقصد تھا۔ دراصل شاہ لطیفؒ کو بچپن سے ہی ایسا ماحول میسر ہوا تھا۔ اور اپنے حال میں مستغرق رہتے تھے۔ دوسرے بچوں کے برعکس کھیل کود سے کنارہ کش رہتے تھے۔ شاہ صاحبؒ کی شخصیت اور فکر پر اس ماحول کا بڑا اثر ہوا تھا۔ بزرگی، عزت اور عظمت آپ کے خاندان سے ہی حصہ میں تھی۔ عظیم المرتبت خاندان سادات کے رکن تھے۔ آپ کے جد امجد حضرت شاہ عبدالکریم بلڑی سندھ کی شاعری کے علم بردار تھے۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت شاہ حبیب ایک صوفی درویش تھے۔ فارغ البالی ہونے کے باوجود کنز نفس مزاج رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ بڑی نیک سیرت تھی۔ وہ سندھ کے ایک برگزیدہ ہستی مخدوم عربی دہانی کے خاندان میں سے تھی۔ مخدوم عربی دہانی بقول مصنف "الف الالف" حضرت مخدوم نوح کے استاد اور ہمعصر تھے۔ آپکا مزار ہالا میں واقع ہے۔ شاہ لطیفؒ کا بچپن اپنی والدہ ماجدہ کی پر شفقت آغوش میں اپنے گاؤں میں گزرا۔ آپ کو والدہ کی نیک صحبت سے اخلاق اور نیکی، علم و تحمل، عزت و شرافت، حب الوطنی، اور خلق خدا سے ہمدردی کے پاکیزہ اسباق ملے جن کی وجہ سے آپ کی توجہ کو انسانیت کے معراج پر پہنچایا۔ شاہ لطیفؒ کا کلام آپ کی سیرت کا آئینہ ہے۔ آپ اپنے کلام کے مجسمہ تھے۔ آپ کا اصول ہر حال میں تواضع و انکساری تھا۔ فرماتے ہیں۔

سو نہ کنھن شئ جے جیکی منجھ ترابے

جو کچھ خاک میں موجود ہے۔ وہ کسی اور چیز میں نہیں ہے۔

شاہ صاحب نہ صرف خود سادگی سے رہتے تھے بلکہ اپنے عقیدتمندوں اور مریدوں کو بھی سادگی سے زندگی بسر کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ خدا کی ذات اقدس اور اس کی حقیقت کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لئے جس راہ عمل کو اپنایا۔ اس میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ اپنی فقیرانہ زندگی میں وہ کچھ حاصل کیا جو اس وقت بادشاہوں کو حاصل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ آج صدیاں گذرنے کے بعد بھی لوگ اسکے نام سے عقیدت رکھتے ہیں۔

مذہب

انسان کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے، ابتدائے آفرینش سے بنی نوع انسان نے جو طریقے، آج تک اختیار کئے ہیں۔ اُن میں مذہب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مذہب کی وجہ سے انسان میں اتحاد اور ترقی کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ مذہب کے ذریعے انسان معراج پر پہنچتا ہے۔ اور اس کی عدم موجودگی میں پستی میں جا گرتا ہے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے مذہب بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ جسے ہر شخص اپنی اپنی بصیرت کے مطابق دیکھتا ہے۔ اس ضمن میں فرماتے ہیں۔

عورتین جیا ٹون، تنھن جون لکن لک هزار

جیئ سپکنھن جیئ سین، درشن ڈاریون ڈار

— — پریم تنھنجا پاسے، عمرا چئي عمرا چوان۔

تیری عظمت و شان کی تعریف ہزاروں انسان لاکھوں طریقوں سے کرتے ہیں۔

ہر ایک نے تیرا دیدار مختلف طریقوں سے کیا ہے

اے میرے محبوب تیری نشانیوں کی تعریف کس کس طرح کروں۔

شاہ لطیفؒ مذہب اسلام پر سختی سے پابند تھے۔ آپ کی پوری زندگی یاد الٰہی میں گذری۔ آپ کے حالات زندگی اور کلام سے ایسی کسی بھی بات کا اشارہ یا ذکر ہی ملتا کہ آپ صبر و بردباری میں پھنس کر غلط راہوں پر چلے گئے ہوں۔ آپ اپنے بزرگوں کے طریق یعنی مسلک اہل سنت کے پیرو تھے اگرچہ آپ کے مذہبی حالات پر کوئی اپنی طرف سے رائے قائم کرتا ہے تو یہ بعد از قیاس ہوگی۔ آخر شاہ صاحب کس بنا پر اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلنے سے گریز کرتے۔ جب کہ آپ نے اپنے والد حضرت سید حبیب شاہ کے ہاتھ پر بیعت فرمائی تھی۔ شاہ صاحب پر تحقیق کرنے والوں نے آپ کے مذہبی عقیدت کے متعلق کافی بیان میں یہ ثابت کیا ہے کہ آپ سُنی المعتقد تھے۔ اور عاشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ شاہ لطیفؒ کی سیرت اور زندگی کا سب سے زیادہ اور نمایاں قدر وصف، جذبہ عشق رسول صلعم ہے۔ ذات رسالت مآب کے ساتھ عشق جنون کی حد تک تھا۔ آپ کے کلام میں جذبات کی شدت اور وقت طاری ہونے والی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جس طریقے سے آپ نے حضور صلعم کا ذکر کیا ہے اس کو پڑھنے سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

حضور رسول صلعم کے ذکر سے آپ کا پورا رسالہ بھرپور ہے۔ فرماتے ہیں۔

کٹي نيٺ خمار مان، جان عياڻون نازنظر۔

سورج شاخون هڪيون ڪماڻو قمر۔

تارا ڪتيون تائب ٿيا ديکيندي دلبر۔

جهڪو ٿيو جوهر جا ٿب جي جمال سين۔

جب میرے محبوب نے اپنی خمار آلودہ نگاہوں کو اٹھا کر دیکھا، تو سورج نے اپنی روشنی بوجہ شرمندگی چھپالی اور چاند کی روشنی بھی مدھم پڑ گئی۔ ستارے بھی میرے محبوب کو دیکھ کر تائب ہو گئے۔ اس جہان کا جوہر میرے محبوب کے حسن و جمال سے جھک گیا۔

دوسری جگہ اپنی عقیدت اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

وحده لاشريک له، جان تو چئين اين

تاڻيج محمد صادق، نرئون منجهان نيه

تان توں وڃئون ڪين ناٿين سر بين ڪي

ترجمہ

وحدہ لا شریک لہ ، اگر یہ کہتے ہو تو

اس جہاں کو پیدا کرنے کا سبب محمد صلعم کو دل کی گہرائیوں سے مانو

تو پھر تو کس طرح غیر کے آگے اپنا سر جھکائے گا ۔

جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اتنے مخصور تھے ، تو کیا آپ حضور کے ہر قول مبارک کے پیرو نہ ہونگے ۔ حضور صلعم سے نسبت کی سبب آپ اصحاب کرام سے بھی بیحد محبت رکھتے تھے ، اس ضمن میں فرماتے ہیں ۔

جوڑي جوڙ جهان جي ، پاڻ هيائين پرواز ۔

حامي ، هادي ، هاشمي ، سردارن سردار

سُنهي سحابن سٽ ۾ ، منجهه مسجد مٿيادار

چارئي چڱا چوڌار ، ڏٺا ميعاندي حبيب سين ۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس جہان کے جفت کو پیدا کیا ، اور اس پر خود پرواز کیا ۔

ہمیں ، حامی ، ہادی ، ہاشمی ، اور سرداروں کے سردار کو ، دیا ۔

آپ مسجد کے اندر اپنے اصحاب کے ساتھ بہت اچھے لگتے ہیں ۔

چاروں اچھے دوست اپنے حبیب کے گرد رہتے تھے ۔

مالک حق اور خالق رسول کو حضور صلعم کے دوستوں سے محبت ، ایمان کی نشانی سمجھتے ہیں ۔ جس نے آپ کے دوستوں سے عداوت رکھی اُس کے ایمان میں خلل ہے کیوں کہ خوب کے دوست بھی محبوب ہوتے ہیں ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی ہے اصحاب کی پیروی کرو ، ارشاد ہے ۔

اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم ۔

میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں جسکی بھی پیروی کروگے تو ہدایات پاؤگے ۔

قرآن حکیم کے بعد دوسرا درجہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت واحادیث کا ہے ، آپ نے حقائق خفائق کو آشکا فرمایا ، ورنہ شاید ربوبیت کے راز کی بھی پردہ نہ اٹھتا ، ارشاد ربانی ہے ۔

کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اُعرف فخلقت الخلق لاعرف ۔

" میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا ، خواہش ہوئی کہ اپنے آپ کو ظاہر کروں اسلئے میں نے خلق کو پیدا کیا "

حدیث میں آتا ہے کہ

" علیکم بسنتی وسنت الخلفاء الراشدین من بعدی " ۔

" میرے طریقہ اور میرے خلفاء الراشدین کے طریقہ کی پیروی کرو ۔ "

عبداللطیف بھٹائی کے مذہب کے متعلق مرزا قلیچ بیگ نے اپنی تصنیف " احوال شاہ عبداللطیف " میں لکھا ہے کہ شاہ صاحب کا مذہب کیا ہی پیچیدہ اور الجھا ہوا تھا تو ہی اُن کو پسند تھا ، سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہب کی معنی ہی پیچیدگیوں سے پاک ، مذہب تو رشد اور ہدایات کا واحد طریقہ ہے پھر اس میں پیچیدگی کا

---

۱ تیسیر الباری صحیح البخاری مترجم جناب مولانا مولوی وصیف الزمان صاحب ، ملک سراج الدین اینڈ سنز ۔

۲ احوال شاہ عبداللطیف مرتبہ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ مرحوم

کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صوفیوں کا مذہب تو اظہر من الشمس کی طرح ہوتا ہے۔ لیکن کسی الجھن کی وجہ سے یہ ثابت کرتا ہے کہ شاہ صاحب کا مذہب صوفیانہ اور عام خاص کی سمجھ بالا ہے

مولانا دین محمد وفائی لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کا مذہب صوفیانہ تھا۔ وہ نہ متعصب رنگ کے سخت گیر مذہبی تھے، اور نہ ہی مذہبی اصولوں سے بے پرواہ تھے، اور اس طرح لکھتے ہیں[1]

"روایت ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی چاروں اصحاب اور پنج تن پاک کے ماننے والے تھے"

ڈاکٹر گرمکھانی اس بات سے انکار نہیں کرتے۔ اپنی تصنیف مقدمہ اللطیفی میں اس طرح تحریر کرتے ہیں۔

"روایت ہے شاہ عبداللطیف بھٹائی لیف آباد اعداد کی طرح سنی مذہب کے تھے۔ لیکن بعض امور میں آپ کی روش شیعوں جیسی تھی۔ آل رسول سے محبت رکھتے تھے۔ اپنے کلام میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور امام پاک کی طرف خاص اشارہ کئے ہیں۔ "سرکیڈارو" تو پورا کا پورا امامین کی شہادت کے ذکر سے بھرپور ہے۔

ڈاکٹر گرمکھانی ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو مذہب اسلام کے عقائد سے اتنی واقفیت نہ تھی۔ کسی مسلمان کو امامین سے محبت رکھنے کی وجہ سے اسے مذہب سے خارج سمجھا جائے یا اسے اہل تشیع میں سے خیال کیا جائے یہ غلط ہوگا۔ کیوں کہ اہل تشیع کی طرح اہل سنت و جماعت کے یہاں بھی امامین حابرین کی محبت ایمان کا ایک رکن ہے۔ امامین حابرین، دین اسلام پر قربان ہوئے تھے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس عظیم سانحہ پر شہداء کربلا کا ذکر رنج و غم سے ساتھ قربان کر آنسو بہائیں۔ مگر ذرا بہت افسوس کہ ساتھ کرنا یا "سرکیڈارو" میں شہداء کربلا کا ذکر کرنا یا مرثیہ پڑھنے سے ان کو شیعہ کہنا غلط ہے۔ شاہ صاحب عاشق رسول صلعم اور اصحاب کرام کے عقیدت سے متعرف تھے۔ قرآن کے مطابق شاہ بھٹائی نماز پنجگانہ اور تہجد پابندی سے ادا کرتے تھے۔ اور بکثرت وظیفہ پڑھتے تھے۔ آپ قائم اللیل تھے۔ سال بھر روزے رکھتے تھے۔ تسبیح و تحلیل آپکا معمول تھا۔ یہ روایت ہے کہ قرآن پاک ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا تھا۔ جسے اکثر اوقات میں تلاوت فرماتے رہتے تھے

ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے نے بھی لکھا ہے کہ شاہ بھٹائی اہل تشیع تھے جو کہ انہوں نے "سرکیڈارو" لکھا ہے، اور آخر عمر میں کربلا چلے جانے والے تھے اور یہ بات یہ ہے کہ آپ کی اولاد اب تک شیعہ مسلک پر کاربند ہیں۔ ڈاکٹر سورلے نے ڈاکٹر گرمکھانی کی تنقید میں یہ خیال آرائی کی ہے "سرکیڈارو" کے متعلق علماء کے درمیان بڑی بحث چلی تھی۔ اور کہا جاتا تھا کہ یہ ابیات شاہ لطیف بھٹائی کی نہیں ہیں۔ علامہ آغا آزاد قاضی مرحوم نے تو اس سرکو اپنے تالیف کردہ رسالہ میں نکال دیا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ "سرکیڈارو" کے ابیات کسی اور شاعر کے ہیں غالباً امان لاشعاہ نے لکھے ہیں۔ لیکن اس پر بڑی تحقیق کے بعد یہ ثابت ہوا ہے کہ "سرکیڈارو" شاہ صاحب کا کلام ہے ڈاکٹر نوبو مرحوم کی رائے موجب یہ ابیات شاہ بھٹائی کے ہی ہیں۔ ڈاکٹر گرمکھانی نے اپنی تحقیق کی بنیاد پر "سرکیڈارو" کو شاہ صاحب کا کلام تسلیم کرتے ہیں اور اسے اپنے رسالہ میں شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ کربلا کے واقعہ کا ذکر بھی کیا ہے۔

اس بحث پر سندھ کے فاضل ادیب مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی کی رائے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

"سرکیڈارو شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام ہے۔ امان لاشعاہ کا کلام اپنی جگہ پر ہے اور شاہ صاحب کا کلام اپنی جگہ پر ہر ایک میں اپنی فکر کی علیحدہ ندرت موجود ہے۔ "سرکیڈارو" کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ شعر کی مشہور صنف کو کمال پر پہنچایا ہے۔ حملہ آوروں کا مقابلہ، جنگ کے میدان کا نظارا، شہیدوں کا انتظار، یہ وہ مناظر ہیں جن کو ہمارے فکر شاعر نے اس سوز گداز اور جوش سے بیان کیا ہے کہ وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ امان لاشعاہ کا تخیل اس بلندی تک نہیں پہنچ ہی سکتا۔ عربی کا مشہور قول ہے۔

"خذ ما صفا ودع ما کدر" ہم نے صفائی کو لیا ہے کدورت کو چھوڑ دیا ہے"

---

[1] لطف اللطیف مرتب مولوی دین محمد وفائی مرحوم

مقدمہ اللطیفی ڈاکٹر گرمکھانی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے مرید :-

شاہ بھٹائیؒ کے روحانی فیض نے پورے سندھ کو عموماً اور اُنکے ارادتمندوں کو خصوصاً اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ ان میں سے اکثر مرید باکمال بزرگ و ذاکر تھے جن کی سخن فہمی کی خوشبو سے پوری سندھ کی فضا معطر ہوگئی تھی۔ آپ کے مریدوں کا سلسلہ بہت طویل تھا، جس کا ذکر اُپر آچکا ہے۔

شروع جوانی کے زمانے میں آپ نے اپنا وقت سیر و سیاحت میں گذارا، وطن واپس ہونے کے بعد "بھٹ" کو آباد کیا۔ اس وقت سے آپکے مریدوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ "بھٹ شاہ" میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد ہزاروں لوگ شاہ لطیف بھٹائیؒ سے باطنی سکون اور ظاہری پاکی حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوجاتے تھے۔ اور فیض حاصل کرنے کے بعد آپ کے گرویدہ ہوجاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب کوئی نیا مرید آپ کے عقیدتمندوں میں داخل ہوجاتا تھا تو پہلے آپ اُس کو ایک مصلیٰ اور پانی کا کوزہ دیتے تھے کہ تنہائی میں بیٹھکر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہتا تھا۔ اگر وہ شخص آپ کی کسوٹی پر مکمل طور پر پورا اُترتا تھا تب وہ مریدوں کے حلقے میں داخل ہوجاتا تھا۔ اس طرح آپ کا فیض عام ہوتا گیا۔ آپ ہمیشہ یہ تلقین فرماتے تھے۔ فوراً کھانا، کم سونا، کم بولنا، اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنا، دوسروں سے خلوص کا برتاؤ کرنا، ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہنا۔

شروع میں مریدوں کو اپنے قادریہ کریمہ طریقہ کے وظائف پڑھنے کی ہدایات فرماتے تھے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تھا، جو کہ آدھی رات کو مریدوں کو کیا کرتے تھے۔ وظیفہ کی ترتیب تھی، اللہ ھو، اللہ۔ اللہ۔ ھو۔ ھو۔ یہ وظیفہ آپ نے جدامجد حضرت شاہ عبدالکریم بلڑی کا دیا ہوا تھا جو آپ نے بھی قائم رکھا تھا۔ کبھی بے خودی کے عالم میں مریدوں کی استدعا پر ان کو اس طرح تلقین فرماتے تھے: "پاک اپنے دل کے آئینہ کو صاف کریں۔ ان میں خود بخود حسن ازلی یا نور الٰہی کی تجلی کا پرتو حاصل کرو گے۔ اللہ تعالیٰ جانتا اور دیکھتا ہے۔ اپنے بندے کی نیت سے واقف ہے اور وہ کبھی بھی نا امید نہیں لوٹاتا۔ اکثر مرید آپ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے جن کا ذکر اسطرح ہے۔

بھٹ فقیر :- آپ کے حلقہ مریدی میں سب سے زیادہ قریب بھٹ فقیر تھے، جنہوں نے شاہ بھٹائیؒ کی زندگی کو اچھی طرح دیکھا، وفات کے بعد شاہ صاحب کے کپڑے اور دیگر چیزیں انکے پاس رہتی تھی، جن کو شاہ بھٹائیؒ نے استعمال کیا تھا۔ شاہ صاحب کے سجادہ نشین کے مقرر کرنے اور اُن کو شاہ صاحب کی خلعت پہنانے کا شرف ان کو ہی نصیب ہوا۔

مخدوم نورمحمد وائی :- وہ بزرگ تھے جو شاہ صاحب کے پہلے استاد تھے۔ جنہوں نے آپ کو شروع میں "الف۔ ب" پڑھائی تھی، جس سے شاہ بھٹائیؒ نے "ب" پڑھنے سے انکار کیا تھا۔ یہ صاحب حال کے بھٹی بزرگوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جو وائی کے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ جہاں سے ہجرت کرکے بھٹ شاہ میں سکونت اختیار کی تھی، اور شاہ صاحب کے ارادتمندوں میں شامل ہوگئے تھے۔ آپ کی اولاد میں سے ایک بزرگ میاں احمد وائی اپنے وقت کے بڑے صوفی اور عارف تھے۔

اٹل اور چنچل :- یہ دونوں مشہور عامر موسیقی تھے جو دہلی شہر کے مشہور موسیقار کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور شاہ صاحب کے خاص مصاحبین کی حیثیت سے رہا کرتے تھے۔ یہ موسیقار ہندوستان سے میاں نور محمد کلہوڑہ کے دربار کی تعریف سن کر آئے تھے لیکن شاہ بھٹائیؒ کی صحبت میں رہکر ہمیشہ آپکے گرویدہ ہوگئے تھے۔ شاہ لطیفؒ کے دربار میں سماع کی محفلیں جاری رہیں۔ سندھی موسیقی کے ساتھ، ساتھ ہندی اور فارسی موسیقی کی جھلکیاں بھی پیش کرتے تھے جس کی وجہ سے شاہ بھٹائی ہندی موسیقی سے بہت متاثر ہوگئے تھے۔ شاہ لطیف بھٹائیؒ کے رسالہ میں، ہندی موسیقی کے مطابق سر منظم کئے ہیں۔ سر سورٹھ، سر کلیان، سر سیمی کلیان، سر حسینی، سر دیسی، سر بلاول وغیرہ ہندی موسیقی کی علم الاصنام کے موجب دیپک راگ ہے۔ اور سر سارنگ بھی موجود ہے۔ شاہ صاحب ان دونوں موسیقار کی عزت کرتے تھے۔ یہ دونوں ہمیشہ شاہ لطیف بھٹائیؒ کی خدمت میں رہتے تھے اور شاہ صاحب کے آخری دم تک ساتھ دیا۔

۱؎ لطیف مرتب مرحوم مولوی دین محمد وفائی صفحہ ۱۴۔

۲؎ ایضاً " " " "

۳؎ شرح لطیفی مصنف مرحوم محمد بخش واصف۔

فقیر محمود شاہ :- فقیر محمود شاہ کا درجہ سب مریدوں میں افضل تھا۔ یہ درویش شاہ بشاش کے محبوب مریدوں میں سے تھے۔ وہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے اپنی پوری مملکت کو چھوڑ کر تارک الدنیا بن کر ایک کوزا پانی کا لے کر آپ کی مریدی میں شامل ہوگیا۔ شاہ بشاش کے دل میں اُن کے لئے بڑی عزت تھی۔ انہوں نے شاہ صاحب کی زندگی میں وفات کی تھی۔ جس پر شاہ صاحب کو بیحد صدمہ ہوا تھا۔ بھٹ شاہ میں اُنہیں دفن کیا گیا۔ شاہ صاحب نے وصیت فرمائی تھی۔ کہ میری لحد درویش محمود شاہ کے پاؤں کی طرف کریں۔

میاں محمد عالم شاہ :- یہ درویش شاہ بشاش کی والدہ صاحبہ کا بھتیجا تھا۔ اور شاہ صاحب کو بیحد عزیز تھا۔ شاہ بشاش صاحبہ اُن کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ شاہ بشاش کی وفات کے بعد مسند نشین کا سوال پیدا ہوا تو اُس نے بھی سید جلال شاہ کی سجادہ نشینی پر دیگر سیدوں کی طرح مخالفت کی تھی جس کی وجہ سے ان کو بہت تکلیفیں دی گئی تھیں۔

دریو فقیر :- دریو فقیر اپنی ظرافت کی وجہ سے مشہور تھے۔ شاہ صاحب نے دریو فقیر کا ذکر اپنے کلام سُر بلاول میں کیا ہے۔ یہ ایک سیلانی شخص تھا۔ کبھی کبھی آپ کی بارگاہ سے مہینوں غائب رہتے تھے۔ پھر گھوم پھر کر یکایک مرشد کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے۔

شاہ صاحب کے مریدوں میں۔ جن کو آپ کی صحبت سے بڑا فیض حاصل ہوا تھا۔ اور شاہ صاحب کے کلام سے متاثر ہوئے۔ جن کا کلام ہمیں دستیاب ہو سکا ہے وہ تھے تمر فقیر۔ صالح فقیر۔ اور عنایت اللہ جوڈھو فقیر وغیرہ۔

تمر فقیر :-

شاہ صاحب کے مریدوں میں تمر فقیر کو بڑا رتبہ حاصل تھا۔ جنہیں آج تک لوگ یاد کرتے ہیں۔ افسوس کہ اس عبادت گذار اور باکیزہ شخصیت کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی۔ اُن کی ابتدائی زندگی کے متعلق کچھ معلومات حاصل نہیں ہو سکی۔ بڑی تلاش کے بعد بھی آپ کے والدین کے ناموں کا کوئی سراغ مل نہ سکا۔

نواز فقیر سے روایت ہے کہ تمر فقیر اپنی والدہ کے بطن میں تھے۔ تو اُن کے والد کا انتقال ہوگیا۔ آپ کی والدہ اپنے دیور محبت فقیر سالاری اور دوسرے عزیزوں کے ساتھ حج بیت اللہ کا ارادہ کیا۔ جانے سے پہلے شاہ بشاش کی خدمت میں دعا کے لئے حاضر ہوئے۔ شاہ صاحب نے ان کی دعا خیر کی اور ارشاد کیا۔ آپ کے یہاں بیٹا تولد ہوگا جو بڑا نیک اور صالح ہوگا۔ جب یہ جماعت حج کرنے کے بعد مدینہ منورہ پہنچی تو اس حاملہ عورت نے فرک کے باغ میں ایک نخل کے درخت کے نیچے فرزند کو جنم دیا۔ جسکا نام علی رکھا۔ لیکن ان کو تمر کے نام سے پکارا گیا۔ تمر کے معنی کھجور ہے۔ چھ عرصے کے بعد جب وطن واپس آئے تب اس یتیم بچہ کو شاہ بشاش کی خدمت میں پیش کیا۔ اور اسطرح وہ بچہ شاہ بشاش کے مریدوں میں داخل ہوئے اور دائمی رفاقت اختیار کرلی۔ اس معصوم بچہ نے شاہ صاحب کی خدمت اور صحبت میں رہ کر روحانیت کے مقامات طے کرلئے۔ ان کو شاہ صاحب کا کلام یاد تھا۔ جسے بڑی خوش الحانی سے گاتے تھے۔ شاہ بشاش اُن کو بڑی شفقت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ علامہ مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ نے ان کے کمال محویت کی ایک عجیب مثال بیان فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ شاہ صاحب نے تمر فقیر سے کہا میں چھپ جاتا ہوں۔ تو مجھے تلاش کرو۔ اتنے میں شاہ صاحب نظر سے غائب ہوگئے۔ تمر فقیر نے کائنات کے ہر کونے میں ڈھونڈا۔ آخر کار شاہ صاحب کو اعلیٰ علیین میں پایا۔ شاہ صاحب نے تمر فقیر سے کہا اب تو چھپ جا اور میں تجھے ڈھونڈوں جب وہ چھپا تو شاہ بشاش نے ارض و سما کے اطراف کی تلاش کی۔ مگر کہیں بھی نظر نہ آئے۔ آخر شاہ صاحب تھک گئے۔ تب تمر فقیر آپ کے سر مبارک کے بالوں میں سے جوں کی صورت میں ظاہر ہو کر آپ کے قدموں پر گر کر معذرت کی۔ شاہ صاحب نے اُسے کہا۔ تو، تو مجھے میں چھپا تھا؟ تمر فقیر نے جواب دیا قبلہ آپ کے بغیر میرے لئے دوسری جگہ کہاں ہوگی۔

تمر فقیر مقالہ نگار ــ علامہ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم ــ رسالہ ثقافتی زندگی ــ ماہ نومبر ۱۹۵۵ء۔

تمر فقیر آبی جوان میں قدم رکھا تھا تو شاہ بھٹائی نے رحلت فرمائی۔ شاہ صاحب نے وفات سے پہلے ایک بزرگ مخدوم محکم الدین سیلانی سے تمر فقیر کے لئے سفارش کی تھی جو ایک جلیل القدر اولیاء اور وجد و حال صوفی تھے۔ شاہ بھٹائی نے فرمایا۔ میری وفات کے بعد تمر فقیر کو صوفیانہ اسرار و رموز سے بہرہ ور کریں۔

تمر فقیر بڑے اہل دل درویش تھے۔ ہمیشہ درگاہ میں رہکر فقیروں کی خدمت کرتے تھے۔ مسجد کی خدمت کے ساتھ پنج امام بھی تھے۔ اپنے چچا محبت فقیر سالاری کی وفات کے بعد سید جمال شاہ سجادہ نشین کے کچھ وقت کے لئے خلیفہ بنے۔ لیکن اکثر مریدوں کو تمر فقیر کی طرف رجوع دیکھکر سید جمال شاہ کے دل میں اس بات کا خدشہ رہتا تھا۔ کہ کہیں تمر فقیر آگے نہ نکل جائیں۔ لیکن تمر فقیر تو اپنے مرشد کی طرح فقیر و تارک الدنیا تھے۔ مرشد کے جانشین کو ناراض کرنے کے بجائے اس میں بہتری سمجھی کہ "بھٹ شاہ" کو چھوڑ کر خاموشی سے چند رفیقوں کے ساتھ "کچھ" کی طرف جاکر سکونت اختیار کی۔

کچھ کی طرف جاتے ہوئے پہلی منزل دائرہ شریف (ڈیرہ مل) کے جتوئیوں کے یہاں ہوئی۔ جہاں اپنے مرشد و آقا حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام کا قلمی نسخہ "بطور امانت" چھوڑا۔ کچھ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد ان کی کرامتوں کو دیکھکر بڑی تعداد میں لوگ آکر مرید ہوئے۔ خاص طور پر وہاں کا راجہ گھن راؤ جو بے اولاد تھے۔ تمر فقیر کی دعا سے ان کو اولاد نرینہ ہوئی۔ روایت ہے۔ جب ان کی وفات کا وقت قریب ہوا تو۔ ایک تیز رفتار اونٹ پر سوار ہوکر "بھٹ شاہ" کو روانہ ہوئے۔ لیکن بھٹ شاہ کے قریب راہ میں وفات پاگئے ان کی میت کو لاکر شاہ بھٹائیؒ کی مزار کے جنوب میں طے دفنایا گیا۔ مزار پر یہ کتبہ لکھا ہوا ہے۔

ھوالباقی

وصال مرحوم مغفور میاں

زنگی اللطیف تمر شد سمر علیہ الرحمت۔

بقول علامہ ڈاکٹر دائود پوتہ مرحوم۔ اس مصرعہ کو صحیح طور اس طرح پڑھا جائے گا "زنگی اللطیف تمر شد شعر" تمر فقیر ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ شاہ صاحب کا روحانی فیضان براہ راست ان تک پہنچا تھا۔ اس لئے کلام میں بھی سوز و گداز اور درد موجود ہے جس کی ایک مثال یہ ہے۔

منھنجو من منجھائیو، جتن جي جمال

وتو سور سريرجي، ڪيچھين جي ڪمال

موت نہ پائي ماڻ، ٻيٽ نہ ٿيا معذور جا۔

"جتوئی" کے جمال نے میرے قلب میں خلش پیدا کردی ہے۔

کیچ والوں کے کمال نے میرے تن و بدن میں درد بھر دیا ہے

وہ موت جیسے مال جاتی نہ ہوئے اور اس لاچار و مجبور کے عزیز بن نہ سکے۔

صالح فقیر:- صالح فقیر کا شاہ صاحب کے ارادتمندوں میں خاص رتبہ تھا۔ فقیر صالح بھی شاعر تھے۔ ان کے کلام کا کوئی علیحدہ مجموعہ نہیں ہے۔ لیکن جزوی کلام شاہ صاحب کے رسالہ میں موجود ہے۔ جو شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ مرحوم نے ترتیب دیا ہے۔ سر رضا سری میں کچھ ابیات موجود ہیں۔ جن میں فقیر صاحب نے اپنے مرشد کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ یہ بیت ان سے منسوب ہے جس سے ان کے کلام کی پختگی اور روانی معلوم ہوتی ہے۔

مَنھنجا مارو شرن جي، عمر ڪيئي اماڻ

تون حاڪم، حڪومت تي پورا ڪرنہ پاڻ

پوندہ ڪو ڪرم سان، تون منھنجي نہ موڪلين ماڻ

تي سوار سجاڻ، ڪيئي ٻنديا تي بند مان۔

تذکرہ لطفی مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی۔ جلد اول صفحہ ۵۸۷۔

مہر بادشاہ مجھے ماروڑ کی جھونپڑی میں واپس بھیجدیں ۔

تو حاکم ہے، اپنی حکومت پر، اتنا نازاں نہ ہو ۔

آخر اس کریم سے تیرا کام ہوگا، تو ہمیشہ یہاں نہ رہے گا۔

کچھ عقل سے کام لے، اس قید میں پڑی ہوئی کو نجات دے ۔

یہ باکمال شخصیت، شاہ لطیف کے مریدوں میں سے تھے، فقیر صاحب کا اسم گرامی مرت کا مستحق ہے ان کے والد کا نام میاں پیر محمد چوڑھ تھا، مرحوم مرزا قلیچ بیگ اور ڈاکٹر کرفنانی نے ان کا نام جانی ڈہرو لکھا ہے، لیکن ان کے کلام کے جامع عبداللہ خان نے پیر محمد چوڑھ لکھا ہے، مذکور کتاب ۱۸۹۲ء میں سکھر کے ایک مشہور کتب فروش ہرمنگھ نے شایع کی تھی، فقیر عنایت اللہ کے کلام کا موضوع مرشد کی تعریف ہے بعض ابیات میں اتنا غلو نظر آتا ہے جو وہ ناقابل برداشت ہی جاتا ہے، بھٹ کو ساری کائنات سمجھ کر کہتا ہے:۔

احد، اللہ، لطیف مکھو جاڈج ھیک ۔

احد اللہ، لطیف، مکھ کو ایک ہی سمجھیں ۔

عشق کے اس عجیب انداز اور منفرد مقام سے الگ، آپ کے کلام میں ناصحانہ رنگ موجود ہے، جو کہ بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے مثال ہے۔

ھلڻ سونتي منھ ڏيو، پيچڻ پنھون ڏھ

ڏونگر منھ ڏيکي، ڏس پرياڻ جو ڏھ

من طلب شئيا، جڏ وجھ، گھران اُڏي گھن

آريا عنايت چئي، لوڙي آءُ لطيف ۔

اِتي نا رھندين، جيڏيون پنھنجي جت ريءُ ۔

میرا محبوب کی طرف چلنا واجب ہے میرے یہاں پہنچنا پنہوں کے بس میں ہے، اے بھائی اس دکھی کو اپنے دوست کا پتہ نشان بتا دے جس چیز کی طلب کی جاتی ہے، وہ مل جاتی ہے، اس کی راہ میں مل رہی ہوں، عنایت کہتا ہے میں اپنے محبوب کو ڈھونڈھ کر حاصل کرونگی۔

میں یہاں اپنے حبیب کے بغیر ای میرے ہم جولیاں رہ نہیں سکتی ۔

شاہ لطیف بھٹائی کے رسالہ میں ایسے شعراء کا کلام ملتا ہے جو اس دور کے اچھے شاعر تھے، لیکن ان کے حالات زندگی کا پتہ نہیں جو گوشہ گمنامی میں ہیں، اور کلام دستبرد زمانہ سے ضائع ہوگیا ہے۔ نہایت قلیل آنداز میں ان کا کلام شاہ بھٹائی کے قدیم رسالوں میں موجود ہے۔ جن کے اسماء گرامی یہ ہیں

شیخ کھرلانی، قطب فقیر، سیتھ ملاول شاہ، بڈھو فقیر، قاسم فقیر، لطف اللہ فقیر، لکھو جونیجو، حبیب فقیر، سوھن فقیر، سنگیل فقیر اور سیتھ شاہ جیون

اس کے علاوہ شاہ بھٹائی کے بہت سے مرید تھے جو آپ کی گرد رہکر خدا کی مخلوق کی خدمت کرتے تھے، جن میں، میاں عبدالواسع، اسماعیل فقیر، احمد، عنایت وسائی، عبدالجلیل، اس فقیر کے ذمے نماز کے انتظام کا بندوبست کرتا تھا، وسیو فقیر، رحموں فقیر، عارف فقیر، ان کے دھے یہ تھا کہ جب کوئی نیا مرید آجاتا تھا، اس کو نماز اور دوسرے ظاہری اسلامی عقائد بتا دیں۔ عرس فقیر کو شاہ بھٹائی کا پورا کلام یاد تھا، جسے وہ سر سوں الحانی سے گاتا تھا ۔

حصۂ دوم

باب اوّل

اسلامی تصوف

(تصوف کی تاریخ)

اسلام میں تصوف کی تاریخ بڑی طویل ہے جس کے سمجھنے کے لئے اہل فکر کا ایک بڑا گروہ صدیوں سے اس کے مسائل پر غور و فکر کرتا چلا آرہا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اسلام کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ظاہری اور باطنی زندگی میں یکسانیت ہو۔ ذکر اور عمل کی حد قائم ہو۔ وہ ایمان اور عمل دونوں کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ فکر اور عمل کی اس تحریک نے اسلام میں تصوف کی بنیاد رکھی۔

تصوف خود عہد رسالت اور اصحاب اکرام کے زمانہ میں موجود تھا۔ اگرچہ اس کا نام یہ نہ تھا۔ نہ ہی اس کی صورت و شکل یہ تھی۔ جو کہ دو صدیوں کے بعد مرتب ہوئی لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اوائل اسلامی دور میں وہ کس صورت میں موجود تھا۔ اس لئے سب سے پہلے اس بابرکت و مقدس ہستی کا ذکر کرنا ہے جن کی ذات گرامی دین اسلام اور اس جہان کے وجود میں آنے کا سبب بنی۔ آپ کی مقدس حیات میں دین اسلام کا آغاز اور اس کی تکمیل ہوئی۔ اس لئے تصوف کی بنیادی صورت کسی نہ کسی طرح عملی طور پر آپ کی حیات مبارک میں موجود تھی۔

نبوت سے قبل مکہ معظمہ میں اکثر شہر سے دور، دنیاوی شور و غل سے نکل کر غار حرا میں تنہا یاد الٰہی اور قدرت خداوندی پر غور و فکر میں مشغول رہتے تھے۔ اس طرح آپ کی پاکیزہ زندگی کے چالیس سال طے ہو چکے۔ ایک روز حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ سے کہا پڑھ[1] اس طرح تین مرتبہ کہنے کے بعد کہا[2]

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ

"پڑھ اللہ کے نام سے جس نے پیدا کیا انسان کو گوشت اور جمے ہوئے خون سے۔ پڑھو! تمہارا رب تو بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم دیا۔ اس نے انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں جو سب سے پہلے وحی کے ذریعہ اس وقت اتریں جب آنحضرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم، غار حرا میں تشریف فرما تھے۔ ان آیات کریمہ سے دین اسلام کو بڑی تقویت سب سے پہلے ملی۔ منصب نبوت پر فائز ہونے سے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی استغراق کی کیفیت رہتی تھی[3] "ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس وقت آپ پر استغراق کی کیفیت طاری تھی آپ نے حضرت عائشہ صدیقہ کو دیکھکر فرمایا تو کون ہو؟

عائشہ

عائشہ کون؟

ابوبکرؓ کی بیٹی

---

[1] آسان تفسیر تیسواں پارہ قرآن پاک ابو سلیم محمد عبدالحی صفحہ ۳۸۲۔ شایع کردہ مکتبۃ الحسنات رامپور (یوپی)

[2] اسلامی تصوف اور اقبال مصنف ابو سعید نورالدین صفحہ ۵۴

[3] تاریخ تصوف اسلام مصنف مصطفیٰ حلیمی پاشا مترجم رئیس احمد جعفری صفحہ ۲۱

ابوبکر کون ؟

محمد صلعم کے دوست

محمد کون ؟

اس کے جواب میں حضرت عائشہ رضہ خاموش ہوگئیں، اور سمجھ گئیں کہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور حالت میں ہیں، آپ پر کوئی خاص کیفیت طاری ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اقدس کے علاوہ ہم اگر آپ کے اصحاب کرام رضہ کی حیات پر نگاہ ڈالیں گے تو ہمیں ان کے اقوال و اعمال میں بھی تصوف کی حقیقت نظر آئیگی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضہ، آنحضرت کے سچے دوست تھے، اور پہلے خلیفۃ المسلمین ہوئے آپ کی زندگی، صدق، تقویٰ اور زہد میں گذری، آپ کے ایثار کی مثال دنیا، اب تک پیش کر نہ سکی۔ جب جنگ تبوک کے موقع پر آنحضرت صلعم نے امداد کے لئے امر فرمایا، تو اس اعلان سے تمام مسلمان اپنی مرضی کے مطابق مال وجنس لائے، لیکن آپ نے گھر میں جو کچھ تھا، سب لاکر آنحضرت صلعم کی خدمت میں پیش کیا، حضور صلعم نے پوچھا، اہل و عیال کے لئے کیا چھوڑا، جواب دیا اللہ اور اس کا رسول، ان کے لئے کافی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور محبت میں محو رہتے تھے، مشاغل دنیاوی نے کبھی اس کی محبت میں فرق آنے نہ دیا، جو شخص معرفت الٰہی میں مست اور ان کی محبت کا مزا چکھ لیتا ہے، تو وہ دنیا سے کنارہ کش ہو جاتا ہے یہ ہی تصوف کی سب سے بڑی علامت ہے۔ حضرت عمر فاروق رضہ، حضرت ابوبکر رضہ کے وصال کے بعد دوسرے خلیفۃ المسلمین منتخب ہوئے، اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے اسلام کی بڑی خدمت انجام دی، آپ سادہ زندگی کو بہت پسند فرماتے تھے، خلافت کے فرض پر فائز ہونے کے بعد تو آپ کی زندگی میں اور بھی سادگی آگئی تھی، مقررہ وظیفہ سے زائد کبھی نہ لیا، کپڑے پھٹ جاتے تھے، تو ان میں پیوند لگاتے تھے، آپ ہمیشہ دنیا سے بیزاری کرتے تھے۔

حضرت عثمان غنی ذی النورین رضہ حضرت فاروق رضہ کی شہادت کے بعد خلیفۃ المسلمین ہوئے، آپ صبر و حیاء کے مجسمہ تھے، بڑے بڑے مصائب میں بھی صبر و شکیب میں رہے، آپ کو جام شہادت نصیب ہوئی آپ کو قرآن پاک سے بیحد محبت تھی، شہادت کے وقت آپ قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول تھے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ تھے، آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ہمیں تصوف کی بنیادی حقائق معلوم ہوتے ہیں بلکہ صوفیائے کرام کے اکثر سلسلے آپ پر ختم ہوتے ہیں۔ آپ بڑے عالم تھے، دین کا فہم قدرت کی طرف سے آپ کو عطا ہوا تھا، آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا تھا

"انا مدینۃ العلم و علی بابہا" "میں علم کا شہر ہوں اور علی رضہ اس کا دروازہ ہے"

حضرت ابن عباس رضہ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا، کہ آپ برادر صاحبزادہ کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟ جواب دیا میرے اور ان کے علم میں وہی نسبت ہے جو بارش کے ایک قطرہ کو بحر بیکراں سے ہوتی ہے۔ [1] ابن ابی الحدید نے ایک جگہ لکھا ہے۔

طریقت، حقیقت اور احوال تصوف بھی علم ہی کی اقسام میں داخل ہے، اس فن میں درک رکھنے والے ہر اسلامی ملک میں پائے جاتے ہیں، ان سب کا سلسلہ حضرت علی رضہ پر جاکر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی تصریح شبلی، حضرت جنید بغدادی، حضرت سری سقطی حضرت بایزید بسطامی اور کرخی نے کی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس علم سے تعلق رکھنے والوں کا آج تک یہی شعار ہے، کہ وہ اس کو سند متواتر حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچاتے ہیں

حضرت امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف کی حقیقت کا بیان اور خلاصہ اس طرح کیا ہے، کہ تصوف شریعت میں بخلاف اس کے عمل کے بعد علم پیدا ہوتا ہے فرماتے ہیں

---

[1] حضرت علی شخصیت اور کردار مصنف عباس محمود العقاد مترجم منہاج الدین اصلاحی صفحہ ۶۱۔

انسان کو اشیاء کا جو ادراک ہوتا ہے، اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ اقتباس استدلال تعلیم سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غور و فکر کے بغیر ایک چیز کا ادراک ہوتا ہے، اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں سے ہوا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان پہلے تمام دنیاوی تعلقات سے کنارہ کش ہو جائے، یعنی اولاد، اہل عیال دوست و احباب، دولت و ملکیت کسی چیز سے واسطہ نہ ہو اور ایک گوشہ میں بیٹھکر خدا تعالیٰ کی طرف، اس طرح متوجہ ہوکر کسی چیز کا دل میں خیال نہ آئے۔ اس کے ساتھ زبان سے اللہ اللہ کہنا چاہئے، رفتہ رفتہ یہ مشق اس قدر بڑھے کہ زبان کو حرکت نہ ہو اور تصور میں زبان سے اللہ تعالیٰ کا لفظ ندا جائے، پھر یہ تصور اس حد تک پہنچے کہ حرف حرف اور اس کی صورت کا خیال جاتا رہے اور اللہ تعالیٰ کا تصور دل میں اس طرح اثر کر جائے کہ کسی وقت بھی جدا نہ ہونے پائے، جب یہ حالت پیدا ہو جائے گی تو مکاشفہ شروع ہوگا، ابتدا میں برق خاطف کی طرح نکل جائے گا آہستہ آہستہ ترقی ہوتی جائے گی اور اثبات و دوام حاصل ہوگا۔[1]

اسلام کی دو حیثیتیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی، ظاہری حیثیت کا تعلق عمل اور حکم پر ہے اور باطنی کا نیکی اور طاعت پر، جو دل میں معنوی کیفیت جگاتی ہے۔ اسی باطنی حیثیت کو عمل اور حکم سے وابستگی ہوتی ہے۔ جو اصحاب کرام میں احسان کے نام سے مشہور ہوا۔ آگے چل کر تصوف کے نام سے موسوم ہوا تصوف کے لغوی معنی پشم کا لباس پہننا ہے کیونکہ یہ ماخوذ ہے صوف (بضم صاد) سے جسکے معنی اون اور پشم کی ہے۔ حضرت امام ابو القاسم عبد الکریم القشیری رحمت اللہ نے فرمایا ہے۔[2]

جس مذہب کہ صوفی کسی طرح بنا، کیونکہ قیاس اور لغت کے لحاظ سے اس کے اشتقاق کا قاعدہ نہیں ملتا، میری رائے یہ ہے کہ صوفی لفظ صوف "پشم" سے نکلا ہوا ہے، گویا فرقہ (گروہ) کے افراد عام لوگوں کے خلاف اچھے کپڑے پہننے کے بجائے سادے اون کے کپڑے پہنتے تھے۔

ایک صوفی سے روایت[3] ہے کہ میں حضرت جنید بغدادی کے پاس گیا، تھوڑی دیر میں ایک اور شخص آکر بیٹھ گیا۔ اس وقت حضرت جنید بغدادی خاموشی سے سر نیچے جھکائے ہوئے تھے۔ اس شخص نے سانس لی اور الا اللہ الا اللہ کہا۔ اس پر حضرت جنید نے غصے سے اس شخص کی طرف دیکھا اور فرمایا، اے شخص! یا تو، تو۔ ادھر موجود ہے یا میرے پاس، اگر تو وہاں ہے تو تیرا الا اللہ کہنا بے حرمتی ہے کیونکہ جو شخص اپنے محبوب کے پاس موجود ہو، جس کا وہ ذکر کر رہا ہے، تو واصل ہونے کی صورت ذکر کا کوئی مطلب نہیں۔ اور اگر تو ہمارے پاس ہے تو تیرا یہ قول غیبت ہے اس لیے کہ تو نے غائب کا ذکر کیا ہے۔ اس پر کسی نے سوال کیا تصوف کیا ہے؟ فرمایا تصوف یہ ہے کہ تو مخلوق کے ساتھ نفس نفس نے زندگی گزار اور اللہ کے ساتھ دل کے کسی صوفی سے دریافت کیا گیا کہ صوفی کا کیا مطلب ہے؟ جواب دیا۔

صوفی میں چار حرف ہیں، اور ہر حرف میں اشارہ پایا جاتا ہے چنانچہ "صو" سے مراد صفا کی میرے مع اللہ ہے جو اللہ کے ساتھ حالت کے ذریعہ سے ہوتی ہے نیز یہ اللہ کی طرف کان لگاتا ہے، اور اللہ کی طرف سے آنے والی باتوں کو سمجھتا ہے، اپنے تمام ارادوں کو اللہ پر موقف کر دیتا ہے اور یہ کہ اللہ ہی کے ساتھ وجد کی قوت ہے، اس لیے کہا جاتا ہے[4]

ما صبر حتی یعجز الصبر من صبری ۔۔۔ واتلف من طول الاقامة فی صدری

خافة ان یشکو ضمیری صبابتی ۔۔۔ الی دمعتی سوء فتجری ولا ادری

---

[1] کیمیائے سعادت امام غزالی صفحہ ۳۹

[2] الرسائل القشیریہ، تالیف حضرت ابی القاسم عبد الکریم بن ہوازن القشیری

[3] رسالہ صوفی ۔۔۔ [4] الرسائل القشیریہ تالیف ابی القاسم عبد الکریم بن ہوازن القشیری فصل ۵ صفحہ ۵۷

میں اس قدر صبر کروں گا کہ صبر بھی میرے سے عاجز آجائے گا اور

سینہ میں اسکے قیام کی زیادتی سے میں ہلاک ہو جاؤں گا۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں [1]

تصوف کثرت صوم و صلوٰۃ کا نام نہیں ہے، بلکہ تصوف سینہ کی سلامتی اور نفس کی سخاوت کا نام ہے۔

علامہ ابن خلدون نے اپنی کتاب مقدمہ ابن خلدون میں علم تصوف پر بحث کی ہے۔ امام ابوالقاسم القشیریؒ کے لفظ صوفی کے متعلق اس طرح نقل کرتے ہیں

"کسی بھی قیاس اور مشاہدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نام لغت عربی سے لیا ہوا ہے ظاہر میں ایک لقب ہے جس کو لفظ "صفا" سے لیا ہے، تو کسی نے لفظ صفت سے مشتق بتایا ہے، یہ سب قیاس علم لغت کے اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں اور عام قیاس کیا جاتا ہے کہ لفظ "صوف" یعنی اُون کپڑے سے لیا ہے جو کہ درست نہیں ہے، کیونکہ صوفیوں کے کپڑوں میں صوف کی کوئی خصوصیت نہیں"

بعض علماء نے لفظ صوفی کو صفا اور اصلاح سے صفائی سے مشتق خیال کیا ہے یعنی صوفی وہ ہے جس کو حق تعالیٰ نے صفائی قلب سے نوازا ہے اور قلب کی صفائی اور اصلاح سے ظاہر ہے کہ سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے، اور تمام اعمال درست ہو جاتے ہیں جیسے

"ان الصفا صفۃ الصدیق ان لم یکن صوفیا علی الحقیقۃ"

(صفا صدیق کا وصف ہے اگر صوفی واقعی صوفی ہو)

بعض علماء کی رائے ہے کہ صوفی لفظ "صف" سے مشتق ہے یعنی صوفیہ حضور حق میں اپنے قلوب کے ساتھ صف اول میں حاضر ہوتے تھے یہاں پر معنی کے لحاظ سے کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، لیکن لغت کے اعتبار سے "صف" کی طرف نسبت ہو تو صفی حاصل ہوگا نہ کہ صوفی۔

اصحاب صفہ وہ لوگ تھے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے تھے انہوں نے اپنی خاص راہ خدا میں سب کچھ دے دیا تھا، اہل عیال زن و فرزند، مال و دولت اور گھر بار سب کو چھوڑ کر آنحضرت صلعم کے پاس بیٹھ گئے تھے آنحضرت صلعم ان کے لئے مسجد نبوی کے پاس ایک چبوترہ بنوا کر دیا تھا جس کو عربی میں صفہ کہتے ہیں، یہ لوگ اس صفہ پر رہتے تھے۔ شب و روز عبادت و تعبد میں کی حالت میں عبادت، ریاضت اور مجاہدہ نفس میں گذارتے تھے، کو اپنی زندگی میں دو کپڑے بھی نصیب نہ ہوئے صرف ایک کپڑے سے بدن کو ڈھانپ لیتے تھے [2]

سید سادات الحسینی ملتانی جو سہروردی طریقہ کے ایک نامور شیخ گذرے ہیں اپنی تصنیف "کنز الرموز" میں لکھتے ہیں

علم تحقیق از دل آگاہ گیر شارع شرع حبیب اللہ گیر

چون کلیم اللہ درین راہ خوف با صفائی سر فرو پوشیدہ صوف

حقیقت کا علم دل سے حاصل کر اور شریعت کی راہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کر

اس راہ میں کلیم اللہ (حضرت موسیٰؑ) کی طرح چلتا رہ اور صفائی کے ساتھ اپنی پوشیدگی کو اُونی کپڑے سے ڈھانپ۔

"اصحاب صفہ" جنکا ذکر اوپر آچکا ہے جو کہ ایک اُونی کپڑے میں زندگی بسر کرتے تھے (جن کی تعداد ستر بتائی جاتی ہے)۔ صوفیہ کو بھی انہی اوصاف کی بنا پر اہل صفہ کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ مگر لفظ صوفی کو "صف" سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ حضور صلعم کے دور مبارک سے خیر القرون کے زمانہ تک

---

[1] الرسائل القشیریہ تالیف ابی القاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری۔ فصل ۵ صفحہ ۵۵

[2] مقدمہ ابن خلدون مولفہ حضرت علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون المغربی۔ مترجم مولانا سعد حسن خان پوسی صفحہ ۴۸۶ فصل ۱۱۔

یعنی ایک سو ہجری تک لفظ صوفی کا استعمال نہ ہوا۔ عبادت گذار عارف کو عابد اور زاہد کے نام سے پکارتے تھے۔ ایک رائے کے مطابق تصوف کا لفظ "سین" سے تھا اور اس کا مادہ "صوف" تھا جس کی یونانی میں معنی حکمت نکلتی ہے۔ دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتابیں عربی زبان میں لکھی گئیں تو یہ لفظ صوفی یعنی حکیم لکھنا شروع ہوا رفتہ رفتہ سوفی سے صوفی ہو گیا[1] بہرحال اصطلاح میں اس سے مراد ہے خواہش نفسانی سے پاک ہونا۔ چنانچہ ان صفات کے لوگ کے اعمال و افعال کو مجازاً تصوف کہنے لگے۔ تصوف کی تعریف ہے "التخلق باخلاق الالٰہیۃ" یعنی فدائی اخلاق اپنے اندر پیدا کرنا۔ خرقہ تصوف وہ ہے جو مرید اپنے شیخ کے ہاتھوں سے پہنتا ہے۔ جس ارادت سے حلقہ میں داخل ہوتا ہے، اور اسکے ہاتھ پر توبہ کرتا ہے اور تقویٰ کا لباس پہنتا ہے۔ فرمود ربانی ہے

"ولباس التقویٰ ذالک خیر"

"تقویٰ کا لباس اچھا ہے"

تصوف سے مراد ہے کہ ظاہر میں ادب شریعت کی ایسی پابندی اختیار کی جائے کہ اسکا علم باطن سے ظاہر میں بھی پایا جائے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں پابندیوں کو اختیار کرنے والے کو کمال حاصل ہو جائے۔ بعض کہتے ہیں تصوف روحانیت پیدا کرتا ہے اور علوم حقیقت سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی[2] نے فرمایا ہے "تصوف راست جز واست علم و عمل و اخلاق"۔ شریعت کے تین جز ہیں، علم، عمل اور اخلاق۔ تصوف علم باطن ہے جس کو علم لدنی، کشف، علم غیب کہتے ہیں۔ یہ علم انبیائے علیہم السلام میں بدایت کامل اور فطری ہوتا ہے جو مجاہدہ اور ریاضت کا محتاج نہیں۔ لیکن اولیاء کرام کو ریاضت اور مجاہدات کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ جسکی تشریح اکثر صوفیائے کرام کی کتابوں میں ملتی ہے۔

تصوف کے ارتقائی منازل پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں اہل بصرہ کے ایک گروہ میں اس قسم کا رجحان پیدا ہوا جو شریعت کی پابندی کے ساتھ باطنی نشو و نما کو بھی حاصل کرتے تھے[3]۔ اس گروہ میں امام عراق[4]، حضرت حسن بصری[5]، حضرت سفیان ثوری[6] اور حضرت بی بی رابعہ بصری بلند مقام کے حامل تھے۔ ان صوفیوں پر علم کی طلب زیادہ غالب نہ تھی، مگر تقدس، دنیا سے بے تعلق اور خدا تعالیٰ اور رسول اکرم سے محبت بے پناہ تھی، ان بزرگوں کے خلوص اور محبت کے جذبہ کو دیکھکر عوام دن بدن ان کی طرف رجوع ہوتے گئے۔

تیسری صدی ہجری میں صوفیائے کرام کا دوسرا گروہ پیدا ہوا جس میں حضرت ذوالنون مصری[7]، حضرت بایزید بسطامی[8]، حضرت جنید بغدادی اور منصور حلاج بھی وہ صوفی تھے، جنہوں نے تصوف میں متفق فکر اور اعتقاد کو قائم رکھا۔ حضرت جنید بغدادی[9] حقیقی معنی میں صوفیوں کے سردار تھے، اور آپ کو "سید الطائفہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ علامہ حضرت جنید بغدادی کا قول ہے "ما اعلم تصوف سنت کے اندر قدم کے کوئی اس وقت کے صوفیوں کی تحریک میں کچھ ایسی باتیں آگئی تھی جو پہلے دور کے صوفیوں میں موجود نہ تھی۔ صوفیائے کرام کے خاص طبقے میں بڑی بڑی ریاضتوں کا وجود نظر آتا ہے وہ اس دنیا سے مکمل طور پر قطع تعلق کرکے مستقل طور پر ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے۔ اس وجہ سے تعلق مع اللہ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ یہ بزرگ مدتوں تک مراقبہ میں رہتے تھے اور ان حالات میں وجد اور رقص کی حالت طاری رہتی تھی۔ انسان کو دنیا میں سب سے نزدیک چیز نظر آتی ہے، وہ ہے اسکا وجود۔ قرآن پاک میں ہے

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ

دکھا دیں گے اُنھیں (تفحص کرنے والے کو) اپنی نشانیاں کو خود اُن جہان و قدرتی نظاروں میں ہیں، وہی نشانیاں آپکے وجود میں بھی موجود ہیں۔

---

[1] اسلامی تصوف اور اقبال مصنف ڈاکٹر ابو سعید نورالدین صفحہ ۱۷ ۔ [2] مکتوب امام ربانی مجدد الف ثانی مترجم مولوی عالم الدین صفحہ ۳۲۹

[3] خزینۃ الاصفیا جلد دوم من تصنیف و تالیف مفتی غلام سرور صاحب لاہوری مطبع منشی نول کشور لاہور صفحہ ۲۲۵

[4] تصوف مصنف سید صفی الحمید صفحہ ۴۲ ۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

صوفی اس پر عمل کرتے ہیں۔ اپنے وجود اور اس جہان کے قدرتی نظاروں میں فکر کرتے ہیں جس سے محبوب حقیقی کا وصل نصیب ہوتا ہے وہ کہتے ہیں [1]

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

"جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پالیا"

صوفی کے نزدیک مذہب میں شریعت کا سب سے زیادہ دخل ہے۔ شریعت پر قائم رہنے سے روح کو روشنی حاصل ہوتی ہے جو کہ تھوڑے سے عرصہ میں کثیف جسم سے نکل کر لطیف جسم میں آجاتی ہے۔ جس کو طریقت کہتے ہیں جہاں سے ترقی کر کے ان دونوں حالتوں میں آتا ہے جو حقیقت سے معرفت تک پہنچ جاتی ہے

صوفی کا قول ہے کہ ذات پاک سے ملنے کے لئے شریعت پر لازماً قائم رہنا ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شریعت کا راہی اور راہنما سمجھا جاتا ہے۔

شیخ سعدی علیہ رحمۃ [2] گلستان کے پہلے باب میں فرماتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ شریعت کی حقیقت اس طرح ہے

بی حکم شرع آب خوردن خطا است

وگر خون بفتوای پرہیزی رواست۔

"شریعت کے حکم کے بغیر پانی پینا بھی جائز نہیں ہے، اگر شریعت کے حکم سے خون پیا جائے ہوتا ہے"

صوفیوں کا خاص عقیدہ ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں پہنچ جائیں تب فقیروں اور درویشوں سے صحبت ضروری ہے کیونکہ ان کی صحبت سے روح کی ترقی ہوتی ہے مولانا رومی فرماتے ہیں

یک زمانی صحبتی با اولیا بہتر از صد سال طاعت بے ریا۔

دعا میں جس وقت تک صرف حالت ہیں وہ عام وقت ایک ہفت میں ہیں رہتے کبھی آسمان پر پرواز کرتے ہیں تو کبھی زمین کی اتھاہ پر نظر کر لیتے ہیں جسکو عروج کہتے ہیں اور پرواز کو عروج کہتے ہیں اس حالت میں ان کی زبان سے بے ساختہ ایسے کلمات نکلتے ہیں جن پر اعتراضات وارد ہوتے ہیں جیسے حضرت بایزید بسطامی کہتے تھے "سبحانی ما اعظم شانی" منصور حلاج نے کہا "انا الحق" اور شمس تبریز نے کہا "قم باذنی"

اسلامی تصوف کی ابتدائی تاریخ متضاد روایتوں سے بھرپور ہیں انکے قدیم ماخذ جو کہ ہم تک پہنچے ہیں۔ ان کی روایتوں پر صدیاں گذرنے کے بعد بھی آج وہی اعتراض پیش کیا جاتا ہے تصوف کی تاریخ کے قدیم ماخذوں میں مندرجہ ذیل ممتاز تصانیف شمار کئی جاتی ہیں۔

۱۔ کتاب اللمع ۔ مصنف حضرت شیخ ابو نصر سراج ۔ ۲۔ فتوح الغیب ۔ مصنف ۔ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ۔

۳۔ کشف المحجوب ۔ حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویری [3] ۔ ۴۔ الرسائل القشیریہ ۔ تالیف ۔ حضرت امام ابی القاسم عبدالکریم القشیری [3]۔ ۵۔ عوارف المعارف ۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی

صوفیوں کے متاخر گروہ میں ذیل کے بزرگوں کی تصانیف کو امتیاز حاصل ہے۔

۱۔ تذکرۃ الاولیا ۔ مصنف ۔ حضرت شیخ فرید الدین عطار [3] ۔ ۲۔ سیرۃ الاولیا مصنف حضرت محمد مبارک العلوی ۔ ۳۔ نفحات الانس ۔ مصنف حضرت مولانا نور الدین عبدالرحمان جامی [2]

۴۔ اخبار الاخیار ۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی [3]۔ ۵۔ الطاف الکریم ۔ مصنف ۔ حضرت علامہ عبدالوہاب الشعرانی [3]۔ ۶۔ سبحۃ الابرار مصنف ۔ شہزادہ دارا شکوہ

ان تصانیف کے علاوہ علامہ ابن خلدون نے اپنی مشہور تصنیفات ۔ کتاب العبر ۔ دیوان المبتدا والخبر کے مقدمہ میں تصوف کی تاریخ اور صوفیائے کرام کی واردات قلبی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اسلامی دنیا کے اس مشہور مورخ کی تصنیفات کو بڑی توقیر سے دیکھا جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے [3]

---

[1] تمدن عرب مصنف ڈاکٹر گستاؤلی بان مترجم شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی صفحہ ۳۸۸

[2] گلستان شیخ سعدی رح

[3] سیرۃ الاولیا من تصنیف مولانا سید محمد مبارک العلوی الکرمانی صفحہ ۳۶

اولیاء اللہ خدا تعالیٰ کی رضامندی اور اسکی خوشنودی کے لئے باہم ایک دوسرے کو دنیا میں دوست رکھتے ہیں خدا قیامت کے دن انکے چہرے روشن، ماہتاب سے زیادہ درخشاں ہونگے، اور نور کے منبروں پر میدان محشر میں جسوقت لوگوں کو خوف پیش آئیگی تو وہ اس خوف سے امن و امان میں رہینگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت مبارکہ پڑھی:

اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ

آگاہ ہو کہ خدا کے دوستوں پر کبھی خوف و غم طاری نہ ہوگا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ وہ اندھیرے کے چراغ، اور ہدایت و رشد کے سرچشمہ ہیں، اخلاق میں تکلف اور ریا کرنے سے بچتے ہیں، اولیاء کی یہ مدح و ثنا اس برکت کے سبب سے ہے، جب آنحضرت صلعم نے معراج مبارک کی رات میں خرقہ فقر کے خلعت سے مشرف و ممتاز ہوئے، جسے اپنے عمر میں سر مبارک سے اوتار کر خلفاء راشدین سے خاتم، رسول اکرم صلعم وصی جناب امیر المومنین حضرت اسد اللہ الغالب علی بن ابیطالب کرم اللہ وجہہ کو عنایت فرمایا جن سے اولیاء نامدار اور مشائخ کبار تک سلسلہ اور ہاتھوں ہاتھ پہونچتا رہا، جن کا مختصر ذکر یہاں پیش کیا جاتا ہے:

حضرت خواجہ حسن بصری: منقول ہے کہ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے ارادت کا خرقہ حضرت امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پہنا، اس بزرگ کے فضائل بے شمار ہیں، آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی ابی الحسن ابو سعید، حضرت زید بن ثابت سے آزاد کردہ تھے، خواجہ حسنؒ مدینہ طیبہ میں اس وقت تولد ہوئے تھے جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت میں دو سال باقی رہ گئے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دست مبارک سے ان کی تحنیک[1] فرمائی تھی۔ حضرت خواجہ حسن کی والدہ اُم المومنین حضرت بیبی ام سلمہؓ کی خادم تھی، ایکدن وہ کسی کام سے باہر چلی گئی تو حضرت خواجہ رونے لگے، حضرت بیبی ام سلمہؓ نے اس ہونہار بچے کو اپنی چھاتی مبارک کو منہ میں دی، خدا کی شان سے فوراً دودھ اتر آیا اور چند قطرہ خواجہ صاحب کے پیٹ میں اوتر گئے[2] خواجہ صاحب سے جو بعد برکتیں اور کرامتیں ظہور میں آئیں، ان کا سبب وہی دو باتیں ہیں۔ حضرت ام سلمہؓ ہمیشہ خواجہ حسنؒ کے حق میں دعا کرتی تھی، اور فرماتی تھی خداوند تعالیٰ اُسے خلق کا مقتدا اور پیشوا بنا[3]

حضرت خواجہ حسن بصریؒ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ کی شہادت کے بعد بصرہ چلے گئے تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بصرہ میں ملاقات کی تھی بہت سے صحابہ کرام، جن میں ابو عمر بن علاء، ابو موسیٰ، انس بن مالک، حضرت ابن عباس سے حدیث شریف روایت کی ہیں۔ آپ صرف اور علم زہد اور پرہیزگاری، عبادت و ریاضت میں وقت کے امام تھے۔ ابو عمر علاءؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت خواجہ حسن بصری اور جوادؒ بن یوسف تغلبی سے زیادہ فصیح کوئی نہیں دیکھا، آپ نے ماہ رجب ۱۱ ہجری میں وفات فرمائی، آپ کی مزار مبارک بصرہ میں ہے۔

حضرت بی بی رابعہ عدویہ بصریہؒ دنیائے اسلام کی مشہور عاشق الٰہی اور صوفی خاتون حضرت بی بی رابعہ بصریؒ کے والد کا نام اسمٰعیل تھا، جو بصرہ کے رہنے والے تھے حضرت رابعہ اپنے والدین کی چوتھی بیٹی تھی، اس لئے رابعہ نام رکھا گیا تھا۔ آپ کے والد بیحد غریب شخص تھے، اور صبر و تحمل سے اپنی زندگی بسر کر رہے تھے جس شب کو رابعہ کی ولادت ہو رہی تھی، اس وقت ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا، آپ کی بیوی کو اچانک درد زہ شروع ہوا، تو اپنے شوہر کو کہا کہ پڑوسی سے تیل ہی لے آئیں، لیکن اس غیرتمند شخص نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے اپنے آپ کو روکا ہمسایوں کے گھر تک گئے لیکن خالی ہاتھ واپس آئے بیوی کو احساس ہوا کہ میرا شوہر تہی دست ہے۔ غریب اپنی مجبوری پر افسوس کرتے ہوئے سو گئے، خواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا، آنحضرت

---

[1] تحنیک، پیدا ہونے کے وقت بچے کے منہ میں کھجور چبا کر دینے کو کہتے ہیں۔ جسے حضور صلعم نے اپنے موئے مبارک سے کھجور چبا کر حضرت امام حسنؓ کے منہ میں دی تھی۔

[2] الکمال فی اسماء الرجال مصنف محمد بن عبید اللہ بن محمد عرف شیخ ولی الدین (عربی) صفحہ ۲۱۴

[3] سیرۃ الاولیا مصنف حضرت سید محمد مبارک العلوی الکرمانی صفحہ ۲۰

صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے "غم نہ کر یہ لڑکی خدا تعالیٰ کی مقبول اور برگزیدہ ہے۔ ارشاد ہوا کہ تو امیر بصرہ سے جا کر کہہ دو کہ وہ روزانہ سو بار رات کو اور چار سو بار دن کو درود بھیجا کرے۔ مگر گذشتہ جمعہ کو تم نے یہ عمل نہ کیا۔ لہٰذا اس کے عوض چار سو دینار اس سوکھی قاصد کو دیدے" صبح کو انہوں نے حکم نبی صلعم کی تعمیل کی اور دربار میں پہنچے۔ امیر بصرہ کو پیغام نبوی کہہ سنایا، تو اس امیر کو کمال خوشی ہوئی کہ اسکا درود حضور کی دربار عالی میں قبول کی گئی۔ امیر نے دس ہزار درم مسکینوں میں تقسیم کئے اور اس پاکباز قاصد کو چار سو دینار پیش کیئے۔ بہرحال یہ بچی اس حالت میں تولد ہوئی اور اپنی بہنوں کے ساتھ بڑی ہو کر والدین سے دین علم اور قناعت کی باتیں سیکھیں۔ اس دوران والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس زمانے میں بصرہ فتنہ اور فساد سے محفوظ نہ تھا یہ شہر برباد کر دیا گیا۔ رابعہ اور ان کی بہنیں بھی بچ نہ سکیں وہ بھوک سے تنگ ہو کر سوکھے ٹکڑوں کی تلاش میں گھر سے نکلیں، چوروں نے انہیں پکڑ کر فروخت کر دیا۔ رابعہ ایک تاجر کے ہاتھ فروخت ہو گئیں۔ تاجر نے انہیں اور مقتضی کو بیچ دیا جس نے اسے کنیز بنا کر گھر کے کام میں لگا دیا۔ رابعہ نہایت فرمانبرداری اور خاموشی سے اپنے مالک کی خدمت کرتی رہیں۔ جو بڑا سنگدل تھا اس لئے اس نے رات دن کام لینا شروع کیا۔ جب بھی رابعہ کو فرصت ملتی تو نماز میں مشغول ہو جاتی تھی۔ رو رو کر پروردگار سے کہتی تھی۔ "اے میرے خدا! میں یتیم، مصیبت کی ماری غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں۔ اس کے باوجود میں تیری رضا کی طالب ہوں" ایک مرتبہ حسب معمول آپ عبادت الٰہی میں مشغول تھی۔ اس دوران ان کا مالک نیند سے بیدار ہوا اور دیکھتا ہے کہ رابعہ مناجات میں مشغول ہے اور کہہ رہی ہے

اے میرے خدا! دل کا حال تجھ پر روشن ہے میرے دل کی تمنا صرف یہ ہے کہ میں تیری خوشی فرمانبردار ہوں تیری حضور میں دیر سے حاضر ہوئی ہوں۔ میرے مالک تجھے صرف تیری رضا چاہتی ہوں" خواجہ نے جب آپ کو اس حالت میں دیکھا تو بہت متاثر ہوا۔ دوسرے دن صبح کو اس کے پاس آئے اور کہا آپ کی عبادت نے میرے قلب پر بڑا اثر کیا ہے۔ میں آپ کو آزاد کرتا ہوں۔ رابعہ نے آزادی حاصل کر کے راہ فلاح و بہبود کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ اور خدا والوں کی زندگی بسر کرنے لگی اور دن رات میں ہزار رکعتیں نماز و نوافل پڑھتی تھی اور رات کو روزہ افطار کرتی تھی۔ ان کو زیادہ وقت گریہ وزاری میں گزرتا تھا۔

حضرت رابعہ کی یہاں حضرت سفیان ثوری اثر رہتے تھے، جنہوں نے اس کو عذاب کا لقب دیا تھا۔ ایک زاہد نے بیان کیا کہ رابعہ کے ساتھ یاد الٰہی میں مشغول رہا دونوں میں معرفت الٰہی کی باتیں ہونے لگی بڑی دیر تک اسرار وجودی پر گفتگو جاری رہی تھی زاہد بہت مائل ہوا کہ وہ مرد ہے اور رابعہ عورت جب گفتگو ختم ہوئی تو اس شخص نے محسوس کیا کہ وہ بالکل نیک دست ہے اور حضرت رابعہ معرفت و اخلاق سے مالا مال ہے۔

بی بی رابعہ بصری نے کئی حج کئے تھے۔ پہلی بار جب وہ مکہ معظمہ کے قریب پہنچیں تو چشم پرنم سے کہا۔ اے خدا! میرا دل ٹوٹا ہوا اور غم سے بھرا ہوا ہے مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ میں مٹی کی مورت ہوں اور کہ پتھر کا۔ ایک میں تو بہت سنا چکے ہی سدا ہوں۔ فوراً الہام ہوا۔ اے رابعہ کیا تجھے موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ یاد نہیں کہ کوہ طور پر خدا کے انوار کی معمولی جھلک پڑی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ تو مجھے ان ظاہر الفاظ سے دیکھنے کی تمنا نہ کر۔ جب مکہ معظمہ پہنچے تو کیا دیکھتی ہے کہ کعبہ آپ کے استقبال کو آ رہا ہے۔ اسے دیکھ کر کہا کعبہ لیکر کیا کروں گی مجھے رب چاہیے کعبہ کے مقاصد سے خوش نہیں ہو سکتی۔ البتہ جمال محبوب سے مسرور ہو سکتی ہے۔

جہاں تک تصوف کا تعلق ہے، بی بی رابعہ کے وقت میں اس کی ابتدا تھی۔ اور اس نے اختیار کیا۔ اس لئے آپ کا شمار اولیاء صوفیوں میں سے ہے۔ قرآنی آیات دعائیں اور اشعار بلند آواز سے مخصوص صوفیانہ رنگ میں پڑھا کرتی تھی۔ جس سے عشق الٰہی پیدا ہوتا تھا۔ رابعہ کا آخری وقت بیماری میں گذرا، اور گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اپنے حجرہ میں سے باہر نہ نکلی۔ لوگوں نے ایک ندا سنی۔ "یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک"۔ اے آرام یافتہ نفس اپنے رب کی طرف رجوع ہو"

لوگوں نے دروازہ پر کھڑے ہو کر سنا، جب ان کی روح خالق اکبر سے جا ملی اور وہ کلمہ شہادت پڑھ رہی تھی۔ یہ واقعہ ۱۸۵ھ ہجری میں ہوا۔ آپ کا مزار مصر میں ہے۔

۱۔ سفینۃ الاولیا مصنف شہزادہ داراشکوہ ترجمہ محمد علی لطیف نفیس اکیڈمی کراچی صفحہ ۲۲۰ ۔ رابعہ بصری مصنف وداد الکعالیبی مترجم عبدالصمد الازہری

۲۔ حیات ابدی مصنف ام عصامہ خاتون صفحہ ۱۱۔

۳۔ تذکرۃ الاولیاء مصنف شیخ فریدالدین عطار مطبوعہ مجتبائی صفحہ ۴۸۔

حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ آپ جلیل القدر مشائخ طریقت میں سے ہیں، تجلیات کے حرم اور اسرار حق کے مظہر تھے اور تبع تابعین کا شرف حاصل تھا۔ محدث تھے حضرت شیخ جنید بغدادیؒ فرماتے تھے، "ابو یزید منا بمنزلۃ جبرئیل من الملائکۃ" "ہم میں بایزیدؒ کا مقام ایسا ہے جیسا کہ جبرئیل کا فرشتوں میں"

آپ نے بہت سے علماء دین کی خدمت کی نیز خصوصاً حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت ابو حفص یحییٰ، اور شقیق بلخی اور ان سے علم کی تحصیل بھی کی۔ علم تصوف کے حقائق سے استنباط کمال ان سے زیادہ کسی اور کو حاصل نہ تھا۔ وہ ہر حال میں علم دوست اور شریعت کی تعظیم کرنے والے تھے۔ ایک مشہور روایت ہے

ایک مرتبہ آپ مکہ معظمہ گئے اور محض خانہ کعبہ کو دیکھا، کہا حج قبول نہ ہوا۔ کیونکہ اس نے پتھر تو بکثرت دیکھے ہیں، دوسری مرتبہ گیا تو خانہ کعبہ اور صاحب خانہ کعبہ کو دیکھا، کہا ابھی تو عبدی حقیقت سے بیزار ہی ہوا، تیسری مرتبہ گیا تو صاحب خانہ کعبہ (خدا) کو دیکھا، اور کعبہ کو نہ دیکھا، آواز آئی اے بایزیدؒ! اگر تو اپنے آپکو دیکھتا اور ساری دنیا کو دیکھتا تو مشرک نہ ہوتا۔ تو نے تو اپنے آپ کو دیکھا ہے تو مشرک ہے، اس وقت میں نے اپنے آپ دیکھنے سے توبہ کی۔[1]

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ پر استغراق کی حالت تھی اور بار بار کہنے لگے "سبحانی ما اعظم شانی"۔ "تعریف میرے لئے ہے میری شان کتنی اعلیٰ ہے" آپ کے مریدوں نے اس بات کی شکایت کی۔ آپ نے کہا پھر اگر ایسے کلمات سنو تو ایک دم سے خنجر سے ہلاک کر دیا، کچھ عرصے کے بعد وہی کلمات سن کر ایک مرید نے فوراً خنجر نکال کر اپنے مرشد پر وار کیا، لیکن بایزیدؒ کو کچھ بھی نہ ہوا۔ اس کے برعکس خنجر چلانے والا زخمی ہو گیا۔ اور مر گیا۔ جب بعد میں روئداد سنائی گئی، تو جواب میں کہا وجد کی حالت میں میرا سینہ آئینہ کی مانند ہو گیا۔ جس میں اس مرید نے اپنا عکس دیکھا۔ اس نے تو خنجر اپنے جسم میں لگایا۔ اکثر کہتے تھے کہ جب میں اپنے آپ سے دور نظر کی تب مجھے تینوں چیزیں ایک دکھائی دیں۔ یعنی عاشق، معشوق، اور عشق۔

حضرت شیخ جنید بغدادیؒ آپ تبع تابعین میں سے ہیں۔ طریقت میں شیخ اور شریعت میں امام ہیں۔ آپ کا اسم گرامی ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید البغدادی تھا آپ کا لقب قواریری اور زجاج وخراز تھا۔ آپ کے والد شیشہ بیچتے تھے اور آپ ریشم کا کام کرتے تھے۔ حضرت سفیان ثوریؒ آپ کے مصاحب تھے۔ حضرت جنیدؒ بچپن میں سری سقطیؒ جو اپنے وقت کے بڑے بزرگوں میں سے تھے آپ کی زیر نظر تعلیم حاصل کی کیونکہ حضرت سری سقطیؒ آپ کے ماموں تھے، اور ان کی توجہ اور تعلیم سے حضرت جنیدؒ کو درجہ ملا۔ حضرت جنیدؒ نے تیس سال مسلسل سخت مجاہدے کئے جس سے روحانیت اس درجہ تک پہنچی کہ بعض اوقات خود مرشد حضرت سری سقطیؒ مقامات سلوک میں رائے لیتے تھے۔ حضرت سری سقطیؒ سے لوگوں نے پوچھا، کیا کسی مرید کا درجہ اپنے مرشد سے اونچا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہاں۔ اس کی دلیل ظاہر ہے جنیدؒ کا درجہ مجھ سے زیادہ ہے۔ یہ مشہور ہے کہ حضرت سری سقطیؒ کی زندگی میں مریدوں نے حضرت جنیدؒ سے عرض کی کہ ہمیں ایسی نصیحت فرمائیے جس سے ہمارے دل راحت ہو جائیں، انہوں نے عرض قبول نہ کی اور فرمایا میرے مرشد کے ہوتے ہوئے کون نصیحت کر سکتا ہے۔ فقط ایک رات انہوں نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیدار کیا، آنحضرت صلعم فرماتے ہیں اے جنید! لوگوں کو واعظ نصیحت کر خدا تعالیٰ نے تمہارے کلام کو ایک دنیا کی جان کا سبب قرار دیا ہے۔ جب وہ بیدار ہوئے تو دل میں خیال کیا، میرا درجہ حضرت سری سقطیؒ سے بڑھ گیا ہے۔ اس لئے تو حضور صلعم کا ارشاد ہوا ہے۔ صبح ہوئی تو حضرت سری سقطیؒ نے ایک مرید بھیجا اور کہا جنید سے کہہ کہ مریدوں کی درخواست پر ہم نے کوئی نصیحت نہ کی مشائخ بغداد کی مخالفت ہی دیکھی۔ اب حضور صلعم نے فرمایا ہے، آپ کے حکم کی تعمیل ضرور کرنی ہے۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا شیخ کے ارشاد سے میرا وہ خیال دماغ سے نکل گیا۔ سمجھ لیا کہ حضرت سری سقطیؒ پر میرا تمام حال آئینہ ہے، چنانچہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر توبہ کی۔ اور کہا میرا یہ حال کیوں کر جان گیا۔ آپ نے فرمایا میں نے خدا تعالیٰ کو خواب میں دیکھا، فرمان ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دے کہ جنید سے کہیں کہ وہ وعظ و نصیحت کریں تاکہ اہل بغداد کی امید بر آئے

---

[1] سفینۃ الاولیاء مصنف دارا شکوہ صفحہ ۱۰۵۔ [2] انوار اصفیا مرتب ادارہ تصحیح و تالیف۔

[3] ایضاً ــــــ ــــــ ــــــ [4] نفحات الانس مصنف حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ

حسین بن منصور حلاج منصور حلاج کا نام حسین بن تھا۔ ان کے والد نو مسلم تھے۔ جو ایران کی ایک بستی بیضا کے رہنے والے تھے، وہیں حسین بھی پیدا ہوئے۔ منصور اپنے اہل وعیال سے ہجرت کرکے سوشتر کے شہر میں سکونت اختیار کی۔ وہاں حسین حضرت سہیل بن عبداللہ کے شاگرد ہوئے۔ اٹھارہ سال کی عمر تک انکی خدمت میں رہ کر ظاہری علوم کی تحصیل کی۔ بعد میں عرب کی طرف چلے گئے وہاں اس وقت تصوف نے اپنا سا رنگ دکھانا شروع کیا تھا، جس میں وقت کے بڑے عالم شریک ہو رہے تھے۔ حسین بھی اس نئی تحریک میں شامل ہوگئے۔ شروع میں حضرت ابوالحسن نوری[1] اور حضرت جنید بغدادی جیسے بزرگوں کی صحبت نصیب ہوئی۔ ان سے علم تصوف میں بہت کچھ سیکھا۔ وہاں سے بصرہ گئے جہاں حضرت عمرو بن عثمان مکی[2] کی خدمت میں رہ کر ان پر عجیب رنگ چڑھنا شروع ہوا۔ حضرت عمرو بن عثمان نے تصوف پر بہت سی کتابیں لکھی تھیں، ان کو اکثر اپنے ساتھ رکھتے تھے، مگر کسی کو بھی نہ دکھاتے تھے۔ کسی نہ کسی طرح ان کی ایک کتاب منصور کے ہاتھ لگ گئی، جسکے مطالعہ سے ان پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ اور وہ باتیں جو ایک صوفی کو عوام کے سامنے کہنا خلاف مصلحت تھی، سربازار کھڑے ہوکر لوگوں کو سنانے لگے۔ عوام اس اسرار و رموز کی باتیں کیسے سمجھ سکتے تھے۔ اس باتوں سے خلاف ہوگئے۔ یہ حالات دیکھکر مرشد بھی بیزار ہوگئے۔ منصور نے بصرہ کو چھوڑ کر بغداد میں جاکر حضرت جنید[3] سے ملے اور یہاں بھی وہی باتیں کرنے لگے۔ اور حضرت جنید سے عجیب سوالات کیئے۔ آپ نے جواب میں فرمایا، "منصور وہ وقت دور نہیں کہ جب لکڑی کا سرا تیرے خون سے لال ہوگا۔" منصور نے کہا "آپ بھی اپنا لباس اس سے پہلے تبدیل کر لیجئے۔" بغداد کو چھوڑ کر اپنے شہر سوشتر چلے گئے۔ وہاں طبیعت اعتدال پر آگئی۔ اور عاشقانہ شان سے رہنے لگے۔ لوگ آپ کے گرویدہ ہوگئے۔ لیکن پھر وہی حوس پیدا ہوا۔ اور سب کچھ چھوڑ کر سیاحت اختیار کرلی جہاں بھی گئے لوگوں کو فیض پہنچاتے رہے۔ اس کے بعد مکہ چلے گئے۔ اس سفر میں چار سو معتقد ساتھ تھے۔ حج سے فارغ ہوکر سب کو رخصت کیا اور خود کعبہ کے سامنے ننگے پاؤں کھڑے ہوکر سال بھر ریاضت کی سخت جاڑے اور سخت گرمی میں سال پورا کیا، حتیٰ کہ ان کی کھال اکھڑنے لگی اور چربی پگھل کر بہنے لگی۔ دن میں صرف ایک روٹی غیب سے ملجاتی تھی۔ اس سے دن رات گزارہ افطار کرتا تھا۔ دوسرا حج ادا کرکے مصلحت کو نکلے۔ عجیب استغراق کی حالت طاری رہتی تھی۔ عوام تو خیر خود ان سے بڑے عالم بھی ان کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہوگئے۔ حضرت شبلی[4] سے ملے، جنہوں نے سمجھایا کہ دوست کے راز کو چھپانا چاہئے۔ ان کی باتوں کا اثر تو ہوا لیکن اس ضبط کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن "انا الحق" کا نعرہ لگانا شروع کیا۔ علماء نے اس کفر کے کلمے سے روکا، لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ کیفیت دن بدن بڑھتی گئی۔ ایک دن یہ قصہ کہی:-

أنا من أهوى ومن أهوى أنا ـــ نحن روحان حللنا بدنا

فإذا أبصرتني أبصرته ـــ وإذا أبصرته أبصرتنا

میں وہی ہوں جسے میں چاہتا ہوں، اور جسکو میں چاہتا ہوں وہ میں ہوں ہم دونوں دو روحیں ہیں جو ایک قالب میں۔ اس لئے جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو میں بھی اسے دیکھتا ہوں۔

لوگوں نے علماء کے حضور جاکر شکایت کی علماء نے صوفیہ علماء سے مشورہ کیا، اور منصور پر کفر کا فتوا لگایا گیا۔ لیکن منصور اپنی حالت میں مست تھے، حق حق، انا الحق

---

[1] حضرت شیخ ابوالحسن نوری اپنے وقت کے جید عالم تھے، نور کے رہنے والے تھے۔ آپ کا قول ہے "تمام لذات نفس کو ترک کرنے کا نام تصوف ہے" آپ نے فرمایا ہے "من لم یعرف اللہ تعالیٰ فی الدنیا لم یعرفہ فی الآخرۃ" جس نے خدا تعالیٰ کو دنیا میں نہیں پہچانا، وہ آخرت میں اس کو نہ پہچان سکے گا۔

[2] حضرت شیخ عمرو بن عثمان مکی الصوفی، سید الطائفہ کے مرید تھے، حسین بن منصور حلاج کے استاد تھے۔ آپکا کلام زیادہ باریک ہوتا تھا لوگوں نے آپ سے قطع تعلق کرلیا تھا، مکہ سے باہر کردیا تھا۔ حسین بن منصور پر جو کچھ ہوا وہ آپ کی دعا کے اثر سے، کیونکہ منصور نے انکو رنج پہنچایا تھا۔ ان کی وفات بغداد میں ہوئی۔

[3] حضرت ابوبکر شبلی رح تبع تابعین میں سے تھے۔ آپ بڑے بزرگ اور مشائخ میں سے تھے۔ حضرت شبلی نے منصور کے متعلق فرمایا ہے "انا والحلاج فی شیٔ واحد مخلص جنونی واہلکہ عقلہ" (میں اور حلاج ایک ہی حال میں ہیں بس مجھے میرے جنون نے چھوڑ دیا، لیکن ان کے عقل نے انہیں ہلاک کردیا۔)

کہتے رہے۔ یہاں تک کہ قتل کا فتویٰ صادر کر دیا گیا مخالفین کی بڑی کوشش ہوئی کہ کسی طرح منصور کو سزا ملے تو خلیفہ مقتدر باللہ کے وزیر حامد بن عباس سے جا کر ملے اور اس بات کو عباسی رنگ دیکر بتایا اور وزیر بھی منصور کے درپے ہو گئے اور علماء سے اسکے قتل کی فتویٰ طلب کی، جو کہ بیک قتل کا فتویٰ دینے پر تیار نہ تھے، لیکن مخالفت کی آگ بڑھی ہوئی تھی آخر منصور کی ایک ایسی تصنیف ڈھونڈ کر لائے جس میں کچھ باتیں شریعت کے خلاف لکھی ہوئی تھی جس دیکھکر علماء متفق ہو گئے اور وزیر نے خاص پر زور دیا کہ وہ قتل کی فتویٰ لکھدیں قاضی نے وزیر کی ناراضگی کا خیال کرتے ہوئے فتویٰ لکھدیں جس پر حاضر علماء نے دستخط کر دیئے۔ وزیر نے منصور کو قید میں بند کر دیا، اور قتل کے لئے کل روئیداد خلیفہ کے سامنے پیش کی خلیفہ نے جواب دیا، جب تک پنج صد تعداد واجب القتل نہ لکھدیں میں کوئی حکم نہ کرونگا۔ حضرت جنید نے علماء دین کی فتویٰ دیکھا حالانکہ خود اس معاملے میں آنا نہیں چاہتے تھے فوراً صوفیاء لباس اُتار کر علماء لباس پہنا، اور اس طرح لکھا۔ ظاہر کے لحاظ سے قتل کا فتویٰ دیا جاتا ہے مگر باطن کا حال رب جانتا ہے خلیفہ نے پورا ایک سال اس معاملے کو روکے رکھا۔ آخر ۲۴ ذیقعدہ ۳۰۹ھ میں منصور کو قتل گاہ میں لایا گیا، جس دن سولی دی جا رہی تھی اُس دن تعداد میں اتنی خلقت جمع ہو گئی تھی کہ اسکا اندازہ بیان قیاس سے باہر ہے وزیر نے جلاد سے ایک ہزار کوڑے لگائے۔ اگر اُس سے دم نہ نکلے تو ایک ہزار اور کوڑے لگائے جائیں دو ہزار کوڑے لگائے گئے لیکن اس عاشق خدا نے اف تک نہ کی ملک خلقت کو دیکھکر نعرہ لگاتا تھا۔ جس انا الحق کا ایک فقیر سے آگے بڑھ کر سوال کیا اے منصور عشق کسے کہتے ہیں جواب دیا، آج، کل اور پرسوں دیکھ لوگے، آج عاشق کو سولی دیجائے گی، کل اسکو جلایا جائیگا، اور پرسوں اسکی خاک اُڑائی جائے گی۔ ایک شخص نے پوچھا منصور تم نے یہ کیا کیا ہے جواب دیا ہے بادشاہ کی حضور میں جانے کے لئے یہی روش کی جاتی ہے۔ حضرت شبلیؒ نے پوچھا اے منصور تصوف کیا ہے، جواب جو کچھ آنکھوں سے دیکھتے ہو وہ تو تصوف کا ایک سرا ہے۔ شبلیؒ نے پوچھا اسکا اصل سر کیا ہے، جواب وہ تیرے بس سے باہر ہے منصور پر لوگوں نے پتھر برسانے لگے۔ جب ان کے ہاتھ کاٹے گئے تو کہا، اس عورت کے ہاتھ کاٹنا تو آسان ہے، لیکن وہ ہاتھ جو حق کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں ان کو کاٹنا آسان نہیں ہے۔ ان کے پاؤں کاٹے گئے کہا، ان پاؤں سے میں دنیا کی سیر کرتا تھا، لیکن میرے پاس اور بھی پاؤں ہیں جن سے دونوں جہانوں کی سیر کر سکتا ہوں، اُن کو بھی کاٹ ڈالو اگر طاقت ہے" منصور زمین پر گر پڑے اور اپنے کلائیوں سے خون بھر رہا تھا، اپنے منہ پر ملنے لگا، لوگوں کے پوچھنے پر جواب دیا کہیں تم لوگ یہ نہ سمجھیں کہ درد برداشت نہ کر سکنے سے خون دینے سے زرد ہو گیا ہے، پھر منصور کی آنکھیں کھینچ کر نکالی گئیں۔ تب لوگوں میں دہشت کہرام مچ گیا۔ جب ان کی زبان کاٹنے کے لئے نزدیک آئے تو کہا صبر کرو، اور کہا

زاہد بخیال خویش مستم داند — کافر بگمان خدا پرستم داند

فردم غلط فہم مردم مردم — اے کاش کسے ہمراز ہستم داند

آسمان کی طرف سر اُٹھا کر کہا، یا اللہ ان مکلیفوں اور عقوبتوں کے صدقے، ان لوگوں پر رحم فرما! دیکھ میں اس سولی پر تیرا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ زبان کاٹنے کے بعد اُن کا سر تن سے جدا کیا گیا، خون جو اُنکے جسم سے نکل رہا تھا، زمین پر ہر قطرہ سے انا الحق کا نقش بن جاتا تھا۔ جلانے سے پہلے انکے ایک ایک رونگٹے سے انا الحق کی صدا آتی رہی۔ جب اس کے جسم کی خاک کو دریا دجلہ میں ڈالا گیا تو دجلہ میں ایسا سخت طوفان آیا کہ شہر ڈوبنے لگا۔

منصور علیہ الرحمہ نے نعرہ انا الحق لگایا، تو اُن کے بعد صوفیوں نے اس نعرہ کو عملی جامہ پہنایا، اور تصوف بن کر خالص عشق عرفان کا مت بن گیا۔ منصور بڑے زاہد اور عالم و فاضل تھے۔ معارف اور شریعت پر بڑی دقیق کتابیں لکھی تھی، اور ان کے نہایت فصیح و بلیغ اقوال زریں موجود ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"ترک دنیا نفس کا زہد ہے ترک آخرت دل کا زہد ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان صرف دو قدم کا فاصلہ ہے۔ ایک قدم دنیا سے اُٹھالو اور دوسرا عقبیٰ سے پھر مولا سے مل جاؤ گے۔ صوفی اوصاف ہیں۔ صوفی واحدانی ذات ہے"

حافظ شیرازیؒ نے اُن کی عقیدت میں فرمایا ہے

چوں منصور از مراد انا کہ برادرش برد ابند

کہ با این درد اگر بند درمانند ہر مانند

حضرت ذوالنون مصری قدس سرہ | آپ تبع تابعین، علماء و مشائخ میں سے تھے۔ آپ کا اسم گرامی ثوبان بن ابراہیم، اور نوبی نسل میں سے تھے۔ ابوالفیض ذوالنون لقب تھا۔ آپ کی ولادت ۲۲۵ھ ہجری کو مصر میں ہوئی۔ آپ نے اپنی زندگی گوشہ نشینی میں گذاری۔ جب تک زندہ تھے تو لوگ آپ کے منکر تھے۔ جس رات انتقال فرما رہے تھے اسی رات کو ستر آدمیوں کو خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضور صلعم فرما رہے تھے۔ خدا کا دوست ذوالنون آرہا ہے میں اس کے خیر مقدم کو آیا ہوں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو لوگوں نے ان کی پیشانی پر یہ تحریر لکھی ہوئی دیکھی۔ "ھذا حبیب اللہ مات فی حب اللہ قتیل اللہ" (یہ خدا کے دوست ہیں انہوں نے خدا کی عشق میں وفات پائی۔ خدا کے شہید ہیں) اسلامی تصوف کی تاریخ پر نظر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ پہلے بزرگ ہیں جن کی سے نظریہ "وحدت الوجود" خیالات منسوب کئے جاتے ہیں۔ تصوف میں آپ کا درجہ بہت بلند تھا۔ جب آپ نے وفات فرمائی اور جنازہ اٹھایا تو ایک بڑا پرندوں کا غول جنہوں نے اپنے پروں سے پر ملا کر آپ کے جنازہ پر سایہ کر کے اڑ رہے تھے راہ میں مؤذن کی آذان سنائی دی، اور کلمہ شہادت پر آپ کی انگلی اٹھی۔ لوگوں نے یہ حالت دیکھ کر شور کیا کہ شاید وہ زندہ ہے چنانچہ جنازہ رکھا گیا۔ لیکن دیکھا کہ کوئی جان نہیں ہے، لیکن انگلی نیچے نہ ہوئی اسی حالت میں ان کو دفن کیا گیا۔ مصر کے لوگوں نے جب یہ حالت دیکھی تو اپنی ناروا حرکات پر نہایت پشیمان ہوئے۔

آپ نے فرمایا تھا جب کبھی پیٹ شکم سیر ہو کر کھانا کھایا تو کوئی نہ کوئی خدا تعالیٰ کی نافرمانی کا باعث کیا۔ آپ کی مزار مصر میں ہے۔ اور اس پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے جو کسی انسان کی لکھی ہوئی تحریر نہیں ہے "ذوالنون حبیب اللہ من الشوق قتیل اللہ"

امام ابوالقاسم القشیری | امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری خراسان میں ربیع الاول ۳۷۶ھ ہجری میں تولد ہوئے۔ یہیں میں ہی یتیم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم ابوالقاسم سیاق سے حاصل کی جو عربی ریاضی کے نامور استاد تھے۔ خدا رسی کی شوق میں شیخ ابوعلی دقاق کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تھوڑے عرصہ میں انہی کی دختر نیک سے نکاح ہوا۔ ابوعلی کی وفات کے بعد شیخ عبدالرحمان سلمی (صاحب طبقات الصوفیاء) سے مستفید ہوئے۔ اپنے دور کے فاضل اور مشائخ میں سے تھے۔ اور کثیر تصانیف لکھیں جن میں اکثر تصوف پر ہیں۔ آپ کی مشہور تصنیف "رسالۃ القشیری فی علم التصوف" جو ۴۳۲ھ ہجری میں عالم اسلام کی جماعت صوفیہ کو خطاب کر کے لکھی تھی۔ امام القشیری ۱۶ ربیع الثانی ۴۶۵ھ ہجری میں وفات پائی اس وقت آپ عمر ۸۶ سال کی۔ امام موصوف نے رسالۃ القشیری میں علم تصوف اور طریقہ تصوف کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے جسے حضرت مولانا جامی رح نے اپنی تصنیف نفحات الانس میں لفظ بہ لفظ نقل کی ہے۔ امام القشیری نے تصوف کی اصلی ماہیت کو بیان کرتے ہوئے حضرت بشر حافی کا ایک واقعہ درج کیا ہے۔

قال رایت النبی صلعم فی المنام، فقال لی یا بشر قدری لم رفعک اللہ من بین اقرانک لا یا رسول اللہ قال بانباعک سنتی و خدمت الصالحین و نصیحتک لاخوانک، وصل بیتی، ھو الذی بلغک منازل الابرار

حضرت بشر حافی، خواب میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت زیارت سے مشرف ہوئے، ارشاد ہوا، بشر تجھے معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ نے تجھے تیرے معاصرین میں اتنا معزز کیوں فرمایا ہے، عرض کیا معلوم نہیں، ارشاد ہوا کہ تو نے میری سنت کی پیروی کی اور صالحین کی خدمت اپنے بھائیوں کی خیر اندیشی کی اور میرے احباب اور اہل بیت سے محبت، یہ سب چیزیں تھی جس کی بدولت تو ابرار کے درجہ پر پہنچا۔

نفحات الانس مصنف مولانا نورالدین محمد عبدالرحمان جامی رح صفحہ ۳۶

شیخ ابوعلی دقاق کا اسم گرامی حسن محمد دقاق ہے۔ آپ ملک نیشاپور کے امام تھے۔ نصر آبادی کے مرید تھے۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گذارا۔ آخری وقت میں نیشاپور میں گذرا۔ امام القشیری سے روایت ہے کہ آپ زندگی کے آخری ایام میں ہر شام کو مکان کے بالائی حصہ پر چڑھ کر سورج کی طرف رخ کر کے کہتے تھے۔ اے جہاں کے راہرو آج تیری کیا گذری کہاں کہاں غروب کے اوپر جھکے کچھ نیچے رہنے والوں کی بھی تو نے خبر رکھی کہ ان پر کیا گذری (نفحات الانس مصنف مولانا عبدالرحمان جامی رح صفحہ ۳۲۲)

سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ | عالم اسلام میں اولیائے کرام کے سردار اور مقدس و مطہر ہستی ہیں۔ آپ اپنے وقت کے بڑے صوفی تھے، اپنی روحانی قوت اور نورانیت سے دین اسلام کی خدمت کرکے سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو زندہ اور روشن کیا۔ آپ کی بے مثال زندگی و سیرت بنی نوع انسان کے لئے قابل تقلید ہے۔ آپ کا اسم گرامی سیدنا عبدالقادر لقب محی الدین کنیت ابو محمد اور موت اعظم و رہبر ہے۔ آپ کی ولادت ۳۷۰ھ ہجری ایران کے ایک گاؤں گیلان میں ہوئی، اسی گیلان کی نسبت آپ کو گیلانی کہتے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی سید ابو صالح موسیٰ جنگی تھا۔ اور والدہ ماجدہ ام الخیر امۃ الجبار بیبی فاطمہ تھا۔ آپ کے والد حسنی اور والدہ حسینی سید تھی۔ آپ دس سال برس کے ہوئے تو والد بزرگوار کا انتقال ہوا۔ آپ کی پرورش نگہداشت والدہ کے نام ہوئی۔ آپ دس سترہ برس کے ہوئے تو علم کی تحصیل کے لئے بغداد کی طرف تشریف فرما ہوئے۔ اس زمانے میں بغداد علم کا گہوارہ تھا۔ بغداد پہنچ کر آپ نے ابو حامد بن یوسف[1] سے قرآن مجید حفظ کیا۔ اور بڑے بڑے علماء کرام سے علم شریعت اور فقہ میں تحصیل حاصل کی۔ اور دن رات عبادت میں مشغول رہنے لگے۔ بیس سال اس عالم میں گذارنے کے بعد آپ کو یہ درجہ حاصل ہوا۔ شیخ ابو سعید مخزومی رح کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ اس بزرگ نے آپ کو خرقہ خلافت بھی عطا کیا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عنایت فرمایا تھا جو حضرت خواجہ حسن بصری رح کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پہنچا تھا جن سے دست بدست شیخ ابو سعید مخزومی رح سے آپ کو ملا۔ اس خرقہ کے پہننے کے بعد حضرت غوث اعظم[1] پر برکات و عنایات الٰہی کا ظہور ہوا۔ آپ کا زمانہ خلفائے عباسیہ کا دور تھا۔ لوگ بدعمل اور نفس کی حرص میں مستغرق تھے۔ دین اسلام میں فتنے طرح طرح کے ہو گئے تھے۔ اس وقت حضرت غوث اعظم نے وعظ و درس و نصیحت کلمۃ الحق سے خلق کی اصلاح میں کوشاں ہوئے جو کہ حضور پاک کے روحانی حکم سے لوگوں رشد و ہدایت میں لگ گئے۔ آپ کے ہاتھ پر پانچ ہزار یہودی و نصاریٰ نے اسلام قبول کیا۔ اور ایک لاکھ سے زائد گنہگاروں نے آپ کے دست مبارک پر توبہ کی۔ آپ کا وجود اسلام کا زندہ معجزہ تھا۔ شیخ حارث بن عثمان فرماتے ہیں، حضرت غوث الثقلین زہد و تقویٰ اور کمالات معرفت میں یگانہ روزگار اور عبادت و ریاضت میں بے مثل تھے۔ آپ صاحب کرامات تھے، جن کا کوئی حساب نہیں ہے۔ آپ کی وفات دن کے غروب ہونے کے وقت پیر کے دن تاریخ گیارھویں ماہ ربیع الثانی ۵۶۱ھ ہجری میں ہوئی۔ آپ کی عمر ۹۱ سال تھی۔ آپ کی مرقد مبارک بغداد میں ہے۔

آپ کا طریقہ عالیہ قادریہ ہے، جو کہ آپ کے اسم گرامی کی مناسبت سے یہ سلسلہ قادریہ کہلاتا ہے۔ آپ نے روحانی طور پر خاص حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے روح مبارک سے باطنی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے چار شادیاں کی تھیں آپ کے بائیس بڑے صاحبزادے حضرت شیخ عبدالوہاب تھے۔ آپ کی تصنیفات میں تین مشہور ہیں ۱۔ غنیۃ الطالبین

۲۔ فتوح الغیب :۔ یہ آپ کی مشہور تصنیف ہے، جس میں تصوف اور معارف پر کتاب اور مقالات موجود ہیں۔ اس کتاب کو شاہ عبدالحق محدث دہلوی رح نے عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا

۳۔ فتح ربانی :۔ اس کتاب میں ۶۲ خطبات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ قصیدہ غوثیہ جو حضرت اعظم رح نے اپنے متعلق فرمایا تھا۔ کل عربی میں اکیس اشعار ہیں۔ چند مثالیں نقل کرتا ہوں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شَغَفَ الْحُبُّ کَاسَاتِ الْوِصَالِ ۔۔۔ فَقَلْتُ الْغَمْرَ نَحْوِی تَعَالِی

شَفَّنِی وَصَبَّ لَبِّی فِی کُؤُسِی ۔۔۔ فَصَبَّتْ بَکْرُ فِی بَیْنِ الصَّوَانِی

اَنَا الْحُسَّی وَلِلْحُسَّی مَقَامٌ ۔۔۔ قَدَمِی عَلٰی عُنُقِ الرِّجَالِ

وَعَبْدُ الْقَادِرِ الْمَشْهُورُ اِسْمِی ۔۔۔ وَجَدِّی صَاحِبُ عَیْنِ الْکَمَالِ

چہل کافی :۔ یہ تین اشعار ہیں جو کہ آپ سے منسوب کئے جاتے ہیں[4]۔

کفاک ربک بکفیک وکفہ کفا کا فما کدجس کان لکک ۔۔۔ نکرکرا نکرالکری کبدہ تحکی منکنکۃ کلکب لکک

کفاک مالی کفاک الکاف کرمیۃ با کرکبا کان بحکی کوکب الدلک ۔

---

[1] غوث اعظم مرتب امان اللہ خان اوکاڑوی (قلائد الجواہر) صفحہ ۵۰ [2] رسالہ چہار اخلاق ربیع الآخر سنہ ۱۳۲۵ ہجری

[3] قصیدہ غوثیہ حیات نور محمد نور خالدی نقشبندی [4] چہل کافی ۔ مسلم خادمی ملی نسخہ جامع مخدومی حاجی امام بخش خادم منکارچوری سندھ

امام محمد الغزالیؒ | حجۃ الاسلام حضرت امام محمد بن محمد الغزالی الطوسیؒ، اپنے وقت کے بڑے عالم و محدث تھے۔ وہ علمی دنیا میں ایک مجمع البحرین تھے۔[1] آپ کی کنیت امام محمد لقب زین الدین طوسی کے رہنے والے تھے۔ آپ اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ کیونکہ بیک وقت ایک جلیل القدر فقیہ تھے، اور بہت بڑے صوفی تھے۔ آپ کی شخصیت ہیں۔ جس نے علم تصوف کو علمی حیثیت سے ترتیب دیا۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں[2]

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں دونوں طریقوں کو اکٹھا کیا ہے۔ اس ارباب عالی کے آداب اور طریقے بتائے ہیں اور صوفی و صوفیانہ اصطلاحوں کی شرح لکھی ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ تصوف بھی ایک باقاعدہ علم بن گیا۔

آپ نے پہلے علوم ظاہر کی باقاعدہ تحصیل کرنے کے بعد، بغداد کے مدرسۂ نظامیہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ چار سال تک اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ لیکن اس دوران آپ کی طبیعت ظاہری علوم سے اکتا گئی۔ روحانی تشنگی کو مٹانے کے غرض سے انہوں نے تصوف کی طرف متوجہ ہوئے۔[3] اس علم کو بحیثیت عملی طور پر حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ اور دمشق پہنچ کر مجاہدہ و ریاضت میں مشغول ہوئے۔ اس طرح آپ کی شخصیت عالم اسلام میں بڑی موثر ثابت ہوئی۔ آپ نے اصطلاحوں میں اضافہ کیا۔ آپ کی تصانیف میں سفر، سالک، شطح، فنا، بقا، محو، اثبات، حاضرہ، اور مکاشفہ وغیرہ کا ذکر تفصیل سے موجود ہے۔ تصانیف میں تفسیر یاقوت، احیاء العلوم، جواہر القرآن، اور کیمیائے سعادت مشہور ہیں۔ آپ نے ۵۰۵ھ ہجری میں وفات فرمائی وقت عمر ۵۵ سال کی تھی۔ آپ کی مرقد مبارک بغداد میں ہے۔

حضرت محی الدین ابن عربیؒ | حضرت شیخ محی الدین اکبر ابن علی بن العربی قدس سرہ اپنے زمانے کے اکمل اکابلین میں سے تھے۔ جس قدر رموز تصوف آپ نے بیان فرمائے ہیں، کسی اور بزرگ نے بیان نہیں کیے۔ وحدت الوجود کے قائلین کے امام تھے۔ آپ سے کرامات اور خوارق عادات لاتعداد میں صادر ہوئے۔ آپ کی تصانیف میں جو رموز اور مطالب بیان ہیں ان کا مطالعہ کرنا حق تعالیٰ سے قربت حاصل کرنا ہے۔ آپ نے ۵۶۰ھ ہجری مطابق ۱۱۶۵ء میں اندلس (سپین) بمقام مرسیہ میں ولادت پائی، مگر بعد میں شام جا کر مقیم ہوئے۔ اور دمشق میں زندگی کے آخری ایام گذارے۔ حضرت فخر الدین رازیؒ فرماتے ہیں:۔

"امام محی الدین ابن العربی" بہت بڑے جلیل القدر ولی اور اپنے زمانے کے قطب الاقطاب تھے"

شیخ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں: "شیخ اکبر مارفوں کے مربی تھے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بہ قدم چلنے والے تھے" انہوں نے حضرت شیخ اکبر کے منکروں کے جواب میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام تنبیہ النبیہ فی تبریہ ابن العربی ہے۔[4] بقاعیؒ نے لکھا ہے:۔

امام ابن سعد یافی کہتے تھے کہ حضرت شیخ اکبرؒ کو وراثت عظیمہ حاصل تھی۔ فتوحات مکی کے باب میں شیخ اکبرؒ نے اپنے ایک مکاشفہ کا ذکر فرمایا ہے[5]

ایک مرتبہ، عالم واقعہ میں حضرت ادریس علیہ السلام سے ملا اور ابتدائے عالم کے متعلق کچھ پوچھا۔ آپ نے فرمایا، مجھے مدت عالم ابتدا کا حال معلوم نہیں، اور نہ یہ جانتا ہوں کہ مخلوقات کس حد تک پیدا ہوتی رہیں گی۔ کیونکہ ہر نفس کے ساتھ ایک نئی خلقت پیدا ہوتی ہے اور اللہ جل شانہ کی صفت خلق ابدی ہے۔ جب سے ہے ہمیشہ رہے گی۔ اور دنیا و آخرت ہمیشہ رہیں گی۔ میں نے کہا، یا نبی اللہ قیامت کی کوئی علامت مجھے سے فرمائیے ارشاد ہوا، "جب آدم قریب کا وجود اس کی بڑی علامت تھی" میں نے کہا کہ حضرت آدم کے بعد بھی کوئی دار اس کے سوا ہے۔ فرمایا کہ یہاں ایک دار وجود میں ہے اور دنیا تمہیں لوگوں کے سبب ہی دنیا ہوئی

---

[1] اسلامی تصوف اور اقبال مصنف ڈاکٹر ابو سعید نور الدین صفحہ ۳۱۲۔

[2] مقدمہ ابن خلدون مولف علامہ عبد الرحمان ابن خلدون صفحہ ۴۸۸

[3] الغزالی مصنف شبلی نعمانیؒ صفحہ ۲۵

[4] نفحات الانس مصنف حضرت مولانا جامیؒ صفحہ ۵۸۲

[5] فتوحات مکی مصنف حضرت محی الدین اکبرؒ مصنف مکہ محمد الدین صفحہ ۷

حافظ عبداللہ ذہبی، حضرت شیخ اکبرؒ کے نہایت مخالف تھے۔ ایک بار لوگوں نے ان سے پوچھا کہ امام محی الدین عربی نے "فصوص الحکم" کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لکھا، تو انہوں نے باوجود سخت مخالفت کے جواب دیا، ایسا جھوٹ علامہ کبھی نہیں بول سکتے، یہ سچ ہے[1]

حضرت شیخ اکبرؒ کو تصوف میں ایک واسطے سے حضرت شیخ سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ سے خرقہ ملا تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام سے بھی ایک واسطہ میں علوم باطن حاصل ہوا۔ خود فرماتے ہیں[2] —

"جیسے اس خرقہ کو شہر موصل کے باہر ۶۰۱ھ ہجری میں ابوالحسن علی بن عبداللہ بن جامع سے پہنا۔ اور ابن جامع نے حضرت خضر علیہ السلام سے

حضرت شیخ اکبرؒ نے بہت بڑا تصانیف کا ذخیرہ چھوڑا تھا لیکن افسوس کہ اس زمانے میں بہت کم کا پتہ ملتا ہے۔ جن میں "فتوحات مکیہ" اور "فصوص الحکم" مشہور ہیں۔ یہ دونوں کتابیں تصوف میں قابل قدر شمار کی جاتی ہیں۔

مولانا رومیؒ کا زمانہ حضرت محی الدین ابن العربی کی آخری عمر سے ملتا ہے۔ اور حضرت امام غزالیؒ شیخ اکبرؒ سے ۵۵ سال پیشتر گذرے ہیں۔

آپ کی وفات ۲۲ ربیع الآخر ۶۳۸ھ ہجری مطابق ۱۲۴۰ء دمشق میں انتقال فرمائے۔ آپ کی مزار مبارک جبل قاسیون کے دامن میں ہے جس کو صالح کے نام سے پکارتے ہیں

باب دوم

پاک و ہند میں تصوف

پاک و ہند میں تصوّف کی ابتدا

پاک و ہند میں تصوف کے شروع کے زمانے سے اثر لیا ہے، کیونکہ فتح اسلام سے لے کر بارھویں صدی ہجری تک سندھ مشائخ، علماء اور صالحین کا گہوارہ رہا ہے حالانکہ ان بزرگوں کے حالات کسی خاص کتاب میں تفصیل سے نہیں ملتے، لیکن کسی بیان کے ضمن میں ان قدیم و مشہور بزرگوں کا تذکرہ ملجاتا ہے۔ ۵ھ ہجری کے بعد تصوف کو عملی اور علمی صورت ملی، جو آگے چل کر فلسفۂ تصوف ایک مستقل فن کی صورت اختیار کی ان میں چار طریقے مشہور ہوئے

۱ نقشبندی:۔ اس کا بانی حضرت خواجہ محمد اباالسوف، متوفی ۵۶۳ھ ہجری مطابق ۱۱۲۶ء ہے۔ اس سلسلے کو اُن کے بعد خواجہ عبدالخالق غجدوانی متوفی ۵۷۵ھ ہجری نے فروغ دیا لیکن اس سلسلے کو جس بزرگ نے بام ترقی پر پہنچایا، وہ تھے حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبندی متوفی ۷۹۰ھ ہجری۔[1]

۲ قادریہ:۔ تاریخ کے نقطۂ نظر سے یہ سلسلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جس کے سربراہ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس سرہ تھے۔ بارھویں صدی عیسوی میں آپ کے خلفاء نے اس سلسلے کی ترویج اور ترقی میں دنیا کے اسلامی ممالک میں فروغ دیا۔ آپ سے اوپر یہ سلسلہ سید الطائف حضرت جنید بغدادی رح تک ملایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں قادریہ سلسلہ کا قدم تقدم اور فروغ حضرت سید میاں میر لاہوری قادری سے ہوا۔ آپ ۹۵۰ھ ہجری سیوان سندھ میں تولد ہوئے۔ آپ کی والدہ کی فاطمہ سندھ کے مشہور بزرگ حضرت قاضی قاضن کی دختر تھیں لیکن حضرت شیخ محمد صدیق صاحب عظمت و کرامت قادریہ سلسلہ کے صحیح وارث تھے آپ نے آج شریف میں ۸۹۴ھ ہجری میں وفات پائی

۳ چشتیہ:۔ اس سلسلہ کے بانی حضرت ابو اسحاق شامی تھے۔ لیکن اس سلسلے کی توسیع و تنویر حضرت خواجہ معین الدین حسن اجمیری رح نے کی۔ یہ سلسلہ چشتیہ کے سردار خواجہ اللہ ابدال رح ہیں۔ جو حضرت شیخ ابو اسحاق شامی رح کے مرید تھے۔

۴ سہروردیہ:۔ اس سلسلہ کا خاندان سب سے پہلے خوارزم سے ملتان میں آکر مقیم ہوا۔ اس خاندان کے خاندان کے سالار حضرت کمال الدین علی شاہ قرمطی تھے۔ جن کے تقویٰ کو دیکھکر ملتان کے لوگ جوق در جوق خدمت میں حاضر ہوکر مریدان باصفا میں داخل ہوتے رہے۔ اس زمانے میں ایک بڑے بزرگ مولانا شہاب الدین ترمذی جو لوٹ کر وہیں رہتا تھا۔ آپ کی شہرت سن کر حضرت کمال الدین سے راہ رسم پیدا کی آگے چل کر مولانا کے صاحبزادی کا حضرت کمال الدین کے فرزند شیخ وجیہ الدین سے نکاح ہوا۔ ۵۸۹ھ ہجری میں فرزند تولد ہوا۔ اس مولود مسعود کا نام شیخ بہاءالدین ذکریا رکھا گیا جنہوں نے ہندوستان میں سہروردی طریقے کی بنیاد رکھی اور اس سلسلہ کو بڑا فروغ ملا۔ اس سلسلہ میں حضرت سید جلال الدین بخاری، حضرت شیخ احمد، حضرت شیخ نظام الدین اور حضرت شیخ سعد الدین سہروردی رح اور آپ کے دو مشہور مرید حضرت قاضی حمید الدین ناگوری اور سید مبارک غزنوی رح جنہوں نے بڑا نام پیدا کیا۔

سب سے پہلے ہندوستان میں اسلام کے آفتاب کی روشنی اُمڈ کر آئی وہ سرزمین پاک سندھ میں مردان حق اور جلیل القدر بزرگوں نے جنہوں نے فیضان حق سے اس سرزمین کا چپہ چپہ اسلامی تصوف کا علمی و عملی نمونہ بن گیا۔ سب سے پہلے صوفی جنہوں نے ہندوستان کا قصد کیا وہ بھی پہلے سندھ کے مردم خیز زمین پر قدم رکھا وہ بزرگ تھے حاجی ابو تراب رح جو ۱۰۰ھ ہجری کو عہد بنو عباس میں یہاں تشریف لائے تھے آپ تبع تابعین میں سے تھے۔ اس طرح سندھ میں تصوف کو بڑی اہمیت ہے جہاں سے ہندوستان میں اسلام پھیلا۔ ان بزرگوں میں سے چند نامی بزرگوں کے حالات دیئے جاتے ہیں جنہوں نے دامن تصوف کے ذریعہ اسلام کو فروغ دیا۔

حضرت علی بن عثمان ہجویری داتا گنج بخش۔

آپ اپنے وقت کے یکتائے روزگار، امام اور اپنے طریقے میں یگانہ تھے۔ اہل تصوف میں بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں آپ کی ولادت ۴۰۰ھ ہجری کو غزنی کے قریب ایک گاؤں ہجویر میں ہوئی آپ حضرت شیخ ابو الحسن بن حسن علی رح کے مرید تھے اور علوم ظاہر و باطن میں کمال حاصل کیا۔ دیگر بڑے بڑے مشائخ کی صحبت میں رہکر فیض حاصل کیا

---

[1] رسالہ صوفی بعنوان "سہروردی ہندوستان میں" مقالہ نگار حضرت خواجہ حسن نظامی صفحہ ۲۔ ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۸ ہجری

[2] شیخ بہاءالدین ذکریا ملتانی کا خاندان قدیم الایام سے سندھ میں مقیم تھا۔ آپ کے بزرگ تاجر سندھ محمد قاسم کے ساتھ آئے تھے

[3] حاجی ابو تراب۔ تاریخ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۲۵۲ مصنف میر علی شیر قانع۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے آپ کے مزار مبارک پر چلہ کیا تھا، جب اعتکاف ختم کرکے داتا کی مزار سے رخصت ہوئے تو یہ شعر پڑھا۔[1]

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا　　ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما۔

اس کے بعد آپ کو گنج بخش کے لقب سے پکارا گیا۔ آپ مرشد کے حکم سے ہندوستان میں آئے اور لاہور میں سکونت اختیار کی آپ نے تصوف پر ایک کتاب "کشف المحجوب" تصنیف کی، جس تصوف کے اسرار و رموز بیان فرمائے ہیں۔ حضرت جہانگیر اشرف سمنانی نے اپنی تصنیف لطائف اشرفی میں لکھتے ہیں۔

"کشف المحجوب از کتب معتبرہ مشہور می است و لطائف و حقائق در آں کتاب جمع کردہ است"

شہزادہ دارا شکوہ لکھتے ہیں[2]۔

"حضرت ہجویری را تصنیفات بسیار است کشف المحجوب مشہور و معروف است و ہیچ کس را مثل آں سخن سبب شدہ است کامل"

آپ کا مزار مبارک لاہور میں مرجع خاص و عام ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجری چشتی[3]

حضرت خواجہ معین الدین چشتی المعروف خواجہ غریب نواز، ہندوستان میں چشتی سلسلہ کے بانی، اور طریقت کے شیخ، حقیقت کے اصل الاحوال اسرار الٰہی کے حامل، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نائب اور اسلام کی روشنی کا نور پھیلانے والے ۵۳۱ھ ہجری میں سجستان[3] میں تولد ہوئے، آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ سے جا ملتا ہے، جب آپ بارہ برس کی عمر کو پہنچے، تو آپ کے والد بزرگوار کا انتقال ہوا، آپ کو ورثے میں ایک باغ ملا جس کی نگہداشت خود کرتے تھے۔ اس باغ میں آپ کی ملاقات ایک مجذوب ابراہیم قلندر سے ہوئی، جس کی نظر سے متاثر ہوئے، اور سب کچھ چھوڑ کر ترک وطن ہوکر خدا تعالیٰ کی طلب میں نکل کر سمرقند جاکر کلام پاک حفظ کیا اور علوم ظاہری کی تعلیم میں مشغول ہوئے۔ تحصیل کے بعد سیر و سیاحت کے لئے نکلے۔ عراق کی ایک بستی ہارون[4] میں حضرت شیخ عثمان ہارونی کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور شرف بیعت حاصل کی بقول اخبار الاخیار[5]

"بہشت سال در خدمت خواجہ عثمان ہارونی قدس سرہ بود، در سفر و حضر جامہ خواب خود نگاہ داشتے"

کامل بیس سال مرشد کی خدمت میں رہکر ایک لمحہ بھی آرام نہ کیا۔ مرشد کے ساتھ مکہ اور مدینہ منورہ بھی گئے، مدینہ حاضر میں بارگاہ رسالت سے ہندوستان جانے کی بشارت ملی۔ خواجہ ہارونی کو اپنے مرید کے لئے بیحد عزت تھی۔ اور آپ خرقہ خلافت اور چار ترک ٹوپیاں عطا کی تھیں، اور نصیحت فرمائی:۔

"کلاہ چار ترکی سے مراد ہے چار چیزوں کا ترک کرنا پہلا ترک دنیا، دوسرا ترک عقبیٰ، جس کا مقصد ہے خدا تعالیٰ کے سوا، دوسرا مقصود نہ رکھنا، تیسرا ترک خورد و خواب، مگر اتنا جس سے زندگی کا رشتہ چل سکے۔ چوتھا، ترک خواہش، یعنی نفس جو کچھ اسکی مخالفت کرتا رہنا۔ جو شخص ان چار چیزوں کو ترک کرتا ہے تو اُنکو چار ترکی ٹوپیاں پہننا سزاوار ہے"

آپ بغداد سے ہوتے ہوئے اصفہان، استرآباد، سبزوار اور غزنی سے ہوکر ہندوستان پہنچے، اور اجمیر میں سکونت فرمائی۔ اجمیر میں اس وقت ہندوؤں کے سوا کوئی ایک بھی مسلمان نہ تھا۔ خواجہ صاحب نے جب اجمیر میں قدم رکھا تو بہت سے ہندو مسلمان ہوگئے۔ اسلام روز افزوں ترقی کرتا رہا، جس کی وجہ سے وہاں کا راجا پتھورا چوہان (پتھورا) نے خواجہ صاحب کو شہر بدر کرنے کی دھمکی دی آپ نے فرمایا "پتھورا زندہ بہ مسلمان دادیم" پتھورا کو زندہ ہی مسلمانوں کو دیدیا"

یہ پیشگوئی حرف بہ حرف صحیح نکلی، پتھورا شہاب الدین محمد غوری کے ہاتھوں میدان جنگ میں مارا گیا۔ خواجہ صاحب کے فیوض سے ہندوستان کی سرزمین اسلام کے نور سے منور ہوگئی۔ خواجہ صاحب کا لقب "وارث النبی فی الہند" مشہور ہوا۔ آپ نے ۶ رجب ۶۳۳ھ ہجری میں ۹۷ برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔

---

[1] انوار اصفیا۔ مرتبہ ادارہ تصنیف و تالیف شیخ غلام علی منیر لاہور۔ صفحہ ۹۸۔ [2] سفینۃ الاولیاء مرتبہ شہزادہ دارا شکوہ صفحہ ۲۱۰

[3] سجستان کو سیاہ سجستان اور سجزی بھی لکھتے ہیں۔ [4] ہارون نیشاپور میں ایک گاؤں ہے حضرت شیخ ہارونی (عثمان) شریعت، طریقت اور حقیقت کے علم میں اپنے وقت کے علامہ اور ابدال کے مقتدا تھے، خرقہ ارادت خواجہ حاجی شریف زندنی کی خدمت میں سے حاصل کیا تھا، آپ ۶۰۰ھ کو مکہ میں وفات پائی۔ [5] اخبار الاخیار مصنف شیخ عبدالحق محدث دہلوی

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اوشی اپنے وقت کے قطب الاقطاب بڑے جلیل القدر صوفی اور ولی تھے۔ تارک دنیا، فقر و فاقہ میں بے نظیر تھے۔ ہر وقت یاد الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی غریب نوازؒ کے خاص مرید اور حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے مرشد تھے۔ آپ کا اسم گرامی حضرت بختیار اور قطب الدین تھا۔ کاکی اس لئے کہلاتے تھے کہ آپ کے معدے کے نیچے غیب سے روٹیاں حاصل ہوتی تھیں۔ دو سال کی عمر میں والد کا انتقال ہوا۔ والدہ نے بڑی محنت سے تربیت دی اور اس وقت کے عالم حضرت مولانا ابو حفص سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ ان سے علوم ظاہر و باطن سیکھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اوشی تشریف لائے تب ان سے بیعت کی اور بیس سال خدمت کرنے کے بعد انہوں نے خرقہ خلافت دے دی۔

آپ کو سماع سے بڑی رغبت تھی۔ اکثر سماع کی مجلس منعقد ہوتی تھی۔ کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ شیخ علی سجزی کی خانقاہ میں محفل سماع ہو رہی تھی، خواجہ صاحب بھی اس محفل میں موجود تھے جب قوال نے شیخ احمد جام کا قصیدہ اپنے سنا اور اس کا یہ شعر سنتے ہی وجد طاری ہوا۔

کشتگانِ خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جانِ دیگر است

کئی دن تک یہ حالت رہی آخر ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ میں وفات پائی۔

حضرت شیخ بہاؤ الدین ذکریاؒ

آپ کے جد بزرگوار حضرت کمال الدینؒ مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے خوارزم سے ملتان میں آکر مقیم ہوئے۔ ملتان میں ایک بزرگ مولانا ہشام الدین ترمذیؒ نے اپنی بیٹی حضرت کمال الدین کے صاحبزادے حضرت شیخ وجیہ الدین کے نکاح میں دی۔ ۵۷۸ھ کو شیخ بہاؤ الدین ملتان میں تولد ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں اتنا علم حاصل کیا جو کسی کو تیس برس میں بھی حاصل نہ ہوتا اس دوران آپ کے والد کا انتقال ہوا تو خاندان پر مفلسی اور مصیبت چھا گئی۔ شیخ بہاؤ الدینؒ کا کوئی خبر گیر نہ تھا۔ اس حالت میں بھی تعلیم کو جاری رکھا۔ ملتان سے سفر کرکے خراسان اور بخارا ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچے۔ مدینہ منورہ جاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کی مجاوری کرتے رہے۔ وہاں شیخ کمال الدین محمد یمنی سے حدیث کا درس لیتا رہا۔ بعد میں بغداد جاکر شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی صحبت سے فیض حاصل کرکے خلافت کا خرقہ حاصل کیا۔ حضرت شیخ سے حکم ہوا کہ ملتان میں جاکر اپنے وطن کے لوگوں کو ہدایت دیدو۔ اس طرح ملتان تشریف لے آئے۔ آپ کے ساتھ سر خاں حضرت شیخ جلال الدین تبریزی بھی آئے۔ آپ نے دو شادیاں کی تھیں۔ ہندوستان کے عارف حضرت شیخ صدر الدین، پہلی زوجہ سے تولد ہوا۔

آپ کی وفات بھی عجیب حالت میں ہوئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو پیغام بھیجا تھا جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

ایک دن آپ اپنے حجرے میں مصروف فرما تھے کہ ایک شخص نورانی لباس پہنے ہوئے آئے۔ ایک تھیلا سر بمہر آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ صدر الدینؒ کو دیکر کہا، یہ نہایت ضروری کاغذ ہے۔ اسکو حضرت شیخ کی خدمت میں جلدی پہنچا دو۔ صاحبزادے حجرے میں گئے اور والد کو خط دیکر واپس چلے آئے۔ باہر آکر دیکھا تو وہ شخص غائب تھا۔ اتنے میں حجرہ سے چاروں طرف سے ایک آواز آئی۔ حسنا طلب کنا۔ دوست، دوست کے پاس چلے گئے۔ شیخ عارف ہو گئے صدا سینے ہی حجرہ میں گئے۔ بھائی والد بزرگوار عالم خاک سے عالم پاک چلے گئے۔ صرف جسم باقی ہے۔ یہ واقعہ ۶۶۶ھ تاریخ ۲۷ صفر کو ہوا۔

حضرت شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ

ملتان کے ان اولیائے کرام میں سے ہیں، جن پر زمانہ ہمیشہ فخر کریگا۔ آپ کا اسم گرامی حضرت مسعود بن عزیز الدین محمود تھا۔ آپ کا سب امیر المومنین

رسالہ صوفی ماہ شعبان المعظم ۱۳۳۰ھ صفحہ ۳۔

انوار الاصفیا صفحہ ۱۹۳۔

سفینۃ الاصفیا جلد سوم مصنف غلام سرور صفحہ ۱۹

نفحات الانس صفحہ ۵۳۶۔

حضرت عمر بن خطاب سے جا کر ملتا ہے۔ آپ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ایک دن مسجد میں بیٹھے کتاب نافع کا مطالعہ کر رہے تھے، کہ ایک درویش وہاں آئے اور آپ سے پوچھا، کیا یہ کتاب مجھے کچھ نفع دے گی۔ جونہی حضرت کی اس درویش سے نظریں چار ہوئیں تو دل پر بڑا اثر ہوا، اور کھڑے ہو کر جواب دیا، جی ہاں مجھے تو آپ کی نظر کرم سے نفع ہوگا۔ اور فوراً ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ اور درویش سے باطنی رموز کے سوالات کئے، پوچھا آپ کون ہیں۔ انہوں نے جواب دیا میرا نام قطب الدین بختیار ہے۔ میں دہلی جا رہا ہوں، حضرت نے عرض کیا مجھے بھی ساتھ لے چلو، دہلی میں جا کر فیض حاصل کیا۔ آپ اپنے وقت کے غوث اور قطب تھے اور بیشمار خوارق و کرامات کا ظہور ہوا۔ آپ نے ۵ محرم ۶۶۴ھ کو وفات فرمائی، مزار مبارک پاک پٹن میں ہے۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ:

آپ صوفیاء کے مشاہیر مشائخ میں سے تھے اور محبوب الٰہی کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے خلیفہ تھے۔ آپ نے سلسلہ نظامیہ جاری کیا۔ آپ کا اسم گرامی سید محمد بن سید احمد بن سید عبداللہ علوی تھا۔ اور لقب سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء تھا۔ بدایوں میں آپ کے والد بزرگوار کا انتقال ہوا۔ والدہ ماجدہ نے تعلیم کا بندوبست کیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے شوق ارادت میں پاک پٹن پہنچے۔ وہاں مرشد سے قرآن پاک، علم قرأت اور حدیث سے علوم حاصل کئے۔ جب آپ کا مرتبہ کمال تک پہنچا تو شیخ نے اجازت دی کہ دہلی جا کر وہاں کے لوگوں کو تربیت اور ہدایت دیں۔ حضرت امیر خسرو اور حسن دہلوی آپ کے مرید تھے۔ آپ کے کرامات مشہور ہیں۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ ایک شخص نے اپنا ضروری کاغذ کھو دیا تھا۔ وہ شخص پریشان ہو کر حضرت کی خدمت میں آکر اپنی دعا پیش کی۔ شیخ نے اس کو ایک درم دیا، اور کہا اس کا حلوہ خرید کر حضرت شیخ فرید الدینؒ کی روح کو خوش کر درویشوں کو کھلا دو۔ جب اس شخص نے حلوائی سے حلوہ خرید لیا تو حلوائی نے حلوہ ایک کاغذ میں لپیٹ کر دیا۔ اس شخص نے جو دیکھا تو اسے اپنا کھویا ہوا کاغذ نظر آیا۔ آپ کی وفات ۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ میں ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر ۹۳ سال تھی۔

حضرت بوعلی قلندرؒ:

حضرت بوعلی ۶۰۷ھ پانی پت شہر میں ولادت پائی۔ ظاہری علوم کی تکمیل بھی اسی شہر میں ہوئی۔ آپ کے قدم و برکت سے اس علاقہ کے بہت سے ہندو، راجپوت مسلمان ہوئے۔ چالیس برس کی عمر میں دہلی تشریف لائے۔ اس زمانہ میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ رحلت فرما گئے تھے اور آپ کو علماء دین نے دہلی کے مدرس اور مفتی کا عہدہ پیش کیا۔ جسے قبول کرتے ہوئے سال عہدہ انجام دی۔ اتفاق سے ایک درویش کی صحبت میں رہ کر درس و تدریس کو چھوڑ کر قلندر بن گئے۔ اور آزادانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ آگے چل کر اضمحلال اور جذبے کی حالت طاری رہتی تھی۔ اس جوش کی کیفیت میں شعر کہتے تھے۔ شاعری میں آپ کا دیوان موجود ہے۔ اور بہت سی مثنویاں بھی چھوڑیں۔ تصوف کے علوم کو سمجھنے کے لئے ریاضت اور مجاہدہ میں مشغول ہوئے۔ سب کتابوں کو دریا میں ڈال کر جنگل کی راہ لی۔ کرنال کے نواح پانی پت میں آخر عمر تک مقیم رہے۔ مستی کی حالت میں ایک مرتبہ موضع شرفی حدود سے بہت بڑھ گئے تھے۔ اس وقت آپ کے ہمعصر بزرگ مولانا صدر الدین سامانی جو شریعت کا سختی سے پابند تھا، شیخ کی ریش مبارک پکڑ کر موچھوں کو شریعت کی حد کے مطابق تراش دی۔ جب وہ چلے گئے، تو شیخ نے اپنی داڑھی کو مار مار پکڑ کر کہنے لگے۔ ریش کیسی مبارک ریش ہے جو شرع محمدی کی راہ میں پکڑی گئی۔ آپ صاحب دل صوفی تھے۔ آپ کا کلام پاکیزہ اور لطیف خیالات سے بھرپور ہے۔ جسے بڑی عقیدت سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ نے ۷۲۴ھ میں پانی پت کے علاقہ میں وفات کی۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ:

آپ کا اسم گرامی احمد لقب بدر الدین ابوالبرکات۔ خیوم زمان مجدد الف ثانی عرف امام ربانی۔ آپ کے والد بزرگوار مخدوم عبدالاحد تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب امیر المومنین سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کی ولادت سرور جمعہ ۱۴ شوال ۹۷۱ھ سرہند شہر میں ہوئی۔ بچپن میں عام بچوں کی طرح گریہ و زاری نہ فرماتے تھے، بلکہ ہر وقت خندہ پیشانی سے رہتے تھے۔ آپ نے اپنے والد بزرگوار کے زیر نگرانی سات کلام پاک حفظ کرنا شروع کیا اور ظاہری علوم کی تحصیل شروع کی۔ والد کے ہاتھ پر بیعت کی۔ انکی صحبت میں رہ کر ریاضت اور عبادت

میں مشغول ہوئے۔ طریقہ نقشبندیہ کے فضائل بھی اپنے والد بزرگوار سے حاصل کیئے۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مرید اور بڑے صاحب دل تھے۔ حضرت امام ربانیؒ اپنے والد کے انتقال کے بعد حج کے ارادہ سے دہلی تشریف لائے۔ وہاں حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ رحمت سے بیعت ہوگئے۔ حضرت باقی باللہ فرمایا کرتے تھے کہ شیخ احمد ایک آفتاب ہیں۔ ہم جیسے ہزاروں ستارے اس کی روشنی میں گم ہو جائیں اسمان کے نیچے ان کی نظیر نہیں ہے۔ ان جیسے اس امت میں چند ہی آدمی گذرے ہیں۔ آپ کی وفات ۲۹ صفر ۱۰۳۴ ہجری میں ہوئی اور مزار مبارک سرہند میں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا اسم گرامی حضرت قطب الدین احمد اور مشہور نام عظیم الدین تھا۔ لیکن ولی اللہ محدث دہلوی مشہور کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۴ شوال ۱۱۱۴ ہجری مطابق ۱۷۰۳ء کو قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم پانچ سال کی عمر سے اپنے والد بزرگوار کے زیر نظر شروع ہوئی۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کرکے فارسی اور عربی تعلیم کا شوق پیدا ہوا چودہ سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہوکر شادی کرلی۔ اشغال شائخ نقشبندی کی تعلیم حاصل کرکے تفسیر بیضاوی پڑھنا شروع کیا۔ اپنے والد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے ہاتھ پر بیعت کی ۱۷ سال کی عمر میں والد کا انتقال ہوا۔ تو والد کی مسند درس پر بیٹھا۔ ۱۱۴۳ھ میں حج بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضرت محمد افضل محدث سیالکوٹی سے حدیث کی سند لی۔ دہلی میں درس تدریس اور اسلام کی تبلیغ فرماتے رہے۔ آخر عمر تک یہ فیض جاری رکھا۔ آپ نے ۲۹ محرم ۱۱۷۶ ہجری مطابق ۱۷۶۲ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کی اولاد میں چار صاحبزادے۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، اور شاہ عبدالغنی جو شاہ اسماعیل شہیدؒ کے والد تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی زندگی میں عجیب انقلاب دیکھے اور مغل بادشاہوں کو دیکھا جن میں اورنگزیب عالمگیر، شاہ عالم، بہادر شاہ، معز الدین جہاندار شاہ، فرخ سیر سے عالم شاہ ثانی تک۔ اور ان کے سیاسی داؤ پیچ کو بھی دیکھا۔ اس وقت کے معاشرہ کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا۔

شاہ صاحب نے اسلام کی بڑی خدمت کی۔ جمود کو توڑ کر عمل کی دعوت دی جو آپ کی کثیر تعداد تصانیف میں موجود ہے۔ آپ کی تصانیف میں فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن، قصص الانبیاء، مسوّیٰ، مصفّیٰ، حجۃ اللہ البالغہ، کشف العینین، شرح الرباعیتین، تصبیر فصلہ وحدت الوجود والشہود، مکتوبات۔

سرمد شہید

سرمد کی ابتدائی زندگی کے متعلق مستند حالات نہیں ملتے۔ لیکن تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ وہ ایران کے شہر کاشان کے رہنے والے تھے۔ اور قوم یہود سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں مسلمان ہوگئے تھے۔ حالانکہ اصل قومیت کے متعلق روایت نہیں ملتی۔ ان کا خاندان ارمنی اور یہودی تھا۔ لیکن سرمد فیضان الٰہی سے مشرب بالاسلام ہوئے اسلام میں آنے کے بعد کیا نام اختیار کیا؟ بس سرمد کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے اشعار اور نقطہ بینی کو دیکھکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ علم وفضل شعر و شاعری اور عربی زبان میں کمال درجہ رکھتے تھے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں ایران کے تاجر اپنا مال لے کر سندھ میں آتے رہتے تھے ٹھٹہ۔ علم، فضل اور تجارت کا مرکز تھا۔ سرمد بھی اپنا مال لے کر ٹھٹہ میں آئے۔ لیکن انہیں معلوم نہ تھا۔ کہ یہ تجارت انہیں عشق کے لئے اسیر کر دیگی۔ سادہ لوح ایرانی تاجر نے دل کا سودا کرلیا اور ٹھٹہ میں قیام دوران ایک حسین و جمیل ہندو لڑکے اتھیچند کے حسن و جمال میں محو ہوگئے۔ اور اپنا پورا مال و متاع لٹا دیا۔ دیوانگی کی حالت میں پہنچ گیا۔ رفتہ رفتہ وہ ہندو لڑکا بھی اپنی دولت اور عزیزوں کو چھوڑ کر سرمد سے رنگ ہوگئے۔ سرمد بیگانہ ہوکر ریگستان میں مجنوں کی طرح خاک چھانتا پھرا۔ پھر ایک مستقر کی تلاش میں ایک جگہ بیٹھکر عشق کے آخری امتحان کا انتظار کرنے لگے۔ شاہجہاں بادشاہ کے آخری دور حکومت میں دہلی چلے گئے۔ لوگ آپ کے گرویدہ ہوگئے۔ شہزادہ دارا شکوہ جو صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا۔ درویش اور فقیروں کے دوست تھے، سرمد کے خاص عقیدتمند ہوگئے۔ اور اس کی صحبت میں اکثر رہتے تھے۔ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر ۱۰۶۹ ہجری میں تخت نشین ہوئے

شا جرالطیف ترجمہ العبد الضعیف شاہ ولی اللہ دہلویؒ صفحہ ۱۹۳

تو وہ زیادہ دارا شکوہ اور اس کے ساتھیوں کے بہت تکلیف۔ لوگوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ لیکن سرمد اپنے حال میں مست تھا انہیں لوگوں کی وہ آخری منزل طے کرنی تھی۔ سرمد کو دنیا سے کیا غرض تھی، دہلی کی گلیوں میں ننگے پھرا کرتے تھے۔ تذکرۃ الخیال میں لکھا ہے کہ برہنگی کی وجہ سے شہنشاہ اورنگزیب نے وقت عالم شیخ عبدالقوی کی طرف رجوع کیا۔ جس نے سرمد کو بلا کر پوچھا کہ باوجود علم و فضل کے برہنہ رہنا کس عذر پر مبنی ہے۔ اور کہا "عریانی چرا می باشی" سرمد نے جواب دیا "شیطان قوی است۔" شیخ عبدالقوی نے پوری کیفیت اورنگزیب سے کہی شہنشاہ نے دور اندیشی سے کام لیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سرمد کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے۔ علم و فضل کے لحاظ سے بہت بلند مرتبے کے مالک تھے۔ اس معاملے کو عرصے تک ملتوی رکھا۔ آخر یہ طے ہوا کہ سرمد کو علماء کے مجمع میں طلب کیا جائے۔ چنانچہ علماء دین کی مجلس منعقد ہوئی جس میں سرمد کو بلایا گیا۔ سب سے پہلے اورنگزیب عالمگیر نے سوال کیا "تم دارا شکوہ کو مژدہ سلطنت دیا تھا، سرمد نے جواب دیا بیشک یہ درست ہے اسے ہندی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی۔ ایک عالم نے سوال کیا مرتکبی شریعت نے خلاف ہے اور وہ بھی ایک مذہب عقل کے لئے جب سرمد کو لباس پہننے کے لئے کہا تو سرمد نے پہننے سے انکار کیا۔ شہنشاہ اورنگزیب نے علماء سے کہا صرف برہنگی وجہ قتل نہیں ہو سکتی۔ ایک ایک عالم نے کہا جو علم تم نے حاصل کیا ہے۔ اس کا بھی خیال نہیں۔ سرمد نے کہا۔

ما آنچہ خواندہ ایم، فراموش کردہ ایم الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم۔

(ہم نے جو کچھ پڑھا اسے فراموش کر دیا۔ صرف حدیث دوست یاد ہے اس کو بار بار پڑھتا ہوں۔)

ایک عالم جو ان کے عادات سے واقف تھا، اس نے سرمد کو کلمہ طیبہ پڑھنے کو کہا۔ تو سرمد نے اپنی عادت کے مطابق کلمہ پڑھا تو صرف "لا الٰہ" آگے نہ پڑھا یہ جملہ نفی ہے۔ اس علماء نے شور مچایا سرمد نے کہا ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں، اور اثبات تک نہیں پہنچا۔ الا اللہ کہوں تو جھوٹ ہوگا، اور جو دل میں نہ ہو تو زبان پر کیسے آئے گا۔ علماء نے متفق ہو کر کہا ایسا کہنا صریحاً کفر ہے۔ اگر توبہ نہ کرو گے تو واجب قتل ہو جاؤ گے۔ ظاہر پرست کیا جانے کہ سرمد کس منزل پر پہنچا ہے۔ وہ تو قتل کی دھمکی سے مرعوب ہو جانے والے نہ تھے، سرمد نے توبہ سے بھی انکار کیا۔ علماء نے اسے فتویٰ سنا دی۔ شریعت کی حد مقرر ہو گئی اور واجب القتل ہوئے۔ دوسرے دن سرمد کو مقتل میں لایا گیا۔ تو ایک درویش دوست نے سمجھایا کہ اپنی حالت بدل دیں۔ یہ سن کر سرمد نے کہا

حریست کہ آوازہ منصور کہن شد من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را۔

سرمد کو قتلگاہ میں لایا گیا تو اتنا ہجوم اکٹھا ہو گیا کہ جس کا اندازہ کیا نہیں جا سکتا۔ جب جلاد تلوار لیکر قتل کے لئے آگے بڑھا تو سرمد نے کہا

سر جدا کرد از تنم شو خیک یا ما یار بود قصد کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود۔

عاقل خان رازی اپنی مختصر تاریخ عالمگیری میں لکھتا ہے، جب جلاد قتل کرنے لگا تو سرمد نہایت اطمینان سے سر جھکا کر بیٹھ گئے اور کہا۔

شورے شدہ از خواب عدم چشم کشودیم دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم۔

جلاد نے ایک ہی وار سے ان کا سر تن سے جدا کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۰۷۳ھ ہجری میں ہوا بقول مولانا ابوالکلام آزاد نے خلیفہ ابراہیم سے راوی ہے کہ سرمد نے زندگی میں کلمہ طیبہ "لا الٰہ" سے زیادہ نہیں کہا۔ لیکن شہادت کے بعد لوگوں نے سنا کہ سر کٹنے سے تین بار "الا اللہ" کی صدا بلند ہوئی یہ حقیقت ہے کہ ان قربانیوں سے جن کے ہاتھ خون آلودہ ہوتے وہ خون ناحق ہونے کی جگہ ثواب کے مستحق ہوتے ہیں۔ لیکن میدان عشق بھی قربان گاہ بنتا ہے۔ سرمد شہید کا مزار جامع مسجد دہلی کے قریب ہے جہاں بڑی عقیدت سے لوگ پھول نچھاور کرتے ہیں۔ سرمد کے کلام کا مجموعہ رباعیات ۱۸۸۲ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔

۱۔ حیات سرمد مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم صفحہ ۲۰

۲۔ نظام المشائخ جلد دوم محرم الحرام سرمد شہید از مولانا ابوالکلام آزاد۔

باب سوم
سندھ میں تصوّف کی ابتدا

سندھ میں اسلامی تصوف کے اولین نقش کا تعین کرنا اگرچہ تاریخ کی روشنی میں ایک امر عظیم ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ابتدائی طریقہ جو زہد و تقویٰ کا حامل تھا۔ اس سے سندھ کے رہنے والے مسلمان سب سے پہلے متعارف ہوئے تھے۔ لیکن تصوف کی وہ شاہراہ جس نے آگے چل کر سندھ کے مسلمانوں نے اسلام اور اسلامی تعلیم میں اپنا جداگانہ مقام قائم کیا۔ اس کے ابتدائی مبلغین کا سراغ اس وقت ملنا مشکل ہے نفحات الانس میں مولانا جامیؒ نے صوفیوں کا تذکرہ میں ذکر کیا ہے۔ اُن میں حضرت ابو علی سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی شامل ہے۔

حضرت ابو علی سندھیؒ زہد و ہدایت کے سبب متقدمین اور مشائخین میں بلند مقام حاصل کیا تھا۔ یہ پہلے سندھی صوفی بزرگ ہیں جن کا نام صوفیاء کرام کے تذکروں میں ملتا ہے نفحات الانس کے مصنف نے آپکا ذکر اس طرح کیا ہے[1]

"شرح مطلعات شیخ روزبہان بقلی میں مذکور ہے کہ حضرت ابو علی سندھی۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کے استادوں میں سے ہیں حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا ہے" میں ابو علی سے توحید میں فنا ہونے کا علم سیکھتا تھا۔ اور ابو علی مجھ سے الحمد اور قل ھو اللہ سیکھتے تھے"۔

تاریخ تحفۃ الکرام میں شیخ سندھی کا ذکر نفحات الانس کی عبارت سے لیا ہے میر علی شیر قانعؒ نے آپ کو سندھ کے مشائخ اور علماء کے تحت دیا ہے[2]

"ذکر برخے وجوہ مشائخ و علمائے سندھ کہ محقق مقرر و معدن فن شان کما ہو حقہ صورت نیافتہ"

بحرحال نفحات الانس کی روایت کے مطابق یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ موصوف حضرت بایزید بسطامیؒ کے زمانے میں تھے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ ۲۶۱ھ کے مطابق ۸۷۴ء میں رحلت فرمائی تھی۔ سندھی بزرگ بغداد اور اس کے قریب و جوار میں اپنے علم و فضل کے سبب مشہور تھے اور شیخ سندھی نے اپنے وطن سندھ کو الوداع کہکر بغداد پہنچے ہونگے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ جیسے عارف نے اُن کے روحانی مرتبے کا اعتراف کیا ہے۔ علم تصوف میں فنا اور بقا کا مسئلہ اتنا دقیق ہے جو اس کو بڑے سے بڑا رازدار صوفی بھی مشکل سے سمجھا سکتا ہے۔ اس زمانہ میں ابو علی سندھی کا ہونا اور سندھ کے دور افتادہ علاقہ میں اس درجے کی شخصیت کا ہونا سندھ کے لئے حقیقی افتخار ہے۔ اس زمانے میں عراق میں صوفیانہ تحریکیں جن میں قادریہ اور سہروردیہ خاص تھی۔

سندھ میں اس وقت سے دو ڈھائی صدیوں تک سکوت کا عالم تھا اور تصوف کے متعلق کوئی خبر نہیں ملتی۔

مقدمہ تاریخ تصوف کی تمہید میں حسین سہروردیؒ خواجہ حسن نظامیؒ کی وساطت سے لکھتے ہیں[3]

"سندھ کا صوبہ ہندوستان کے صوفیوں کا گہوارا تھا۔ خواجہ حسن نظامی کے قول سہروردی سلسلہ کے صوفی پہلے سندھ میں آئے یہ تحریک سندھ میں عرب فتوحات ۷۱۱ء سے پہلے آئی یہ حقیقت ہے کہ سندھ میں سہروردیہ طریقہ کی شہرت حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ ۱۲۶۷ء کے ہاتھوں سے ہوئی تھی۔"

لیکن سندھ میں سہروردیہ طریقہ کا داعی و پیل شیخ الشیوخ حضرت نوح البدھریؒ کی ذات گرامی سے ہوا جو شیخ شہاب الدین سہروردیؒ ۱۲۳۵ء کے مرید تھے

---

[1] نفحات الانس۔ مصنف حضرت مولانا نور الدین عبدالرحمٰن جامیؒ صفحہ ۶۵

[2] تاریخ تحفۃ الکرام (فارسی) مصنف میر علی شیر قانع جلد سوم صفحہ ۱۶۸

[3] اکثر تذکروں میں ان بزرگوں کے ذکر کو مختصر الفاظ میں لکھا ہے۔ جس میں ابو معشر سندھی اور اُن کے فرزند ابو عبدالملک محمد، امام اوزاعی، ابو نصر سندھی، حافظ ابو خلف بن سالم ابن علی سندھیؒ، ابو ضلع سندھی، کشاہم حضرمیہ وغیرہ ——— [3] تاریخ تصوف۔ مصنف ارتھر جان اربری مقدمہ صفحہ VIII

سے تھا۔ سہروردی طریقہ حضرت شیخ الشیوخ بہاؤالدین زکریا[1] سے پہلے سندھ میں پہنچ چکا تھا۔ اس طرح حضرت نوح الکھری کا اسم گرامی متقدمین میں سے ہے تاریخ تحفۃ الکرام اور حدیقۃ الاولیا میں آپکا ذکر موجود ہے۔

شیخ الشیوخ حضرت نوح بکھری[2]

" شیخ الشیوخ حضرت نوح بکھری سہروردی اجل اولیائے سندھ اکمل مرید حضرت شہاب الدین سہروردی ست در فرست کہ بکھر قدیم است سکونت داشتہ نقل است کہ ہرگاہ غوث العالم شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی از خدمت شیخ شہاب الدین مرید شدہ سوئے ملتان رخصت یافت، شیخ فرمود کہ مریدے رشد از مریدان ما در فرستہ ہند است او را البتہ خواہی دید کہ او چراغ و قنبلہ در روغن از خود آوردہ بجز اقتباس محتاج بود قضارا وقتی کہ شیخ بہاؤالدین زکریا بفرستہ رسید، شیخ نوح کشتی گردان بطوفان اجل سوئے خود چنان کشیدہ بود ....!"

" شیخ الشیوخ حضرت نوح بکھری، شیخ شہاب الدین سہروردی[3] کے کامل اور اجل مریدوں میں سے تھے۔ فرستہ بضلع بکھر قدیم میں رہتے تھے۔ نقل کرتے ہیں کہ جس وقت غوث عالم شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی شیخ شہاب الدین کے مرید ہوئے، اور آپ کو ملتان جانے کے لئے اجازت ملی تب شیخ نے آپ سے فرمایا کہ میرے لائق مریدوں میں فرستہ (سندھ) میں ہے۔ ان کو جا کر دیکھنا، کیوں کہ وہ دیا ہے۔ تیل اور باتی اپنی لائے تھے۔ ان کو صرف روشنی کی ضرورت تھی، قضا سے شیخ بہاؤالدین زکریا فرستہ میں اس وقت پہنچے، جب شیخ نوح بکھری وفات پا چکے تھے۔ آپ انکے تجہیز و تدفین میں شریک ہوئے۔"

تحفۃ الکرام کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ بہاؤالدین زکریا[4] تقریباً تیس سال کی عمر میں بیعت سے فارغ ہو کر بکھر پہنچے، گویا یہ زمانہ ۱۲۲۰ء کے لگ بھگ شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس زمانہ میں سندھ کے بادشاہ ناصرالدین قباچہ کی حکومت تھی۔ اور بکھر براہ راست اسکے قبضہ میں تھا۔ جہاں اس کا فرزند علاؤالدین بہرام شاہ بطور نائب، حکومت کر رہا تھا۔ حضرت نوح بکھری[5] کی مزار بکھر میں ہے۔ سہروردی طریقہ کے پہلے داعی حضرت شیخ نوح بکھری[6] کے بعد شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی[7] کا ذکر آتا ہے، جن کے فیض و کرم سے سندھ کا ذرہ ذرہ معمور ہو چکا تھا۔ تاریخ اور تذکروں سے معلوم ہوتا ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری قدس سرہ جو سندھ میں تشریف لائے تھے۔ اور سندھ میں چشتی سلسلہ کی داغ و بیل رکھی۔ دلیل العارفین کی چوتھی مجلس میں ذکر ہے کہ خواجہ صاحب اپنے مرشد کی معیت میں سیوستان (سندھ) میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ ایک دن خانقاہ میں گئے جس میں شیخ صدرالدین محمد احمد سیوستانی رحمۃ اللہ علیہ شیخ صدرالدین سیوستانی[8] جو یاد حق میں انکا استغراق حد سے زیادہ تھا۔ آپ کتنے دنوں تک انکی خدمت میں رہے آپ کی خدمت میں جو بھی آئے وہ محروم واپس نہ جاتے تھے، ان کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتے تھے۔ اور فرماتے تھے۔ میرے حق میں دعائے خیر کریں کہ میں ایمان اپنا قبر تک سلامتی سے لے جاؤں۔ جب قبر اور موت کی سختی کا ذکر کرتے تھے تو بید کی طرح کانپ اٹھتے تھے۔ روتے روتے ان کی آنکھوں سے خون بہنے لگتا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے چشمے سے پانی۔ بہتا ہے یہ رونا مدتوں تک بند نہ ہوتا تھا۔ رونے سے فارغ ہونے کے بعد میری طرف دیکھ کر فرماتے تھے۔

" اے عزیز جس پر موت آنے والی ہو اور اس کا حریف ملک الموت ہو تو اس کو سونے، ہنسنے اور خوش رہنے سے کیا کام "

اس کے بعد فرمانے لگے اے عزیز! اگر تمہیں ان لوگوں کے حال کا ذرہ بھی معلوم ہو جو مٹی کے نیچے اپنی کوٹھڑی میں سوتے ہیں۔ جس میں کچھ بھرے ہوئے

---

[1] سندھ میں تصوف اور صوفیانہ شاعری (مسودہ)، مصنفہ مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی جلد دوم صفحہ ۳۹

[2] حدیقۃ الاولیا۔ تالیف سید عبدالقادر بن سید ہاشم تتوی بتصحیح پیر صمام الدین شاہ راشدی

[3] فرستہ قدیم بکھر کا نام تھا۔ "بلدہ بکر نام قدیش فرستہ است" تاریخ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۱۲۴۔

ہیں جو ڈنگ مارویں تو، اس طرح گل جائیں جسطرح پانی میں نمک گل جاتا ہے۔ بعد میں فرمانے لگے۔

"ایک مرتبہ ایک کامل ولی کے ساتھ بصرہ کے ایک قبرستان میں بیٹھا تھا۔ نزدیک، ایک صاحب قبر پر عذاب ہو رہا تھا۔ اس بزرگ کو جب یہ معلوم ہوا تو زور سے نعرہ لگایا، اور زمین پر گر پڑا۔ میں ان کو اٹھانے کے لئے نزدیک گیا، دیکھا تو ان کی روح جسم سے پرواز کر چکی تھی، تھوڑے وقت میں انکا جسم پانی کی طرح بہہ گیا۔ اس دن سے مجھ پر فکر کی سختی اور ضعیفی طاری رہتی ہے۔ اسلئے اے عزیز دنیا میں اتنا مشغول نہ رہو جو حق سے غافل رہجائیں۔"

دلیل العارفین سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عثمانؒ کے ساتھ خواجہ معین الدین چشتیؒ سیوستان سندھ میں آئے تھے۔ کب آئے تھے اس کا اندازہ ذرا مشکل ہے۔ شیخ صدرالدین سیوستانیؒ چھٹی صدی ہجری میں گذرے ہیں۔ تاریخ تحفۃ الکرام میں آپ کا ذکر لکھوی نے بزرگوں میں آتا ہے تحریر ہے

"سید صدرالدین عرف صدرو بن سید محمد صاحب آیات باہر و کرامات ظاہری، ولی وقت و سر سبد شیخ مشائخ روزگار فخر جامع سادات، جامع البرکات بود اولادش در سند نجابت دودمان و اصالت خاندان مقصف بعض اولادش ساکن سیوستان"

تحفۃ الکرام کی روایت پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی رحمت اللہ علیہ نے سندھ کے بزرگ حضرت صدرالدینؒ سے ملاقات کی تھی۔

حضرت مخدوم آدم نقشبندیؒ

حضرت مخدوم آدمؒ سندھ میں مخدوم آدو کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی مخدوم عبدالاحد تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ سے جاکر ملتا ہے۔ آپ اپنے وقت کے بڑے عالم و فاضل تھے۔ شہنشاہ اورنگزیب کے دور حکومت میں دہلی تشریف لے گئے تھے، جہاں آپ کی ملاقات حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم نقشبندیؒ سے ہوئی۔ حضرت معصوم ان سے نہایت شفقت سے پیش آئے ایک دن قرآن پاک کی ایک آیت مبارک کی معنیٰ پوچھی وہ آیت یہ تھی۔ "والطور و کتاب مسطور فی رق منشور والبیت المعمور" مخدوم آدم نے صاحب توجہ اور وضاحت سے آیت کی معنیٰ بیان کی، جبکہ اس وقت خواجہ معصومؒ نے اپنی توجہ باطنی سے ان پر عرفان و عقیدت کی راہیں روشن کردیں، اس اثر کے بعد مخدوم آدم نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور طویل عرصہ تک مرشد کی خدمت میں رہ کر فیض حاصل کیا۔ خلافت سے سرفراز ہوکر، مرشد کے ارشاد سے وطن واپس آئے۔ اور اپنے رشد و ہدایت سے سندھ کے لوگوں کو مستفیض کرتے رہے۔ آپ کی وفات ۱۰۷۰ھ میں ہوئی اور مکلی میں مدفون ہوئے

حضرت مخدوم ابوالقاسم نقشبندیؒ

آپ کا اسم گرامی ابوالقاسم اور لقب نورالدین تھا۔ آپ نے حضرت سیف الدین شاہؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی جب سرہند سے خرقہ نقشبندی حاصل کرکے سندھ میں تشریف لائے، اس وقت سندھ میں قادریہ اور سہروردیہ طریقہ عام ہونے لگا۔ شروع میں آپ نے سندھ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ مخدوم آدمؒ کی خدمت میں رہ کر فیض حاصل کیا۔ مخدوم آدم کے اشارہ سے سرہند چلے گئے جہاں حضرت شاہ سیف الدین کی خدمت میں حاضر ہوکر فیض حاصل کیا۔ شاہ صاحب حضرت امام ربانیؒ کے پوتے تھے۔ آپ کی ملاقات کا قصہ بڑا دلچسپ ہے حضرت سیف الدین اپنے جد امجد کی مزار مبارک کی طرف جا رہے تھے، اور اپنے پالکی کے انتظار میں تھے۔ کہ آپ کو دور سے دیکھکر فرمایا مخدوم جو بزرگوار نے آپ کی سفارش فرمائی ہے یہ سن کر آپ فوراً قدم بوس ہوئے اور بیعت کرلی۔ اپنے مرشد سے باطنی فیض حاصل کرلیا، پھر سندھ میں آکر حکم کے مطابق دین کی خدمت انجام دی۔ آپ کی ذات بابرکات سے سندھ کے عوام بہت مستفیض ہوئے۔ تاریخ تحفۃ الطاہری میں آپ کا ذکر اس طرح ہے۔

تاریخ تحفۃ الکرام ـــــ میر علی شیر قانع

تاریخ تحفۃ الطاہرین ـــــ صفحہ N

آن ذات ملک صفات مرشدِ مرحمت بود کہ بر خلق می ساخت و سحاب رحمت بود کہ عالم از رشحۂ عنایتش فیض می یافت، ہزاراں مردم عین نظر فیض اثر وی بسلک دل راہ بردند و بشغل ذکر خفی بدرجۂ تحقیق رسیدند۔

صاحب تحفۃ الکرام رقمطراز ہیں:۔

"از اجل مشائخ صاحب وقال برآمدہ۔ بعض مکاتیب ساختہ جریش گم گشتگان بادیۂ ضلالت را شاہراہ حق ظاہر کرد بسیار بزرگ از خدمتش بمقصد رسیدند"

یہ ایک حقیقت ہے کہ مخدوم ابوالقاسم سندھ میں علم و فضل کے علمبردار تھے۔ اور سندھ کے عظیم المرتبت عالم آپ سے بیحد عقیدت رکھتے تھے آپ نے ۹ شعبان ۱۱۲۷ ہجری کو وصال فرمایا کسی نے اس طرح تاریخ وصال نکالی ہے۔

بسال وصل او ہاتف بفرمود ابوالقاسم سراسر نور حق بود
۱۱۲۷ ہجری۔

حضرت مخدوم لعل شہباز قلندر قدس سرہ

حضرت مخدوم شہباز قلندر رح کی شخصیت کو سندھ میں بڑی عقیدت اور احترام سے دیکھا جاتا ہے آپ کی پاکیزہ زندگی کے حالات کتابوں میں تفصیل سے ملتے ہیں۔ آپ کا اسم گرامی سید عثمان ہے حسینی سادات میں سے تھے آپ کا نسب مبارک حضرت امام جعفر صادق رضہ سے ملتا ہے۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی سید کبیر الدین شاہ تھا آپ کا وطن مروند تھا، جو آذربائیجان کے علاقہ میں ایک گاؤں ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ مروند کے سلطان کی دختر تھیں۔

حضرت کی ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار کے زیر نظر ہوئی۔ قرآن پاک کو حفظ کیا۔ تھوڑے عرصہ میں دینی علوم پر عبور حاصل کر لیا اس شعور کو پہنچ کر بابا ابراہیم ولی قدس سرہ کے معتقد ہوئے جو حضرت جمال شاہ جد کے مرید تھے۔ حضرت شہباز قلندر نے آپ کی خدمت میں رہکر طریقت کی منزلیں طے فرمائیں اور خرقہ خلافت حاصل کر کے افغانستان کی راہ سے ہندوستان میں آئے۔ اور ملتان سے ہوتے ہوئے سندھ میں تشریف فرما ہوئے۔ سلطان غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ - ۶۸۶ھ) کے دور حکومت میں ملتان پہنچے تھے۔ جہاں سلطان کے لائق فرزند سلطان محمد جس کو تاریخ میں خان شہید لکھتے ہیں۔ وہ ملتان کا گورنر تھا، جو خود بھی ایک نیک سیرت شجاع، مدبر شاعر اور سخن شناس تھا۔ حضرت مخدوم کا بیحد معتقد تھا۔ تاریخ فرشتہ میں اسطرح ذکر ہے۔

اس وقت جب سلطان محمد ملتان میں تھے۔ حضرت عثمان مروندی جو اپنے وقت کے بڑے بزرگوں میں سے تھے۔ ملتان میں وارد ہوئے۔ شاہزادہ نے آپ کے ساتھ بڑی تواضع سے پیش آئے۔ خدمت اقدس میں نذر گزاری اور بڑی کوشش کی کہ شیخ موصوف وہیں رہیں۔ آپ نے لئے ایک خانقاہ بنانے کا ہی حکم دیا اور بہت سے گاؤں آپ کے نام پر وقف کیئے مگر شیخ نے قبول نہ کیا اور اپنی منزل کی طرف کوچ کیا۔ روایت ہے کہ ایک دن شیخ عثمان مروندی کے اشعار سن کر مجلس میں موجود درویشوں پر وجد طاری ہو گیا۔ اور رقص کرنے لگے شہزادہ سلطان محمد آپ کے آگے ہاتھ باندھکر کھڑے ہو گئے اور زار و قطار روتے رہے"

آپ کو علم غیبی سے ارشاد ہوا تھا کہ سندھ کی طرف جائیں۔ لہٰذا آپ ۶۶۹ ہجری میں سندھ میں تشریف فرما ہوئے۔ اور سیوستان (سیوہن) میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور اپنی برکت سے بگڑے ہوئے لوگوں کو سیدھا راستہ بتایا اور اسلام کا نور روشن کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مخدوم شہباز قلندر کی شخصیت نہایت بلند تھی۔ اگرچہ آپ میں جلال زیادہ تھا، لیکن آپ نہایت صابر اور شاکر تھے۔ خزینۃ الاصفیا کے مصنف کی یہ زیادتی ہے کہ وہ لکھتے ہیں "شیخ عثمان مروندی اولامر پیر تھے۔" اور ملامتیہ مشرب کے تھے "لکن بہ صرحاً ماط"۔ آپ احکام شریعت کے سختی سے پابند تھے۔ تھوڑے عرصہ میں ہزاروں

۱۔ مخدوم شہباز قلندر۔ مقالہ نگار مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی۔ رسالہ کامل قلندر۔ صفحہ ۶۔

۲۔ خزینۃ الاصفیا۔ مصنف غلام سرور لاہوری صفحہ ۴۶

حضرت عثمان مروندی بن سید کبیر شاہ۔ بن سید شمس الدین شاہ۔ بن سید نور شاہ۔ بن سید محمود شاہ۔ بن سید احمد شاہ۔ بن سید ہادی شاہ۔ بن سید محمدی شاہ۔ بن سید منتخب شاہ بن سید غالب شاہ۔ بن سید منصور شاہ۔ بن سید اسماعیل شاہ۔ بن سید امام محمد۔ بن حضرت امام جعفر صادق رضہ

اسان فیض حاصل کرکے روشن ضمیر ہوئے مخدوم صاحب عربی، فارسی زبانوں میں استعداد کی منزل رکھتے تھے، آپ اپنے وقت کے بڑے شاعر تھے، برٹن، تاریخ سندھ[1] میں لکھتے ہیں

"شہباز قلندر بڑے عالم اور لسانیات، اور صرف نحو کے ماہر تھے۔"

عربی صرف نحو کی کتابیں، برٹن کے زمانے میں مروج تھیں۔ ان میں میزان الصرف اور صرف صغیر مشہور تھیں"

حضرت قلندر لعل شہباز اپنے دور کے بڑے عارف، صاحب کرامات اور شاعر تھے، آپ سے بہت سے اشعار خاص طور پر فقیر تاج بخش بیدل روہڑی سے منسوب کئے ہیں جن میں سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

این قدرت نگر، آن ہست ہر سو جلوہ گر
زان ہست عالم سر بسر در ہر صفت یکتا بدان
یک نور دیدم در جہان، ہم آشکار آہم نہان
ہر ہستیٔ حق سر بسر گز نیا مد در نظر
گاہی چنین گاہی چنان در ہر صفت یکتا بدان
حقا چنین دارم خبر در ہر صفت یکتا بدان

قلندر شہباز کے ایک ارادتمند نے ایک قصیدہ بھی آپ سے منسوب کیا ہے جو کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں ہے جس کے چند اشعار دیئے جاتے ہیں۔

خدا است رب حکیم قدیرا — ز انوار خود کرد نور نبی را
محمدؐ نور است ہر جلی را — علی شاہ عالم امام کبیرا
کہ بعد از محمدؐ بشیراً نذیراً

مقالات الشعراء میں آپ کے دو غزلیں نظر آتی ہیں جو مشہور ہیں۔

ز عشق دوست ہر ساعت درون نار می رقصیم
گہی بر خاک می غلطم گہی بر خار می رقصیم
بیا اے مطرب مجلس اسماع ذوق را در ده،
کہ من از شادی وصلش قلندر وار می رقصیم
شدم بدنام در عشقش بیا اے پارسا اکنون،
نمی ترسم ز رسوائی، بھر بازار می رقصیم
صدا خلق گویند گدا، چندین چہ می رقصی،
بدل دارم اسرارے ازاں اسرار می رقصیم
منم عثمان مروندی کہ یار خواجہ منصورم
ملامت می کند خلق و من بر دار می رقصیم

---

[1] تذکرہ صوفیاء سندھ مصنف اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۲۰۳

[2] تذکرہ لطفی "تاریخ ادبیات سندھ" مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۔ ← مقالات الشعراء میر علی شیر قانع

دوسری غزل کی مطلع ہے۔

من آن دمم کہ در بحر جلال اللہ بودستم
بکوہ طور با موسیٰ کلیم اللہ بود ستم

اس عظیم شخصیت نے اپنی پوری زندگی تجرد میں گذاری اسلئے آپ کو کوئی اولاد نہ ہوئی آپ نے سال ۱۱ شعبان ۶۷۳ھ ہجری مطابق ۱۲۷۴ء کو وفات فرمائی۔ آپ کا مزار مبارک سیوہن شریف میں ہے جہاں ہر سال ہزاروں کے تعداد میں لوگ بڑی عقیدت و احترام سے برسی مناتے ہیں۔ مولانا عنایاں سیوستانی آپ کی عقیدت میں لکھا ہے

نیست از آسیب دوران مر سیوستاں را نہیب — گرچہ آید زیر طوفاں جملہ عالم فی المثل
کشتی نوح ست گویا شاہ دوسے ہمچو نوح — منکران را تیر و چوب از دور ہی اہل دل است
غافلاں را میکند ہشیار از روز ازل۔

زمانے کے مصائب سے سیوستان کو کوئی بھی خوف نہیں ہے۔ اگرچہ پورا جہاں مثال کے طور پر کسی طوفان کے زد میں کیوں نہ آجائے۔ شاہ گویا نوح علیہ السلام کی طرح ہے اور سیوہن حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ہے۔ منکر کو تیر اور لاٹھی سے شرمندہ اور دور رکھتا ہے۔ آپ کے نوبت کی آواز اہل دل کے لیئے بڑی معنیٰ رکھتی ہے۔ غافلوں کو روز ازل کا انجام یاد دلاتی ہے۔

آپ کی تاریخ وفات اس قطعہ سے نکلتی ہے

چون عثمان ولی از دار دنیا
برفت و باب جنت شد بر او باز
ز مخدوم اجل جوئے ارتحالش
بفرما عارف محبوب شہباز۔

آپ کا روضہ مبارک فیروز شاہ کے عہد حکومت میں ملک رکن الدین والی سیوستان نے تعمیر کرایا تھا بہرحال سندھ کی پاک زمین کو یہ شرف ہے کہ ایسا کامل ولی، صوفی، اپنی زندگی کا آخری سال گذار کر ہمیشہ کے لئے سندھ کا ہو گیا

حضرت مخدوم نوح ہالائی[1]

آپ کا اسم گرامی لطف اللہ، لقب مخدوم نوح تھا۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت مخدوم نعمت اللہ ہالاکندی کی مقدس شخصیت تھی آپ کے آباؤ اجداد کوٹ کرور (ملتان) میں آباد ہوئے تھے، جن میں حضرت شیخ ابوبکر کتابی[2] اپنے وقت کے عظیم المرتبت صوفی اور درویش تھے۔ شیخ ابوبکر کتابی[2] کا سلسلہ نسب امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا کر ملتا ہے۔ بزرگ شیخ کے صاحبزادے مخدوم فخر الدین کبیر، سیر و سیاحت غرض سے سندھ میں سیوستان کے قریب[3] تشریف لائے تھے اور وہاں سکونت اختیار کرلی تھی۔ وہیں وفات پائی۔ آپ کے خاندان سے ایک اور بزرگ حضرت فخر الدین صغیر ہالا کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں نے بڑی عزت اور احترام کیا اور ان لوگوں کے اصرار پر ہالا میں مستقل سکونت اختیار کی۔ مخدوم صاحب کی کرامتوں کی بڑی تفصیل ہے، جس کا ذکر تحفۃ الکرام اور حدیقۃ الاولیا میں ملتا ہے۔

---

[1] تلخیص شہباز "مقالہ نگار مرحوم پیر فیر اللہ بدوی سیال کامل قلندر صفحہ ۱۲۔

[2] تذکرہ صوفیائے سندھ مرتب اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۲۸۵ [3] اس جگہ کو آج بھی لوبک کہتے ہیں

مخدوم نوحؒ اپنے وقت کے بڑے صوفی اور بلند مرتبہ عالم تھے، آپ نے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا، جس کو ہندوستان میں اولیت کا شرف حاصل ہے آپ سے پہلے شیخ سعدیؒ اور ملا حسن کاشفی نے فارسی زبان میں قرآن پاک کے ترجمہ کئے تھے آپ کے بعد علامہ شہاب الدین دولت آبادی اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے فارسی میں ترجمہ اور تفسیر لکھا۔

روایت ہے، آپ نے ابتدائی تعلیم اور قرآن پاک کی تعلیم مخدوم عربی دیانہؒ سے حاصل کی تھی مخدوم خان محمد ہوشانی نے بیان کیا ہے "ایک مرتبہ سید صدر شاہ نماز ظہر ادا کرنے کے بعد مسجد میں لیٹے ہوئے تھے کہ وہاں مخدوم نوحؒ تشریف فرما ہوئے ان کو لیٹے ہوئے دیکھکر فرمایا "قم الصلوٰۃ الذکری" (اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے کھڑے ہو جاؤ) سید صدر شاہ نے آپ سے پوچھا "من علمک" (آپ کو کس نے تعلیم دی) اس نے فرمایا "علمنی ربی" (مجھے میرے رب نے سکھایا) دلیل الذاکرین میں یہ حقیقت واضح طور آتی ہے، جس کی روایت حضرت جلال الدین، جلال محمدؒ نے کی ہے کہ حضرت نوحؒ نے فرمایا کہ آپ فرماتے تھے اللہ تعالیٰ نے مجھے چار چیزیں سکھائی[1] ۱۔ کلمہ طیبہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" جس کی میں تلقین کرتا ہوں، ۲۔ قرآن مجید، جس کی میں معانی اور تفسیر بیان کرتا ہوں، تیسری ۳۔ خواب کی تعبیر، مجھے عالم غیب سے خواب کی تعبیر کا علم ملتا، اس لئے کہتے ہیں کہ علوم باطنی میں حضرت نوحؒ بظاہر کسی کے مرید نہیں تھے، ۴۔ علم حدیث عطا فرمایا۔

تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ آپ بہت گریز فرماتے تھے پھر بھی آپ کے ملفوظات موجود ہیں جن میں آپ کے اقوال اور دلائل بڑی کتب سے نقل کئے گئے ہیں آپ کے سندھی زبان میں ابیات نظر آتے ہیں جن کا ذکر مخدومی ہرو فیر لطف اللہ بدوی نے اپنی تصنیف تذکرہ لطیفی حصہ اول میں کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو شعر و شاعری سے بھی کتنا شغف تھا۔

حضرت مخدوم نوحؒ ستاسی سال کی عمر میں ۲۰ ذی القعدہ ۹۹۸ھ میں رحلت فرمائی حدیقۃ الاولیاء میں آپ کی وفات کا ذکر اس طرح ملتا ہے

حضرت مخدوم وقت روز پنجشنبہ و ہفتم ماہ ذی القعدہ رحلت فرمودہ بودہ حقیر و فقیر این لفظ در تاریخ وی گفتہ بود "حیفی نوح بود" در ۹۹۸ھ ہجری از خم خانہ وحدت ذوالجلال جام ذلال لقائی حضرت احدیہ مکشوف و نوش شد و بحضرت سرای بیوت رضوان، بحر احمد و بقدوم صورت الزوم روحانیا را مژدہ گانی رسانید،

آپ کا مزار مبارک ٹھالا میں مرجع خاص و عام ہے۔

مخدوم عربی دیانہؒ

مخدوم عربی دیانہؒ اپنے وقت کے عالم اور صاحب کرامات بزرگ تھے آپ کا ذکر تحفۃ الکرام اور حدیقۃ الاولیاء میں ملتا ہے، بلند مرتبت شخصیت، مجذوب پیراسات کے حامی تھے و مخدوم جونپوری کے معتقد تھے آپ بڑے عبادت گزار تھے۔ مخدوم عربیؒ زہد و تقویٰ میں بہت بلند مقام کے حامل تھے۔ میر علی شیر قانع لکھتے ہیں، کہ آپ کو تلاوت کلام پاک سے بڑی محبت تھی۔ ایک سنت میں پالیس مرتبہ قرآن پاک کے ختم ہو جایا کرتے تھے۔ حضرت سے آپ کو خوش الحانی سے نوازا تھا، جب تلاوت فرماتے تھے، تو پرندے اڑنا چھوڑ دیتے تھے اور پانی کا بہاؤ ٹھہر جاتا تھا

ایک دن کا ذکر ہے کہ آپ اپنی خانقاہ میں عبادت الٰہی میں مشغول تھے کہ آپ کے ہاتھ سمندر کی جھاگ سے تر ہو گئے اور اس سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگے، ایک مرید جو اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر تھا، یہ دیکھکر حیران ہوا اور اس حقیقت کے متعلق عرض کیا، آپ نے فرمایا، میرا بیٹا نامرید میرے چند مریدوں کے ساتھ جہاز میں سمندر میں ایک کشتی میں سوار تھے کہ اچانک طوفان میں پھنس کر کشتی ڈوبنے لگی میرا بیٹا مجھ سے رجوع ہوئے میں نے اس کشتی کو طوفان سے نکال کر کنارے پر لگایا ہے۔ اس وجہ سے میرے ہاتھ سمندر کی جھاگ سے تر ہوئے آپ نے ۹۸۰ھ ہجری کو ٹھالا میں وفات کی

---

[1] حدیقۃ الاولیاء مصنف سید عبدالقادر بن سید حاتم۔ صفحہ ۱۳۹ [2] تاریخ تحفۃ الکرام صفحہ ۱۵ جلد ۳

حضرت شاہ خیرالدین شاہ جیلانی رح

حضرت شاہ خیرالدین شاہ جیلانی قدس سرہ سید ما حضرت غوث اعظم دستگیر رح کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی حضرت احمد بغدادی رح تھا۔ حضرت صاحب بغداد میں ۹۱۱ھ ہجری کو تولد ہوئے، بچپن میں بغداد سے مکہ کی طرف تشریف لے گئے وہاں چودہ سال رہکر علوم کی تحصیل کی، بعد میں وہاں سے سندھ میں تشریف لے آئے۔ اور مخدوم نوح بکھری رح کی صحبت میں رہکر رشد و ہدایت حاصل کی سکھر میں ایک پہاڑی پر بیٹھکر عبادت الٰہی میں مشغول ہوئے۔ آپ کی کرامات اور عبادت کا چرچا عام ہوا، ہزاروں کے تعداد میں لوگ آپ کے مرید ہوگئے تھے جن میں اکثر صاحب کمال کے درجہ پر ہوگئے۔ آپ کے مناقب، دلیل الذاکرین، اور مقولے مبارک پیر سید محمد راشد کے ملفوظات میں موجود ہیں۔ دلیل الذاکرین سے نقل ہے کہ ایک مرتبہ شاہ صاحب نے اپنے فرزند کو عبادت الٰہی کی تلقین کی جو برداشت کرنہ سکے اور رحلت کر گئے۔

آخری زندگی کے ایام میں اس پہاڑ سے اتر کر اس جگہ آئے جہاں آپ کا مزار ہے۔ وہ رہیں ترخان خاندان کے حکمرانوں کی جو آپ کو نذرانہ کی طور پر دیدیگئی آپ اپنے اہل و عیال کے ساتھ وہاں مقیم ہوئے۔ آپ نے ۲۷ ماہ رمضان المبارک ۱۰۲۷ھ ہجری میں رحلت فرمائی۔ آپ بڑے صاحب دل صوفی اور صاحب شریعت تھے۔ آپ کے خلفاء میں سید نصیرالدین متعلوی تھے جنہوں نے آپ کی وفات کے بعد حضرت نوح بکھری کے خلیفہ یحیٰی راشد کی صحبت میں رہکر فیض حاصل کیا۔ شاہ صاحب کی خدمت میں فقیر سدھو اور فقیر جمال الدین صحیفہ رہتے تھے۔ آپ کی تاریخ وفات اس قطعہ کے آخری مصرع سے نکلتی ہے

شاہ خیرالدین مہ برج شرف
مقبل درگاہ ایزد سرمدی
سال تاریخ وصالش عقل گفت
مرشد کامل طریق احمدی
۱۰۲۷ ہجری

آپ کی درگاہ پرانے سکھر میں ہے جو مرجع خاص و عام ہے۔ پیاسے اپنی پیاس بجھانے آتے ہیں۔ ہر سال ۱۱ ربیع الاول پر بڑے اہتمام سے گیارھویں منائی جاتی ہے۔ آپ کے مزار پر نیلا گنبد ہے جو دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس خوبصورت گنبد کو ۱۱۷۴ھ ہجری میں آپ مرید اور مجاور کی کوشش سے تعمیر ہوا۔ سید اسد اللہ ساقی معصومی، جو میر محمد معصوم بکھری کے پوتے تھے۔ اس گنبد کی تاریخ لکھی، جو اس طرح ہے۔[1]

شہ خیرالدین سرور سالکان
ولی خدا زبدہ عارفان
زہی روضہ آئی مظہر نور حق
بیا بند فیضی زیارت کنان
رسیدش بنا روضہ خوشنشان
چون ساقی طلب کرد تاریخ آن
بگفتا خرد مہر کہ فیض دان
۱۱۷۴ ہجری

قاضی قاذن رح

قاضی قاذن بن ابوالخیر ابو سعید بن قاضی زین الدین سیوہن سندھ کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد اور جد حضرت قاضی ابوالخیر اور قاضی زین الدین

---

[1] اخبار الوحیہ از اسد سندھ نمبر صفحہ ۱۷۹

بکھر کے رہنے والے ہے۔ جہاں سے ہجرت کرکے سیوہن میں سکونت اختیار کی۔ قاضی قادن کی ابتدائی تعلیم والد کے زیر سایہ ہوئی حفظ قرآن کے بعد علم معقول و منقول کی طرف رجوع ہوئے، بعد میں علم تصوف میں کمال حاصل کیا۔ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سفر میں گذرا علمی شہروں کے غرض سے سیہون سے ہجرت کرکے دریبلے اور بکھر آکر رہے، بکھر میں تھوڑے عرصے میں آپ کی علمی شہرت بڑھتی گئی۔ جس کی وجہ سے وقت کے حکام میں بھی عزت ہونے لگی۔ جرانی کے زمانہ میں سید میراں محمد شاہ مہدی جونپوری جو ہندوستان کے نتائج میں سے تھے سندھ میں تشریف لے آئے تو قاضی صاحب ان کے ارادتمندوں میں داخل ہو گئے۔ سندھ کے اکثر علماء قاضی قادن سے اس بات پر ناراض رہے، لیکن وہ پوری زندگی مہدویہ طریقے کے مقلد رہے۔ جام نظام الدین سمہ (۸۶۳ھ - ۹۱۲ھ) کے زمانے میں بکھر کے قاضی مقرر ہوئے اور جام فیروز کے زمانے تک اس عہدہ پر رہے۔ مرزا شاہ بیگ ارغون نے جب جام فیروز سے سندھ کے جنوبی حصہ کو فتح کر لیا، تب قاضی صاحب سے بھی عہدہ واپس لے لیا۔ شاہ بیگ ارغون کی وفات کے بعد جب ان کے فرزند شاہ حسین ارغون اور جام فیروز کے درمیان صلح ہوئی تو قاضی صاحب جام کی طرف سے مرزا کے یہاں ایلچی مقرر ہوئے لیکن جلد ہی یہ صلح ختم ہوئی اور دونوں کے درمیان لڑائی ہوئی جام شکست کھا کر گجرات چلے گئے اور قاضی بکھر میں جا کر مقیم ہوئے۔ شاہ حسین نے آپ اس عہدے کی پیشکش کی، لیکن قاضی صاحب نے بڑی عمر کی وجہ سے انکار کر دیا۔

قاضی قادن[1] اپنے دور کے نہ صرف عالم تھے بلکہ اعلیٰ طریقت بھی تھے۔ آپ کی منزل اور مرتبہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا کلام سندھ کے جید عالم صوفی حضرت شاہ عبدالکریم بلڑی نے اپنی کتاب ملفوظات، بیان العارفین میں درج کیا ہے۔ آپ کے سندھی زبان میں صرف سات ابیات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بیان العارفین میں ایک روایت نظر آتی ہے جو اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتی ہے:۔

شاہ عبدالکریم بلڑی[2] فرماتے ہیں، ایک دن ایک ملامتی درویش قاضی صاحب کی مسجد میں محراب کی طرف پاؤں پھیلا کر سوئے ہوئے تھے۔ قاضی صاحب کو جب ان کی اس حرکت کا پتہ چلا تو اسے ڈرانے کو مسجد میں آیا۔ ان کی پاؤں کی طرف کھڑے ہو کر ذرا مارنے کا قصد کیا تو پاؤں کی جگہ ان کا سر نظر آیا۔ اسطرح دوسرے ذرے مارنے کی کوشش کی لیکن وہی کیفیت رہی۔ قاضی صاحب نے مایوس ہو کر بجز پرستاں ہو کر اس درویش سے قاضی صاحب کو کہا پاؤں جس طرح چاہو کرلو، مگر دل اپنے خالق کی طرف ہونا چاہئے۔ یہ سنتے ہی قاضی صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔

قاضی صاحب سندھ کے پہلے شاعر تھے جنہوں نے سندھی زبان میں شعر کی بنیاد رکھی اور تصوف کی باریکیوں کو پیش کیا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں

میں نے جو کچھ علم حاصل کیا، وہ میرے لئے ملائے جان بن گیا ہے وہ حروف اور الفاظ بلا نقش سطر بنکے کیسے دوڑے آرہے ہیں

دوسری زبان کی طرح سندھی زبان کا تحریری اولین سرمایہ، شعر کی صورت میں موجود ہونا مسلم شدہ بات ہے کہ سندھی زبان کا بنیادی شعر قاضی قادن سے شروع ہوا اپنے کلام میں خدا شناسی کا حال خوبی معلوم ہوتا ہے۔ سندھ کے ادیبوں نے آپ کا ذکر کیا ہے۔ قاضی فیض محمد نے انگریزی زبان میں نہایت شستہ طریقے سے لکھا ہے

---

[1] مہدوی تحریک، ہندوستان سے شروع ہوئی، اور تابع میں مہدویہ تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ جو اپنی اولین شکل میں مسلمانوں میں سرنو بیداری پیدا کرنے کے لئے ایک درویشانہ تحریک تھی، اس کے بانی سید میراں محمد مہدوی جونپوری ہیں۔ ان کی ولادت جونپور ہندوستان میں ۸۴۷ھ کو ہوئی تھی ۸۷۰ھ سے ۲۳ سال دنیا کے مختلف حصوں میں سیاحت کرنے بعد ۹۱۰ھ کو قندھار کے نزدیک فراہ میں وفات کی۔ قندھار جانے سے پہلے سندھ میں بھی رہے اور ان کا قیام ٹھٹھہ اور ٹالپی کے شہر میں ہوا قاضی قادن ان کے ارادتمند ہوئے۔

[2] تذکرہ لطفی جلد اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۱۲۵۔

[3] Kazi Kazan of Sewhan was the first Sindhi poet, who introduced philosophy and mysticism in Sindhi poetry. His first Seven verses are full of it. He has in his poetry laid great emphasis on the purity of Mind and the study of Self. In one of his verses he says. 'Even if you master thoroughly the great Arabic work QUDOOR and QAFIA you will only be like an Ant sitting with in a well in limited environment knowing nothing of the world out side .....

Mysticism dominates Sindhi Poetry by
(Faiz Muhammad Soomro)

باب چہارم

تصوف اور شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سندھ کی وہ برگزیدہ شخصیت ہیں جن کے کلام میں ہدایت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ حضرت سعد بن ہشامؓ سے روایت ہے[1]

"ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، آنحضرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق کیا تھا؟ آپ نے فرمایا، تو قرآن پڑھا ہے۔ میں نے جواب دیا ہاں، میں قرآن پڑھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا پورا قرآن کریم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق ہے، جو شخص قرآن پاک جیسی عظیم کتاب لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اس کو خود اس کا عملی نمونہ ہونا چاہئے، یہی سنت ہے کہ آنحضرت صلعم نے مکہ کے کفاروں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"تحقیق میں نے آپ کے اندر، اس سے پہلے ایسی زندگی گذاری ہے۔ آپ اپنے عقل سے کام نہیں لیتے، اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہو سکتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولے، اور ان کے آیات کا انکار کرے، تحقیق وہ مجرم ہے اور کبھی بھی چشمکارہ حاصل نہ کریگا۔"

اس حدیث مبارک کو پڑھتے ہوئے حق و باطل کی کسوٹی ہمارے سامنے آجاتی ہے، اور اپنے عقل سلیم سے اُمت مسلمہ میں اسی طرح اعلیٰ نبیؐ کی تقلید کی، شاہ بھٹائیؒ کی زندگی درویشانہ اور متوکلانہ گزری ہوئی تھی۔ یہ اثر ہے آپ کے عظیم کلام سے ہمیں وضاحت سے ملتا ہے، اپنے کلام کے لئے خود فرماتے ہیں:

جي توں بيت پائين، سي آيتون آهين

نيومن لائين پريان، سندي پاڻ ڏي.

(ان ابیات کو ابیات نہ سمجھو، یہ قرآن کی آیتیں ہیں جو دل کو محبوب (خدا تعالیٰ) کی طرف لے جاتی ہیں)

اس دعوے کا صحیح ہونا یا نہ ہونا، وہ کسوٹی آپ کا عرفانی کلام ہے، کیوں کہ آپ کے متبرک کلام کا ہر ایک حرف، خدا تعالیٰ کی شرشار نظر آتا ہے حافظ شیرازی علیہ رحمت فرماتے ہیں:

غلام همت آنم که زير چرخ کبود

ز هر چه رنگ تعلق پذيرد آزاد است

میں اس شخص کی ہمت کا بندہ ہوں، جو اس آسمان کے نیچے ہر ایک ایسی بات سے جس میں کسی کے میلان سے قلب پر رنگ آجائے اور آزاد ہو۔

شاہ بھٹائیؒ اس قبل میں فرماتے ہیں:

صوفي سالم سي ديا، جي اهڙ جن آذيار

بازي باز نندن کي، آهي اويسار

پير بين حسين بمڪلم، سندي سائين عنا

(اس دنیا سے وہ صوفی سلامت گئے، جو کثرت سے لاتعلق رہے، جب کے کھیل کھیلنے اس رندی نصیب)

(جو تعلق نے انکو عشق حقیقی کی آخری منزل پر پہنچایا۔)

---

[1] اسلامی تصوف اور بھٹائیؒ (مقالہ) مقالہ نگار راقم حروف رسالہ نئی زندگی (سندھی) ماہ اپریل ۱۹۷۱ء

اسلامی تصوف کا اصل حاصل کیا ہے؟ قرآن حکیم اور اُنکا عمل۔ حضور علیہ کی ذات مقدس "والتین" کا حسین کردار۔ حافظ شیرازی رح اسکا بیان یوں ادا کرتا ہے

صبح خیزی، و سلامت طلبی چون حافظ

ہرچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآن کردم۔

(صبح خیزی کی سلامتی کو جب تو طلب کرتا ہے حافظ۔ تو یہ جو تجھکو حاصل ہوا ہے وہ قرآن حکیم کے بدولت حاصل ہوا ہے۔)

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔

جسي ڀي جباڻ جو غني ڪيمو ڪرڻ

ٻلي تون نہ ٻان سان، چاڻي پس چوءِ

فصل ميں فرقان ۾، اسم اعظم لاور

ٻيا در ڏيجي ڪ نوش، اين آمل آئيش سپيءِ۔

اپنے دل میں رب جبار کا ذکر مخفی کرتا رہ۔ اپنی زبان سے بھی چاروں وقت ظاہری ذکر کر

قرآن پاک سے اپنی فکر سے اسم اعظم کو حاصل کر دوسرے دروازوں پر مت جا۔ یہ بیبہا چیز اُن سے ہی حاصل ہوگی۔

اسلامی تصوف کی بنیاد کو اِن دونوں بزرگوں نے قرآن حکیم کو ہی سمجھا ہے جو اپنے شیریں کلام کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے کلام کا مطالعہ کرنے والا ان کے کلام کو الہامی کہتے ہیں اگر یہ حقیقت صحیح ہے۔ تو ہمیں قرآن حکیم کو اسلامی تصوف کا بنیاد تصور کرنا چاہئے۔ کیوں کہ قرآن پاک میں شروع سے لے کر آخر تک "توحید" نظر آتی ہے۔ اُنکے پرجلال دعوٰے سے کون انکار کر سکتا ہے قرآن پاک کا ارشاد اعلیٰ ہے۔

کہدے یہ وہ راستہ ہے جو اللہ کی طرف لے جاتا ہے میں پوری بصارت سے ہوں اور آپ اُنکے تابع ہیں

تعریف کے لائق ہے اللہ، اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت پوری بصیرت ہے، قلب اور دماغ کی روشنی ہے، شیخ فرید الدین عطار رح فرماتے ہیں۔

ہر کہ نادیدہ نام او رگویہ۔ مشرک است آن فضول نا پنجار

جو بھی انکو دیکھنے کے سوائے اُنکا نام لے۔ وہ مشرک ہے فضول ہے اور ملامت کے لائق ہے۔

قادر کریم کا نظارہ کیا ہے؟ وہی ذکر و فکر کی دعوت ہر بصیرت ہے۔ حضرت محی الدین ابن العربی "متعصب صوفیوں کے رہنما کا قول ہے۔

لفي كل شيءٍ له آيةٌ تدلُّ على انّه واحد

"ہر چیز میں انکی شان موجود ہے جو اس بات کی دلیل ہے وہ ایک ہے"

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کا مفہوم، حضرت محی الدین ابن العربی رح کے شعر سے واضح نظر آتا ہے۔ اس شعر کی اس سے زیادہ تشریح اور ہو نہیں سکتی، ہر چیز میں پالنے والے کی شان موجود ہے۔ جسے دیکھکر صرف خاموش اور استعجاب رہ جاتا ہے، اور آفاق کی پوری سیر نفس کی سیر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

شاہ بھٹائی رح کے کلام میں یہیں توحید کا مفہوم اتنا صاف نظر آتا ہے۔ جس کے بیان کرنے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ اُسکی حقیقت میں چیز لاحد ہے۔ خود فرماتے ہیں۔

وحده لا شريك له۔ اي ڪيڏو اي حق۔

ٻيا ڪي ڪ ٻڪ، جن وڏ ٿو، سي وڏ شا۔

اللہ تعالیٰ کی ذات واحد ہے۔ اُسکا کوئی شریک نہیں۔ یہ وحدانیت حق ہے نفاق کو جس نے معرفت سے گرفت میں لیا اس کو ہر چیز حاصل ہوئی۔

ایک کامل صوفی اور ارباب ہمت کی حیثیت میں صوفیوں کی سیادی تعمیر میں شاہ عنایتؒ نے اپنی فرمان تبلیغ کی وضاحت کردی ہے۔ وہ لوگ جو وحدانیت کی توحید کا انکار کرتے ہیں وہ محروم اور گمراہ ہیں۔ تصوف والوں کے یہاں اس تعمیر کی تکمیل تب ہوتی ہے جب کہ توحید کے ساتھ رسالت کا بھی اقرار کرنا ضروری ہو۔ شاہ لطیفؒ "حقیقت محمدیؐ" کی تبلیغ اس طرح فرماتے ہیں:۔

وحدہٗ لا شریک لہٗ، جنہن چیو جن

تن چیئو محمد مصطفیٰ، جیجان سائڈ جین

تنہن منجھان تن، او تنہ منجھن نہ اولٹو۔

اللہ کی ذات پاک، واحد ہے۔ اسکا کوئی شریک نہیں ہے جیسے یہ مانا۔ انہوں نے دل کی خوشی سے حضرت محمد صلعم کی ذات گرامی کو بھی مانا جن کی ذات پاک کے لئے جہاں پیدا کیا۔ جس نے مانا انہوں نے منزل مقصود حاصل کی۔

علامہ نجم الدین محمود شبستری، جو اکابر صوفیوں میں سے تھے۔ یہ ہی حقیقت بیان فرمائی ہے:۔

محقق را کہ از وحدت شہود است نخستین چشم بر نور وجود است

وطے کز معرفت نور صفا دید، ز ہر چیزے کہ دید اول خدا دید۔

وہ محقق جس نے وحدانیت کو دیکھا ہے۔ سب سے پہلے اُن کی آنکھ وجود کی نورانیت پر ہے لیکن جب آنکھ معرفت کے راستے، نور کی صفائی نظر آتی ہے تو وہ ہر چیز میں خدا کو دیکھتا ہے۔

شاہ عنایتؒ فرماتے ہیں:۔

صوفی صاف ٹیو، ذوقی حق وجود جو

تنہان پوءِ تیو، جیئری پسڻ پرین جو۔

"صوفی نے اپنے وجود کے ورق کو دھو کر صاف کیا۔ اس کے بعد اُن کو حیات میں محبوب کا دیدار نصیب ہوا۔"

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:۔

آئینہ دل چون شود صافی و پاک

نقشہا بینی برون از آب و خاک

دل کا آئینہ اگر صاف و پاک ہو جائے تو مٹی اور پانی والی چیز میں سے عجیب نقش نظر آنے لگتا ہے

مگر یہ وجود کا ورق کس طرح صاف ہو اور وہ تصوف کا مرحلہ کس طرح پورا ہو جائے اس کے لئے مشہور صوفی محمد بن احمد العکری فرماتے ہیں، تصوف حق کی حالت پر استقامت اختیار کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے صوفی اپنے آپ کو ظاہری و باطنی طور پر دیکھتا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ اُن کو حق کا مشاہدہ ہو۔ رومیؒ کا تصور کتنا واضح ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ ایک عظیم صوفی کی حیثیت سے اپنے کلام میں ہر منزل پر یہ سبق فرما رہے ہیں کہ اسادی حرص جس بھی رنگ میں ہے وہ مذموم ہے۔ اس سے عجیب عجیب پریشانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر تو چاہتا ہے کہ راہ مطلق کے لئے تجھے مکمل طور سے علم ہو جائے تو سب سے پہلے اپنے وجود کو فنا کر دے۔

امتیازات ہمہ اوہام اندر تو عدم باش وجود این جا نیست

"اس عالم کا پورا، عیار محض جمال ہے۔ تو اپنے آپ کو کچھ سمجھ کر اس کے وجود کی کوئی بھی حقیقت نہیں ہے"

محبت الٰہی کے لئے سب سے پہلی چیز ہے "خود کو فنا کرنا" اس کے بعد ہی حال حاصل ہوگا۔ ان دونوں چیزوں کو ہم بھٹائیؒ کے کلام میں انوار سے دیکھتے ہیں۔ وہ ہمیں ایک سالم صوفی نظر آتے ہیں اور ان کا پورا حال و قال نظر آتا ہے۔ بھٹائیؒ حضرت مولانا رومیؒ کے فکر سے متاثر ہیں۔ اس لئے آپ کی آواز بھی وہی ہے۔ "قال را بگذار مرد حال شو" حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مطلق کتابوں میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے فرزند کو سلوک کی تعلیم دیتے ہوئے ان کے سینے کو انگلی سے مس کیا، فرزند نے عرض کیا، "میرے سینے میں قرآن پاک ہے" آپ نے فرمایا مجھے معلوم ہے، میں تیرے سینے سے یہ خیال نکالنا چاہتا ہوں، کہ تو نے قرآن کا حافظ ہے" اگر علم فخر اور غرور سکھاتا ہے تو، اس حرص کو پامال کرنا چاہیئے"

شاہ صاحب اس قبیل میں فرماتے ہیں:-

اکثر پڑھ الف جو، ورق سب دساں
آندر تون اُجار، ینا پڑھندین کیترا۔

سبق پڑھ الف کا، اور دوسرے اوراق کو چھوڑ دے۔ اپنے سینے کو صاف کر، تو کتنے اوراق پڑھو گے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:-

صد کتاب و صد ورق در نار کن
خفتہ دل را یک دمے بیدار کن۔

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں:-

نہ کھٹی کبو کوھ، جو رھٹی رھیو نہ سپرین
کیئے کو کیا کرینگے، جب کہ میرا محبوب ہی نہ رہا۔

اس رہنے کے لئے خاقانیؒ کا قول ہے۔

یک دم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی۔

"ایک دم خدا تعالیٰ سے ہونا، حضرت سلیمان کے ملک سے بہتر ہے"

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اسلامی تصوف کے بڑے عارف تھے علامہ قادر بخش بیدل (دھڑوی (سندھ)) نے شاہ لطیفؒ کے علمی رتبے کی تعریف اپنی مشہور مثنوی "دلکشا"[1] میں اس طرح کی ہے۔

آن سر آمد عارف و شاہ عشق — رہبر مشاق حق در راہ عشق۔
موجہائے منطقش دریائے راز — بیت بیتش سائر صہبائے راز۔
بیت اُو نے بیت بل اقلیم وجد — مومن توحید را تسلیم وجد۔
حرف حرفش سر بسر سوز و گداز — لفظ لفظ او حقیقت خوش مجاز
گر تو آری بر زباں اسم شریف
عبد را گردان مغانی با لطیف

---

[1] مثنوی "دلکشا" مسودہ من تصنیف حضرت قادر بخش بیدلؒ دھڑی سندھ

"وہ عارفوں کے پیشوا اور عشق کے شاہد، جو عشق کی راہ میں، حق کے عاشقوں کا رہبر ہے۔ آپ کے گفتگو کی موجیں رازِ الٰہی کے دریا میں سے ہیں، آپ کے کلام کی ہر ایک سطر میں رازِ الٰہی کی شراب کا پیالہ ہے۔ اُن کے احسان، احسان نہیں ہے بلکہ وحدت کی ولایت ہے، توحید پر ایمان رکھنے والوں کے لئے تسلیم و رضا کا وحدہ ادا کرنے والا ہے۔ آپ کا ہر ایک حرف مکمل موزوں گداز ہے، اور آپ کا ہر لفظ اُنکی حقیقت ہے، اور پسندیدہ راز۔ اگر تو اُن کا نام اپنی زبان پر لانا چاہتے ہو تو، عبد کو لطیف سے ملا دو، یعنی عبد اللطیف شاہ لطیف وحدت الوجود اور ہمہ اوست کی فکر کے قائل ہے جن کی مثال آپ کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ یہ فکر آپکو اپنے طریقہ سے حاصل ہوا۔ آپ کے کلام میں وحدت الوجود کے نکتے موجود ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شعر و شاعری صرف اس حقیقت کی تبلیغ ہے۔ اور جس ایک فارسی کے شاعر شوکت بخاری کہتے ہیں

غریق بحر وحدت، جلوۂ کثرت نمی بیند ——

بر آب نتوان دید، موج آب دریا را

(وحدت کے سمندر کا غریق، کثرت کے جلوہ کو نہیں دیکھتا، کیونکہ پانی سے نیچے پہنچنے کے بعد لہروں کو کس طرح دیکھے گا)

شاہ لطیف جس مرکز کے تابع تھے۔ وہ نظریہ وحدت الوجود تھا۔ جو کہ آپ کے یہاں کمال پر پہنچ گیا تھا۔ توحید کے لئے شاہ صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ وجود واحد ہے، وہی موجود ہے۔ اور مخلوقات کے وجود میں امتیاز کا قائل ہے۔ وہ اس حقیقت کے ادراک سے ماورا ہے جو خود اس کی ذات کے اندر موجود ہے۔

یہ جہان حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ کی صفات کا اظہار ہے۔ اس کے ہر ذرہ سے ان کا جمال عیاں ہے۔ اسی جمیل چیز میں کسی فنی کی ضرورت نہ تھی، لیکن ایک فنی کے وجود کو بھی لایا گیا۔ اس کے بعد اس سے کنارہ کرنے کا حکم، کیسا پریشان کن ہے اس کے متعلق شاعرانہ شوخی کے ساتھ کیسا عجز کا اظہار کیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر خدا تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ رہتا تو انسان، اس دنیا کے فتنے سے کہاں تک بچ سکتا۔ شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں

سون کي سون پيرين بڌي وڏو ڄاڻ ڄ

مٿون آئين چون، ته متان پانڌ پسائين.

(میرے صبر نے مجھے باندھکر پاؤں میں ڈالا اُس سے کہہ رہا ہوں دیکھنا کہیں دامن نہ رنگ جائے)

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ ——

بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش.

شاہ صاحبؒ ابتدائی زندگی سے وحدت الوجود کے قائل ہے۔ بتدریج جیسے جیسے عمر و فکر بڑھتا گیا، تو رنگ بھی پختہ ہوتا گیا۔ آپ حضرت مولانا رومیؒ کے مقلد تھے۔ اس لیئے وحدت الوجود کے رنگ سے کبھی آزاد ہو نہ سکے۔ حضرت شیخ محی الدین ابن العربیؒ نے اس مسئلہ کو خاص سے پیش کیا ہے، فرمایا ہے۔

"وجود حقیقت میں صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، اور عالم کا کوئی بھی وجود نہیں ہے۔"

آپ کے نزدیک عالم اور خدا کی نسبت عبد کی نسبت ہے۔ اس عبدیت کا اثبات یا تو وجود عالم کی نفی سے کرتے ہیں یا خدا کے اثبات سے ابو الحسین نوریؒ فرماتے ہیں "تصوف نہ تو کوئی قانون ہے نہ کوئی اصول، لیکن یہ از خود موجود ہے"

تاریخ تصوف اسلام ـــ صفحہ ۳۰۷

شاہ لطیف کی صحبت صوفیوں سے ہوتی تھی، جن سے وحدت الوجود کا زیادہ قائل ہو گیا تھا ان میں حضرت مخدوم محمد معین ٹھٹوی کا بھی ذکر ہے، مخدوم موصوف وحدت الوجود کی فکر کے عامل تھے، اس مسئلہ پر مخدوم صاحب کی خط و کتابت شکارپور کے مشہور عالم و کامل، صوفی بزرگ حضرت فقیر اللہ صاحب علوی سے ہوتی رہتی تھی۔ یہ مکتوب حضرت علوی کے مشہور تصنیف "مکتوبات" میں محفوظ ہیں۔ جس میں شاہ صاحب کے ہم اوست کے خیال کو صاف طور پر دیا ہے جس کے قبیل شاہ صاحب نے فرمایا ہے۔

هيڏانئن عاديان ڪرهو ۽ چوڏس چنا ٿو،

منهن ڪاڪ ڪڪوري، منجهين لڏا ٿو،

راڻو ۽ راڻو، رڻ ۾ راڻي پيو ناهه ڪو۔

کس طرف اپنے اونٹ کو لے جاؤں (کہاں جاؤں) کیونکہ ہر طرف روشنی ہے جس سے ککاک (دنیا) اور وہ لڈاٹو (وہ دنیا) اپنے وجود میں دیکھی ہے

(نور خدا تعالیٰ) کے سوا کوئی اور چیز نظر نہیں آتی، کسی چیز کا کوئی وجود ہی نہیں۔

دوسری جگہ پر فرماتے ہیں:

جيو تي تنگ تنوار وٽ تڻ واڻي هيڪڙي،

سڀ شيءِ شيا، سوريءَ سڏا ڪار

سمه منصور هزار، ڪهڙا چاڙهيو چاڙهين۔

ہر وہ پر چڑھتی اور درخت کو ایک ہی بات ہے، اس جہاں کی ہر چیز میں عشق الٰہی کی

جنبش اور جوش ہی ہے۔ سب سولی کے لائق ہیں۔ ہزاروں منصور موجود ہیں

آپ کس کس کو سولی پر لٹکانا چاہتے ہو۔

شاہ صاحب نے اپنے کلام میں تصوف کے پیچیدہ مسائل کو نہایت سادگی سے بیان فرمایا ہے۔

تون هنين جي تلاش، تن ۾ پڻ آهي تنهنجي

ڪاڏ ڪروڻي آڏ ڪم، اي پسروڻ جا ٻاٽ

هٿ هاڻي ڳڙ ڀاٽ، ڇوڻ پر پسين جي۔

جس کو تو یاد کرتا ہے، اُن کو تو ہی یاد ہے ــــ کاڈ کروڑی آڈ کم کی بات کو سمجھ لے

ہاتھ میں کافی ہے، زبان میں مٹھاس، اور پھر بھی محبوب کی طلب کرتا ہے

اس حقیقت کو مولانا جلال الدین رومیؒ اس طرح ظاہر فرماتا ہے۔

ــــ جملہ معشوق ست، عاشق پردہ

ــــ زندہ معشوق ست، عاشق مردہ

یہ جمال حقیقی ہے جو کہ زندہ رہے گا، اُسکے مست اور شیدائی پروانہ وار قربان ہونگے۔ شاہ لطیفؒ کے صوفیانہ ارشادات کو اکثر بزرگوں نے جمع کیا ہے اور اپنی سمجھ سے تشریح بیان کی ہے۔ مولانا غلام محمد غائبؒ کا منہاج العاشقین اور علامہ نادر بخش بیدل روہڑی کا "سند الموحدین" پنج گنج مشہور ہے۔ جن کو دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا تصوف میں کتنا بڑا مقام تھا۔

اسلامی تصوف کا سب سے زیادہ ماحصل ہے باطن کی صفائی اور ان کے صفات کا لباس جو کہ تقویٰ کا لباس ہے۔

قرآن پاک کا قول مبارک ہے۔

ولباس التقویٰ ذالک خیرٌ

(تقویٰ کا لباس اچھا ہے)

تصوف سے مراد یہ ہے کہ ظاہر میں آداب شریعت کی پابندی اختیار کی جائے جو اُن کا حکم باطن سے ظاہر ہو۔ ان دونوں پابندیوں کو اختیار کرنے والے کو کمال حاصل ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تصوف سے روحانیت ہوتی ہے جو علم حقیقت سے تعلق رکھتی ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ میں وہ سبھی خصوصیات موجود تھیں جہاں پر شاہ لطیفؒ نے کلام سے جستہ جستہ استفادہ کیا ہے۔ حالانکہ آپ کا پورا کلام ان خصوصیات سے بھرپور ہے انسان حیات کے مقصد کو "لیس للانسان الا ما سعیٰ" کے رنگ میں اس طرح سادگی سے پیش کرتا ہے۔

پیٹی پاٹنا پیٹی، نو نہ تھیندیون گالھیون۔

سچیون راتیون سمھی، پر سکان نہ پیٹی۔

سپان سیٹی، پار پھندو، خبردار۔

اے ناخدا تجھے یہ دونوں باتیں کہاں نصیب ہونگی۔ ایک تو پتوار کے نزدیک پوری رات سوجائے اور دوسرے کنارے پر بھی کامیابی سے پہنچنے کی خواہش کرتے ہو۔ جب تک تو بیدار نہیں ہوتا ہے۔ تب تک تیرا منزل مقصود پر پہنچنا مشکل ہے۔

انسان کی زندگی کی کامیابی، انسانی کشمکش پر مدار رکھتی ہے۔ اس فلسفیانہ نکتہ کو نہایت سادگی سے بیان فرمایا ہے کہتے ہیں

جان جیئین تان جل، ھانئی جاءِ جلئی جی

تتیءِ تندیءِ ھل، ھانئی جاءِ ویٹئی جی۔

"جب تک تو زندہ ہے، زندگی میں جاتا رہ جلتا رہ کیونکہ یہ آرام کی جگہ نہیں ہے"

علامہ اقبالؒ اس تبدیلی میں فرماتے ہیں:-

بدریا غلط با موجش در آویز حیات جاودان اندر ستیز است۔

اس سے انکار نہیں کہ شاہ عبداللطیف کا کلام فکر کا ایک سمندر ہے، جو موج در موج، ایک سیلاب کی طرح مطالعہ کرنے والے پر چھا جاتا ہے۔

حضرت فقیر قادر بخش "بیدلؔ"[2] روہڑی نے اپنی تصنیف پنج گنج[1] میں ایک روایت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے بزرگ کی شان میں بیان کی ہے۔ اس عجیب روایت کو دیکھ کر شاہ لطیفؒ کے کامل ولی ہونے کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس روایت کو مخدومی جناب مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدویؒ نے بھی اپنی طرز تحریر سے لکھا ہے یہ واقعہ تاریخ کا ایک عجیب ورق ہے۔ بیدلؔ لکھتے ہیں:-

"۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے افغانستان، ہندوستان کو فتح کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس وقت مغل سلطنت کا زوال تھا محمد شاہ اپنے عیش و عشرت میں غرق تھا، پوری ملک کا نظام وزیروں کے ہاتھ میں تھا، جو اپنے اپنے اقتدار کی فکر میں تھے، فوجی نظام درہم برہم تھا۔ اس پراشوب دور میں نادر شاہ نے شمشیر کی جنگ و جدل کے لاہور کو فتح کرکے دہلی میں داخل ہوا محمد شاہ، اس سفاک بادشاہ

---

[1] پنج گنج — مصنف — علامہ حضرت قادر بخش بیدلؔ (مسودہ فارسی)

[2] بھٹائی اور بیدلؔ — مضمون نگار — مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدویؒ — سالانہ نیشنل زندگی — ماہ مئی ۱۹۶۸ء

کی موجودگی کی وجہ سے ہراساں تھا۔ دہلی والوں کی بیوقوفی سے ایران کی فوج کے سپاہیوں کو قتل کیا گیا۔ سپاہیوں کے قتل ہونے سے نادر شاہ کا تیور بدل گیا
غصے میں آکر قتل عام کا حکم دیا۔ تھوڑے وقت میں دہلی کی گلیوں میں انسانی خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ حضرت بیدل رح کی حکایت اس واقعہ
سے تعلق رکھتی ہے۔ اس مہیب خونریزی کے دوران ایک ایسا دردناک واقعہ رونما ہوا۔ جس کا تعلق سندھ کے زندہ جاوید بزرگ
حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی سے ہے۔ جن سے انکی عظمت کا اندازہ نمایاں طور پر کیا جاتا ہے۔ علامہ بیدل لکھتے ہیں:-

دہلی کے اس قتل عام کے دوران ایران فوج کا ایک سپاہی دہلی کی گلیوں میں ننگی تلوار ہاتھ میں لیئے دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے سامنے جو آیا
اسے قتل کرتا گیا۔ اتفاق سے اس کے ہاتھوں ایک عارف، بیگناہ شہید ہوگیا۔ اس عارف کا جب سر تن سے جدا ہوا تو وہ سر بولا

"تو نے اپنے سر پر خبر نہیں کتنے خون ناحق لیئے ہیں، لیکن یہ سر کوئی معمولی سر نہ تھا"

سپاہی اس نعرہ کے سر سے یہ بات سن کر ہیبت سے لرز گیا، اور اس کے اوپر دہشت طاری ہوگئی، وہ توبہ توبہ کرکے لشکر سے نکل گیا۔
اس عارف کی شہادت کے بعد، وہ ایرانی اپنے گناہوں کی ندامت سے ملک در ملک بھٹکتا پھرا لیکن کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی، آخر اسے اپنی
جان کا واحد وسیلہ یہ نظر آیا کہ مدینہ طیبہ جاکر بارگاہ رسالت صلعم کی چوکھٹ پکڑ کر اپنے مقصد کے لئے التجا کرے۔ وہ بڑے افسوس کے
ساتھ وہاں پہنچا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی درگاہ میں عاجزی سے روتا رہا۔ وقت گذرتا گیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ ناامید
نہ ہوا ان کو یقین تھا۔

یا رب تو کریمی و رسول تو کریم۔
مد شکر، فتادیم میان دو کریم۔

اس نے اپنی استقامت کا قدم حصول طلب کی راہ پر رکھا، اور کافی انتظار کے بعد اس حلاوار کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی درگاہ
عالی سے بشارت ہوئی۔ ارشاد ہوا چونکہ یہ معاملہ نہایت سنگین ہے۔ اس لئے کسی برگزیدہ شخص کے تعرف کے بغیر اس سے چھٹکارا حاصل
ہونا ناممکن ہے تجھکو سلطان العاشقین حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی طرف جانا چاہیئے جو سندھ میں رہتے ہیں۔ حضور صلعم سے یہ بشارت
سن کر اس سپاہی کی اضطراب میں سکون آگیا، اور اس کو امید پیدا ہوگئی کہ آپ مشکل آسان ہونے میں دیر نہیں، اس وقت
عرب سے سندھ کے سفر پر نکلا سفر کی تکلیفوں کو جھیلتا ہوا سندھ میں وارد ہوا۔ اور اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ بھٹ پر پہنچ کر
اس پر سکون مقام کو دیکھکر حیران رہ گیا۔ اور اس کے قلب کو سکون آگیا۔ شام کے وقت شاہ لطیف" کی خدمت میں حاضر ہوا
جب تنہائی ہوئی تو سندھ کے عظیم مفکر اور رہبر نے اس سے حقیقت معلوم کی اس شخص نے اپنی سفاکی، بیتابی، اور پریشانی کا
پورا واقعہ بیان کیا۔ شاہ بھٹائی نے اس شخص کو اطمینان دلایا۔ جس کے بعد وہ شخص غایت سکون سے اپنا وقت بھٹ شاہ پر
گذارنے لگا۔ اور اپنی اس سعادتمندی پر ناز کرنے لگا۔

ایک رات شاہ بھٹائی نے اس شخص کو نیند سے بیدار کیا اور بشارت دی کہ اس عارف نے، جس کو تم نے بیگناہ شہید کیا تھا
امت کے سردار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضور میں معاف کردیا۔ اس بشارت کے ملنے کے بعد وہ سپاہی مطمئن ہوکر
وطن واپس ہوا۔

حضرت قادر بخش بیدل رح کی یہ حکایت کوئی معمولی نہیں ہے۔ اس سے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عظیم مرتبے کی خبر ملتی ہے۔ اس سادہ برگزیدہ شخصیت کو اہمیت
حاصل تھی۔ حضرت بیدل نے اس واقعہ کو اپنی تصنیف میں داخل کرکے مستند کردیا ہے۔ حضرت شاہ بھٹائی رح اپنی زندگی کی ہر گھڑی فیض الٰہی کو حاصل کرنے اور تبلیغ
کرنے میں بسر ہوئی۔ حضور صلعم کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ اور وہ منزل حاصل کی جس پر دوسرا کوئی پہنچ نہ سکا۔

باب پنجم

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ اور شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ

حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے اکثر سوانح نگاروں نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ آپ کے ساتھ سفر و حضر میں تین کتابیں رہتی تھیں، جن میں پہلی کتاب قرآن پاک، دوسری کتاب رسالہ شاہ عبد الکریم بلڑی (آپ کے جدِ امجد) اور تیسری کتاب مثنوی مولانا رومیؒ۔ مثنوی کا یہ نسخہ سندھ کے علم دوست حکمران میاں نور محمد نے تحفہ کی طور پر دیا تھا، جو شاہ بھٹائیؒ کے مطالعہ میں رہتی تھی۔ آپ کے کلام سے واضح ہوتا ہے کہ آپ پر مولانا رومیؒ کے کلام کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ ان کے فکر و رموز سے استفادہ کیا ہے یوں کہ مثنوی اور شاہ کے رسالے پر نظر کرنے سے ہمیں ان کے خیالات اور مضمون میں یکسانیت نظر آتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مولانا رومیؒ نے مثنوی میں مختلف حکایات بیان کر کے ایک ماہر غواص کی طرح اپنے مطالب کے موتی حاصل کیے ہیں مولانا رومیؒ نے کہانیوں کو ابتدا سے آخر تک بیان کرتا ہے۔ لیکن شاہ صاحب اپنے کلام میں کوئی حکایت بیان نہیں کرتے بلکہ کہانی کا ہر بیت داستان کی ابتدا بھی ہے تو انتہا بھی۔ ایک بیت میں پوری داستان سما جاتے ہیں۔ جس میں تصوف کے اہم اور باریک نکات کی بھی وضاحت فرماتے ہیں۔

حضرت مولانا رومیؒ کے کلام کا اثر دنیا میں ہر دور کے شعرا پر ہوا ہے خصوصاً مشرق کے تمام شعرا پر۔ علامہ اقبال کو حضرت مولانا رومیؒ سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے علامہ اپنے کلام میں ہر جگہ ان کو اپنا پیر و مرشد تسلیم کرتے ہیں جن کی چند مثالیں دی جاتی ہیں۔ اسرار خودی فرماتے ہیں:۔

باز بر خوانم ز فیض پیر روم — دفتر سربستہ اسرار علوم
جان او از شعلہ ہا سرمایہ دار — من فروغ یک نفس مثل شرار
پیر رومی خاک را اکسیر کرد — از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد (الخ)

پیام مشرق میں مولانا رومیؒ کی عقیدت میں فرمایا ہے

مرشد رومی حکیم پاک زاد — سر مرگ و زندگی بر ما کشاد

اسی طرح زبور عجم میں کہتے ہیں:۔

راز معنی مرشد رومی کشود — نکتہ من بر آستانش در سجود

جاوید نامہ میں علامہ اقبال نے پیر رومیؒ کی قیادت میں عالم افلاک کی سیر کی ہے۔ یہ وہ طاقت سیر تھی جس میں انہوں نے اپنا نام "زندہ رود" تجویز کیا ہے۔ ایک اور جگہ اردو میں فرمایا ہے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کی لالہ زاروں میں
وہی آب و گل ایران وہی تبریز ہے ساقی۔

اسی طرح شاہ عبد اللطیف بھٹائی کے کلام پر مولانا رومیؒ کے فکر اور شعر کا روحانی اثر نظر آتا ہے بلکہ معنوی رابطہ یکساں نظر آتا ہے ان بزرگوں کا بھی خاص مقصد ہوتا ہے، وہ اپنے متاخرین کا ذکر کر دیتے ہیں۔ مولانا رومیؒ شاہ لطیف بھٹائیؒ کے پیشرو تھے اور شاہ لطیف نے ان کے کلام اور پیغام کی ترجمانی کی ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں "شاہ بود و شاہ حق آگاہ بود"

اسرار و رموز علامہ اقبال صفحہ ۔ پیام مشرق صفحہ ۔ زبور عجم صفحہ ۲۵۳۔

ی دیکھکر یہ گمان صحیح ہوتا ہے کہ شاید مولانا رومیؒ نے پیشنگوئی فرمائی تھی جب پیغام کو شاہ جشاؒ سندھی زبان میں فروغ دینگے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

اصطلاح ہندیان را ہندہ مدح اصطلاح سندیان را سندہ مدح

ایک حقیقت ہے کہ جو کام مولانا رومیؒ نے ادھورا چھوڑا تھا، اس کام کو شاہ لطیفؒ نے مکمل کردیا تھا۔ سندھی زبان میں شاہ لطیف نے مولانا رومیؒ کے پیغام

چہ کلام کے ذریعہ عام کیا۔ چنانچہ مولانا کے حالات زندگی کو مختصر طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کا اسم گرامی محمد تھا۔ آپ کا لقب جلال الدین عرف مولانا روم تھا۔ آپ کی ولادت ۶ ربیع الاول ۶۰۴ ہجری

ی ۳۰ ستمبر ۱۲۰۷ء کو خراسان کے شہر بلخ میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام حضرت بہاؤالدین محمد بن الحسین الخطیبی تھا۔ جو اپنے وقت کے بڑے جید

تھے۔ اس لئے آپ کو سلطان العلماء کہتے تھے۔ جو کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد مبارک میں سے تھے۔ آپ کے دادا حضرت حسین الخطیبی بلخی

ے صوفی اور صاحب حال تھے۔ خلیفہ وقت محمد خوارزم شاہ نے اپنی صاحبزادی آپ کے نکاح میں دی تھی جن کے بطن سے حضرت بہاؤالدین تولد ہوئے۔ مولانا

ی کی ابتدائی تعلیم بھی اپنے والد کے زیر سایہ ہوئی۔ جن کی تعلیمات نے معتقدین کا دائرہ وسیع کردیا تھا۔ ان کی بڑھتی ہوئی شہرت، خلیفہ خوارزم کے مصاحب

امام فخرالدین رازی کو بہت کھٹکنے لگی تھی۔ ایکدن خلیفہ خوارزم نے مولانا بہاؤالدین کے پاس گیا۔ لاکھوں آدمیوں کا مجمع دیکھکر امام رازی سے کہا کس منصب کا

ع ہے۔ امام صاحب کے کہنے پر خزانہ شاہی اور قلعہ کی چابیاں مولانا کے پاس بھیجدیں اور کہلا بھیجا کہ سلطنت کے اسباب میں صرف یہ چابیاں میرے پاس

ی ہیں۔ وہ بھی حاضر ہیں۔ مولانا بات کو سمجھ گئے اور فرمایا جمعہ کو وعظ کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد شہر سے نکلے تو مریدان خاص

ی تین بڑے بھی ساتھ تھے۔ خوارزم شاہ کو جب یہ خبر ہوئی تو بہت پچھتایا۔ صبح میں حاضر ہوکر بڑی منت کی لیکن وہ اپنے ارادے سے باز نہ آئے۔ اس وقت

مولانا رومیؒ کی عمر چھ برس تھی۔ یعنی وہ قافلہ ۶۱۰ھ ہجری کو نیشاپور پہنچا تھا۔ وہاں کے مشہور صوفی و شاعر شیخ فریدالدین عطارؒ آپ کے والد سے ملنے

لئے آئے۔ نوجوان جلالالدین کی باتوں کو سن کر اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے شیخ بہاؤالدین سے کہا اس جوہر قابل سے غافل نہ ہو۔ یہ کہکر اپنی مثنوی

اسرارنامہ مولاناؒ کو عنایت کی۔ جب یہ قافلہ نیشاپور سے نکل کر بغداد پہنچا تو، وہاں کے لوگوں کو پہلے اپنا منتظر پایا۔ کیونکہ بہاؤالدین کے علم و فضل

کا چرچہ اور ان کی نیکی بہت سی منازل طے کر چکی تھی۔ بغداد میں مشہور عالم صوفی شیخ شہاب الدین سہروردی نے آپ کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ بغداد

میں کچھ وقت ٹھہرنے کے بعد شام سے ہوتا ہوا یہ قافلہ مکہ شریف پہنچا۔ اور مقامات کی زیارتوں کے بعد ارزنجان کی راہ لارندہ پہنچے۔ اس وقت مولانا کی اٹھارہ

سال ہو چکی تھی۔ اس موقعہ پر خواجہ لیلاق سمرقندی کی دختر گوہر خاتون کا رشتہ پیش کیا جو مولانا بہاؤالدین نے مولانا کے لئے قبول کیا لارندہ میں قیام کے دوران

قونیہ کے فرمانروا سلطان علاؤالدین کیقباد کا دعوت نامہ ملا کہ سرزمین روم کے لوگ آپ کے فیضان حق کے حصول کے لئے بے چین ہیں۔ چنانچہ یہ جماعت

۱۲۲۳ء میں قونیہ پہنچے۔ اس سرزمین کی آب و ہوا مولانا بہاؤالدین کو راس نہ آئی۔ اکثر اوقات علالت میں گزارا۔ دو سال کی لمبی بیماری کے بعد، اس

فانی جہان سے رخصت ہوگئے۔ اس وقت مولانا کی عمر چالیس سال تھی۔ مولانا نے ظاہری و باطنی علوم کے رموز اپنے والد سے حاصل کئے تھے۔ لیکن مزید علوم

کی تحصیل اپنے والد کے شاگرد رشید اور معتقد برہان الدین محقق ترمذی سے حاصل کیا۔ جو مولانا کے والد کی وفات کی خبر سن کر قونیہ آکر مولانا سے ملے تھے۔

سید برہان الدین نے مولانا کا ظاہری علوم میں امتحان لیا، جس میں انہیں کامل پایا اور کہا اب صرف علم باطن رہ گیا ہے۔ تمہارے والد کی امانت

ہے جو میں تم کو دیتا ہوں۔ چنانچہ نو برس کے عرصہ میں طریقت اور روحانی مسلک کی تعلیم دیتے رہے۔ اس کے دوران مولانا ان کے مرید ہوگئے۔

مولانا علم سے واقف ہوگئے تھے۔ لیکن ظاہری علوم کا رنگ ابھی تک باقی تھا۔ دینی علوم کا درس دیتے تھے۔ نفوس لکھنے سے سماع سے سخت

نفرت کرتے تھے۔ لیکن یکایک آپ کی زندگی میں تغیر پیدا ہوا جو شمس تبریز کی ملاقات کے بعد شروع ہوا۔ یہ واقعہ ۱۲۲۴ء میں ہوا

ایک دن مولانا اپنے گھر میں طلبہ کو درس دے رہے تھے۔ چاروں طرف کتابیں رکھی تھی۔ شمس تبریز آئے اور سلام کرکے بیٹھ گئے۔

مولانا کی طرف مخاطب ہو کر کتابوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا یہ کیا ہے۔ مولانا نے جواب دیا، یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے۔ یہ کہنا تھا کہ کتابوں میں آگ لگ گئی مولانا بہت پریشان ہو کر اس سے کہا، یہ کیا ہے، مولانا کو انہوں نے جواب دیا یہ وہ چیز ہے جسے تم نہیں جانتے، یہ کہہ کر چلے گئے۔ لیکن مولانا کا بہت برا حال ہوا، اپنا گھر بار چھوڑ کر ملک ملک کی خاک چھانتے رہے لیکن اس شخص کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ایک روایت ہے،

شمس تبریز کی مولانا سے پہلی ملاقات اس طرح ہوئی تھی، جسکا ذکر شمس الفقراء مولانا شبلی نعمانی نے بھی کیا ہے جو اس طرح ہے۔

ایک دن مولانا رومیؒ ایک حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، اور سامنے کچھ نایاب کتابیں رکھی ہوئی تھی۔ شمس تبریز نے آکر پوچھا یہ کیا ہے۔ مولانا نے جواب دیا یہ قیل وقال ہے۔ تم کو اس سے کیا غرض شمس تبریز نے کتابیں اٹھا کر حوض میں پھینک دیں۔ مولانا کو اس حال سے رنج ہوا اور ان سے کہا، اے درویش تم نے یہ کیا کیا، میری نایاب کتابیں ضایع کر دیں جو اب ان کا ملنا بہت مشکل ہیں۔ شمس تبریز حوض میں ہاتھ ڈال کر تمام کتابیں ویسی ہی خشک نکال کر رکھدیں، مولانا یہ حال دیکھکر حیران ہوئے۔

کہتے ہیں کہ شمس تبریز ۶۴۲ھ ہجری مطابق ۱۲۴۵ء میں قونیہ آئے تھے، اور ایک سرائے میں مقیم ہوئے تھے کچھ دنوں کے قیام کے بعد ایک دن سرائے کے دروازہ پر بیٹھے تھے کہ مولانا رومی کی سواری بڑی شان سے گذری۔ شمس تبریز نے مولانا کو دیکھکر پہچانا، اور کہا یہ وہ شخص ہے جس سے ملاقات کی بشارت ہوئی تھی۔ شمس تبریز نے آگے بڑھ کر سواری کو روکا اور سوال کیا۔ مولانا خدا تعالیٰ کے زیادہ خدمت گذار صالح بندے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یا حضرت بایزید بسطامیؒ حالانکہ ایک طرف حضرت بایزید بسطامی کا یہ حال تھا کہ وہ تمام عمر اس خیال سے فربہ نہ کھایا کہ معلوم نہیں جناب رسول مقبول صلعم نے اس کو کس طرح کھایا تھا، دوسری طرف انہوں نے اپنے لئے کہا تھا، "سبحانی ما اعظم شانی" حالانکہ حضور نبی کریم صلعم فرمایا کرتے تھے، "ما عرفناک حق معرفتک" میں دن بھر ستر دفعہ استغفار کرتا ہوں۔ مولانا نے جواب میں کہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بلاشبہ درجہ بلند ہے، اگرچہ بایزید بسطامیؒ بہت بڑے پایہ کے بزرگ تھے، لیکن ولایت میں وہ ایک خاص مقام پر ٹھہر گئے اور اس درجہ کی عظمت سے یہ الفاظ ان کی زبان سے نکل جاتے تھے، لیکن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدم بہ قدم منازل پر چڑھتے جاتے تھے، جب نیچے سے وادی پر جاتے تھے، تو پہلا پایہ پست نظر آتا تھا، اور اس سے استغفار فرماتے تھے

اس ملاقات کے بعد شمس تبریز غائب ہو گیا، کچھ دنوں کے بعد مل گیا، اور مولانا کے ساتھ صلاح الدین زرکوب کے حجرہ میں ایک سو بیس دن چلہ کشی کی، جب خلوت سے باہر آئے تو مولانا کی حالت میں عجیب تغیر پیدا ہوا سماع سے دلدادہ ہو گئے، درس و تدریس کو چھوڑ کر اپنے بچوں سے بے نیاز ہو گئے مریدوں کی طرف نظر بھی نہ اٹھاتے تھے، ہر وقت شمس تبریز کی خدمت میں رہتے تھے، شہر میں اس بات کا چرچا ہو گیا، کہ اس دیوانے نے مولانا پر سحر کر دیا ہے۔ ایک شور برپا ہو گیا، آپ کی مخالفت ہونے لگی، شمس تبریز، مولانا کو ساتھ لے کر دمشق چلے گئے۔ اچانک شمس تبریز غائب ہو گئے، جس سے مولانا کو سخت افسوس ہوا، باہر نکل کر جذوبانہ حرکتیں کرنے لگے، مولانا رومیؒ کی بیقراری حد سے بڑھ گئی جسے دیکھکر لوگوں کو ان پر ترس آیا، اور شمس تبریز کو واپس بلانے کی کوشش کی، آخر مولانا کے بیٹے سلطان ولد اس مہم پر گئے، کسی نہ کسی طرح شمس تبریز کا پتہ حاصل کر کے ان سے ملا اور باادب تسلیم بجا لا کر مولانا کا خط پیش کیا، شمس تبریز نے مسکرا کر کہا "یہ دام و دانہ نگیرند مرغ دانا را" چند روز کے بعد قونیہ روانہ ہوئے سلطان ولد کمال ادب سے شمس تبریز کے رکاب کے ساتھ دمشق سے قونیہ

---

[1] شمس تبریز کے والد کا نام علاؤالدین تھا، وہ اسماعیلیہ فرقہ کے امام تھے، بلکہ ان کے دادا نورالدین حسن بن صباح کے پیرو اور حلقہ حشیش میں داخل تھے اور حسن بن صباح کے دست راست تھے، شمس تبریز نے اپنا خاندانی مذہب چھوڑ کر کمال الدین جنیدی کے مرید ہوئے۔ لیکن عام صوفیوں کی طرح پیری مریدی میں اعتقاد نہیں رکھتے تھے، سیاحت کرتے رہتے تھے، جہاں بھی جاتے تھے، تو کاروان سرائے میں اتر کر مراقبہ میں بیٹھ جاتے تھے۔ سوانح مولانا رومی مصنف مولانا شبلی صفحہ ۲۳

[2] سلطان ولد مولانا کے بڑے صاحبزادے تھے ۶۲۳ھ میں تولد ہوئے تھے، یہ صحیح معنوں میں فرزند وارث ثابت ہوئے، والد کی مثنوی کو جمع کر کے دنیا کے سامنے پیش کی تھی

پیدل آئے۔ مولانا یہ خبر سن کر اپنے مریدوں اور شاگردوں کو لے کر انکے استقبال کو آئے۔ اور بڑے گرم جوشی سے ملے۔ مولانا اس ملاقات سے بہت خوش ہوئے۔
چند روز کے بعد شمس تبریز نے مولانا کی ایک پروردہ کے ساتھ شادی کرلی جسکا نام کیمیا تھا[1] مولانا نے مکان کے سامنے ایک خیمہ نصب کیا جس میں شمس تبریز
رہنے لگے۔ مولانا کے صاحبزادے علاؤالدین جو کبھی مولانا سے ملنے کے لئے آتے تھے تو شمس تبریز کے خیمہ سے گذر جاتے تھے۔ شمس تبریز کو یہ بات ناگوار گذرتی
تھی، منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے۔ شمس تبریز کو بہت غصہ آیا اور اس مرتبہ عزم کیا اب جاکر واپس نہ آؤنگا چنانچہ وہ پھر سے غائب ہوگئے۔ مولانا نے چاروں
طرف آدمی دوڑائے لیکن ان کا کہیں بھی پتہ نہ چلا شمس تبریز کے جانے سے مولانا کو بہت رنج ہوا۔ جوہر خفیہ[2] میں آپ کے شاگرد سپہ سالار نے لکھا ہے کہ شمس تبریز
رنجیدہ ہوکر کہیں چلے گئے۔ لیکن اکثر تذکرہ نویسوں نے متفق طور پر لکھا ہے کہ اس وقت میں ان مولانا کے مریدوں نے حسد کی وجہ سے انہیں قتل کردیا تھا
حضرت مولانا جامی[3] لکھتے ہیں مولانا کے صاحبزادے علاؤالدین نے شمس تبریز کو قتل کروا دیا تھا۔

مولانا کی حالت مدت تک شمس تبریز کی جدائی میں غیر رہی کبھی تو اضطرابی کیفیت میں گھر سے نکل جاتے تھے۔ ایک دن راستہ میں شیخ صدرالدین کوتب کی دکان کے سامنے
کھڑے ہوگئے، جو چاندی کے ورق کوٹ رہے تھے۔ ان کے ہتھوڑے کی آواز میں ایک قسم کی موسیقیت کا عنصر پیدا ہو رہا تھا۔ اس آواز کو سنتے ہی مولانا پر
وجد طاری ہوگیا۔ اور ناچنے لگے۔ شیخ نے یہ دیکھکر اپنے ہاتھ نہ روکا اور ورق کوٹتے رہے یہاں تک بہت سی چاندی ضائع ہوگئی۔ جب شیخ تھک گئے تو باہر نکل آئے
مولانا نے ان کو آغوش میں لے لیا اور جوش میں آکر یہ شعر کہا۔

یکے گنجے پدید آمد ازین دکان زرکوبی

زہے صورت زہی معنی، زہی خوبی، زہی خوبی۔

شیخ نے یہ شعر سن کر وہیں اپنی پوری دکان لٹادی اور مولانا کے ساتھ ہوگئے۔ شیخ صدرالدین حضرت سید برہان الدین کے شاگرد تھے اور مولانا کے مرشد
جانی تھے۔ مولانا کو ان کی صحبت میں بڑی تسلی ہوئی۔ اس تعلقات کی بنا پر مولانا نے شیخ صدرالدین کی صاحبزادی کا عقد اپنے بڑے صاحبزادے سلطان ولد
سے کیا۔ اچانک ۶۶۲ھ میں شیخ صدرالدین بیمار ہوگئے۔ اور تین دن کی علالت کے بعد انتقال کرگئے۔ مولانا کو سخت صدمہ ہوا شیخ صدرالدین کے
انتقال کے بعد مولانا نے حسام الدین چلپی کو محرم و ہمراز بنایا۔ حسام الدین ہی کی درخواست پر مولانا نے اپنی مثنوی لکھنی شروع کی تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد مولانا کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ وفات سے پہلے عجیب واقعہ رونما ہوا ۶۷۲ھ کو قونیہ میں زبردست زلزلہ آیا جو چالیس
دن تک قائم رہا۔ اس آفت ناگہانی سے لوگ بہت گھبرائے۔ جوق در جوق مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے فرمایا زمین بھوکی ہوگئی ہے۔ اس کو
لقمہ چاہئے۔ انشاءاللہ کامیاب ہوگی۔ مولانا بیمار ہوگئے۔ اکمل الدین اور غضنفر نے مل کر آپ کا علاج کیا لیکن مرض کا یہ حال تھا کہ کچھ خبر نہیں ہوتی کہ
کیا ہونے والا ہے۔ بیماری کی خبر عام ہوئی لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ شام سے شیخ صدرالدین جو شیخ حضرت محی الدین ابن العربی کے مرید تھے،
مولانا کی عیادت کو آئے مولانا کی حالت غیر دیکھکر بیقرار ہوئے۔ اور دعا کی کہ خدا تعالیٰ اپنی بلا رحمت دے مولانا نے فرمایا، چھ غنائیں چلچلہ میں بس ایک
پیرہن کا پردہ باقی رہ گیا ہے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ نہ اٹھے۔ شیخ روتے ہوئے اٹھ آئے۔ مولانا نے یہ شعر پڑھا۔

چہ دانی تو کہ در باطن، چہ شاہی ہمنشین دارم

فروغ زیبی من منگر کہ پاشہ اہنشین دارم

---

[1] مراج مولانا رومی مرتب شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی صفحہ ۱۹

[2] ایضاً " " " " "

[3] نفحات الانس مرتب حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی" صفحہ ۴۸۷ (اردو ترجمہ)

مولانا نے اپنے ممراز شیخ حسام الدین چلپی کو اپنا جانشین بنانے کے لئے وصیت فرمائی۔ جنازہ نماز کے لئے فرمایا۔ مولانا صدرالدین پڑھائینگے۔ اس کے بعد دنیا کی عظیم شخصیت اور شیخ المشائخ یکشنبہ ۵ جمادالثانی ۶۷۲ھ ہجری کو غروب آفتاب کے وقت انتقال فرما گئے۔ آپ کے جنازہ کو دو روز دن اٹھایا گیا۔ جس میں لاکھوں انسانوں نے ہر طبقے کے بلا کسی تفریق مذہب و ملت کے شامل ہوئے۔ مولانا کا مرقد مبارک قونیہ میں ہے۔ ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے مولانا کے مزار مبارک پر بڑا لنگر چلتا ہے۔ ملک الادبا بدرالدین نے حضرت مولانا کے لئے مرثیہ لکھا ہے۔ جس کے دو شعر نقل کرتا ہوں۔

کو دیدہ کہ در غم تو نمناک نشد — یا حبیب کہ در ماتم تو چاک نشد۔

سو کند بروی تو کہ از پست زمین — بہتر ز توئی در شکم خاک نشد۔

مولانا رومی رح کی تین تصنیفات مشہور ہیں:۔

۱۔ فیہ ما فیہ:۔ یہ کتاب ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے معین الدین پروانہ کو لکھے تھے۔ سپہ سالار نے مختصر طور پر اس کا ذکر کیا ہے [۱]

اگر در آن ولایت من ماندیم موافق طبع ایشان می زیستیم و آن مہجور زیدیم کہ ایشان خوش ندی مثل درس گفتن و تصنیف کتب و تذکیر و وعظ گفتن و زہد و عمل ظاہر ورزیدن۔

۲۔ دیوان شمس تبریز:۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب میں اندازاً پچاس ہزار اشعار موجود ہیں جو سب کی سب غزلیں ہیں، جن میں شمس تبریز کا نام بطور تخلص استعمال کیا تھا۔ عوام اس تصنیف کو شمس تبریزی تصنیف سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا نے ۵۰ غزلیں زرکوب کے نام سے بھی لکھی تھی۔ مولانا نے شمس تبریز کا نام اس طرح دیا ہے جیسے کوئی مرید اپنے پیر سے خطاب کر رہا ہو۔ یا پس غائبانہ ان کے اوصاف بیان کرتا ہو

۳۔ مثنوی:۔ ایران کے ادب میں چار کتابیں مشہور ہیں۔ ۱۔ شاہنامہ فردوسی۔ ۲۔ گلستان سعدی۔ ۳۔ دیوان حافظ۔ ۴۔ مثنوی مولانا روم رح۔ ان کتابوں میں جتنی مقبولیت مثنوی کو حاصل ہے، وہ کسی دوسری کتاب کو نہیں ہے۔ جو اشعار مولانا نے وجد کی حالت میں کہے تھے۔ جو اس کی مقبولیت کا سبب بنے۔ مثنوی میں ایک طرف تو مختلف کہانیاں دی ہوئی ہیں جن سے ناسمجھ نکات حاصل ہوتے ہیں، دوسری طرف اعلیٰ علمی رموز اور دقیق مسائل، تشبیہات کے ذریعے سمجھائے گئے ہیں۔ مثنوی کے مضامین پر نظر کرنے سے ان میں علم کلام اور الاہیات کے مسائل پر مدلل بحث اور تصوف کے مسائل کے صحیح راستے نظر آتے ہیں مثنوی کی شان میں حضرت مولانا عبدالرحمان نورالدین جامی نے فرمایا ہے

مثنوی مولوی معنوی — ہست قرآن در زبان پہلوی

مثنوی ہاد کان وحدت است — وحدت اندر وحدت اندر وحدت است

یہ ہی کتاب ہے جس کی وجہ سے مولانا کا نام آج تک زندہ ہے اور آپ استاذ الشعراء مشہور ہیں۔ آپ کے بڑے صاحبزادے سلطان ولد نے مثنوی کو ترتیب دے کر دنیا کے علم ادب پر بڑا احسان کیا تھا۔ مثنوی کے کل مجموعی اشعار کی تعداد ۲۶۶۶ بتائی جاتی ہیں۔ مثنوی کے متعلق دنیا کے عالموں نے اپنی رائے دی ہے یہاں ایک مشہور مستشرق پروفیسر رینولڈ نکلسن اپنی کتاب رومی، صوفی اور شاعر میں اس طرح لکھا ہے [۳]

مثنوی کا مصنف وہی کہ باطنی عمیق اور گہرائیوں کی معنوی سمجھانے کا دعویٰ کرتا ہے، وہ صحیح ہے لیکن کتاب کے کسی بھی صفحہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوگا کہ مثنوی کی اصول ترتیب، قصے، کہانیوں اور روایتوں میں ظہور پذیر ہونگے۔ اور قرون وسطیٰ کے مذہبی

۱۔ رسالہ فریدون ابن احمد سپہ سالار چاپ تہران صفحہ ۱۱۷۔ ۲۔ فیہ ما فیہ۔ چاپ دانشگاہ تہران صفحہ ۷۲۔ بین این عبارات را فریدون احمد سپہ سالار

۳۔ مناقب العارفین۔ افلاکی۔ Rumi, Poet, & Mystic by Prof: Reynold Nicholson P. 24

خیالات اورنگ کی وسیع منزل اپنے دائرہ میں لیے آتے ہیں جو کہ مولانا کا یہی مقصد تھا۔"

ان الفاظ سے مثنوی کی بہترین تشریح ہوتی ہے:۔ یہ کتاب مذہبی جذبہ کو عشق کے ذریعے پاکیزہ بنانے کی ایک اعلیٰ کوشش تھی، مثنوی ایک بحر بیکنار ہے جس کی معانی میں قوی النفس غواص نت نئے نکات کے جوہر نکالتا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمت نے مثنوی میں مذہب اور اخلاق، فلسفہ اور تصوف کے متعلق کارآمد باتیں بتائی ہیں۔ حمد و جہد اور ان کے تعلقات و علاقے کے بیان کا مسلسل رشتہ کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ بات سے بات پیدا کرکے اپنی اصلی مدعا سے دور نکل جاتے ہیں۔ مگر تمام جہاں گردیاں کرکے پھر اسی راہ پر آکر گامزن ہو جاتا ہے۔ مثنوی کی پہلی بیت ایک بادشاہ، کنیز اور حکیم کے متعلق ہے جو ایک عجیب نظریہ پیش کرتا ہے غور سے دیکھا جائے تو دیکھا جائے تو فلسفہ جنگ و جہاد کی ایک ایسی دلیل ہے جو اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ مثنوی کا شعر گویا بانسری کا پیغام ہے یا فلسفہ جہاد کی تمہید ہے بانسری اور روح کی آواز ہے جو اس قفس عنصری میں قدسیہ فرماتے ہیں۔

بشنو از نے چون حکایت میکند — وز جدائیہا شکایت میکند۔

کز نیستان تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — تا بگویم شرح درد اشتیاق۔

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش — باز جوید روزگار وصل خویش

من بہر جمعیتے نالاں شدم — جفت خوشحالاں و بدحالاں شدم

ہر کسے از ظن خود شد یار من — وز درون من نہ جست اسرار من۔

مولانا رومیؒ مثنوی کے خود فرماتے ہیں:۔

اِجْتَهَدْتُ فِي تَطْوِيلِ الْمَنْظُومِ الْمَثْنَوِيِّ الْمُشْتَمِلِ عَلَى الْغَرَائِبِ وَالنَّوَادِرِ وَغُرَرِ الْمَقَالَاتِ وَدُرَرِ الدَّلَالَاتِ وَطَرِيقَةِ الزُّهَّادِ وَحَدِيقَةِ الْعُبَّادِ قَصِيرَةِ الْمَبَانِي كَثِيرَةِ الْمَعَانِي

میں نے اس منظوم مثنوی کی تدوین میں کوشش کی، جو نایاب نکتوں، روشن باتوں، ہدایات کے موتیوں پر اور زاہدوں کے طریقہ (زہد و تقویٰ) اور عابدوں کے گلستان پر مشتمل ہے جس کی بنادیں محدود مگر معانی غیر محدود ہیں"

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور حضرت مولانا رومی رحمت اللہ علیہ۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کے مقلد تھے۔ شاہ بھٹائیؒ کے کلام پر نظر کرنے سے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ رسالہ میں بہت سے ایسے ابیات نظر آتے ہیں جن میں شاہ بھٹائیؒ نے مولانا رومیؒ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ شاہ صاحب عقیدت میں فرماتے ہیں:۔

طالب عشق شنہ تھی، ایہ رومیؔ جیو رہاؤ

ہیرین ویاسش پاؤ، پسڑ پوہ پسریجن کی۔

(طالب، عشق، رومیؔ سے مثال، دور کر پردہ، نظر میں رکھ جمال)

شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں اکثر مولانا رومیؒ کے کلام کا موازنہ بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً مثنوی کا پہلا شعر ہے۔

بشنو از نے چون شکایت می کند — و از جدائی ہا حکایت می کند۔

بانسری سے سن کیا حال سناتی ہے — اور وہ ہجر و فراق کی کیا شکایت کرتی ہے۔

مفتاح العلوم مثنوی مولانا روم دفتر اول مرتب حضرت مولانا مولوی مرزا محمد نذیر عرشی صفحہ ۲۰

شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں۔

— ۔۔ ڈیل شي ڏيون ڪري عقل ڪوڪاري،

—— من ۾ پنهنجا سارِيا، مونجون هوتن لاءِ هاري ۔

(باسري (نيتان سے کاڻي جاتي ہے) فريادِ کرتي ہے، اور اس کے سينے سے کوک اٹھتي ہے ۔۔

وہ تو اپنوں کو ياد کرکے درد و فراق ميں روتي رہتي ہے ۔

ان دونوں ابياتوں ميں خيال کي يکسانيت نظر آتي ہے ۔ يعني "کل شيءٍ يرجع الي اصله" مولانا رومي رح اور شاہ صاحب کا عقيدہ ، تعليم و توحيد ايک ہي معلوم ہوتي ہے ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکام پر سر بسجود نظر آتے ہيں ۔ اور حضور نبي کريم صلي اللہ عليہ وسلم کي عقيدت اور عشق ميں سرشار ہيں

۔ ۔ ۔ ۔ سيّد و سرور محمد نور جان بهتر و بهتر شفيع بر مان

گر بگويم تا قيامت نعت او هيچ ان را مقطع نايت هجو ۔

شاہ لطيف فرماتے ہيں ۔

جوڙيو جوڙ جهان ۾، پاڻ مهياڻين پرواز ۔

ماهي، مادي، ماشي، سردارون سردار

سونهين سهاڻن صف ۾، منجهه مسجد مڪياڻ

چارئي چڱا چوڌار، مٿا هيٺا نڦا حبيب سين ۔

اللہ تعالیٰ نے اس جہان کي تخليق فرماکر خود ظہور کيا ، يہ سب حضور نبي کريم صلعم کے لئے کيا ۔ جو ماہي ہے، مادي ہے

ماشي اور سرداروں کے سردار ہيں ، اپنے اصحابوں کے ساتھ مسجد ميں خوب اچھے لگتے ہيں ، چاروں دوست ساتھ ساتھ اپنے حبيب کے دہنے ہيں ۔

جس طرح دنيا ميں مثنوي ايک غيرفاني کتاب ہے، اس طرح شاہ کا رسالہ بھي غيرفاني ہے ۔ دونوں کتابوں ميں تصوف کے مسائل کي وضاحت، اخلاقيات، الہامات، عرفانيات، تشبيہات موجود ہے ۔ مولانا رومي اپني مثنوي کے لئے فرماتے ہيں ۔

ما ز قرآن مغز را برداشتيم استخوان پيش سگان انداختيم

دوسري جگہ اپنے کلام کے متعلق فرمايا ہے ۔

مثنوي ارکان وحدت ۔ ۔ وحدت اندر، وحدت اندر است ۔

من چگويم وصف آن عالي جناب نيست پيغمبر ولي دارد کتاب ۔

شاہ صاحب نے اپنے کلام کے لئے فرماتے ہيں ۔

جي تون بيت پائين سي آيتون آهين

نبي من لائين پريان، سندي پار ڏي ۔

جن ابيات کو تم ابيات سمجھے ہو وہ آيتيں ہيں ، جو دل محبوب کي طرف لے جاتي ہيں ۔

جو ان کتابوں کو بڑي عزت سے ديکھتے ہيں ، قرآن پاک کے بعد سمجھتے ہيں ۔ دونوں بزرگوں کو اہل نظر اولياء ميں شمار کيا جاتا ہے ۔ ان کے ابيات ميں روحانيت سمائي ہوئي ہے ۔ دونوں بزرگوں نے قرآن پاک کي حقيقت اور رسول اللہ صلي اللہ عليہ وسلم کي مبارک زندگي کا گہرا مطالعہ کرنے

جو اپنے آپ کو اس سانچے میں ڈھال دیتے تھے ، وہ مقام حاصل کر لیا ، جس کو فانی فی الرسول کا درجہ حاصل ہوتا ہے ۔ شاہ صاحب ایسی محبت حاصل کرنے کے لیے

محبت سپرسین ۔ ھي ھئي ، پڻ وڏي ڳالھ

(محبوب کی محبت ایک بڑا کام ہے)

اسطرح مولانا رومی" فرماتے ہیں ۔

محبت صالح ترا صالح کند محبت طالح ترا طالح کند

مولانا جلال الدین رومی ایک عظیم مفکر تھے ، جن کے فقر سے شاہ صاحب "متاثر تھے ۔ شاہ صاحب نے ایک نئی راہ اور نیا اسلوب ایجاد کیا تھا ۔ وہ ہر چیز کی ہر چیز سے مدد ۔ چنانچہ اپنے کلام میں سندھ کے قدیم تاریخی کہانیاں اور واقعات کو پیش نظر رکھکر اپنی مدعا حاصل کر لیتا ہے ۔ آپ کے کلام میں حب الوطنی کا عنصر دنیا کے کسی بھی دوسرے شاعروں میں نہیں ملتا ، جس سے آپ کی عظمت بہت بڑھ گئی ۔ شاہ لطیف نے ہر چیز کو بڑی باریک بینی سے دیکھا

مولانا رومی محبت بد سے کنارہ کرنے کے لئے ہمیشہ تلقین فرماتے ہیں ۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ھست

پس بہ ھر دستے نباید داد دست ۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں ۔

منھن جي موھن جڙو ، آندر ۾ ابليس

اندرو خام خبيث ، ھيڏي ھوءَ نہ ڇڏين ۔

ظاہری صورت موہن عضمی ہے ، لیکن باطن میں ابلیس جیسا ہے ، اپنے خام خبیث کو لیکن اندر سے کوئی نہیں نکالتا ہے ۔

مولانا رومی نے تقدیر کے مسئلے میں جبر و اختیار کے درمیان اپنے مسلک کو رکھا ہے فرماتے ہیں ۔

بر توکل زانو ئے اشتر بہ بند

شاہ صاحب نے اس خیال کو یوں بیان کرتے ہیں ۔

تاکي ۾ تاڻي ٻڌ ، منھنجو ترھو ۔

اھڙي ۾ آئي ھوند ڏيئو ھو ٻيو ۔

تھوڑے پانی میں اپنے تیرنے کا سامان پیدا کر ، جب گہرے پانی میں جائیگے تو کوئی تجھے سہارا بھی نہ دیگا

مولانا فرماتے ہیں ۔ ھرچہ از دوست مے رسد نیکو است ۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں پريان سندي پاريءَ مڙئي مٺائي ۔

محبوب کی طرف سے جو بھی حاصل ہو وہ مٹھائی ہے

دونوں بزرگوں کے نظریات میں کتنی یکسانیت ہے ، دونوں جامع الکمالات اور جامع العلوم تھے ۔ اپنے کلام میں تصوف کے ساتھ ساتھ ، تاریخ کے واقعات قصص ، وطن و حب ، حکایات ، فلسفہ ، منطق ، ناصحانہ نکات ، عارفانہ و عالمانہ انداز بیان کو بڑے موثر طور پر پیش کیا ہے ۔ دونوں بزرگوں نے وحدت الوجود کے دقیق مسئلہ کو بڑی آسانی کے ساتھ حل کر دیا ہے ۔ اس کے علاوہ دونوں کے کلام میں سوز و گداز ، وجد و حال ، اخلاق حسنہ ، ریاضت ، عبادت حمد و شکر ، محبت اور استغراق کی کیفیت کو اپنے کلام میں پیش کیا ہے ۔ شاہ عبد اللطیف بھٹائی کے کلام میں رقیق القلبی زیادہ ہے ، رقت انگیز

واقعات اور درد نغمات کا دل و دماغ پر براہ راست اثر پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ایچ۔ ٹی سورلے نے اپنی تصنیف شاہ عبداللطیف بھٹائی میں لکھتے ہیں [1]

"شاہ بھٹائی کی سادگی سے بھرپور موسیقی میں نہ تو رومیؒ نے نظم ساز کو طاقت ہے نہ تو حافظ کی موسیقی کی جادو میں لپٹا ہوا طرز آتا ہے، اور نہ ہی حافظ شیرازی کی ترنم زیر نغمہ نوازی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ ایک عجب کرامت ہے کہ آپ کے کلام میں حقیقت کی خاموش جستجو اور ان نغموں کی سادگی کے طلسم میں ہر ایک اسیر ہے۔"

بقول مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی کے [2]

شاہ صاحب کے زمانے میں وحدت الوجود کا نظریہ فرسودہ ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ اس طریقہ میں مولانا رومیؒ کے مقلد تھے، البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک کامل شاعر کے کلام کا دوسرے کامل شاعر پر اثر ضرور ہوتا ہے، چونکہ رومیؒ متقدمین میں سے تھے، اسلئے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اس وجہ فکر سے اگر استفادہ کیا ہو تو اس سے انکار کی کوئی توجیح نہیں ہوتی، جبکہ سفر اور حضر میں مثنوی کا شغل مطالعہ کے لئے آپ کا ایک محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی اپنے عظیم پیش رو حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ علیہ رحمت کے بعد شعر و فکر کی دنیا میں انفرادی حیثیت کے مالک ہیں۔

---

[1] شاہ عبداللطیف ادھٹ مرتب ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے (انگریزی)

[2] مفکر سندھ مصنف اختر انصاری اکبر آبادی ناشر ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات حیدرآباد سندھ ص ۸۹

حصۂ سوم (باب اوّل)

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری

شاعری کا ارتقا

شاعری واردات قلب کے اظہار کا نام ہے۔ وہ واردات اندرونی کیوں نہ ہوں۔ شاعر کے لفظی معنی صاحب شعور کے ہیں۔ شعور کو احساس (FEELING) کہتے ہیں یعنی شاعر وہ شخصیت ہے جس کا احساس قوی ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعر کے خمیر میں وہ عناصر عالم جاودانی سے ودیعت ہوتا ہے۔ انسان کی طبیعت پر خاص حالات طاری ہوتے ہیں۔ مثلاً ہنسنا، رونا۔ جب یہ حالات انسان پر غالب ہوتے ہیں تو اُن پر مختلف حرکات صادر ہوتی ہیں۔ رونے کے وقت آنسو جاری ہوجاتے ہیں اور چیخنے کے وقت ایک ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جس سے مسرت کا اندازہ ہوتا ہے اس طرح شعر بھی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ شاعر کی طبیعت پر جب غصہ یا استعجاب طاری ہونے کے وقت ایک خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ جذبہ موزوں الفاظ کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے

ہر زمانہ اپنی رفتار کے مطابق شاعر پیدا کرتا ہے، جو اپنے زمانے کا مجسمہ ہوتا ہے۔ شاعری کی تاریخ کا یہ ایک نمونہ ہے کہ جب کسی قوم میں شجاعت اور جوانمردی کا جوہر کمال پر پہنچتا ہے۔ اس قوم کے افراد میدان جنگ کو عیش و نشاط کا ایوان سمجھتے ہوئے، شمشیر برہنہ کو ہلال عید کی تابانی پیدا کرتے ہیں، تو شاعر پھر نعرہ جنگ بلند کرتا ہے، جہاں قوم کی اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے تو شاعر اس قوم میں روح پھونکنے کے لئے صدا بلند کرتا ہے۔ لیکن بزرگ اور ولی عوام کو صحیح راستہ دکھانے کے لئے روحانیت کا پیغام شعر کی صورت میں پیش کرتے ہیں، ایسے شاعر کو جب اپنے فکر و نظر کا کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے تو اس کو داخلی شاعری کہا جاتا ہے اور شاعر کو صاحب پیغام شمار کیا جاتا ہے۔ اگر وہ واردات اثر پذیر ہوتا ہے اور بیرونی واقعات سے متاثر ہو کر کسی بات کو موزوں طریقہ سے کہہ دیتا ہے، تو وہ خارجی شاعری کہلاتی ہے۔ ایسی شاعری اکثر قومی ہوتی ہے۔ اور پہلی قسم کی شاعری رجائی ہوتی ہے کیونکہ مدحاح کے لئے دعا (امید سے ہونا ضروری ہے) ہو ورنہ پیغام والا پیغام پورے طور پر دوسروں تک پہنچا نہیں سکتا اور اگر پہنچا بھی دیگا تو اس کا اثر دیرپا نہ ہوگا

مولانا عبدالسلام ندوی اپنی تصنیف شعرالہند میں لکھتے ہیں[1]۔

"شاعری صرف جذبات و احساسات کے اظہار کا نام ہے۔ اور اس لحاظ سے اگرچہ شاعری کے ہر ایک صنف محسوسات انسانی کا ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں ہر شخص کو جذبات کی اندرونی تصویریں بہت نمایاں طور پر نظر آسکتی ہیں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کو بیان کرنے سے پہلے شاعری کی ارتقائی منازل پر مختصراً بحث کرنا ضروری سمجھتا ہوں حضرت مولانا رومی رح کا قول ہے:۔

شاعری جزویست از پیغمبری جاہلانش کفر دانند از خری۔

شاعر کو تلامیذ الرحمٰن بھی کہتے ہیں۔ شاعری کی زبان کو عرش الٰہی کی چابیاں کہتے ہیں۔ اس لئے شاعری کے لئے ضروری ہے کہ وہ فطرتاً طبع کے سلیم ہو، ان کی فکر بلند ہو اور صحیح طبیعت کے مالک ہو، اُن کی نگاہ مشکل حقائق کو سمجھنے کی استعداد رکھتی ہو علم کو حاصل کرنے والا ہو کیوں کہ شعر میں ان کا فکر عمل اور فکر نمایاں ہوتا ہے۔ شاعر ہر معاشرہ سے واقف ہوتا ہے۔ اور ہر محاورے کو جانتا ہے۔ تاکہ اُن کے اشعار اس منزل پر پہنچ جائیں اور صدیوں تک زمانہ انکی قدر کرے اور شعر سے اُن کی شخصیت کو بقا اور دوام حاصل ہو جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس شاعر کا شعر، انکی ذات میں دفن ہو جائے گا۔ کیونکہ شعر کی عالمانی قدر میں ایک سماجی قدر ہے جو کافی حد تک شاعری کے دوسرے قدروں پر منحصر ہیں انکی ترتیب، اُنکی سماجی اصناف کے مطابق ہونا چاہئے وہ سماجی قدر ہے جو اجتماعی مفاد میں اضافہ کرتا ہے۔ اس لئے اُنکے دوسرے افادی قدروں سے جدا کیا نہیں جاتا۔ مختصراً مکمل طرح اچھا شعر وہ ہے جو صرف فن کے معیار کی

---

[1] شعرالہند حصہ دوم مصنف مولانا عبدالسلام ندوی صفحہ ۱۸۴۔

کسوٹی پر نہیں، بلکہ زندگی کے معیار کی کسوٹی پر پورا اُترے۔

شاعری کی حقیقت پر سب سے پہلے ارسطو نے بحث کی ہے اور ایک کتاب بوطیقا (پوئٹری) Poetics لکھی تھی۔ اس کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا۔ ابن رشد نے اس کی تلخیص کی تھی، لیکن آگے چل کر عرب شعرا نے اس کا بنیادی طور پر اثر قبول کیا۔ ارسطو نے کتاب کی تحریر کے مقصد کا ذکر کیا ہے

رزمیہ شاعری ٹریجڈی (المیہ)، کامیڈی (طربیہ)، بھجن اور اس طرح بانسری اور چنگ سے راگ نکلتے ہیں

اگر آپ بالکل عام نقطہ نظر سے دیکھیں گے تو سب نقلیں ہیں، جن میں ڈرامائی روح موجود ہے

شاعری کو ادبی اصناف میں قدیم ترین مقام ہے۔ قدیم شاعری کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ غنائی یا وجدانی۔ اس قسم کی شاعری میں شاعر اپنی طبیعت سے مدد لیتا ہے۔ اور اپنی قلبی واردات بیان کرتا ہے۔ اور اپنے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ۲۔ قصصی یا بیانیہ اس قسم کی شاعری میں شاعر لڑائیوں کے واقعات اور قوم کے بلند کارناموں کو قصہ کی شکل میں نظم کرتا ہے مثلاً ہومر کی ایلیڈ (ILIAD) اور اوڈسی ODYSSEY فردوسی کا شاہنامہ وغیرہ

۳۔ تمثیلی یا ڈرامائی۔ جس میں شاعر ایک واقعہ یا کہانی کو جب حال افراد (کردار) اپنے ذہن میں پیدا کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں شاعر دوسروں کو جاننے سے پہلے اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے جذبات اور احساسات کو نظم کرتا ہے۔ عربی شاعری۔ ان جنگی واقعات سے حال ہے جن سے قوم کے قابل قدر کارناموں کی یاد دائمی نما حاصل کرتی ہے جس طرح یونانیوں کے لئے ایلیڈ، رومیوں کے لئے اینیڈ، ہندوؤں کے لئے مہابھارت اور رامائن اور ایرانیوں کے لئے شاہنامہ

عرب میں شاعری کا آغاز کب ہوا اس کی تاریخ نہیں ملتی۔ البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب شاعری کو تاریخ نے جانا، تو وہ نہایت ہی محکم و مرتب شکل اختیار کر چکی تھی، جو کہ پختہ اور مسلم صورت میں نمودار ہوئی۔ قبل اسلام کی شاعری کا میدان سنگلاخ اور صحرائی عرب تھا، کیونکہ عرب بدوی کی طبیعت میں آزادی اور صحرائی بودوباش اس زمانے کی شاعری میں نمایاں ہے۔ جس میں ایک عجیب اور پروقار شان ٹپکتا ہے۔ چونکہ بدوی فلسفی نہ تھے لہٰذا اس زمانے کے غیر ضروری تاویلات سے کنارہ اختیار رکھا، انہوں نے آسان الفاظ اور عمدہ و سادہ تراکیب استعمال کیئے۔ وہ شاعری کھنڈرات اور ٹیلوں سے گذر کر خانہ بدوش زندگی میں سما گئی جسکی وجہ انہیں مخصوص انداز فکر بخشا، جب کوئی شاعر اس جگہ سے گذرتا جہاں مختلف قبائل خیمہ زن ہوتے ہیں تو ان کی طبیعت مچل جاتی، تھی اور اظہار جذبات میں آجاتے تھے اور یاد ماضی آجاتی تھی۔ قدیم معاشقہ اور فرقت کے اندوہناک حالت ان کی زبان کو خاموش کر نہیں سکتی تھی۔ اور اظہار جذبات میں جس کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس دور کے مشہور شعرا گذرے ہیں ان میں امرؤ القیس اپنے ایک قصیدہ کی ابتدا اس طرح کرتا ہے۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل　　بسقط اللوی بین الدخول فحومل

"اے میرے دوست ذرا ٹھہر تاکہ میں (مقام) دخول اور حومل کے درمیان سقط اللوی میں اپنے محبوب اور اس کے مکان کھنڈر کی یاد میں رو لوں"

عدی بن زید عبادی، دنیا کی بیثباتی کے لئے کہتا ہے

ابو الخضر انی بناہ و اذ دجلۃ تجبی الیہ والخابور

ابو الخضر (قلعہ کا نام) کا مالک جس نے اس کو بنایا تھا۔ اب کہاں ہے، جس کے پاس دریا دجلہ اور خابور کا وصول جمع ہوتا ہے

فن شاعری پہلا حصہ ارسطو مترجم عزیز احمد صفحہ ۲۱

ایلیڈ Iliad یونانی رزمیہ ہے جس میں ہومر نے ٹرائے کی جنگوں کے واقعات کو نظم کیا، یہ کتاب یونان کی تمدن کا جامع نمونہ ہے۔ اینیڈ، یہ لاطینی رزمیہ ہے جسے روم کے بلند پایہ شاعر ورجیل نے ۱۹ قبل مسیح نظم کیا اس رزمیہ میں ہومر کی ایلیڈ کی نہایت خوش اسلوبی سے پیروی کی ہے۔ مہابھارت، ہندوستان میں رزمیہ شاعری کا شاہکار ہے جسے ہندوؤں کے مقدس گرو ویاس نے سنسکرت زبان میں تین ہزار قبل لکھی۔ شاہنامہ فارسی رزمیہ، جسکو حسن بن اسحٰق فردوسی نے شاہان ایران (ساسانی) کی تاریخ اور مابین جنگ کے واقعات کو نظم کیا تھا جسکو فتح علی بغدادی، اصفہانی نے عربی زبان میں ترجمہ کیا۔

مقدمہ تاریخ ادبیات عرب پروفیسر گب مترجم سید محمد اولاد علی گیلانی صفحہ ۲۵۲۔

شعر ایک ایسی چیز ہے جو شاعر کے سینے میں جوش مارتی ہے، اور زبان کی راہ سے باہر نکلتی ہے نثر مسجع کو بھی شعر کہتے تھے، جس میں وزن اور قافیہ موجود ہوتا ہے اس لئے انہوں نے قرآن پاک کو شعر کہدیا تھا عربوں نے آزاد نثر سے مسجع و مقفیٰ کی طرف بڑھکر ترقی کی ہوگی نثر مسجع سے رجز کی طرف اور اس سے قصیدہ کی طرف بڑھے ہوں گے، باقلانی اپنی کتاب اعجاز القرآن میں لکھتے ہیں، عربوں نے سب سے پہلے زبان کی ابتدا نثر سے کی پھر بتدریج شاعری تک پہنچے جو حقیقت میں اتفاقاً امر ہوگا، لیکن جب انہیں شاعری اچھی اور مناسب معلوم ہوئی تو اس کا تتبع شروع کیا۔

صاحب بحر الفصاحت موصل مزاف آنتاب نما اور روضۃ الاحباب سے حوالا دیتے ہیں کہ شعر کی ابتدا حضرت آدم نبی علیہ والسلام سے ہے جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو حضرت آدم صفی اللہ نے اسکے ماتم میں اشعار کہے تھے، جن کا ذکر بحر الفصاحت کی کتاب روضۃ الصفا میں موجود ہیں[1]

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعراء کی تعریف فرما کر انکو خود امتیاز بخشا ہے، اور انکے نتائج طبع اور جنبش قلم کو ملاحظہ فرما کر خزانہ فیض سے صرف تحسین رحمت فرمایا۔ حضور صلعم نے فی اللہ دعا مبارک جیسے فرمائے تھے، صحیح بخاری و مسلم میں ابو اسحاق تابعی سے مروی ہے براء بن عازب صحابی کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین میں دلدل سے اتر کر اللہ تعالیٰ سے فتح اور مدد کی دعا مانگی تھی اور فرمایا تھا

أنا النبی لا کذب أنا ابن عبد المطلب

"میں پیغمبر ہوں اس میں جھوٹ نہیں، میں بیٹا ہوں عبد المطلب کا"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دیوان مشہور ہے، جسکی شرح شرح طول و بسط کے ساتھ قاضی حسین بن معین الدین میبدی نے لکھی ہے[2]

دَعْ ذِکْرَ ھِنْدٍ فَمَا لِھِنْدٍ وَفَاءُ رَیْحُ الْعِبَادِ عُفُوٌّ دُھْنٌ سَوَاءُ

یَکْسِرُ قَلْبَکَ ثُمَّ لَا یَجْبُرُنَّہٗ وَقُلُوبُھُنَّ مِنَ الْوَفَاءِ خَلَاءُ

چھوڑ ذکر اسکا یعنی (عورت) کا اسلئے کہ ان میں وفا نہیں، ہوا کا جھونکا اور اسکا عدد و بدن برابر ہے

تیرا دل توڑینگی پھر نہ جوڑینگی، ان کے دل میں وفا نہیں، وہ وفا سے خالی ہیں۔

عرب شعر کا موجد عرب بن قحطان تھا لوگ اسکے موزوں سخن کو شعر کہتے تھے، پھر شدہ شدہ بعد شعر کلام موزوں معنے پر یہاں تک پہنچا، اس طرح عرب میں بہترین شعراء پیدا ہوئے عرب کے دیہات کی زبان ماں ہے، کیونکہ شہر میں ہر سال مختلف دنیا کے ملکوں سے لوگ جمع ہوتے ہیں اور وہاں بیت سے باہر کے لوگوں سے سکونت اختیار کی ہے دیہات میں خالص عرب النسل ہیں تو وہاں کی زبان ہی صحیح ہے اور بدوی قوم کی گفتگو کو سند پکڑ کے لیتے ہیں، پروفیسر گب لکھتے ہیں

اس دور کے شعرا و سخن پر غور کرتے وقت ہم اپنے آپ کو ایک مختلف ماحول میں پاتے ہیں، اسلام کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی نے پرانے قسم کی شاعری پر بہت برا اثر ڈالا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ صاف طور پر اس قسم کی شاعری کے سخت خلاف تھا، کیونکہ آپ کا مقصد ہی یہ تھا کہ آخر شاعری کی شکل پر جو مخلص طاقت موجود ہے اسی بالکل تباہ کر دیا جائے۔

فارسی شاعری ہی اس طرح قدیم ترین ہے حقیقتاً قدیم فارسی شاعری کی کیا صورت تھی وہ صحیح طور پر معلوم نہیں غالباً دو قسم کی تھی

تنقیدات طہٰ حسین ۔ عبد الصمد صارم الازہری صفحہ ۹۲۔

بحر الفصاحت مصنف مولانا محمد نجم الغنی مطبع منشی نول کشور لکھنؤ ۱۹۲۶ صفحہ ۱۱۔

ایضاً

علی شخصیت اور کردار مصنف عباس محمود الغفار اصلاحی صفحہ ۲۵۶

۱۔ غنائیہ (BALLAD) ۲۔ رزمیہ (EPIC)۔ ابتدائی اسلامی دو صدیوں میں فارسی شاعری کی تاریخ اکثر خالی نظر آتی ہے۔ اس طویل زمانے میں عربی زبان تنہا حکومت کرتی رہی، ایران کی شاعری کے اصولوں سے قطعی واقف نہ تھے۔ اس وجہ سے مسلمان مصنفین نے قدیم فارسی شاعری کو صحیح شاعری تسلیم کرنے میں تامل کرتے تھے، وہ خلیل بن احمد (متوفی ۱۷۰ھ - ۷۸۶ء) کے قائم کردہ علم عروض کے قوانین کی کسوٹی پر نہیں اتر سکتی۔ ایرانی شاعری ساسانی عہد میں خواہ سن ہجری کی ابتدائی دو صدیوں میں سادہ قسم کی تھی۔

بہرام گور جس کے متعلق عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ فارسی شاعری کا اولین موجد ہے جس کے دیوان سے عرفی نے بھی استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے عربی اور فارسی اشعار جمع کئے تھے۔ لیکن اس کے مابعد تحقیق کے مطابق محمد بن واصف کی فارسی شعر میں ابتدائی کوشش تھی، جس نے فارسی زبان میں شعر لکھنے کی ابتدا کی تھی۔ عرب فاتحین نے ان ایرانی منکر انسانوں کو سنوارنے کے بعد ایران میں بڑی تبدیلی ہوئی، اور ایران عربی زبان میں شعر کہنے، اور عربی زبان سیکھنے میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ اس کے علاوہ، ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ عرب حاکموں کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے فارسی شعراء نے اپنی زبان میں تعریفی قصیدے لکھنے شروع کئے۔ اس طرح ایرانی شعراء نے عربی زبان میں بڑا کمال حاصل کیا جو ان کے استادوں کو بھی نصیب نہ ہوا۔

سید المرسلین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکات ذات مقدس نے عربوں کو آدمی بنایا، اور ان کے خواص درست کئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے:

رضینا قسمت الجبار فینا لنا علم ولجهال مال

ہم اپنی قسمت سے خوش ہیں، کیونکہ ہم کو علم ملا اور نادانوں کو دولت۔

آگے چل کر ایران کی سرزمین میں دنیا کے بہترین شعرا پیدا ہوئے، جو دنیا کے ادب پر چھا گئے، جن میں رودکی، محمد نخشبی، دقیقی، فردوسی، عمر خیام، انوری، نظامی گنجوی، مولانا جلال الدین رومی، شیخ سعدی، اور حافظ شمس الدین محمد حافظ شیرازی قابل ذکر ہیں۔

حافظ شیرازی اپنی سخن سنجی کے متعلق کہتا ہے:

در آسمان چہ عجب گر زگفتہ حافظ سماع زہرہ برقص آورد مسیحا را

یہ کون سی عجیب بات ہے کہ حافظ کے سخن کو آسمان پر زہرہ سنتے ہیں رقص میں اپنی مسیحا کو لے آتے

ایران کے قدیم بادشاہوں نے اکثر سندھ پر حملہ کرکے اسے اپنے تسلط میں لیا تھا۔ نو ہزار برس کا طویل عرصہ سندھ ایرانی حکومت کے زیر رہی جس کی وجہ سے سندھ کی مقامی زبان پر ایرانی زبان کا اثر رہا۔ لیکن سکندر اعظم کی فتوحات کا کوئی تاریخ نہیں ملتی۔ لیکن عرب فتوحات کے بعد عرب مورخوں نے سندھ کی تاریخ کو محفوظ کیا۔ بہرحال سندھ کی تاریخ کا باقاعدہ سلسلہ راجہ گھرانے سے ملتا ہے۔ عرب سندھ میں چھٹی صدی عیسوی کی شروعات میں آئے اور اس دور سے سندھی زبان کی تشکیل ہوئی۔ فتح اسلام سے پہلے سندھی زبان کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔ لیکن اس دور میں عربی زبان کے سندھی بلند پایہ شاعر پیدا ہوئے۔ جن میں ابو عطا سندھی (متوفی ۱۳۲ھ) عرب کا مانا ہوا شاعر تھا۔ اس کے علاوہ فرج السندھی، ابوالفرج سندھی

Introduction to the History of Arabic Literature by: Prof: H.A.R Gib - P 51

۱۔ غنائیہ شاعری، وہ ہے جو شعر جذبات سے بھرا ہوا ہو، اس گیت میں کیٹس بند ہوتے ہیں، لے میں ترانے نام سارے ساتھ گائے جاتے ہیں

۲۔ رزمیہ۔ جس میں کسی ایک یا چند بہادروں کے کارنامہ بیان کیئے جاتے ہیں

۳۔ بہرام گور فارسی شاعری کے موجد تھے۔ انہوں نے ایک روز شیر کا شکار کرکے بے ساختہ کہا منم ان پیل دمان و منم ان شیر یلہ (بحر الصاحب)

در ابو صلح اسدی مشہور شاعر گذرے ہیں۔ سندھ کے بحدت سورج اور دیبل کے علماء کا ذکر ملتا ہے، معمورہ علم و ادب کا مرکز تھا۔ سندھی اور عربی کو آمیخت ہوئی

سندھ اور ایران کے تعلقات قدیم زمانے سے تھے۔ اس لئے فارسی زبان کا اثر بہت قدیم رہا ہے۔ فارسی زبان بحیثیت سرکاری زبان سندھ کے

دور ۱۲۰۰ء میں ہوئی۔ تذکرہ لطفی کے مصنف کی تحقیق کے مطابق سندھی شاعری کی شروعات چودھویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی اور یہ سندھ کے

کا ہی وقت تھا جس میں صاف اور سادہ زندگی کی تصویر نظر آتی ہے سندھ نے ہم تاریخی داستان کی بیان ہی کرتی ہے۔ سندھ میں فارسی زبان کی اہمیت

اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس کو درباری زبان کا شرف حاصل ہوا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ فارسی شاعری کو سندھ کے شعراء نے بڑی ترقی دی یہ سلسلہ

ارغون اور ترخان کے دور حکومت سے شروع ہوا، اور اس کا عروج کلہوڑہ اور تالپروں کی حکومت کا ہے

سندھی شاعری کی شروعات ۱۲۰۰ء سے ہوئی اور اسکے مکمل نشان نظر آتے ہیں جس کا ذکر تاریخ نخبۃ الکرام میں کثرت سے ملتا ہے۔ جن میں

شیخ حماد اپنے وقت کے بڑے بزرگ گذرے ہیں جو حضور سرور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور اصحابی حضرت ابوہریرہؓ کی اولاد میں سے تھے اور آج

کے مشہور بزرگ حضرت عثمانیاں جھاگ گنت کے استاد تھے اسحاق آہنگر اور راہو درویش کا ذکر بھی حدیقۃ الاولیا میں موجود ہے جو اپنے دور کے سندھی

شاعر تھے۔ اسحاق کا ایک ایک شعر نظر آتا ہے

ٿيان مان جهرڪ وبهان پيرين جي چهج تي ،

مان ڪرن ڊيرڪ بولي باجهاري مون سين .

"میں چڑیاں کر صور کے چھاج پر بیٹھ جاؤں اور وہ مجھے وہاں سے اڑانے کے لئے آواز دیں، ان بہانے سے میں ان کی آواز سن لوں۔"

ماسوئی درویشوں کے اثبات تاریخ میں ملتے ہیں، جو حضرت تن درویشوں کے سندھ کے منتقل کے لئے پیشگوئیاں ہیں یہ بھی سندھ دور حکومت

میں گذرے مخدوم احمد علی، پیر محمد لکھوی، عثمان احسانی، لطف اللہ قادری وغیرہ ارغون کے دور حکومت کے شاعر تھے حضرت شاہ عبدالکریم

بلڑیؒ اور مخدوم نوح ہالائی کا تذکرہ پہلے صفحات پر ہو چکا ہے۔ حضرت شاہ عبدالکریم بلڑیؒ کی اولاد میں سے۔ ایک سو سال بعد سندھ

کے عظیم بزرگ اور سرتاج شعراء حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ پیدا ہوئے جنہوں نے سندھ کی شاعری میں انقلاب پیدا کیا جو سندھی شاعری

میں ایک عظیم پیغام کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوھیڑے اور وائی

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے رسالے کے اشعار کو دوھیڑہ (دوھو) کہتے ہیں، دوھا قدیم شاعری کی صنف ہے، جس کا رواج وید کے

زمانوں اور دیوتاؤں کی توصیف میں تشبیہی اور تمثیلی شعر تھا، دوھوں کا رواج ہندی زبان کے برج بھاشا میں ملتا ہے، ہندی زبان کا اثر سندھی

پر بہت پرانا اور قدیم ہے ہندی زبان کی طرح سندھی زبان میں بھی دوھے دو اشعار کا مرکب تھا۔ اس قسم کی شاعری سندھ کے قدیم شعراء

قاضی قادن۔ اسحاق آہنگر، پیر محمد لکھوی، حضرت مخدوم نوحؒ اور حضرت شاہ عبدالکریم بلڑیؒ بعد میں شاہ عنایت رضویؒ کی شاعری میں نظر

آتے ہیں مگر شاہ لطیفؒ نے دوھو کی صورت میں ایک نیا اسلوب اور نئی راہ ہموار کر دی جسکو "بیت" کہا گیا۔ مضمون وہی رہا۔ شاہ

لطیفؒ کے دوھوں میں، مذہب، تصوف، اور پیغام کا رنگ آگیا، جس کی وجہ سے عوام کے دلوں پر شاہ بھٹائیؒ کے ابیات کا گہرا اثر ہوا۔

شاہ لطیف نے دوھے کی صورت میں اضافا کر کے، چار، اور چار سے آٹھ اور اس سے بھی زیادہ اشعار کہے۔ اور اس قدیم شاعری میں انقلاب

---

۱ تذکرہ لطفی مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی

۲ حدیقۃ الاولیاء

پیدا کیا۔ دوہوں میں وزن کی پابندی نہیں ہوتی۔ لیکن قافیہ کا ہونا ضروری ہے۔ وہ قافیہ صوتی ہوتا ہے۔ عربی زبان میں ایسے اشعار کو رجز کہتے ہیں رجز حقیقی زمانہ کی پیداوار ہے اگر یوں کہا جائے کہ شعر کی شروعات رجز سے ہوئی تو بجا ہوگا۔ عرب عورتیں جنگ کے دوران بہادر سپاہیوں کو ہمت دلانے کے لئے رجز گایا کرتی تھیں۔ سندھ میں تھر کے علاقہ میں اونٹھ پر سواری کرتے ہیں، قافلہ میں سفر کے دوران۔ دوہے گاتے ہیں۔ ان ابیات کا نہ صرف انسانوں پر اثر ہوتا ہے، بلکہ ان جانوروں پر بھی ہوتا ہے۔ سر میں گانے سے ان ابیات میں اور بھی لطافت پیدا ہوتی ہے۔ اس تبدیلی کو دیکھکر شاہ بھٹائی نے ابیات کی صورت میں موسیقی کے لحاظ سے اضافہ کرکے "وائی" کی صورت ایجاد کی۔ پروفیسر محبوب علی چنہ لکھتے ہیں[1]

"وائی" کسی بول چال کو کہتے ہیں، جو پراکرت لفظ "وایا" اور سنسکرت لفظ "وراتا" سے نکلی ہے۔ سنسکرت میں "ورت" کی معنی "تھرتھر" ہے

شاہ بھٹائی نے وائی کا موجد تھا، جسکے لئے اکثر ادیب متفق ہیں، مگر ساخت کے خیال سے وائی موسیقی میں "ٹھمری"، ہندی زبان کے زیر اثر پیدا ہوئی جسکے لئے مشہور ہے کہ شاہ لطیف بھٹائی نے یہاں ہندوستان کے دو موسیقار اٹلی اور جنجی، آخری عمر تک رہے جو اکثر امیر خسرو، میراں بائی، بھگت کبیر، گورو نانک سکھ اور دیگر ہندی شعراء کا کلام گایا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ شاہ بھٹائی نے ان کے گائے ہوئے اشعار سے متاثر ہوا ہوگا، اور اپنی شاعرانہ طبیعت سے "وائی" کا ایجاد کیا ہوگا۔ "وائی" کی صنف جو آگے چل کر کافی کی صورت اختیار کی

مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ اپنی تصنیف "کافی" میں لکھتے ہیں[2]

"وائی سندھی لفظ کا الفاظ ہے جسکی معنی ہے "کوئی بات" وائی والا لفظ سے نکلی ہے جس میں سے وائی کا بنیاد نکلا"

مرحوم مرزا ھمایوں بیگ اپنے مقالہ "شاہ کے شعر میں خصوصیت" میں لکھتے ہیں:-

"شاہ بھٹائی کی وائی کو بھی دیکھنا چاہیے جو کافی ملتی ہے۔ یہ ایک خالص سندھی غزل ہے جس کی طرز پر کافی کا ایجاد ہوا"

وائی میں سب سے پہلے ایک بند ہوتا ہے جو دو اشعار کی مصرعہ ہوتی ہے، جس کے بعد وہی بند دہرایا جاتا ہے۔ وائی کو بھی کافی کی طرح گایا جاتا ہے۔

وائی کی ایک مثال شاہ بھٹائی کے رسالہ سے دی جاتی ہے، جو سر بھیمن کلیان سے ہے

—— اچي ساڻ لهيج، ساجن سُور تمارى آئون ماري!

سور تماري جي سران، تان مون ڏوهه نه ڏيج

ساجن سُور تماري آئون ماري!

ڏيئن پيري هتڙا، داروُن دوست عَزيز

ساجن سُور تمارى آئون ماري!

میرے ساجن تو آکر میری خبر لے —— میں تمہارے درد فراق میں مرتی ہوں ——

میرے ساجن تو آکر میری خبر لے۔

اگر تیرے درد فراق میں مرجاؤں، تو مجھے دوش نہ دینا، میری جان نثاری بے جا نہ سمجھنا۔

میرے ساجن تو آکر میری خبر لے

ہاتھوں میں دوا لے کر تو آکر میرا علاج کر

—— میں تمہارے درد فراق میں مرتی ہوں۔

---

[1] مقالہ نگار پروفیسر محبوب علی چنہ رسالہ نئی زندگی ماہ دسمبر ۱۹۵۸ء۔ [2] کافی مصنف مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ

شاہ لطیف بھٹائیؒ کا کلام مقبول عام ہے۔ انکا سب سے بڑا سبب آپ کے کلام میں موسیقیت موجود ہے۔ جس شعر میں موسیقی نہیں ہے اسکو شعر ہرگز نہیں کہا جائے گا۔ شاہ لطیفؒ نے سندھی زبان میں فن موسیقی کے نئے اسلوب کے بانی ہیں۔ جس طرح ہندوستان میں حضرت امیر خسروؒ کی حیثیت تھی۔ امیر خسرو کی وفات سے چار سو سال بعد سندھ کے دور افتادہ علاقہ میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سندھ کے عوام کا ہر دل عزیز شاعر کا ظہور ہوا۔ وہ ایک محب وطن اور صوفی شاعر تھے۔ انہوں نے سندھی زبان کو پسند کیا۔ اس زمانے میں عربی فارسی موسیقی کا رواج تھا۔ آپ کے کلام کو دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ فن موسیقی سے بڑی واقفیت رکھتے تھے۔ سندھ میں موسیقی کا رواج قدیم زمانے سے تھا۔ حضرت شاہ عبدالکریم بلڑیؒ اپنے خانقاہ میں خوش الحانی سے کلام کو پڑھتے تھے لوگ خانقاہ کے باہر جمع ہوکر سنتے تھے۔ سندھ کے ادیب اور بزرگ مخدوم احمد شیخ ہالاکنڈی جو اپنے دور کے بڑے ولی ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقی کے دلدادہ تھے جو اکثر سماع کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ شاہ صاحب کے معاصر بزرگ شاعر، دوست مخدوم محمد معین ٹھٹوی کو بھی موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی۔ شاہ لطیف بھٹائیؒ نے اپنے کلام کا بیشتر حصہ ہندوستانی موسیقی کے سروں میں کہا اور اپنا کلام اپنے دیس کی موسیقی کے رنگ میں کہا ہے، اور خالص سندھی سُر ایجاد کئے، جن میں خاص طور پر سر کوہیاری، سر سومل رانو (رانو) سر مارئی، سر کاماریل، سر کھنبات، سر سریراگ اور سر کاموڈ وغیرہ۔ اسکے علاوہ سر سہ نی، سر کیڈارو، سر جیجوہ (سارنگ) سر آسا، سر رامکلی، سر دیسی سر دیاسری وغیرہ ہندوستانی راگنیاں ہیں شاہ بھٹائیؒ سندھ میں سب سے پہلے ایک نیا ساز ایجاد کیا جسکا نام "طنبورہ" ہے اس ساز میں تبدیلی پیدا کرکے پانچ تار والا بنایا۔ شاہ لطیفؒ کو فن موسیقی سے لگاؤ فطری تھا جسکی وجہ سے آپ کے کلام میں موسیقیت کا بڑا عنصر پایا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ کہ شاہ لطیف بھٹائیؒ کا کلام صرف شاعری، تصوف، اخلاقیات، محاکات، اسلامی تبلیغ و حکمت کا گنج ہی نہیں بلکہ سُروں اور موسیقی کا بھی بے مثل خزانہ موجود ہے جو عوام میں مقبول ہے۔

شاہ لطیف اپنی شخصیت کی طرح اپنی شاعری میں بھی بڑی عظمت کے مالک تھے آپ ان عظیم بین الاقوامی قدر رکھنے والی شخصیتوں میں سے ہیں جنہوں نے انسانی فلاح و بہبود، تعلیم و اصلاح کا کام اپنے عظیم پیغام میں دیا ہے۔ آپ کا پیغام دنیا کے بڑے شعراء مثلاً حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ، شیخ سعدیؒ، حافظ شیرازیؒ، سنائیؒ وغیرہ کے پیغاموں سے کم نہیں۔ اپنے اس پیغام کی عظمت کی وجہ سے وہ ان "معلمین عالم" میں شمار ہوتے ہیں جو ایک زمانے میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں، اور جن کا پیغام غیر فانی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے کے الفاظ ہیں۔ "شاہ بھٹائی قرون وسطیٰ کے بڑے شعراء میں سے آخری بڑے شاعر ہیں خصوصیت سے سندھ میں تنہا وہی ایسے بڑے شاعر ہیں جن کی عظمت غیر فانی ہے" حقیقت سے دیکھا جائے تو شاہ صاحب کا سندھی زبان پر بڑا احسان ہے کیونکہ آپ نے اس زبان کو اپنے تصورات کے اظہار کا ذریعہ بنا کر اپنی عظمت کا بڑا ثبوت دیا ہے یہی وجہ ہے کہ سندھ کے لوگوں نے انہیں اپنے دل میں سمو دیا ہے۔ آپ کے بعد کے شعراء سندھی زبان میں خود کو موجودہ دور کے رجحانات کے ترجمان کہتے ہیں۔ کیونکہ آج کی سندھی زبان شاہ بھٹائیؒ کے دور کی زبان سے زیادہ مہذب و مرتب زبان کہی جاتی ہے۔ لیکن وہ اب تک شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے تصورات و خیالات تک پہنچ کر اپنا کوئی تاثر قائم کر نہ سکیں ہیں۔

باب دوم

حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائی کا کلام

کلہوڑوں کے دور حکومت کو یہ فخر حاصل ہے۔ کہ اس دور میں سندھی زبان کا عظیم المرتبت شاعر اور مفکر حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ پیدا ہوا اس عظیم ترین شاعر کے کلام پر نظر ڈالنے سے ان کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاہ بھٹائیؒ کی شاعری داخلی اور پیغامی ہے، ان کے کلام سے بعض جگہ یہ بھی نظر آتا ہے کہ آپ نے واقعات اور مناظر سے متاثر ہو کر بھی شعر کہا ہے لیکن آپ کی شاعری کا سب سے بڑا رنگ رجائی اور پیغامی ہے، سب سے بڑا پیغام حسن ازل کے ساتھ عشق و محبت کا پیدا کرنا ہے جس میں خدا پرستی اور رسالت مآب کا صحیح جذبہ موجود ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ فکر و ادب میں کوئی ایسا شاعر مفکر حیات آفریں کامل پیش نہ کر سکا ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کی شاعری صرف ان کی زندگی کی ترجمان نہیں، بلکہ زندگی و کائنات کی ترجمان ہے۔ وہ زندگی جو کائنات کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے، ان کے اشعار کی بنیاد ان دائمی قدروں پر استوار ہے جو غیر متزلزل اور افاقی ہے۔ اس لئے وہ کسی خاص زمانے کی پابند نہیں بلکہ ہر زمانے میں ایک حقیقت کی طور پر پیش کی جائی گی۔

شاہ لطیفؒ کے کلام میں جذب، حسن یا شاعرانہ تخیل موجود ہے، جو آپ کے کلام کو ہر لحاظ سے حسن کا ایک شاہکار بنا دیتا ہے اس وجہ سے آپ کا کلام جذبات سے لبریز ہے۔ ان جذبات میں اکثر، غم خوشی، حسرت، شکر، صبر، رغبت، قناعت، انصاف، توکل، رحم، امید، کبریائی اور انکساری موجود ہے۔ اپنے کلام کے لئے خود فرماتے ہیں۔

جي تون بيت پائين، سي آيتون آهين،

نيو من لائين، پرڀاڻ سندي پاڙ ڏي،

(ان ابیات کو آیات سمجھو یہ قرآن کی آیتیں ہیں، جو دل کو محبوب کی طرف لے جاتے ہیں)

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کے لئے بھی یہاں تک کہدیا گیا ہے

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآن در زبان پہلوی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مقدس ہستیوں کے لئے شاعر کا لفظ موجب فخر ہو سکتا ہے؟ شاہ کا رسالہ یا مثنوی مولانا رومیؒ محض تفریح طبع کے لئے لکھی گئی تھی؟ ہرگز نہیں، ان بزرگوں کا کام شاعری نہ تھا، جیسا کہ خود مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں[1]

من نمیدانم فاعلاتن فاعلات۔ شعر گویم لیک چون آبحیات

اس طرح حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ نے اپنے مریدوں سے اپنا جمع کیا ہوا کلام کرار جھیل میں پھینک دیا تھا، جس پر مریدوں میں بڑی بے چینی پھیل گئی تھی، ان بزرگوں کو بنی نوع انسان کی اصلاح اور خدا تعالیٰ کا صحیح راستہ بتانا تھا، جس کو قوت سے فعل میں لانے کیلئے شعر کی قوت کے تاثیر کو بہتر و کارآمد سمجھا، اس لئے لوگوں کو ایک شاعر کی حیثیت سے یاد کرنا اور اس کے اصل مقصد کو نظر انداز کر دینا ہے جو اس شاعر کے اندر پوشیدہ ہے

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ عام شعراء کی طرح اہل قال میں نہ تھے بلکہ آپ اہل حال میں سے بھی تھے جب حال طاری ہوتا تو شعر کہتے تھے ورنہ ہر وقت فکر میں محو رہتے تھے، شاہ صاحب کا کلام اس وجہ سے مقبول عام ہے کیوں کہ آپ کا کلام اسلام کی تبلیغ ہے لیکن ولی کا انداز اور عشق کا سوز

---

[1] رسالہ نیرنگ خیال۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۳ء صفحہ ۱۸۴۔

ساز ہی رکھتے تھے کیوں کہ شاہ صاحب ولی اور عاشق رسول تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور شریعت محمدی کے اندر محبت اور عزت و احترام کرتے تھے۔ اور شریعت کی حقیقت کے رموز کو ظاہر کرنے میں مانع تھے۔ شاہ صاحب کے کلام میں ملتی واردات کثرت سے موجود ہے جس میں انسان احترام کی راہوں پر بڑی سادگی سے سوچا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے کلام کا مطالعہ کرنے والا آپ کے روحانی فیضان میں گم ہو جاتا ہے، خود فرماتے ہیں۔

روزہ ۽ نمازون اي پٽ چگو ڪم.

اُو ڪو ٻيو فهم جيان پٽ پرين جو.

روزہ اور نمازیں یہ بھی بہتر کام ہے، لیکن وہ فہم اور ہے جس سے دوست کو دیکھیں"

یہ تفہیم اور افہام، انسانیت کا احترام ہے جس کے حاصل ہونے سے انسان قرب الٰہی کے اعلیٰ مقام کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ علم الاخلاق کے رہبروں نے انسانیت کے احترام اور اس کے لاثانی کردار کو دیکھا ہے۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست

یہ وہ زندہ جاوید پیغام ہے، جس کے بانی شاہ لطیفؒ اس زمین کے رہنے والے شدہ کے دل و دماغ پر بلا کسی مذہبی تفریق و امتیاز کے چھایا ہوا ہے، اور ہمیشہ چھایا رہے گا۔ جب کسی کے دل میں احترام انسانی جاگزین ہو جاتا ہے تو، اس میں وہ سب صلاحیتیں خود بخود موجود ہو جاتی ہیں جو ایک صالح معاشرہ کے لئے ضروری ہیں۔ یہ شخص، "صلح کل" بن جاتا ہے۔ یہی خصوصیتیں ہیں جو شاہ لطیف کے سیم کردار ہیرو میں ملتی ہیں

ڪاري رات، ڪڇو گهڙو، اُٿيو ڀين اونداهي.

ساهڙ ڪاڻ سمٽي، آڏيءَ تي. آ شي.

اي ڪم الاهي، نا نه ڪنن ۾ ڪير گهٽي.

تاریک رات ہے اور گھڑا خام ہے۔ تاریکی ہی انتہا کی ہے۔ چاند کے طلوع ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ دریا میں شور ہے یہ خدا تعالیٰ کی مشیت تھی، ورنہ ایسے خطرناک قدموں کون اتر سکتا۔

سسی دریا کے موج کو دیکھ کر ٹھٹھرتی ہے۔ لیکن جلد ہی خود کو تسلی دیکر آگے بڑھتی ہے۔۔

سڪڻ واري سڙو، جي دهشت سان درياه

اوڙڪ اُنهن جو نه رهي، ايرنا آرواح

ويندي ساهڙ سامهون صدقو ڪنديون ساه.

جن کي حب آنهي آهه، ساهڙ سائي تن جو.

محبت والوں کے لئے، دریا کی دہشت بالکل آسان چیز ہے۔ ان کے روح کی دلچسپی ہمیشہ دریا کی روانی سے ہی قائم ہے محبوب کے سامنے وہ جاتے ہوئے، اپنی جان کو قربان کر دیتی ہے جن کو محبوب کے ساتھ محبت ہے اور وہ ہی ان کا مددگار ہے۔

سوہنی ڈوب گئی، اس کی لاش پانی پر تیرنے لگی، شاہ صاحب اس المناک منظر کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے۔

ڪانڌي ڪنگ ڪياس، وهڻ جنازو سمٽي.

ڳڙ جي ڀيڻن جا، ڪلها تن ڏٺاس

اڪين مڪڻ ڏٺاس، توڙ من ڪاڏو ميهار ڏي.

(آب رواں پر سوہنی کا جنازہ جا رہا ہے، ان کے گرد کلنگ جمع ہو گئے ہیں۔ چڑیوں کے پرندے ان کو گویا اپنے دوش پر اٹھائے ہوئے ہیں)
موت کا فرشتہ سامنے ہے، لیکن دل کا طلب اب بھی مہیوال کی طرف لگی ہوئی ہے

ماروی تھر کی دیہاتی لڑکی، اپنے وطن سے دور سندھ کے عمر سومرہ کے قید میں گرفتار ہے، وہ اس عالم میں سوچ رہی ہے کہ میری ہمجولیاں اپنے وطن میں شاید یہ سوچ رہی ہونگی کہ میں یہاں عیش میں ہوں اور ان کو بھول گئی ہوں، لیکن انہیں کیا خبر کہ میں کس مشکل میں گرفتار ہوں۔ شاہ لطیفؒ نے اس کیفیت کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ اپنے کلام کی ایک سادی سی جھلک ہمارے سامنے آتی ہے۔

مون سين ماروئڙيون، ڪهڙي حيت ۽ سنديون

چوٽيءَ ۾ چيڙهه پيو، پيين ٿَٽَ چيون،

نٽين ننڊ ڏي تي، ساري ساڏميون.

متي جي صوف تہ سٽِ پوين سبل جي.

(میری ہم جولیاں مجھے کس کر رو رہی ہیں، میری چوٹی (بالوں) میں مٹی پڑ گئی ہے اور صوف جو میں نے بنی ہیں)

(سندھ والوں کو یاد کرکے میری آنکھوں سے نیند اُڑ گئی ہے، کاش وہ یہاں ہوتیں، تو ان کو عصمت و عزت بچانے کی خبر پڑ جاتی)

ماروی عمر کے قید میں بند ہے، اُن کو اس حالت میں اپنے وطن کی یاد آتی ہے، تو وہ چیخ اُٹھتی ہے، ماروی کی اس حالت کو بڑے فکرمند انداز میں بیان فرماتے ہیں:

الله ائين نہ هوءِ، جئين آءُ سران هن بند ۾

جسو زنجيرن ۾ ساتو ڏينهان سرهه

پيرين وچان لوهه، پوءِ سر پهنم ڏينهه ۾

(خدایا! اس طرح نہ ہو کہ میں اس قید و بند میں گھٹ کر مر جاؤں، میرا جسم زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور شب و روز رونا ہے)

میری یہ آرزو ہے کہ اول منزل پہنچ جاؤں، پھر اگر زندگی کے دن ختم ہو جائیں تو ہو جائیں

بظاہر شاہ لطیفؒ نے ماروی کے نکتہ نگاہ سے حب الوطنی کا یہ منظر پیش کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بے پناہ آرزو کو حب الوطنی کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ بھی اسے قبیل میں فرماتے ہیں:[1]

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران

گفتہ آید در حدیث دیگران

شاہ لطیفؒ کے کلام میں انوکھی محاکات موجود ہیں، چاند کو مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

چنڊ تنھنجي ذات، پاڻيان تلن نہ پرين سين

تون اچي منجھ رات، سچڻ نت سوجھرو.

"اے چاند میں تجھے کس طرح اپنے دوست سے نسبت دوں، تو صرف رات کو روشن ہوتے ہو، لیکن میرا دوست ہمیشہ روشن رہتا ہے"

اس دیئے ہوئے محاکات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں چاند کی تعریف مقصود نہیں ہے بلکہ اپنے دوست کی تعریف مقصود ہے فطرت کے مناظر کو پیش کرنے میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ رانو مومل سے روٹھ کر چلا گیا، مومل حسب دستور اس کے آنے کا انتظار کرتی ہے، اس کی رات انتظار میں کٹتی ہے یہاں اس منظر کو بڑے جاذب انداز میں بیان کرتا ہے

---

[1] مثنوی مولانا رومی ص ۲

ڪنڊن کي موڙيا. تيئرو ٿي پاڻيءَ ۾

راڻيءَ ۾ آيو، ويل نهري ويئي.

ڪه ساڻي راتڙي، ها مسين ٻڌي پئي،

مون کي ڏن ڏيئي، ڇوليو ڏيئ قرار ڪيو.

ثريا جهلملا کر مڑ گئی، پروین کے ستارے آسمان پر چڑھ آئے۔ پوری رات بیت چکی لیکن راز نہ آیا، اس کے آنے کا وقت ٹل گیا۔

حیف ہے اس منحوس رات پر جو اپنے پیارے کے سوا گذر گئی، مجھے داغ دے کر، میرا محبوب اپنے وطن ٹھٹھہ جا کر آرام ہوا۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ کے شاعری کا دور سندھی شاعری کے عروج کا دور تھا، دراصل شاہ لطیف کی صحیح شخصیت کی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ وہ عوامی شاعر تھے اپنے کلام میں سچے اور پاکیزہ عوامی جذبہ کو پیش کیا ہے۔ عوامی شاعر ہمیشہ عام انسانوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ وہ عوام سے اتنے قریب تر ہو جاتے ہیں کہ ان کی دھڑکنوں میں رہتا ہے۔ شاہ بھٹائیؒ نے اپنے کلام میں وطن عزیز کی تاریخ و تہذیب، معاشرتی زندگی، اور تمدن، کسان، مزدور، تاجر، غریب عوام کی ترجمانی کی ہے۔ اور ایک رہنما کی حیثیت سے بھی عوام کو بیدار کرنے کی کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ یکجہتی کا سبق دیتے ہیں فرماتے ہیں

وڳر هيو وتن پرت نہ چنن. پاڻ ۾

پسو پکيئڙن ماڻهون سين گهڻو.

(اکٹھے ہو کر اڑتے ہیں، اور باہمی محبت نہیں چھوڑتے۔ پرندوں کو دیکھو۔ ان میں انسانوں سے زیادہ محبت ہے۔)

ایک جگہ فن و خاشاک اور گھاس کی متعلق غیرت اور قربانی کی جذبہ کو اُجاگر کرکے فرماتے ہیں۔

ڀڃندي پوڻن کي ڪي. هاتف هٿ وجن.

پسو ٻج لطيف چي ڪيڏي کي هڪن.

توڙي هنڌي هن نہ تہ ساڻ هلن سيرجي.

(ڈوبنے والا تنکے کا بھی سہارا لیتا ہے سمجھدار اپنے آپ کو بچانے کے گاس کو پکڑتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں ان تنکوں (دریاہ کے کنارہ پر ہوتے ہیں) کی غیرت دیکھو۔)

اگر اس میں طاقت ہوگی تو وہ اسے بچا لینگے، ورنہ اس ڈوبنے والے کے ساتھ بہہ جائینگے

شاہ لطیفؒ کبھی صلح کل بن کر انسان کو تلقین فرماتے ہیں۔ صبر سے جو کام نتائج وہ شور و شر سے نہیں ملتا، فرماتے ہیں،

هو چوئي تون ٻي چوءُ. ماتوں ورائي.

اڳ اڳراڻ جو ڪري، خدا سو ڪائي

پاڻ ۾ پاڻي ويو ڪيئي ماروهين کي.

(اگر کوئی تجھے برا کہے، تو ایک بدلے میں کچھ نہ کہہ جو شروعات کرتا ہے، وہی سزا کا حقدار ہوتا ہے)

جس نے دغا و فریب دل میں رکھا اسکا وجود نہ ہوگا۔

کتنی عملی تعلیم ہے جو لطیف سائیں نے دی ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد بھی یہی ہے۔ "الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس" غصہ پر صبر کرو اور انسان کے لئے عافیت بن جاؤ" یہ عملی اسباق ہیں جو ہمیں اس بیمثل سخنور سے حاصل ہوتے ہیں۔

شاہ بھٹائیؒ کے کلام پر تنقیدی نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوگا کہ آپ کا کلام تصوف کے باریک نکتوں سے بھرا ہوا نظر آئے گا۔ انسانی کردار کے رموز و اسرار کو سمجھایا ہے۔ اور اپنے کلام میں گویا اپنی حقیقت کو نہایت لطیف انداز سے بیان کیا ہے، جیسے حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

خوشتر آں باشد کہ قصۂ دلبراں گفت آید در حدیث دیگراں ۔

سرمنات، سرموہل رانہ اور سر پورب میں مجاز کا ذکر کیا ہے بقول مرحوم مرزا قلیچ بیگ

"ان سروں میں صرف عشق مجازی کا ذکر کیا ہے اور اپ کے ابیات معلوم ہوتا ہے کہ مجاز عاشق کس کو کہتے ہیں، کس طرح محبت کے مسائل طے کیے جاتے ہیں"

مرزا صاحب کی رائے کس قدر محقق ہے یہ شاہ لطیف کے پاکیزہ سخن سے دیکھیں مجاز کی محبت کا ذکر اس طرح کرتا ہے :-

ساہ وڻي وئين سپرين سرب تفراقي ۔

دلبر دل کسي وجيين ياہ تيين ياقي

جاڙ مون ضعيف سان تو جانب ڪئي جاڪي

هت بت رهيو باقي ، ساہ وڻي وئين سپرين ۔

اے میرے محبوب تو نے لٹیرا بن کر میری جان لوٹی، میرے دلبر میرا دل چھین کر بے وفا بن گئے ۔

تو نے اس ضعیف پر بڑے ظلم ڈھائے یہاں تو صرف خاکی جسم ہے، جان تو تو نے لی ہے ۔

ان سروں میں شاہ صاحب نے محبت، محبوب کا انتظار، عاشق کی بدقراری، وصل و فراق کے نقش نہایت عمدی طرح ادا کیے ہیں ۔

مونکي ماءُ مجاز ، پيچاري جان تنيو ۔

میری ماں عشق نے مجھے پنجیارے کی طرح تکلیف دی ہے ۔

جس طرح مشرق کے صوفی شعراء نے اکثر مجازی محبت کو عشق الٰہی کی بنیاد سمجھا ہے، اس طرح شاہ لطیف بھٹائی نے بھی اس حقیقت سے متاثر نظر آتے ہیں، لیکن وہ اس منزل پر کھڑے نہیں رہے۔ حافظ شیرازی کا قول ہے

فردا کہ پیشگاہ حقیقت شود پدید ،

شرمندہ پروئے کہ نظر بر مجاز کرد ۔

کل جو خدا تعالیٰ کے سامنے تیری حقیقت ظاہر ہوگی

جس نے مجاز پر نظر رکھی ہوگی وہ کس قدر شرمندہ ہوگا ۔

حافظ شیرازی کی طرح سندھ کا یہ اولوالعزم شاعر بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں۔ آپ نے اس حقیقت کا اظہار حافظ شیرازی کے مقابلے میں آسان طریقے سے کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

چاکي وهي جو سلي تس سين هو ،

وٺ هنجڻ ڪريم جي جڳ جو والي جو ،

سو کو هوندو سو ، جنهن جو عشق الله سين

اے بندے تم کیوں دوسروں کے دوست بنتے ہو، تم کو تو خدا تعالیٰ کی بارگاہ تھامنا چاہیے جو پورے جہان کا والی ہے ۔ وہ ہی خوش رہے گا جسکا عشق اللہ تعالیٰ سے ہے ۔

سر سرود میں ان معارف اور حقائق کا مظہر ہے۔ مجاز اور حقیقت کی کشمکش کے بعد شاہ بھٹائی اپنے اصلی مقصد کو حاصل کر لیتے ہیں جو ایک عظیم الشان کامیابی ہے یہی انسان کی جدوجہد کا کمال ہے۔

شاہ صاحب اپنے کلام میں سندھ کے معاشرتی حالت کا بیان فرمایا ہے، جس میں امیروں، فقیروں، اور عام انسانوں کے رسم و رواج ،

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] مولانا نے کی عکاسی فرمائی۔ اس وقت سے عارفؔ کا دل اپنے محبوبوں سے ملا ہوا

[illegible]

[illegible] اور محبت سے میری حالت [illegible] کو بڑی تکلیف پہنچائی ہے

الست بربکم کے نوا پر لبیک کہنے، عارفؔ کی محبت کی بھی دلیل ہے۔ لیکن شاہ شاہاں کا جلیل اس [illegible] کی مدد پر دار ہے۔ ظاہر و بصر تو ہم تو [illegible] سکتا ہے لیکن قدوس صفات روح اور باطنیت سے بہت ملتا ہے۔ فرماتے ہیں:

جیسا کہ جسمی قدامہ لذیتہ، [illegible] مت سدم

میرا جسم [illegible] ہے۔ لیکن [illegible] آپ کے پاس ہے

عارفؔ جب اپنے [illegible] سے علیحدہ ہوئے تو وہ اس نا امیدی اور مایوسی کے عالم میں کہتے ہیں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

لیتا ہے اور تخیل کی نزاکت اور معنی میں محو ہو جاتا ہے۔

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے کلام کو سمجھنے اور ان کے شاعرانہ محاسن سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس چیز کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ شاہ بھٹائی صوفی شاعر ہیں اور تصوف آپ کی شاعری کا سب سے بڑا جز ہے۔ شعر میں آپ کی ذات اور شخصیت کا بڑا دخل ہے۔ شاہ بھٹائی صوفی شاعر ہونے کی وجہ سے عشق کا کردار بہت بلند ہے، جس میں حسن اور عشق کا نصب العین بھی کسی طرح کم نہیں ہے۔ حسن کی بلندی یہ ہے کہ وہ دنیا کے ہر حسن سے بہتر و برتر ہے، ایسے حسن کے لئے عشق بھی ایسا ہی بلند ہونا چاہئے۔ وہ محبوب کے حسن کا فریفتہ ہے اس میں نیکیوں کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اس کے دیئے ہوئے درد میں اسے باقی ہر چیز سے زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے۔ ایک جگہ اپنے محبوب کے شان جمال کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ گویا محبوب اس کائنات میں یکتا ہے ایسی مثال دنیا کے کسی اور زبان کی شاعری میں نظر نہیں آتی فرماتے ہیں:

ناز منجھان نکري، جنھن پرين ڪري تو پنڌُ

پوُن پڻ بسم الله چئي، راهه چمي ٿي رنڌُ

اُپيون گهٽي ادب سين، حورون جيڙُت هنڌُ

ساڻين ڀو سوگنڌُ، ساجن سينڌان سُهڻو.

جب میرا محبوب اپنی شان کے ساتھ خرامان ہوتا ہے، تو زمین بھی بسم اللہ پکار کر راہ کو چومتی ہے حوریں بڑے ادب سے ایک جگہ کھڑی ہو جاتی ہیں۔ میرا محبوب سب سے حسین ہے، میں رب کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔

شاہ لطیف کے کلام میں صوفیانہ تخیل چھایا ہوا ہے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے انہیں سندھ کے ہر طبقے کے لوگوں کا محبوب بنایا ہے۔ اس کا پس منظر وہ زندگی ہے جسے انہوں نے بہت قریب سے دیکھا، وہ احساس ہے جسکی دھڑکن انہوں نے دوسروں سے زیادہ خود سنی، زندگی کے ان دشوار راہوں پر ان کی گہری نظر تھی، لیکن انہوں نے اپنے شاعرانہ انتخاب سے پوری فضا میں سے وہ چیزیں حاصل کیں جو ان کے تخیل اور اخلاق نصب العین کی وضاحت میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ان چیزوں کے درمیا اتنا صحیح امتزاج ہے کہ ایک چیز کے اثر اور مقصد کو زائل نہیں ہونے دیتا۔ شاہ بھٹائی گویہ شاعر بھی ہیں تو حکیم بھی نکتہ دان ہے تو نکتہ سنج بھی۔ آپ کی طبیعت میں عقل اور عشق کی ابدی کشمکش موجود تھی۔ دین اور اخلاق، تہذیب اور تمدن کا بیان، حسن کی کرشمہ سازی اور نقاشی بہ موجود ہے۔ شاہ صاحب نے حقیقت اور مجاز کی تصویر کو بے نقاب کیا ہے۔ کلام میں والہانہ انداز میں انسانی جذبات موجود ہے جسکی آپ نے ترجمانی کی ہے۔ اور قدم قدم پر تلقین فرماتے ہیں۔ اور اس مستعار زندگی کے قافلہ کو طوفان وجہان کی منزل سے پار کرنے کے لئے ساربانی کرتا ہے۔ کبھی خدا تعالیٰ کی درگاہ عالی میں توبہ سے سمندر کے طوفان کی توانائی سے نجات حاصل کرنے کے لئے مرہون ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

سيوبو جن سبحان، ديرن نه وڙهي تن سين

توبه جي تاثير سين، تري ويا طوفان،

ڏيئي توڪل تڪيو اڙ لنگهيا آسان،

ڪامل عشقيبان وچ ڀڳل بين واهرو۔

"جس نے خدا تعالیٰ کو یاد کیا، اسے دریا کی مد و جزر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی، توبہ کے تاثیر سے بڑے بڑے طوفان ٹل جاتے ہیں۔ جس نے خدا تعالیٰ پر بھروسہ کر کے طوفان سے گذرنا چاہا وہ آسانی سے پار ہو گیا۔ وہاں مرشد کامل ناخدا بن کر مدد کے لئے پہنچ جاتا ہے"

انسان کی زندگی میں نیکی اور بدی کے دو پہلو موجود ہوتے ہیں۔ یہ دونوں انسان کے اعمال پر منحصر ہوتے ہیں۔ انسان کشمکش حیات میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس طرح زندگی کے گوناگوں پیچیدگیوں اور مختلف مسائل پر بڑی شائستگی سے بحث کی ہے۔ خاکی انسان جب زندگی کے بے پناہ حدوجہد سے مایوس ہوتا ہے تب اس کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے۔ وہ نہ صرف دنیا کی ہر چیز سے غافل ہو جاتا ہے بلکہ خود خدا تعالیٰ کے قانون اور عالمگیر انصاف میں بھی یقین نہیں رکھتا وہ اعمال ہی ہیں جو انسان کی زندگی کو سنوار سکتے ہیں ڈاکٹر اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔

شاہ صاحبؒ شریعت کے بڑے پابند تھے، اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ فرمایا ہے۔

ساري سِکُ سُبُقُ، شريعت سَنڌو سمهي

طريقتان ٻکو ڏهي، حقيقت جو حق۔

معرفت هَرُ کُے، اصل عاشقن کي۔

یعنی شریعت کا سبق سنبھال کر سیکھ اور سچی دیندار بنو طریقت سے مراد ہے حق تعالیٰ کی حقیقت

معرفت الٰہی اصل مدعا ہے سچے عاشقوں کی

جس طرح کلمہ طیب میں اقرار کرنا ضروری ہے، کہ سوائے رب تعالیٰ کے کوئی رب نہیں۔ اس لئے بندے کو کسی اور کے آگے سر جھکانا کفر ہے کلمہ طیب کے تین حرف ہیں۔ پہلا "لا الٰہ" کوئی رب نہیں ہے الا۔ دوسرا "الا اللہ" سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ تیسرا "محمد رسول اللہ" محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کا رسول ہے۔ پہلے حرف کو نفی دوسرے کو اثبات کہتے ہیں۔ نفی کی معنی دوسرے معبودوں کو ترک کرنا اور اثبات کی معنی ہے ایک خدا کی ہستی کو قائم کرنا۔ نفی اور اثبات کو ملا کر توحید بنتی ہے، اور دوسرے حصہ کو رسالت کہتے ہیں شاہ صاحب نے وحدانیت کے ساتھ رسالت کا جو اقرار کیا ہے۔ اس میں رسالت کو وحدانیت کا ایک اہم جز قرار دیا ہے فرماتے ہیں۔

وَحْدَهٗ لا شَرِيكَ لَهٗ، جان تو چئين ايڪ

تان مُحَ محمد عارفي، نرتون منجهان نيهه

تان تون ويٺو هيئن ٻاڻين سر ٻئن کي۔

خدا تعالیٰ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے جس نے یہ کہا ہے۔ تو صدق دل سے حضرت محمد صلعم کو بھی مان جس کے لئے یہ دنیا پیدا کی۔

پھر تو کس طرح غیر کے سامنے سر جھکاتا ہے۔

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ شاہ لطیف بھٹائیؒ نے سندھی زبان کو جس اوج اور کمال پر پہنچایا ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی آپ کی شاعری اکتسابی نہیں، بلکہ الہامی ہے۔ فصاحت، بلاغت، سلاست جو شعر شاعری کی جان ہیں مخصوص ہے۔ وہ آپ کے کلام میں افراط سے موجود ہے۔ دنیا کے عظیم شعراء کی طرح آپ کا کلام بھی سادگی شستگی اور روانی سے بھرا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی وفات کو دو صدیوں سے زیادہ وقت گذر چکا ہے لیکن آج بھی کلام میں وہی تازگی اور سوز گداز موجود ہے۔ جو آپ کے زمانہ میں موجود تھا عام و خاص میں آپ کا کلام مقبول ہے۔ اور اسے الہامی کلام سمجھتے ہیں۔ یہ حقیقت محض عقیدت پر مبنی نہیں ہے۔ لیکن واقع آپ کی فصاحت و سلاست قابل رشک ہے شاہ لطیفؒ کے کلام کو سندھی ادب میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ہماری عقیدت اسنادوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ تمثیل اور تشبیہ کے استعمال سے حقیقت کے راز کو بڑے دلنشین انداز میں پیش کیا ہے، جس سے پڑھنے والا ہمیشہ حیران رہتا ہے۔ شاہ لطیفؒ کے کلام کو گہری نظر سے دیکھنے سے معلوم

ہوگا کہ ایک باکمال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے وقت کے ایک عظیم مفکر بھی تھے۔ شاہ صاحب کے کلام کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ سندھ کے رومانی داستانوں کو بیان کرتے۔ چونکہ اس دور میں یہ داستان سندھ میں مقبول عام تھے۔ اس میں عوام کے دماغی عناصر کو ان کے ذہن سے پاک کرنا تھا۔ اس لئے شاہ صاحب نے اُن داستانوں کے ذریعہ اپنا پیغام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کے کلام میں تشبیہات زیادہ استعمال کی ہوئی ہیں۔ شاعر کو علم بیان کا جاننا نہایت ضروری ہے، کیونکہ تشبیہات سے کلام میں بڑی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ ان کی قوت مشاہدہ غیر معمولی تھی، اپنے دیس کی تشبیہات، استعاروں اور کنایہ کو لیا ہے جس میں معانی رنگ سمایا ہوا ہے۔ جس کی مثال یہ ہے

جہڑي تو تو جئين لهرين ڳچي اڌ تني.

تون پڻ آهين تئين، دنيا ۾ ڪو ڏينهڙو.

جس طرح پانی کی سطح پر بلبلہ لہرتے لگتے ختم ہو جاتا ہے۔ اے انسان تو بھی اس دنیا میں کچھ دنوں کے لئے ہے

دوسری مثال ہے

نهائين ڪان نينهن سڪ منهنجا سپرين.

سڙي سامهون ڏيهن پاهر پاڻ نه نڪري.

شاہ لطیف غزل گو شاعر نہ تھے، پس آپ کے کلام میں غزل کی روح پائی جاتی ہے۔ غزل کی صنف سے غیر واقف نہ تھے۔ کیونکہ فارسی زبان میں سندھ کے غزل گو شاعر موجود تھے۔ اس کے اثر سے آپ کے کلام میں تغزل کا عنصر موجود ہے۔ تغزل سے مراد ہے شعر میں ہر خیال کو حسن و محبت اور خوش اسلوبی سے بیان کیا جائے۔ جس میں ایک طرف محبت کے لطیف جذبات موجود ہوتے ہیں، تو دوسری طرف عشق کی شوخیاں، وصل کی امنگیں اور ارمان، جدائی کے داغ اور درد موجود ہیں۔ مرحوم پروفیسر احسان احمد بدوی اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں[1]

شاہ لطیف اپنے کلام میں عاشقانہ مضمون کو بڑی وضعداری سے بیان کیا ہے، لیکن شاہ لطیف غزل کی شگفتگی سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ غالب کی طرح اسکا احساس رکھتے تھے۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

کچھ اور چاہئے وسعت میرے بیاں کے لئے

اس لئے آپ نے غزل کو اپنے خیالات کا مرکز نہ بنایا، کیونکہ آپ جانتے تھے کہ شاعری کے حدود وسیع ہیں۔ شاعر اگر چاہے تو کائنات کے حسن، فطرت کے جمال کو اور زندگی کی بلندی و پستی کو نمایاں طور پر اپنے شعر میں ظاہر کر سکتا ہے۔

آفاق ڈاکٹر گربخشانی لکھتا ہے[2]

شاہ لطیف کے عاشقانہ شعر کا مضمون فارسی غزل جیسا ہے لیکن شاہ صاحب نے فارسی غزل کا کوئی تتبع نہیں کیا۔ فارسی غزل میں صبا، پیغام پہنچانے کے لئے ہوتی ہے۔ تو شاہ صاحب کا پیغام پہنچانے والا قمریا زاغ ہے۔ فارسی شاعری میں شراب، ساقی، مطرب وغیرہ کا ذکر ملتا ہے، لیکن شاہ صاحب نے ان باتوں سے بڑی حد تک کنارہ کیا ہے۔

---

[1] شاہ لطیف کے کلام میں تغزل (مقالہ) مقالہ نگار مرحوم پروفیسر احسان احمد بدوی رسالہ نئی زندگی ماہ ستمبر ۱۹۵۶ء

[2] مقدمہ لطیف — مصنف — ڈاکٹر گربخشانی — صفحہ ۱۳۳

شاہ لطیف کے زمانے میں اکثر سندھی زبان میں دوھی، ابیات، وائیاں کا رواج تھا، غزل کا رواج نہ تھا۔ اس لئے آپ نے اپنے دیس کی صنفوں دوھی وائی اور بیت کو اپنے کلام میں انتخاب کیا، جسطرح تغزل کا تعلق اسلوب بیان کے انداز سخن کے موضوع سے ہوتا ہے نہ کہ وزن یا بحر، ردیف یا قافیہ سے۔ اس لئے شاہ بھٹائیؒ کے یہاں تغزل اپنی اصل حیثیت میں موجود ہے چونکہ شاہ بھٹائیؒ صوفی شاعر تھے اس لیئے ایک پاکیزہ شاعر ہونے کے علاوہ، آپ کے کلام میں وطن عزیز کا رنگ سمایا ہوا ہے۔ آپ یہاں فطرت حیا اور سنجیدگی کا عنصر موجود ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنے عشق کا اظہار محبوب کے حسن کی تعریف، اور جدائی کی تکلیف اور بیچینی کو سسئی، مارئی، مومل، سوھنی، لیلیٰ، نوری اور سورٹھ کے زبانی بڑے سوز و درد سے پیش کرتا ہے۔ شاہ لطیفؒ کا یہ انداز بیان نہایت دلکش اور فطری ہے، ایک وفادار کو اپنی وطن سے علیحدہ ہونے کے وقت بھرپور جذبات کو اس طرح پیش کرتا ہے۔

آج پڻ وايون ڪن وڻجارا وڃڻ جون

هلن هارا سپرين سوڻان تان سرهن ،

موڻ جهليندي ڪيترو ايل سامونڊين

پگهه چوٽي جن وڏا پيڙا پاڻ ۾ .

آج وفادار سفر پر جانے کی باتیں کر رہے ہیں جانے والا میرا محبوب میرے زار و قطار رونے سے بھی نہیں رکتا۔

میری ماں سمندر کے اس مسافر کو میں کیسے روکوں۔ انہوں نے تو اپنے جہاز کے اٹھا کر سمندر میں لنگر تک اٹھا دیا ہے۔

ایک اور مثال ہے۔ آج پڻ اکيڙين سجڻ پنهنجا ساريا ،

ڳلن تان ڳوڙهن جون بوندين پن نه ڪن .

سنڌي سڪ پيرين لوڳ ڏٺي نه لهي .

آج بھی میری آنکھوں نے اپنے پیارے کو یاد کیا ہے میرے گالوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں رکتی نہیں۔

اُن کی محبت دوسرے لوگوں کو دیکھنے سے ہرگز کم نہیں ہوتی۔

شاہ بھٹائیؒ سسئی کی زبانی اس کے درد کی صدا کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

سنجي موڻ نه سنڀاليو، صبح ساريم سوڻ ،

آڏي رات آڏمئي، ڏين پلٽيو پوڻ

جتن جي جوڙ ۾ ماءُ ڪيائين ڪوڙيان .

شام کے وقت جینے کوئی خیال نہ کیا۔ اور صبح ہوتے ہی درد دامنگیر ہوا۔ آدھی رات کو مجھے رنج و فراق نے بہت تڑپایا

اے میری ماں! ان شتر سواروں کی محبت نے مجھے مردہ بنا دیا ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں تغزل لطف اور ترنم کی ایسی ہم آہنگی موجود ہے جسکو سننے کے بعد روح کی گہرائیوں میں وہ کلام اتر کر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتا ہے۔ شاہ بھٹائی کے کلام میں سادگی موجود ہے جو ایک مثالی نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں دوسری خوبی جوش ہے۔ جن واقعات یا تاثرات جذبات اور کیفیات کو بیان کیا ہے اُن کو بڑی دلسوزی اور جوش سے پیش کیا ہے۔ پورے واقعات اور جذبات کے اندر زندگی اور اضطراب کی کیفیت کو پیدا کیا ہے اور واقعات کی ادائگی میں کمال مہارت حاصل تھی۔ سسئی فطرت کے ہر پہلو کو دشمن دیکھکر درد سے پکار اٹھتی ہے اس کے ساتھ سسئی کے عزم اور ارادے کی پختگی دیکھئے۔

اُٺ ويري اُونار ويري، ويري تنتم ڏيس،

چوتون ويري واءُ تيو، جنهن لڏا پنهوءَ جا پيس،

پنجون ويري سج تيو، جنهن الهي ڪئي اُڏير،

چهون ويري چپر تيو، جنهن سوان ڪيا ڏسير،

ستون ويري چنڊ تيو، جو ڪڙيون وڏيءَ ڏير،

واهيري جي ويرِ، چلون ڪريان چپيرين،

ساتویں کہتی ہے اونٹ دشمن اور شتربان دشمن تو میرے دیوروں نے نکلے چوتھا دشمن ہوا ہے جس سے میرے پھوٹے ہاؤں کو شایا

پانچواں دشمن سورج بنا جس نے طلوع ہونے میں دیر کی، چھٹا دشمن پہاڑ ہے جس نے اپنے راستے سیدھے نہ کیئے۔

ساتواں دشمن چاند ساتھ رہا وہ دیر تک آسمان میں ٹھہر نہ سکا۔ ام کا وقت ہے سبھی اپنے آشیانوں کی طرف جانے میں مصروف ہیں ہی ہوں جو ہواؤں میں ہوں

شاہ لطیف کے کلام کی شروعات اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد و توصیف سے ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

اوّل الله عليم، اعلي عالم جو ڌڻي،

قادر پنهنجي قدرت سين قائم آهي قديم،

والي واحد وحدهُ، رازق رب رحيم،

سو سارا ۾ سچو ڌڻي، چئي حمد حڪيم،

هوءِ پاڻ ڪريم، جو ڏيئي جوڙ جهان جي،

سب سے اول اللہ تعالیٰ، اعلیٰ علیم اور سارے عالم کا مالک اور رحیم ہے، قادر اپنی قدرت سے قائم اور قدیم ہے

وہ سب کا مالک واحد، رزاق، رب رحم کرنے والا ہے اس سچے رب پاک کی تعریف کر اور حمد و توصیف کرتا رہ

وہ کریم ہے اور وہی پورے جہان کی امیدوں کو برلانے والا ہے۔

شاہ لطیف کے کلام میں ہر روحانی مرض کی دوا موجود ہے۔ اس روحانی صفایابی کے لئے یہ دعائیہ کلمات وماتے ہیں:

تون حبيب تون طبيب، تون درد جي دَوا،

جانب منهنجي جيءَ ۾ آزار جا انواع،

صاحب تاج شفا ميان! مريض ڪي،

میرے رب پاک تو حبیب ہے، تو ہی طبیب ہے، تو ہی میرے درد و تکلیف کی دوا ہے، میرے مولا (محبوب) میرے جسم کے اندر بیماریوں

اور تکلیفوں کے اقسام ہیں، تو ہی شفا دینے والا ہے یا اللہ ان بیماریوں سے۔

شاہ عالمانِ دنیا کے ان چند شعراء میں سے ایک ہیں جنہوں نے شاعری کے ذریعہ ایک لازوال پیغام دیا ہے، جو کسی خاص قوم یا ملک یا ایک مقرر دور کے باشندوں کے لئے نہیں ہے، لیکن آپکا کلام کے لئے ہے۔ مذہب کا ذات کی عظیم ترین حقیقت ہے شاہ صاحب کو اپنا مذہب سب چیزوں سے عزیز تھا، ایمان کی پختگی اور شریعت محمدی صلعم کے سختی سے پیرو تھے اپنے کلام مذہب کو کھول کر سمجھایا ہے، وہ بنی نوع انسان سے حقیقی محبت کا جذبہ رکھتے تھے۔ شاہ صاحب یقیناً ایک اعلیٰ دل بزرگ اور انسان ذات کا دوست تھا۔ بشریت کی نقطہ نگاہ سے اپنے وطن کی خوشحالی اور غریب عوام کے ہمدردی کو اعلیٰ وصف سمجھتے تھے۔ سرمارنگ میں فرماتے ہیں:-

سارنگ سار ليهج ساڻه ڳڙ اچن جو ،

پاڻي پوج پٿن تي ارزان ان ڪريج

وطن وسائيج ته سنگهارن سک ٿئي.

اے بادل اللہ کے واسطے پیاسوں کی حالت پر رحم کرکے اُن کا خیال کرنا برس کر زمینوں میں زیادہ پانی دینا اور راج میں سخا کرنا

میرے وطن پر برسنا، تاکہ سنگھارن (غریب عوام) خوشحال ہو جائیں۔

برسات برسنے کے بعد غریب عوام اور انکے مویشی خوش ہوتے ہیں ان کی خوشحالی کو دیکھکر فرماتے ہیں۔

برونا، تر ونا، وڻيون ترايون

مکڻ پسرين مڙئا، سنگهارون سايون

پاڻيون ۽ پايون پڪي سوڻن پنهنجي.

تیز برسات، بیابان اور تھر (ریگستان) اور نشیبی علاقہ میں برسی، تو غریب عوام بڑا خوش ہوا، اُن کی عورتوں کے ہاتھ مکئی سے بھرے ہوئے ہیں، وہ اب اپنی بھینسوں سے خوب دودھ حاصل کرتے ہیں۔ اب تو خاوندوں اور مالکن اپنے جھونپڑوں میں اچھی لگتی ہیں۔

شاہ عنایتؒ کے رسالے میں ہر جگہ ناصحانہ نقاط نظر آتے ہیں، کہیں انسان کی بے ثباتی زندگی کو یاد دلانے کے لئے غفلت سے بیدار کرتے ہیں فرماتے ہیں،

هڏمن گاڙهو گوٺ، هڏمن مڙهه مقام ۾

واري! سندو ڪوٺ، اڏي اڏيندي ڪيئن ٿو.

اے انسان کبھی تو دولہا بنتا ہے، تو کبھی قبر میں دفن ہوتے ہو

لیکن یہ حویلی کا قلعہ کب تک بناتے رہو گے۔

کہیں بلا (رانی) کا کردار پیش کرتا ہے جو نو لکھا ہیروں کی مالا پر اپنے (راجا) جنبر کو بیچتی ہے۔ اس ایک رات کے بدلے اپنی زندگی کا سکون اور پیار کھو دیتی ہے۔ اس سے ایک باریک نکتہ کا مقصد اخذ کرتا ہے۔ بلا سے مراد ایک سالک بندے کی ہے جسکو ایک بار خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے، لیکن نفس پرستی میں پھنس کر وہ دور ہا کرتا ہے جسکی وجہ سے حق تعالیٰ کی ذات، غیرت جذبہ میں آتی ہے وہ بندہ فراق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے

" اِنَّ سَعْداً لَغَيُوْرٌ وَ اَنَا اَغْيَرُ مِنْ سَعْدٍ وَاللّٰهُ اَغْيَرُ مِنِّيْ وَمِنْ غَيْرِتِهٖ حَرَّمَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ "

بیشک سعدؓ غیرتمند ہے، اور میں سعدؓ سے بھی زیادہ غیرتمند ہوں، لیکن خدا تعالیٰ مجھ سے بھی زیادہ غیرتمند ہے، اپنی غیرت سے ان سب ظاہر و باطن خرابیوں سے روک رکھا ہے۔

حدیث مبارک ۔

باب سوم

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام میں تضمینات

شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں جو کچھ بھی موجود ہے وہ آیات قرآنی کے مطابق ہے۔ آپ نے خدا تعالیٰ اور انکے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ کو اپنایا جسکی بات لاندی ہے۔ آپ کے کلام کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ خوب معلوم ہوگا کہ آپ کے کلام کا مرکز اور مقصد حضور صلعم اور کلام پاک ہے۔ اس روان زندگی کی گمراہ کن حالت سے بچنے اور ہدایت حاصل کرنے کے لئے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو سمجھنے اول عمل کرنے پر زور دیا ہے۔ قرآن پاک کو حکمت عملی اور مخزن رحمت کا منبع سمجھا تھا۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی طرح بنی نوع انسان کو تصوف کی شاہراہ پر لے آنا چاہا۔ جس میں امن و سلامتی، عشق و محبت، دلسوزی اور جذبہ اصلاح کمال پر پہنچتا ہے۔ شاہ لطیفؒ نے انسانی تخلیق کی مراد اپنے خالق سے وابستگی کو لیا ہے جس میں بڑی پختگی موجود ہے۔ بھٹائیؒ نے سرمارفی کی تمثیل میں اس دنیا کی افتادگی کو نہایت عارفانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ اس دقیقت کا بار بار اعادہ کرتا ہے اس صورت بھری حالت کو قرآن پاک کی روشنی میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:-

سوفن وچائم سو سال، منہنجو منصف تیوم ——

دیئ تبت پیوم، جت ملئ نالہ حسن سبئ۔

"اے عمر بادشاہ مجھے تیرے قید میں آکر اپنے حسن کو گنوا دیا، میری صورت گندی ہوگئی ہے، مجھے تو اس گدھ پر جانا ہے، جہاں حسن نے بغیر ملنا معیوب ہے"

قرآن پاک کا اس قبیل میں ارشاد مبارک ہے:-

"لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین" (سورۃ التین ۵-۴)

"ہم نے انسان کی خلقت کو نہایت عمدہ طریقہ سے پیدا کیا، لیکن وہ نہایت پستی میں جا گرا"

شاہ بھٹائیؒ نے بھی قرآن پاک کی اس حقیقت کو پیش کیا۔ دنیا میں وہی شخص کامیاب ہے جسکی عاقبت بالخیر ہو جس کے لئے عمل کی سخت ضرورت ہے اس عمل کی تلقین اور مکافات کے ذکر سے پورا رسالہ بھرپور نظر آتا ہے۔

شاہ بھٹائیؒ نے اپنے کلام میں قرآن پاک، حدیث مبارک اور عربی مقولے تضمین کے طور پر استعمال کئے ہیں اور ان تضمینات کو اپنے عالمانہ و شاعرانہ انداز فکر سے اضافت فرمائی ہے۔ تضمینات جو شاہ بھٹائیؒ کے رسالہ میں موجود ہیں ان آیات، حدیث اور مقولوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ جو مختلف سروں کے داستانوں میں موجود ہیں۔

سر کلیان،

داستان اول —— أنا مولاک وأنت محبوبی۔ ای أتانئین

—— ذکی ذنانئین۔ ہئی سرانون سئیہ چئی۔

میں تیرا رب ہوں اور تو میرا محبوب۔ اس طرح فرمایا دونوں جہانوں کو اپنے نور سے روشن کر کے دیا۔

—— لاخوف علیہم ولاہم یحزنون سچن کونہ سوء —— سورہ یونس رکوع ۱۲ "قرآن پاک"

"انکو نہ تو کوئی خوف ہوگا نہ کوئی انکو غم ہوگا"

داستان تیسرا۔ سوئی راہ مہر کریا، سوئی رضنا۔ سورہ آل عمران رکوع ۳ (قرآن پاک)

وتعز من تشاء وتذل من تشاء ۔ جسکو چاہے عزت والا کرے، جسکو چاہے رسوا کردے

سر کلیان۔ داستان تیسرا بیت ۸۔	آخر والعصر ہو اسم آتائیں ..	= زمانہ شاہد ہے	۔ سورہ والعصر کے آخری حروف قرآن پاک
بیت ۱۵	الستُ بربکم	= میں تیرا رب ہوں	۔ سورۃ الاعراف ۲۲ رکوع قرآن پاک
بیت ۱۲	فاذکرونی اذکرکم ای سرور جان	= یاد کرو مجھے تو میں بھی تجھے یاد کروں۔ بات سمجھو	۔ سورۃ البقرہ رکوع ۱۸ قرآن پاک

سر یمن کلیان :-

داستان پانچواں بیت ۱۸۔	لا مقصود فی الدارین ابن بر آتائیں ..	= سوا رب کے دونوں جہانوں میں اور کوئی مقصود نہیں ہے	= مقالا
داستان ۷، بیت ۲۔	۔ فاذکرونی اذکرکم بن اھا تات	= مجھے یاد کرو تو میں تجھے یاد کروں، دل میں رہتا ہے	= سورۃ البقرہ رکوع ۱۸ قرآن پاک
سر سریراگ "وائی"	واشکروا لی ولا تکفرون عذ یوں عفرانا	= میرا شکر ادا کرو اور کفر نہ کرو۔	= سورۃ البقرہ رکوع ۱۸ قرآن پاک
داستان ۲، بیت ۷۔	= التائب من الذنب ای کت کتا ئون	جو گناہوں سے توبہ کرتا ہے، جیسا کہ اس کو کوئی گناہ نہ کیا	= حدیث (کمن لا ذنب لہ)
بیت ۸۔	= بحرو نعمۃ البشریٰ حر ابن لاء آیو ...	= دنیا و آخرت میں ان کے لئے بشارت ہے۔	= (فی الحیات الدنیا و فی الاخرت) قرآن پاک ۱۰، ۶۴
"وائی"	= کل نفس ذائقۃ الموت	= ہر ایک نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔	سورہ الاعمران رکوع ۱۹۔ قرآن پاک
"وائی"	= یوم یفر المرء من اخیہ	= قیامت کے دن انسان اپنے بھائی سے بھی دور بھاگے گا۔	سورہ ۸۔ ۲۴۔ قرآن پاک

سر سوھنی

داستان ۱۔ بیت ۱۲	۔ واما من خاف مقام ربہ	= جو اپنے رب کے مقام کے لئے خوف کرتا ہے وہی ہے	= سورہ النازعات قرآن پاک
" " "	طالب المولیٰ مذکر ـــــــــ	"طالب الدنیا مونث وطالب العقبیٰ مخنث وطالب المولیٰ مذکر"	حدیث
" ۳۔ بیت ۶	واللہ بکل شیٔ محیط ای آریائی اصحاب ..	= ہر چیز اللہ کے قبضہ میں ہے سب چیزوں کو وہی گھیرے ہے۔	سورہ آل عمران ۱۲ رکوع ۲۔ قرآن پاک
" ۵ بیت ۵۔	من عرف نفسہ فقد عرف ربہ اعوفی اچارا	= جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا	حدیث۔
داستان ۵ بیت ۶ ـــ	خلق آدم علیٰ صورتہ ای وطن منہ ورونہ	خدا تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت کے موافق پیدا کیا۔	
" " " ۹	الفراق اشد من الموت حتی نہ ھوند یاس۔	فراق موت سے بھی زیادہ سخت تر ہے۔	عربی مقولہ
" ۵ ۔ ۱۱۔	ما رایت شیئاً الا ورایت اللہ	میں نے ایسی کوئی چیز دیکھی جس میں اللہ کا جلوہ نہ دیکھا۔	عربی مقولہ
" ۵ ۔ ۱۲	فی انفسکم افلا تبصرون سوھنی کرتی	خدا تعالیٰ کی قدرت کے نشان تیرے اندر ہیں	سورۃ الذاریات رکوع ۱۴ پارہ ۲۷ قرآن پاک
" ۵ ۔ ۱۳	ونحن اقرب الیہ من حبل الورید، تصنو نوھی ساٹ	میں تیرے گردن کے نسوں سے بھی قریب ہوں	سورہ الذاریات رکوع ۲۴۔ ۲۶۔ قرآن پاک
داستان ۵۔ بیت ۱۴	اللہ بکل شیٔ محیط ای آریائی اصحاب	اللہ تعالیٰ ہر چیز میں موجود ہے	آل عمران ۱۲ پارہ ۳ قرآن پاک
" " ۱۵	العشق نار اللہ الموقدۃ کورہ میں کاٹی۔	العشق خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی آگ ہے۔ (العشق سوا)	سورۃ الھمزہ قرآن پاک
" " ۱۷	العشق حجاب بین العاشق والمعشوق	عشق عاشق اور معشوق کے درمیان ایک پردا ہے	عربی مقولہ

سر معذوری

داستان ۱۔ بیت ۹۔	الدنیا جیفۃ وطلابھا کلاب ای صبی جب لاء	= دنیا مردار ہے اس کے طالب کتے ہیں یہ اپنے دل سے لگا۔	حدیث

سر دیسی

داستان ۲۔ بیت ۱۔	تقطعت بینھم ای ارفاق	دور ہے دور ہے وہ بات جس کا تجھے خوف ہے وہ اوطاق سوفی ہو گئی۔	سورۃ المومنون رکوع ۳۰ پارہ ۱۸ قرآن پاک

داستان ۲ بیت ۲	اَلسَّفَرُ قِطْعَةٌ مِنَ النَّارِ ۔ ہماری موت ہمتان	(مسافری) سفر دوزخ کی آگ ہے	عربی مقولہ
" بیت ۳	مَنْ طَلَبَ شَیْئاً وَجَدَّ وَجَدَ ۔ آتو علی شاہ	جو کوئی کسی چیز کی طلب کرتا ہے، وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے	حضرت علیؓ کا قول مبارک
" بیت ۴	مَنْ لَا شَیْخَ لَہٗ فَشَیْخُہُ الشَّیْطَانُ ۔ اوری امدادی	جسکا کوئی مرشد نہیں ہے، اسکا مرشد شیطان ہے۔	صوفی بزرگ کا قول۔
" بیت ۳	لَا شَیْخَ مَنْ تَبِعَ فِی الطَّرِیْقِ اعزبی آ وائی	جو مرشد کے بغیر چلتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو دریا میں ناؤ کے بغیر چلے۔	صوفی بزرگ کا قول
داستان ۳ بیت ۱۴	رَفِیْعُ الدَّرَجَاتِ پرمل پنھون میتری ۔	بڑی شان والا خدا تعالیٰ ہے۔ پنھوں مجھ سے ملا دیں	

سر کوھیاری ۔

داستان ۲ وائی	لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰہِ یری چھو پاٹ	اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید نہ ہو۔ حضور نے خود کہا ہے	سورۃ الزمر رکوع ۴ پارہ ۲۴ قرآن پاک
	اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعاً سچو ای پرماٹ۔	تحقیق اللہ تعالیٰ سب گناہ معاف کرتا ہے یہی بات ہے	سورۃ الزمر رکوع ۴ پارہ ۲۴ قرآن پاک

سر لیلا چنیسر و مومل رانو

	کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ سچی ای صدا	ہر نفس کو موت کی لذت چکھنی ہے یہ سچی صدا ہے	سورۃ آل عمران رکوع ۱۹ قرآن پاک

سر مارئی

داستان ۱ بیت ۱	الست بربکم	کیا میں تیرا رب ہوں	سورۃ الاعراف رکوع ۲۲ قرآن پاک
" "	کن فیکون	ہو جا	سورۃ مومن قرآن پاک
داستان ۱ بیت ۹	وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ وطن آگ وسدماں	میں تیری گردن کی رگوں سے بھی قریب ہوں۔	سورۃ قٓ رکوع ۲ پارہ ۲۶ قرآن پاک
" "	ھاکب جسمی و الفؤاد لدیکم ھوت ھت سدو	میرا جسم یہاں ہے مگر دل آپ کے پاس ہے۔	عربی مقولہ
۱۰	قَیْدُ الْمَاءِ ۔ قَیْدُ الْمَاءِ اَشَدُّ مِنْ قَیْدِ الْحَدِیْدِ	پانی کا قید لوہے کے قید سے سخت ہے	
داستان ۱ بیت ۱۲	جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا ھُوَ کَائِنٌ وھی قلم وتو	جو کچھ لکھنا تھا وہ لکھ کر قلم نے اپنی سیاہی خشک کر دی	حدیث
"	بَیْنَ الْعَیْنَانِ فَ ھَوَا عَدَدَ مَلْ پجان مان پیرت	تیر عشق میں میری دونوں آنکھیں نے خون دیا ہے	شعر
داستان ۱ بیت ۱۴	کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ ۔ ہمچان جمانگیں ھاٹ۔	ہر چیز کو اپنی اصلیت کی طرف لوٹنا ہے	عربی مقولہ
داستان ۵ بیت ۱۱	قُلْ لَنْ یُّصِیْبَنَا اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ ای مصدرت ماسب	کہو لوگو ہمیں مصیبت ہم کو نہ ہوگی سوا اسے جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے	سورہ التوبہ رکوع ۷ پارہ ۱۰ قرآن
داستان ۸ بیت ۱	لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ۔ مارئی کوہ کرھیہ	نہ کسی کو تولد کیا نہ کسی سے پیدا ہوا	سورۃ اخلاص قرآن پاک
" " ۳	لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ پسٹ ناہ پیرس	کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ جیسی نہیں ہے	سورہ شوریٰ رکوع ۲ پارہ ۲۵ قرآن

سر سورٹھ

داستان ۲ بیت ۴	اَنَا اَحْمَدُ لَا مِیْمَ بَیْنَ اَحْمَدَ سائل	میں احمد ہوں بغیر میم کے	
" بیت ۵	اَلْاِنْسَانُ سِرِّیْ وَاَنَا سِرُّہٗ مَنْ اَنَا اِلَّا وَاَنَا	میں انسان کا راز ہوں انسان میرا راز	حدیث

سر کیدارو

داستان ۵ بیت ۷	لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَھَا ہمچاپچھم ما	(سورہ البقرہ) اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی وسعت سے زیادہ سختی نہیں کرتا	سورۃ البقرہ پارہ ۳ قرآن پاک
" "	اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ جلوہ زمیناں	اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کی روشنی (نور) ہے	سورۃ النور رکوع ۵ قرآن پاک
" "	سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مَنْ پ مَنْ گتیاں	ان کی صورت میں سجدے کے نشان ہیں (امام حسینؓ کی پیشانی میں سجدے کا نشان موتی مثل تھا)	سورۃ الفتح رکوع ۴ قرآن پاک

داستان ۶ بیت ۱۰	يجاهدون في سبيل الله كم اهوي حسن	سچا مومن خدا کی راہ میں لڑتا ہے۔ یہی کام کرتے ہیں	سورۃ مائدۃ ۸ پارہ ۶ قرآن
سراسما	ان الله وتر يحب الوتر۔ منی پیاری پاس	تحقیق خدا تعالیٰ ایک ہے اور وحدانت کو پسند کرتا ہے	حدیث۔
داستان ۳ بیت ثانی	عجلوا بالتوبة قبل الموت۔ وہ تون ویر ہ لائی	مرنے سے پہلے توبہ کرنے میں عجلت کرو اس میں دیر نہ کرو	حدیث۔
داستان ۴ بیت ۴۳۔	الذين آمنوا وكانوا يتقون۔ ان پر آیا جی	وہ جنہوں نے ایمان لایا وہ پرہیزگار اور ڈرتا ہے	سورۃ یونس رکوع ۷ قرآن
" والی	ان اولیائی تحت قبائی پنجنجا پاٹ پرائی۔	تحقیق میرے اولیاء اور دوست میری قبا کے نیچے چھپے ہیں	حدیث۔
" والی	لا يعرفهم غيري پرکی عین پسائی۔	میرے سوا اولیاء کو کوئی اور نہیں پہچانتا۔	حدیث۔
سر برودو سندھی			
داستان ۱ بیت ۱۲۔	وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر ان اتانون۔	حق کا حکم اور صبر کی وصیت کرتے رہو اسطرح کہا	سورۃ العصر قرآن پاک
سر رامکلی	فكان قاب قوسين او ادنى۔ تا تانگا ان نمن	حضور صلعم خدا تعالیٰ کے نزدیک دو کمان کے فاصلے جتنا قریب گئے	سورہ نجم رکوع ۴ قرآن
داستان ۵ بیت ۱	كل من عليها فان۔ باقی حسین بچن۔	سب چیز فنا ہوگی کوئی چیز باقی نہیں رہیگی۔	سورۃ الرحمٰن قرآن پاک
" "	الله ولي الذين آمنوا يخرجهم من الظلمات الى النور	اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا دوست ہے انکو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے۔	سورۃ البقرہ پارہ ۳ قرآن پاک
" "	خر موسى صعقا جوگی جنگ جلن	حضرت موسیٰ بیہوش ہو کر گرا جوگی فقیر بھی اس طرح تاب نہ لا سکے۔	سورۃ اعراف پارہ ۹ قرآن پاک
" "	ما زاغ البصر وما طغى امڑیو روش روشن	نہ تو نظر پھری نہ ہی نافرمان ہوئے۔ ایسی (روشن) حالت میں جوگی فقیر بیٹھے ہیں	سورہ نجم رکوع ۱ پارہ ۲۷ قرآن پاک۔
داستان ۹ بیت ۲۲۔	من له المولى فله الكل ای پیرو ترج پند	جسکو اللہ ہے اسکو سب کچھ ہے یہ بات سمجھ لے	حدیث
" "	من عرف الله كل لسانه اعزا ني آمن۔	جسنے خدا تعالیٰ کو پہچانا اسکی زبان بند ہوگئی	حدیث
سر بلاول			
داستان ۱۲۰	رب هب لي امتي چڑھیو جام چٹیں۔	اے میرے رب مجھے اپنی امت دے	حدیث
	فكان قاب قوسين او ادنى۔ ای صبر تین مکان	حضور صلعم اللہ تعالیٰ کے نزدیک دو کمان جتنے فاصلے کے جب قریب تھے یہ مکان سیر ہوا۔	سورۃ نجم رکوع ۱ پارہ ۲۷ قرآن پاک

باب چہارم

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا رسالہ اور اُس کی تدوین

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام کا مجموعہ رسالہ کے نام سے مشہور ہے۔ رسالہ کی معنی پیغام ہے۔ اس پیغام کی مدد سے زندگی کے بہت سے مسائل حل کئے جاتے ہیں اس لیے، رسالہ کو بڑی عزت و توقیر سے دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں اسلام کے بنیادی اصول اور ایمان کے عقائد موجود ہیں جن میں ایمانی جوش و جذبہ، تصوف کے باریک نکات اور انسانیت کے عظیم مقصد کو بیان کیا گیا ہے۔ شاہ بھٹائیؒ کے رسالہ میں جب سے عنوانات پر پیغام یکجا نظر آتے ہیں۔ جن میں حمد باری تعالیٰ، توحید، شرک سے پرہیز، توقیر رسالت، حضور صلعم کی ذات گرامی سے والہانہ محبت، نفس کی پاکی، صبر کی تلقین، جھوٹ فریب سے گریز، سچ و صداقت، محبت، غمگساری، نیک نیتی، سخاوت، ایثار، وطن پرستی وغیرہ۔

شاہ بھٹائیؒ کا کلام اور رسالہ ایک شاہکار ہے جو سندھ کی عالمی اور خوشگوار زبان میں لکھا ہوا ہے۔ جیسے حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی عالمی طرز کی زبان میں موجود ہے۔ شاہ بھٹائی کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ پڑھنے اور سننے والے پر یکساں تاثر پیدا ہوتا ہے۔ رسالہ کی شروعات سرکلیان سے ہے حمد باری تعالیٰ سرکلیان میں گایا جاتا ہے۔ اس طرح سرکلیان حقیقت میں شاہ بھٹائی کے فلسفہ کی ایک کڑی ہے۔ رسالہ میں اکتیس سر یا راگنیاں موجود ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسالہ میں چند ایسے بھی سُر موجود ہیں جن کا موسیقی سے کوئی تعلق نہیں ہے مثلاً سر کھنبھات، سر سشی آری، سر سوہنی، سر عمر ماروی، سر سامونڈی، سر کھاتو، سر کارائل، سر ریت اور سر ڈھر۔ اکثر سروں کے عنوانات سندھ کے لوگ گیتوں سے نسبت رکھتے ہیں مثلاً سر سشی پنھوں، سر سوہنی، سر ماروی، سر مومل رانو، سر للا جنیسر، سر نوری جام تماچی، اور سر سورٹھ۔ یہ سر شاہ لطیفؒ کے مقرر کردہ ہے رسالہ میں جو سب تاریخی کہانیوں کی ہیروئن "HEROINES" موجود ہیں وہ سلامی گدھوی کے "صف بہ کر" اور ولیم شکسپیئر کی ہیروئنس سے بھی زیادہ سنجیدہ اور دلآویز لگتی ہیں۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام کے بارے روایت ہے کہ آپ نے اپنے ہاتھوں سے کچھ بھی نہ لکھا تھا۔ جو بھی کلام کہا ہے وہ فی البدیہہ یا استغراق کی حالت میں مختلف اوقات اور جگہوں پر کہا تھا۔ جسکو آپ کے مریدوں نے سنتے ہی یاد کرلیا یا تحریر کردیتے تھے۔ دوسرے، فقیر وہ کلام گایا کرتے تھے۔ اس طرح شاہ بھٹائی کا کلام جمع کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ شاہ بھٹائیؒ اپنی وفات سے پہلے فقیروں سے تحریر شدہ رسالہ لے کر اڑھیل میں پھینک دیا۔ اس عمل سے آپ کا مقصد یہ تھا، کہ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر لوگ کلام کو سمجھ نہ سکیں اور گمراہ ہو جائیں۔ فقیروں نے یہ دیکھکر بہت روئے اور چلائے۔ اس گریہ زاری کو دیکھکر شاہ بھٹائی کو ان پر رحم آگیا۔ جن مریدوں کو پورا کلام یاد تھا اور لکھا ہوا تھا، بلوا کر کلام کو جمع کرنے کا حکم دیا۔ جب کلام جمع ہو گیا تب اس کو سن کر تصدیق فرمائی۔ اس جمع شدہ رسالہ کو گنج کہتے ہیں۔ ڈاکٹر گربخشانی مقدمہ میں لکھتے ہیں۔ رسالہ کو پانی میں ڈالنے سے فقیروں نے گھبرا کر چلانا اور جیدا شروع کیا۔ شاہ بھٹائیؒ کو ان پر رحم آگیا۔ اور اپنے مریدوں میں سے ایک مریدہ مائی نعمت کو بلوایا جسکو پورا کلام یاد تھا۔ مریدوں کو لکھانے کے لئے کہا۔ جسکو آپ نے سن کر تصدیق دی فقیروں کا جمع کیا ہوا کلام رسالے کی صورت میں تیار ہوا۔ جسکو گنج کہتے ہیں وہ شاہ صاحب کے بڑے خلیفہ سرفقیر کی

رسالہ کی معنی، مقالہ، لبندہ، رسالہ A message mission قاموس الجیب انگلیزی عربی۔ ترتیب الیاس انطون الیاس

Urdu Classical, Hindi & English Dictionary by Jona T. Platts.

رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی مقدمہ مرتب ڈاکٹر موتیچند مولچند گربخشانی — سہ گنج۔ معنی خزانہ

اولاد کے یہاں محفوظ ہے گنج میں شاہ بھٹائیؒ کا کلام غیر مرتب درج ہے۔ شاہ بھٹائی کی وفات کے بعد کلام کو مضمون کے مطابق ترتیب دیکر سلسلے وار سروں کی صورت میں لکھکر رسالہ تیار کیا۔

انگریزوں کے آنے سے پہلے شاہ بھٹائیؒ کا رسالہ مسودوں کی صورت میں موجود تھا۔ آگے چل کر سندھ کے مفکر حضرات نے گنج وغیرہ سے استفادہ کیا یا مریدوں اور فقیروں سے سنے ہوئے کلام کو جمع کیا لیکن شاہ بھٹائیؒ کے کلام کے ساتھ آپ کے معاصر اور مریدوں کا کلام بھی شامل ہوگیا۔ یا تو کاتبوں کی بے احتیاطی کے باعث ان سخنوں میں رد بدل پیدا ہوگئی اور عوام صحیح سخن مل نہ سکا۔ حالانکہ اب تک رسالہ کے تیس سے زیادہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ رسالہ موجود ہو چکے ہیں شاہ لطیفؒ کے کلام کو کامل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاہ کا شہ آنداز میں کلام ضائع ہوا ہے۔ لیکن جو کچھ بچا ہے وہ بھی اتنا ضخیم ہے جس میں پانچ ہزار ابیات اور دو سو کے قریب وائیاں موجود ہیں جو علم موسیقی کے لحاظ سے مختلف سروں میں تقسیم کئے ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ کا رسالہ زندہ جاوید کارنامہ ہے جو توحید کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ وحدت، وجود اور حقیقی جذبات سے سرشار ہے۔ شاہ بھٹائیؒ کے کلام کے متعلق مرحوم ڈاکٹر عارف شاہ جیلانی[1] کا تاثر کتنا عمدہ ہے لکھتے ہیں:-

"جس میں شیخ سعدی شیرازی کے حرفِ مولا ہوں، مولانا جلال الدین رومیؒ کی وحدت الوجود کا نظریہ، مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کی عظمت، عرفی کی گرمجوشی، حافظ شیرازی اور نظیری کی بے داغ تحریر، عمر خیام کی سرخوردہ فلسفی، عطار اور سنائی کا تصوف، میر تقی میرؔ کی نرم دلی، علامہ اقبال کی عظمت، وارث شاہ اور فضل شاہ کا سوز گداز اور خوشحال خانؒ عشق کی سچوف اور بیباک صاف دلی کو مسلم کرتا ہوں، لیکن شاہ بھٹائیؒ کا درد اور سوز اور منزل یہی اور ہے۔ اُنکا کوئی بھی ثانی نہیں ہے۔ وہ سعدی، خوشدل، عرفی مولا، بیدرد، اور سوز گداز سے بھرپور ہے۔ عمگین، ہمدرد، میٹھا، صوفی، وحدت الوجودی، وحدت الشہودی، فلسفی، عالم، رنگ، تارک، ولی اور مرد لعزیز ہے"

شاہ بھٹائیؒ کے سب سروں میں روحانی رموز موجود ہیں، اسکے علاوہ آپ بڑے بڑے سائنٹ، مورخ، جاگرافی داں تھے جیسے آپ کی عظمت کا اندازہ بے اسای ہوتا ہے۔ اور رسالہ شاعری کے اصناف، وحدت الوجود اور وحدت الشہود سے حکمت اور الفاظوں کا گنجینہ ہے سندھ کی ثقافت کا بہترین خاکہ ہے، موسیقی کا خزینہ بھی ہے جس میں ہندوستان کی دیومالا، عربی موسیقی میں کلام موجود ہے۔ سندھ کی خالص موسیقی، مثلاً سرکوہیاری، سرراپو، سرملیگ، سرسوگ، سرلوڈاٹو، خاص طور پر شاہ بھٹائیؒ کے دور کی ترتیب ہیں، جن کی گائکی میں عجیب جادو کا اثر موجود ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کا رسالہ سندھ کے عوام کی تطہیر نفس کا درجہ رکھتا ہے، جس میں نفس کی پاکی، دھیرج، روحانی بیداری، مساوات عملی کے لئے راہ نجات اور شمع حیات کا سرچشمہ ہے۔ یہاں پر رسالہ کی تدوین اور اُن کے مختلف نسخوں کا ذکر کیا جاتا ہے

رسالے کے نسخے

۱۔ گنج۔ گنج شاہ بھٹائیؒ کے کلام کا سب سے قدیم نسخہ ہے جو آپ کی وفات کے چالیس سال بعد ۱۲۷۰ھ میں لکھکر مکمل کیا گیا تھا

۲۔ رسالہ شاہ بھٹائیؒ کے سب سے بڑے جلیل نمر فقیر کے طفل اسماعیل فقیر کی تحریک سے سید عبدالعظیم نامی ایک مرید کے ہاتھوں سے مکمل ہوا

---

[1] ڈاکٹر سید عارف شاہ گیلانی کی ۱۹۶۰ء میں بھٹ شاہ پر شاہ لطیفؒ کی سالگرہ کے موقعہ پر تقریر کا اقتباس ہے

فقیر اسماعیل بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ شاہ لطیفؒ سے انکا روحانی توسل تھا۔ اس نے ۱۲۸۲ھ میں وفات کی اس طرح تمام فقیروں کا متفقہ خیال ہے کہ اس گنج سے زیادہ اور کوئی رسالہ مستند نہیں ہے۔ اس رسالہ کو گنج اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں شاہ لطیفؒ کا پورا کلام بحر ترتیب کے موجود ہے۔ اس گنج سے پہلے شاہ لطیفؒ کا کلام خود بصر فقیر کے دائرہ شریف (اڈیرو لعل) کے سیدوں کے پاس بطور امانت رکھا تھا۔ وہ گنج (رسالہ) وہاں رہ گیا اور اس طرح سندھ کا یہ نایاب خزانہ ضائع ہو گیا اور اسکا آج تک کوئی پتہ نہیں۔ گنج کا نسخہ جو بھٹ شاہ کی درگاہ پر موجود ہے۔ اس کی تدوین سرسٹی ہے

۲۔ بھٹ شاہ کی درگاہ کا نسخہ:۔

یہ رسالہ بھی قدیم ہے جو شاہ لطیفؒ کی درگاہ پر موجود ہے، اور جس فقیر والا نسخہ کہلاتا ہے۔ یہ فقیر شاہ لطیفؒ کے جھڑنا فقیروں میں سے تھا۔ یہ فقیر جمعہ رات کو درگاہ پر شاہ لطیفؒ کے کلام کو سماع کی محفل میں گاتے ہیں۔ یہ رسالہ سماع کے پیشوا غلام شاہ کے پاس ہے جو سجادہ نشین کے بھائی ہیں

۳۔ لنواری شریف والا نسخہ:۔

کہا جاتا ہے کہ یہ نسخہ بھی قدیم ہے جو شاہ لطیفؒ کی وفات کے ۴۵ سال بعد ۱۲۱۰ ہجری مطابق ۱۷۹۶ء میں لکھا گیا تھا۔ اس نسخہ کے ساٹھ سال بعد ایک اور نسخہ لکھا گیا جسکو بھی بھٹ شاہ کا نسخہ کہا گیا۔

۴۔ میر عبدالحسین خان سانگی والا نسخہ:۔

سندھ کے آخری تاجدار تالپوروں حکمران کے پوتے مغربی ایشیا میر عبدالحسین خان سانگی کو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے بڑی عقیدت تھی، اسی جذبہ کے اثر سے آپ کا کلام جمع کیا تھا۔ جو عبدالحسین سانگی والا نسخہ کہلاتا ہے۔ یہ رسالہ ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں لکھا تھا

۵۔ میر نور محمد والا نسخہ:۔

یہ رسالہ مرحوم میر نور محمد خان کے کتب خانہ والا نسخہ ہے۔ یہ رسالہ سندھ کی ایک عورت مائی صاحبہ ملکی بیگم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو نہایت خوش خط، صاف، صحیح اور سنہرے جدولوں سے سجا ہوا ہے۔ نسخہ کے اختتام پر تاریخ ۲۸ ماہ جمادالثانی ۱۲۷۰ھ مطابق ۲۸ مارچ ۱۸۵۴ء لکھا ہوا ہے یہ کسی قدیم نسخہ سے نقل کیا گیا ہے جو نہایت صحیح اور دوسرے شعراء کے کلام سے پاک ہے۔ یہ رسالہ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کی لائبریری میں موجود تھا

۶۔ لطیف والا نسخہ:۔

سر امام بخش خان ٹالپر (متوفی ۱۹۱۴ء) کی فرمائش پر میاں محمد حافظ نامی ایک کاتب نے ۲۹ شعبان ۱۳۲۷ھ مطابق ۲۶ مئی ۱۸۵۴ء میں لکھکر مکمل کیا۔ یہ گنج سے نقل کیا گیا تھا۔ مگر قیاس یہ ہے کہ گنج والے نسخہ سے یہ کسی بھی صورت میں نقل نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ معمولی قسم کا نسخہ ہے سروں کی ترتیب وہی ہے جو بھٹ شاہ والے رسالہ یا احمد احمدی اور میر عبدالحسین خان سانگی والے نسخوں میں ہے۔ اس میں دوسرے شعراء کا کلام بھی شامل ہے

۷۔ سیہون شریف والا نسخہ

اس رسالہ میں شاہ لطیفؒ کا منتخب کلام اور اختصار دیا ہوا ہے، اور بہت سے سرعائے ہیں اور اشعار بھی صحیح نہیں ہیں

۸۔ میر علی مراد خان تالپر والا نسخہ:۔

مرحوم عثمان علی انصاری اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت میر علی مراد خان تالپر نے اپنی عقیدت کے لئے نہایت خوش خط اور سنہری جدولوں کی کناری سے سجا ہوا رسالہ لکھوایا تھا، لیکن اس نسخہ میں کلام اس طرح لکھا ہوا ہے جیسے کسی بزرگ یاد والے کے بتائے ہوئے ہو۔ رسالہ کی ترتیب بھی دوسرے رسالوں کی طرح ہے۔ اور شاہ لطیفؒ کے مریدوں کا کلام کثیر تعداد میں درج کیا ہوا ہے۔

۹. مخدوم ملا کا نسخہ :-

یہ رسالہ ملا میں موجود ہے جو بہت قدیم ہے لکھا گیا ہے، اس رسالہ کی نقل عبدالشاہ ثقافتی مرکز میں موجود ہے یہ رسالہ بھی دوسرے شعراء کے کلام سے پاک نہیں ہے، جس میں اکثر مریدوں اور معاصر شعراء کا کلام بھی درج کیا ہوا ہے۔

۱۰. مرحوم عثمان علی انصاری والا نسخہ :-

مرحوم عثمان علی انصاری نے مختلف سحروں کو اپنے سامنے رکھکر ایک رسالہ تیار کیا تھا، کچھ اسمات سندھ کے مختلف رسالوں میں شائع کرائے تھے یہ رسالہ مسودے کی صورت میں سندھی ادبی بورڈ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

۱۱. حافظ احمد جت والا رسالہ :-

کچھ عرصہ کے ایک شخص حافظ احمد جت قریباً کراچی میں اکر مقیم ہوئے، جن کے پاس شاہ لطیفؒ کے رسالہ کا نسخہ تھا، جسے وہ اپنے ساتھ کچھ ہندوستان سے لایا تھا، جو غالباً گنج کا ہی نقل ہے۔ اُس نسخہ کے بارے ایک عجیب روایت نقل کرتا ہے :

"ہماری پارٹی کے رہنما میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ خود کچھ تشریف لائے تھے، ارشاد سے شاہ بھٹائیؒ کو بخار ہو گیا، میں دن بخار کی حالت میں گاؤں کی مسجد میں قیام کیا، جب طبیعت اعتدال پر آئی تو وہاں سے تشریف لے گئے، دوسرے دن صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ شاہ بھٹائیؒ کی ٹوپی جس کپڑے میں لپٹی ہوئی رکھی تھی جب اسکو کھول کر دیکھا گیا تو اس میں ایک چمڑے کی لکھی ہوئی کتاب موجود ہے، جو خود بھٹائیؒ کا رسالہ تھا"

حافظ احمد جت ڈاکٹر علامہ داؤد پوتہ مرحوم کی خدمت میں ہی حاضر ہوا تھا، ڈاکٹر مرحوم نے اسے اصلی سحر لانے کے لئے ہندوستان جانے کا فرمان پاسپورٹ جاری کر دیا تھا، لیکن احمد جت ہندوستان سے واپس نہ آیا، اس طرح یہ نسخہ ہندوستان میں رہ گیا۔

۱۲. علامہ مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ والا رسالہ :-

سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے مستند رسالہ کو مرتب کرنے کا کام علامہ صاحب کو دیا گیا تھا، جسکی تکمیل کے لئے علامہ نے سندھ کے مختلف حصوں سے شاہ بھٹائیؒ کے رسالوں کے مسودے حاصل کئے گئے اور خود شاہ کی درگاہ پر کافی عرصہ رہکر گنج اور مقبروں سے صحیح لفظ حاصل کرنے رسالہ کا نسخہ تیار کر رہے تھے اس کام پر آٹھ سال مسلسل کام کرتے رہے جب یہ کام آخری مرحلے میں آ پہنچا تو ناگہانی وفات ہوئی یہ کام رہ گیا اس طرح ایک بے نظیر تحفہ سے سندھ محروم رہ گئی بورڈ نے یہ کام سندھ کے ایک اور ادیب مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کے سپرد کیا جو ۱۹۵۸ء سے لے کر آج تک مکمل نہ ہو سکا۔

مطبوعہ رسالہ

۱۳. آرنیسٹ ٹرمپ والا رسالہ ۱۸۶۶ء :-

جرمن فلاسفر ارنیسٹ ٹرمپ، جس نے شاہ بھٹائیؒ کے کلام کو سب سے پہلے شایع کرا کے کلام کو تاریکی سے روشنی میں لائے وہ بھی جرمنی کے ملک میں لندن سے سندھی رسم الخط میں شایع کرایا۔ اس رسالہ کے متعلق عالموں کی رائے ہے ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے لکھتا ہے[1]

سب سے پہلی ادبی کوشش جس سے کلام کو مستقل حاصل، جو آنے والی نسل کے لئے شاہ بھٹائیؒ پر تحقیقی کام کرنے

---

[1] Shah Abdul Latif of Bhit. by Dr. H. T. Sorley.

کا راستہ ہموار کیا وہ تھے باہر کے مشنری تبلیغ کرنے والے پادری ارنیسٹ ٹرمپ۔ وہ اس زمانے میں سندھ میں رہتے تھے۔ جس زمانے میں سر بارٹل فریئر SIR BARTL FRERE کمشنر سندھ تھے۔"

ڈاکٹر سورلے کا خراج ادب کی دنیا میں ایک گونج مثل ہے کیونکہ وہ خود بھی ایک بڑے سندھی ادب کے جاننے والے تھے۔

ڈاکٹر علامہ داؤد پوتہ مرحوم اپنے تاثر بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ ایک صدی تک شاہ بھٹائیؒ کے شاہکار کو سطر انداز کیا گیا ہے آرنیسٹ ٹرمپ کو مرحبا کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ پہلا شخص ہے جس نے اس بات کا خیال کیا اور سندھ کے ادیبوں کو ایسا کوئی بھی خیال پیدا نہ ہوا۔

ڈاکٹر گربخشانی نے لکھا ہے:۔

"آرنیسٹ ٹرمپ شاہ لطیفؒ کے رسالہ کا پہلا تابع کرنے والا شخص ہے۔ جنہوں نے ظلام کو تاریکی سے روشنی میں لائے"

آرنیسٹ ٹرمپ ۱۳ مارچ ۱۸۲۸ء کو السیلڈ جنگیم کے شمال جرمنی میں پیدا ہوئے۔ انکے باپ کا نام جارج تامس ٹرمپ تھا جو اپنے گاؤں کا بھتیری فرشی (carpenter) تھے۔ انکی والدہ کا نام شیرلی مادر تھا جس گھر میں وہ پیدا ہوئے تھے۔ وہ بڑھ آگ میں جل کر تباہ ہوا تھا۔ یہ آگ ۱۸۰۹ء میں انکے گاؤں کو لگی تھی۔ ٹرمپ کا خاندان بہت غریب تھا۔ لیکن یہ بچہ فطرتی طور پر بڑا ذہین تھا۔ اسکول کی تعلیم کے دوران انہوں نے بہت سی مختلف ملکوں کی زبانیں سیکھی جن میں لیٹن گریک۔ فرنچ رہا ہیں تعلیم کے دوران لبرل تحریک میں شامل ہوا۔ جنگ کے بعد قید ہو کر جیل میں گیا۔ رہائی کے بعد انہوں نے اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کیا۔ جسکے بعد لنڈن چلا گیا جہاں انہوں نے Oriental Language سیکھی۔ اس دوران ایسٹ انڈیا ہاؤس میں اسسٹنٹ لیکچرر مقرر ہوئے۔ جہاں ہندوستان کی جدید زبانیں سیکھیں ان کی دھاک کو دیکھکر چرچ مشن سوسائٹی کی طرف سے ہی مشنری کی تبلیغ کے لئے بھیجا۔ اور انہوں نے لغت کی تیاری کی۔ برٹش گورنمنٹ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی لکھیگا اسکی اشاعت وہ کرے گی۔ ٹرمپ سیدھے سے کراچی پہنچ گئے۔ سندھ میں آکر سندھی زبان سیکھی اور سندھی زبان میں مہارت حاصل کی جسکی وجہ سے۔ بمبئی کے گورنر نے انہیں سندھ میں چرچ کے پریسٹ مقرر کئے۔ کراچی کی آب و ہوا نہ راس آئی اور بیمار ہو گئے۔ علاج کے لئے فلسطین بھیجے گئے جہاں عربی زبان سیکھی ۱۸۵۷ء میں شادی کرکے پھر کراچی آئے۔ کراچی میں انہیں بیٹا پیدا ہوا لیکن بیوی کا انتقال ہوا۔ اس پریشانی کی حالت میں سٹزرلینڈ گئے جہاں بچے کی خاطر دوسری شادی کرلی واپس ہندوستان میں آئے۔ اور پشاور بھیجے گئے۔

سندھ میں رہکر ٹرمپ نے ایک سندھی کتاب لکھی جو چرچ مشن نے لنڈن سے ۱۸۵۸ء میں شایع کی۔ شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کا کلام جمع کرنا شروع کیا۔ ۱۸۶۳ء میں شاہ بھٹائیؒ کے رسالے کی مشہور سورٹھ کی کہانی کو جرمنی زبان میں لکھکر شایع کرادی جو بڑی دلچسپ کتاب ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ سندھی گرامر ۱۸۷۲ء لنڈن سے شایع کرائی۔

ٹرمپ نے شاہ بھٹائیؒ کے رسالے کی تمہید میں لکھا ہے کہ انہیں کلام کے بہترین مسودے ملے۔ ڈاکٹر گربخشانی نے اپنے رسالے کی تمہید (مقدمہ) میں ٹرمپ کے متعلق لکھا ہے:۔

افسوس کہ جو مسودے ٹرمپ کو ملے تھے۔ ان کا مقابلہ کرنے کا کام خود کرتے۔ جسے انہوں نے کسی دیہی آدمی سے کرائے

ERNST TRUMPP (A brief account of his work and Life) by Prof. Annemarie Schimel.

۲۔ مقدمہ رسالہ شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ مرتب ڈاکٹر گربخشانی۔

جس نے ان نسخوں کی کوئی قدر نہ کی جس وجہ سے "رسالہ" کی صحت پر اثر پڑا اور بہت سی غلطیاں رہ گئیں، انہوں نے جو تلفظ سمجھ میں نہ آئے وہ اپنی طرف سے لکھے، دوسری بات یہ تھی کہ اکثر تلفظ ۱۸۶۷ء والے، ان نسخوں کو دیکھکر کہا جاتا ہے کہ یہ رسالہ مکمل نہیں ہے لیکن دوسرے رسالوں سے بہتر ہے۔ خاص طور پر وائیوں کو صحیح درج کیا ہے۔ رسالے میں جو ٹائپ استعمال کی ہوئی ہے، وہ ٹرمپ نے رسالہ کے لئے تیار کرائی تھی، سرکار کی مالی امداد کے باوجود رسالہ نہ بہت سے ساتھ (سر) چھپوا نہ سکے۔ جن میں خاص طور پر سر مارٹن۔ ان کی ایجاد کردہ ٹائپ آج کل استعمال میں نہیں آتی، یہ پہلا شخص تھا، جنہوں نے شاہ لطیفؒ کے کلام کو شایع کرایا ان کی محنت تحسین کے لائق ہے، سندھ کے لوگ اُن کے اس احسان کو کبھی فراموش کر نہیں سکتے۔

ارنیسٹ ٹرمپ اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں :-

تحریر شدہ کتابیں سندھ میں نایاب ہیں، اس لئے میں نے جو کچھ مواد جمع کیا ہے وہ صرف گانے والے اور عام فقیروں سے سُنے ہوئے ابیات ہیں، ظاہر ہے اُن کی صحت اور تلفظ میں بڑا اختلاف ہو گا" جن آنکھوں نے ہزاروں مسودہ پڑھے، اور لاکھوں صفحات دیکھے اور لکھے وہ اپنی بینائی کھو بیٹھیں، ٹرمپ نے دیکھا کہ وہ اب لکھ نہیں سکتا نہ پڑھ سکتا ہے، تو اُسے بڑا صدمہ ہوا۔ وہ نہ صرف کمزور ہو گیا، بلکہ سخت بیمار پڑ گیا، زندگی کی آخری سال اپنتال کی تاریکی میں گذاری آخر وہ وقت آپہنچا، ایسٹر کے اتوار کو ۵ اپریل ۱۸۸۵ء میں وفات کی۔

۱۴۔ قاضی محمد ابراہیم والا رسالہ ۱۸۶۷ء

قاضی محمد ابراہیم کی کوشش سے یہ رسالہ ترتیب ہوا اور بمبئی سے لتھوگرافی سے شایع کرایا اس لئے اس رسالہ کو بمبئی والا رسالہ بھی کہتے ہیں، بعد میں خان بہادر محمد صدیق میمن نے موجودہ رسم الخط میں صاف کرکے شایع کرایا اسی رسالہ کو شکارپور سندھ کے مشہور کتب فروش دیوان پوکرداس نے لتھوگرافی میں شایع کیا تھا۔ اس رسالہ میں چھتیس سر موجود ہیں اور تیس حرفی کے اشعار بھی موجود ہیں۔ جو غالباً شاہ لطیفؒ کی نہیں ہے قاضی صاحب کے ارنیسٹ ٹرمپ کے رسالہ سے ایک سال بعد ۱۸۶۸ء میں شایع کیا۔ اس رسالہ کی رسم الخط قدیم ہے لیکن ٹرمپ کی رسم الخط سے ملتی ہے اس رسالے کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کلام جو ٹرمپ کے رسالہ میں موجود نہیں ہے وہ اس رسالہ میں موجود ہے مرزا قلیچ بیگ نے اسے اصلی رسالے سے نقل ہے لیکن یہ بات درست نہیں کہ ڈاکٹر گربخشانی نے بھی اس بات کی طرف اشارہ دیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رسالہ اصلی رسالہ کا نقل ہے لیکن سندھ کے دوسرے شعراء کا کلام بھی شامل کرکے شاہ لطیفؒ سے منسوب کیا ہے

۱۵۔ کریمی رسالہ :-

اس رسالہ کو جمع کرنے والے نے متن کے سوا اور کچھ بھی نہیں لکھا تھا، جب مرحوم محمد صدیق میمن نے اسے شایع کرایا تو اس میں لکھتے ہیں جس وقت یہ رسالہ ترتیب دے رہا تھا، اس وقت میوں محمد حالائی اور اخوند عبدالرحیم زندہ تھے اُن کے پاس وہی قدیم نسخہ موجود تھے، جن کے مشورہ اور بھٹ شاہ کے فقیروں سے کلام صحت اور تلفظ دریافت کرکے مسودہ تیار کیا گیا کبلو بمبئی بھیجا گیا

۱۔ رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی مرتب ارنیسٹ ٹرمپ۔ ۲۔ بمبئی رسالہ مطبوعہ دیوان پوکرداس، کتب فروش شکارپور

۱۶ محکمہ تعلیم والا رسالہ ۱۹۰۰ء

محکمہ تعلیم سندھ سرکار کے ترجمان مسٹر تارا چند شوقیرام آڈوانی نے شاہ کے رسالہ کا متن تیار کیا اور سندھ سرکار نے ۱۹۰۰ء کو موجودہ رسم الخط میں شایع کرایا۔ اس کی تصحیح میں انہوں نے لکھا ہے:۔

"جب جان فلش صاحب سندھ کے ایڈوکیشنل انسپیکٹر تھے تب انہوں نے بھٹ شاہ والے نسخہ کو نقل کرا کے ایک نسخہ تیار کرایا۔ جو راؤ بہادر دیوان کوڑومل کو تبصرے کے لئے بھیجا جو اس وقت حیدرآباد میں نارمل ٹیچرس ٹریننگ کالج کے پرنسپال اور ٹنسلیٹر تھے۔ اس نے بھٹی اور ٹرمب کے رسالوں سے تقابل کر کے ایک نسخہ تیار کیا۔ دیوان کوڑومل کی وفات کے بعد، اس کے جانشین راؤ بہادر تارا چند شوقیرام نے رسالہ کا باقی کام مکمل کیا۔"

رسالہ شایع تو ہوا لیکن اس میں بھی بہت سی غلطیاں رہ گئیں

۱۷ مرزا قلیچ بیگ والا رسالہ:۔

سندھ کے بے مثل ادیب و شاعر، مورخ شمس العلماء مرحوم مرزا قلیچ بیگ نے شاہ لطیفؒ کے کلام کو ۱۹۱۵ء میں ترتیب دیا اور اپنے سامنے وہ سب مطبوعہ رسالوں کو رکھا اور شاہ لطیفؒ کا پورا کلام جمع کیا۔ ان ترتیب شدہ رسالوں سے استفادہ کیا۔ اس لئے وہ بنیادی غلطی مرزا صاحب کے رسالہ میں بھی رہ گئی اور دوسرے شعراء کا کلام بھی رطب و یابس جمع ہو گیا۔ جس سے شاہ لطیفؒ کا کلام دوسرے قدیم شعراء کے کلام سے پاک نہ ہو سکا۔ مرزا صاحب اس رسالے کی ترتیب میں تیرہ سال محنت کی۔ مرزا صاحب خود اپنے مرتب کیئے ہوئے رسالہ سے مطمئن نہ تھے، جیسا ذکر رسالے شروع میں کیا ہے۔

"صحیح اور سچے نسخہ کی ابھی مزید ضرورت ہے کسی صاحب علم کو دل میں خیال پیدا ہوگا جو صحیح نسخہ تیار کریگا۔"

سوانح:۔ مرزا قلیچ بیگ سندھ کے غیر فانی ادیب تھے۔ اس بے مثل ادیب نے اپنی زندگی پچاس سال ادب کی خدمت میں صرف کیئے اور اپنی تصنیفات کا سرمایہ کثیر تعداد چھوڑا اس عظیم مفکر نے ادب کی ایسی کوئی صنف نہ چھوڑی جس پر قلم نہ اٹھایا۔ دوسری زبان سے بہترین کتابوں کا ترجمہ کر کے اپنی سندھی زبان کو مالا مال کیا۔ مرزا صاحب کی ذات گرامی جدید سندھی ادب کی بنیادی حیثیت کی حامل تھی، جسکو زمانے کی گردش کبھی مٹا نہیں سکتی۔

مرزا قلیچ بیگ سندھ کے غیر فانی حیدرآباد کے نزدیک ایک گاؤں ٹنڈو ٹھوڑو میں ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں تولد ہوئے۔ مرزا صاحب کو بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کا اور شعر سے شوق تھا۔ والد کا نام مرزا فریدون بیگ تھا، جو اصلی گرجستان رشیا کے ایک شہر سکز میں پیدا ہوئے۔ ایران کے بادشاہ کے یہاں اپنے خاندان کے ساتھ جنگی قیدی کی حیثیت سے گرفتار ہوئے۔ والد اور بڑے بھائی قید سے فرار ہو گئے۔ باقی یہ بچہ اپنی والدہ کے ساتھ قید میں رہ گیا والدہ بھی قید میں مر گئی اس طرح یہ بچہ دشمن کے رحم و کرم پر تنہا رہ گئے۔ میر گرمعلی خان کے ایک وکیل نے، میر موصوف کے لیئے اس بچہ کو ایران کے بادشاہ سے لیا۔ کیونکہ میر صاحب کو کوئی اولاد نہ تھی۔ سندھ میں آکر جوان ہوئے۔ شادی کی مرزا فریدون بیگ کو سات بیٹے ہوئے۔ جن میں مرزا قلیچ بیگ تیسرے بیٹے تھے۔ مرزا صاحب کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں ہوئی۔ ثانوی تعلیم حیدرآباد میں مکمل کرنے کے بعد منشی کی ایگزامنیشن کالج میں داخل ہوئے وہاں مرزا حیرت جیسے پروفیسر استاد ملے۔ والدہ کے انتقال کی وجہ سے تعلیم آدھوری چھوڑ کر سندھ میں آکر محکمہ مال میں ہیڈمنشی کی نوکری سے زندگی شروع کی سندھ کے مختلف جگہوں پر بڑی دیانتداری سے نوکری کرتے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ آپ کے ادبی خدمات کو دیکھکر انگریز سرکار کی طرف سے شمس العلماء کا لقب ملا اس طرح یہ سندھ کی عظیم شخصیت ۳ جولائی ۱۹۲۶ء میں وفات کی۔

مرزا صاحب نے سندھی، فارسی، انگریزی زبانوں میں کثیر تعداد تصانیف چھوڑیں۔ ان کے علاوہ شاہ لطیفؒ کا رسالہ جسکا ذکر اوپر آچکا ہے۔ "احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی" سندھی اور انگریزی میں۔ لغات الطیفی ۱۹۰۵ء۔ لطیفی لائف ۱۹۱۳ء اور سرسوھنی کی شرح بھی لکھی تھی

۱۸۔ ڈاکٹر گربخشانی والا رسالہ :-

جس وقت ڈاکٹر گربخشانی، شاہ بھٹائی کے رسالہ کو مرتب کر رہے تھے، اس وقت قریب قریب سب مطبوعہ رسالے موجود تھے۔ شاہ کریم اور حق شاہ والا قدیم مسودہ بھی اپنے سامنے رکھے اور حتی المقدور کوشش کرکے صحیح متن تیار کیا۔ یہ رسالہ اپنے دوستوں اور شاگردوں کی مدد سے ۱۹۳۳ء میں پہلا حصہ پریس میں دیا۔ اس حصہ میں رسالہ کے متن سے پہلے ڈاکٹر موصوف نے ایک عالمانہ مقدمہ لکھا ہے، جو اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جس میں شاہ صاحب کی سوانح کے علاوہ مختلف ابواب میں شاہ کی صورت اور سیرت، شاہ کا مذہب، ویدانت اور تصوف، شاہ کی شاعری، شعر کا مضمون اور عبارت شاہ صاحب کی سندھی، شاہ کے کلام میں نحوی بناوٹیں، اور رسالہ کی تصنیف و تالیف کے ابواب موجود ہیں۔ جن کے بعد کلام کی تشریح دی ہوئی ہے جسے دیکھکر اس فاضل شخص کی علمی عظمت کا داد دی جاتی ہے۔ چونکہ مرتب نے رسالہ سے بہت سے ابیات غیر کا کلام سمجھکر خارج کردیئے تھے، اس لیئے سندھ کے ادیبوں نے رسالے پر کڑی تنقید کی۔ ایک سال بعد ۱۹ ستمبر ۱۹۳۴ء میں دوسرا حصہ تیار کرکے شایع کیا۔ جس میں ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے،

"پیر سید غلام حیدر شاہ سجادہ درگاہ شاہ عبدالکریم بلڑی کی مہربانی اور کوشش سے حر حاشیئن میں معاصر حسن خان سانگی والا قدیم رسالہ حاصل ہوا جس سے بڑی مدد ملی اور سب ابیات ان سے صحیح کرکے یہ حصہ تیار کیا۔"

اس نے شایع ہونے کے بعد ڈاکٹر گربخشانی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے لنڈن چلے گئے جہاں برٹش میوزیم کے مشہور قلمی مسودہ کو دیکھا، جس کے مصنف تلخط اپنے تیسرے جلد میں دیئے۔ تیسرا حصہ علی الترتیب ۱۹۳۳ شایع کیا۔

اس میں سی شف فی لسحاشئن میں ہے کہ "شاہ کا رسالہ" ڈاکٹر گربخشانی کا ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مرتب کی محققانہ شان اور ادبی بصیرت نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر خود ہی عالم تھے اور اُن کام میں مدد کرنے والے بھی عالم تھے، تذکرہ لطفی کے مصنف نے اپنے تاثر دیئے ہیں

جس طرح خود ڈاکٹر گربخشانی سندھی ادب کے عالم تھے، اس طرح ان کے ہم کار بھی ملے تھے۔ جن میں ڈاکٹر داؤد پوتہ کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے، جنکا خود ڈاکٹر موصوف نے رسالہ کے پیش لفظ میں ذکر کیا ہے لکھتا ہے۔ "میں اپنے عزیز شاگرد اور اب ہم پیشہ پروفیسر جمالدین داؤد پوتہ۔ ایم۔ اے کا دل کی گہرائیوں سے شکر گذار ہوں جن نے اس حصہ کے تیار کرنے، شرح لکھنے اور پروف ریڈنگ کرنے میں میری دل و جان سے شراکت کی، اگر یہ صاحب ایسی ہمدردی نہ دکھاتا تو شاید یہ کام مکمل نہ ہوتا"

مندرجہ بالا عبارت کا مفہوم بلکل صاف ہے کہ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کا ڈاکٹر گربخشانی کے اس کام میں کتنا حصہ تھا۔ اس زمانے میں مسٹر جیٹھمل طراحانی ایک رسالہ "روح ریحان" کے نام سے حیدرآباد سے شایع کرتے تھے، جس میں "بھٹائی" اور ایک تصوف پر مقالہ شایع کرتے تھے۔ جس کے ایک شمارہ میں مسند کے ایک ہندو ادیب لبلارام وطن مل لعلوانی کے ایک مقالہ کا اقتباس جیٹھمل نے اپنے اداریہ میں دیا تھا۔ جس سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گربخشانی نے شاہ بھٹائی کے رسالہ میں جو محنت کی ہے اس میں نوجوان مسلمان داؤد پوتہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ مسٹر لبلارام کو شاہ بھٹائی کے کلام اور انکی بزرگی سے بیحد عقیدت تھی۔ انہوں شاہ بھٹائی کے کلام اور شخصیت پر انگریزی زبان میں ایک مستقل مضمون لکھی ہے۔ جس سے ڈاکٹر موصوف نے بھی استفادہ کیا۔ مخدومی پروفیسر لطف اللہ بدوی نے اپنے ایک مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں اور ان خطوط کا ذکر کرتے ہیں جو مرحوم علامہ ڈاکٹر داؤد پوتہ نے مرحوم بدوی صاحب کو دکھائے تھے، وہ خطوط ڈاکٹر گربخشانی کے درمیانہ ہوتے تھے۔ یہاں ان کے اقتباس دیئے جاتے ہیں۔

تذکرہ لطفی ۔ مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی جلد اول صفحہ ۳۲۹ ؎ رسالہ ڈاکٹر گربخشانی پیش لفظ جلد اول

رسالہ عام راہ سندھ دسمبر ۱۹۵۰ء مقالہ ڈاکٹر داؤد پوتہ کا رسالہ میں حصہ۔ مقالہ نگار مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی۔

پہلا مکتوب ۔ شاہ کے رسالہ کی ایک کاپی حاصل ہوئی، بڑی مسرت ہوئی۔ اپنے باوجود مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ سرورق پر آپ کے نام کے ساتھ اپنا نام دیکھکر، جیسا کہ آپ سے وعدہ کیا تھا، دلی کوفت ہوئی۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے لیکن آپ کو اس بات کا خیال کرنا چاہئے تھا۔ جو مختصر قبولیت آپ نے دی تھی وہ غیر مکمل اور معیوب ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ میرا ذکر ہی نہ آتا۔ یہ میرے چھ سال کی محنت کا صلا ہے"

دوسرا مکتوب :-

میرا نام آپ کے نام سے منسلک تھا۔ اس کے لئے میرا معذرت خواہ حال ہے۔ جس کے لئے میری کوئی بھی صدائی احتجاج نہیں ہے۔ غلام دستگیر پاندھیانی، جسکا کتاب کے ۲۸۳ صفحات تک کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس کے لئے آپ نے لکھا ہے۔ اس نسخہ کو انہوں نے تیار کیا ہے یہ اچھا نہیں ہے۔ ہم دونوں نے ۲۸۳ صفحات تک ملکر کام کیا۔ یہ دونوں لکھنے والوں کی طرز تحریر کا تعرف ہے۔ سوائے کسی اہم چیزوں کے جو کہ آپ نے حصہ اول کے لئے لکھنے باقی کام ہم دونوں نے ایک جیسا کیا ہے جیسے اپنی طرف سے فراغت میں جو وقت کی قربانی دی ہے وہ اگر اپنی صحت پر صرف کرتا تو بہتر تھا۔ یہ دیکھکر کہ غلام دستگیر میری محنت کے بھی وارث بنے۔ تو دل کو بڑا صدمہ ہوا۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے برٹش میوزیم میں رسالہ کے لئے مسلسل کام کیا۔ اس کام کے لئے میں واپس آنے کا پروگرام ملتوی کیا تھا۔ ایک مغربی عالم ضرور اس امداد کا بغیر کسی طلب کے اعتراف کرتا۔ جو کچھ ہوئے گذرا میں ان کے ذکر سے اب میں بہت دور ہوں اور آگے اس بات کا کوئی ذکر نہ کیا جائے گا۔ کیوں کہ جو کچھ ہوئے گذرا اس سے ہمارے بھتیری تعلقات میں کوئی خلش آنے نہ دوں گا۔

ان دونوں مکتوب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گرفتانی کی رسالہ کی تالیف میں کتنی محنت ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ حقیقت دیر سے ظاہر ہوئی جو پہلے ظاہر ہونی چاہئے تھی۔ لیکن علمی تحقیق معیتہ دیر سے ظاہر ہوتی ہے جب کوئی مصنف اطمینان حاصل کرتا ہے۔ بقول مرزا ولیج بیگ، کوئی صاحب علم پیدا ہو جس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جو صحیح نسخہ تیار کرے۔ ڈاکٹر گرفتانی نے محنت کی اور رسالہ کی ترتیب کا گران بار اپنے سر پر مولیا۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ رسالہ مکمل نہ ہو سکا اور چوتھی جلد کے دیکھے رسالہ سے تقریباً ایک ہزار ابیات نکالے گئے۔ جس کی ان کو کوئی سند نہ تھی۔ بہرحال یہ رسالہ بھتری سمجھا گیا ہے لیکن رسالہ کے شایع ہونے کے بعد سندھ کے ادیبوں نے تنقید کی۔ جن میں دیوان بھروسل بھرجھ اڈوانی نے "سندھو رسالہ" میں آٹھ قسطوں میں تنقید کی۔

شاہ بھٹائی کے رسالہ کی ترتیب سوائے گنج نے اکثر ایک جیسی نظر آتی ہے۔ اکثر مردگوں نے رسالہ پر تحقیق کی ہے لیکن آج تک کوئی جامع صورت میں سمجھ پیش نہیں ہوا۔ اعتراض کرنے سے کام نہیں چلتا۔ مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی نے صحیح نقطہ بیان کیا ہے:۔

"دنیا کے عظیم شعراء کے کلام پر آج تک یہ اعتراض عائد نہیں ہوا کہ ان کے کلام سے صحیح سمجھ کی ضرورت ہے۔ ایک غیر فانی کام کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے وجود کا خود ثبوت ہوتا ہے اور اپنے غیر فانی ہونے کا ثبوت دیتا ہے جو کہ ابدی صحت کے لئے دلیل ہوتا ہے"

سوانح = ڈاکٹر ہوتچند مولچند گرفتانی ۸ مارچ ۱۸۸۴ء کو صدر آباد سندھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے متعلق کوئی احوال نہیں ملتا۔

۱؎ تنقید و تنقید نگاری ۔ مصنف مرحوم پروفیسر احسان احمد بدوی

۲؎ رسالہ سندھو یہ رسالہ سندھی زبان میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسکا مدیر لوچند راجپال تھا جو ۱۹ء سے ۱۹۲۷ء تک جاری رہا اور شکارپور میاں جوگوٹ لگاؤ (؟) سے شایع ہوتا۔ اس رسالہ کو سندھی ادب کا انسیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۰۰ء میں ڈی۔ جے۔ سندھ کالج میں داخل ہوئے ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے پاس کرنے بمبئی کی ولسن کالج سے ایم۔ اے فارسی اور انگریزی میں پاس کی اور وہیں فارسی اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے ۱۹۰۸ء کو سندھ میں آکر ڈی۔ جے سندھ کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ سال ۱۹۲۸ء میں لنڈن یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے داخل ہوئے۔ اس ڈگری کے لئے انکو مقالہ پر ملا "MYSTICISM IN ENGLISH POETRY" "انگریزی شاعری میں تصوف" پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وطن واپس ہو کر ڈی۔ جی۔ سندھ کالج میں مختلف عہدوں پر فائز ہوئے۔ اور آخر پرنسپال ہو کر ریٹائرڈ ہوئے ۱۹۴۰ء کو ۱۱ فیبروری میں وفات کی۔ ڈاکٹر گرفتانی ایک ادیب حیثیت سے سندھی ادب میں بڑا مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے رسالے کے علاوہ دو اور کتابیں بھی لکھی تھی ۱۔ نور جہاں (ناول) ۲۔ "لتواری کے لعل" کلنوری شریف کے بزرگوں کے حالات زندگی۔

۱۹۔ غلام محمد شاہوانی والا رسالہ :-

مرحوم غلام محمد شاہوانی کا بہترین شاہکار شاہ کا رسالہ ہے اس کو سندھی ادب میں اس لئے اہمیت ہے کیوں کہ یہ رسالہ اس وقت منظر عام پر آیا جب سندھ میں شاہ بھٹائی کا رسالہ ناپید ہو گیا تھا۔ کیوں کہ اس وقت سندھ سے ہندو ہندوستان چلے گئے تھے۔ صوبے سے ہندو ہاشر چلے گئے تھے اور مارکیٹ میں رسالہ موجود نہ تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے مرحوم غلام محمد شاہوانی نے ۱۹۵۰ء میں محنت سے اس نسخہ تیار کیا، جسے ایم۔ ایچ۔ احمد برادرس حیدرآباد نے شایع کیا۔ شاہوانی مرحوم رسالہ کے متن کو جمع کرنے کے وقت مقدمہ لکھنے میں کوئی خاص محنت نہ کی اور نہ تو کوئی نئی تحقیق پیش کی ڈاکٹر گرفتانی والے رسالہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ رسالہ کی ترتیب بھی وہی رکھی ہے۔ خبر نہیں وہ مرحوم کیوں نہیں اس طرف متوجہ ہوئے حالانکہ ان سے بڑی توقع تھی۔ اس رسالہ میں کوئی نئی چیز نظر نہیں آتی۔ بہرحال یہ رسالہ سندھی ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

سوانح:- مرحوم غلام محمد شاہوانی سندھ کے ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جنہوں نے وطن کے ادب کی بڑی خدمت کی اور اپنی ادبی تخلیقات سے مالا مال کیا۔ مرحوم نے اپنی مختصر زندگی میں عمدہ کتاب شایع کرائے۔ مرحوم شاہوانی ایک ماہر تعلیمات تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ادب سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ جسکے نتیجہ میں سندھی ادب کو بہترین تصنیفات ملی۔ شاہ کے رسالے کے علاوہ دیگر کتابیں یہ ہیں

۱۔ ادبی خزانہ۔ شیخ سعدی کے گلستان کا سندھی زبان میں ترجمہ۔ مولانا جلال الدین رومی رح کی مثنوی کے دو دفتروں کا ترجمہ کیا۔ اور ڈیل کارنیگی کی مشہور تصنیف "How to win Friends & Influence People" راز و رموز کے نام سے ترجمہ کیا۔ سیدنا غوث اعظم دستگیر رح کی مشہور تصنیف "فتوح الغیب" کا ترجمہ سندھی میں کیا اور سندھی زبان میں تنقید کے اصولوں پر "ادبی اصول" کے نام سے کتاب لکھی۔

۲۰۔ محمد عثمان ڈیپلائی والا رسالہ :-

ڈیپلائی کے رسالہ مرتب کیا جو آج نایاب ہو چکا ہے۔ اس کی ترتیب میں اشعار کی طرح دو کالم میں کلام دیا گیا ہے کلام پر کوئی تحقیق نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ اسمات خارج کیئے گئے۔ اس رسالہ میں سب سے بری چیز نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ مختلف صفحات پر اشعار دیئے گئے ہیں، جس سے شاہ بھٹائی کے رسالہ کی اہمیت پر برا اثر ہوا۔

سوانح:- محمد عثمان بن حبیب اللہ میں ۱۹۰۸ء کو ڈیپلہ تھرپارکر میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی ذہین تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں ہوئی۔ لیکن کن وجوہات کی بنا پر تعلیم کو منقطع کیا۔ لیکن فارسی اور عربی زبانوں میں اچھی تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد چھوٹے قسم کے تاجر تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو اپنا معاون کیا۔ ان کی ذہانت چھپ نہ سکی۔ انہوں نے سندھی ادب میں اسلامی اکابروں پر ناول لکھنے شروع کیا۔ جس میں اسلامی تاریخ پر خاص طور پر تھے جو آج تک بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں

۲۱۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی والا رسالہ

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب سندھ کے بزرگ اور فاضل ادیب ہیں آپ کو سندھی، اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر یکساں دسترس رکھتے ہیں۔ انہوں نے سال ۱۹۵۰ء میں کراچی کے مشہور تاجر کتب و ناشر مرحوم بشیر احمد کی فرمائش پر شاہ بھٹائیؒ کے کلام کو مرتب کیا تھا۔ مولانا قاسمی صاحب شاہ بھٹائیؒ کے کلام سے اچھی طرح واقف ہیں اور اس کے اچھے شارح بھی ہیں۔ مولانا صاحب نے کلام جمع کرتے وقت اپنے سامنے محکمہ تعلیم والا نسخہ رکھا، مشکل الفاظ کی معنی ہر بیت کے ساتھ دیتے گئے۔ جس کی وجہ سے کلام کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس رسالہ میں جو نئی بات نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ جو ابیات جو شاہ لطیف کے ہیں ہیں۔ انکے ساتھ نوٹ دیتے ہیں۔ بیت شاہ بھٹائیؒ کا نہیں ہے

مولانا قاسمی صاحب نے شاہ بھٹائی کے کلام کی شرح شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فلسفی کی روشنی میں دینے کی کوشش کی ہے۔ جس میں قدری کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ رسالہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ۱۹۵۱ء میں مکمل کرکے شایع کیا۔ رسالہ کی چھپائی تین رنگوں میں چھپی ہے۔ اور بہت دیدہ زیب ہے۔

۲۲۔ علامہ آءِ۔ آءِ۔ قاضی والا رسالہ ۱۹۶۱ء

علامہ آءِ۔ آءِ قاضی، صاحب سندھ کے برگزیدہ عالم تھے۔ انہوں نے شاہ بھٹائیؒ کے کلام اور فلسفہ پر بڑی تحقیق کی ہے۔ سندھی ادبی بورڈ نے شاہ لطیف بھٹائی کے کلام کو مرتب کرنے کا کام سپرد کیا۔ جو انگریزی زبان میں شرح لکھی تھی تاکہ شاہ بھٹائیؒ کے فلسفہ کو بیرونی دنیا سے روشناس کرایا جائے۔ علامہ صاحب نے شرح لکھنے سے پہلے رسالہ کے متن کو درست کرنے لکھنا شروع کیا، مکمل ہونے کے بعد سندھی ادبی بورڈ نے بڑے اہتمام سے ۱۹۶۱ء میں شایع کیا جو ۸۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ رسالہ کے شروع میں تین صفحات پر مشتمل ڈاکٹر سی بخش بلوچ کے تعارف عالمانہ انداز میں لکھا ہے۔ مگر تمام اور دوسرے ممالک کے ادیبوں اور شاعروں کی خوائش تھی کہ شاہ بھٹائیؒ کا جامع اور مستند رسالہ منظر عام پر آنا چاہئے۔ یہ تقاضا پوری کی گئی۔ سندھ کے بڑے عالم اور بزرگ کے غور و فکر کا نتیجہ ہے رسالہ میں کلام کو سلسلہ وار ترتیب دینے پر خاص خیال رکھا گیا ہے۔ محترمی جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ لکھتے ہیں:۔

"یہ پہلا مرتب کیا ہوا رسالہ ہے جس میں شاعر کے ذہن اور فکر کی تدریج ارتقا کا خاکہ صاف نظر آتا ہے"

علامہ صاحب نے رسالہ میں کافی کلام عمر کا سمجھکر نکالدیا خاص طور پر سر کنڈارو۔ رسالہ کے آخر میں مشکل الفاظوں کی معنی اور شرح دی ہوئی ہے۔

سوانح :۔ سندھ کے مفکر اور عالم علامہ امداد علی بن امام علی قاضی ۱۸۸۹ء کو حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ آپ کے والد ضلع دادو کے مشہور گاؤں پاٹ کے قاضی خاندان میں سے تھے۔ قاضی صاحب نے ۱۹۰۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرکے مزید تعلیم کے لئے لنڈن چلے گئے، جہاں سے ۱۹۱۰ء کو بیرسٹر (Law) کا امتحان پاس کرکے سندھ میں واپس آئے کچھ عرصے کے لئے جیکب آباد ریاست میں ڈسٹرکٹ جج مقرر ہوئے ۱۹۵۱ء میں سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ اس دوران آپ نے سندھ اور سندھی ادب کی بڑی خدمت کی جسکو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ۱۹۵۹ء میں وائس چانسلر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ علامہ صاحب نے اسلام کی اشاعت کے لئے بڑا کام کیا۔ نوجوان مسلم شاگردوں کو بیدار کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جنکو اپنی تحریر اور تقاریر سے صحیح راہ بتانے اور بیدار کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ عظیم شخصیت ۱۳ اپریل ۱۹۶۸ء کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ علامہ صاحب شاہ بھٹائیؒ کے بڑے شارح تھے۔ انہوں نے شاہ بھٹائیؒ کے فلسفہ اور شخصیت پر تقاریر اور مقالے لکھے ہیں جن میں Shah Abdul Latif's Position among the world Poets مشہور مقالہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک انگریزی زبان میں تصنیف "Shah Abdul Latif, An Introduction to his Art" بھی مشہور ہے۔

۲۳۔ کلیان آڈوانی کا رسالہ (انڈیا)

کلیان آڈوانی ڈی۔ جے۔ سندھ کالج کراچی کے سابق پروفیسر اور ہندوستان میں بمبئی کے جے ہند کالج کے موجودہ پروفیسر کلیان تولچند آڈوانی نے بمبئی انڈیا سے ۱۹۵۸ء میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے رسالہ کو مرتب کیا، اور اُسی سال شائع کیا۔ برصغیر ہند و پاک کی تقسیم کے بعد اکثر ہندو پاکستان (سندھ) کو چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے۔ ہندوؤں کو حضرت شاہ لطیف کے لئے بڑی عقیدت تھی، انہوں نے اپنے ساتھ شاہ بھٹائیؒ اور دوسرے سندھ کے بزرگوں کا کلام لے گئے۔ کلیان آڈوانی نے اس جذبہ کے تحت شاہ بھٹائی کے رسالہ کو مرتب کیا رسالہ شائع ہونے سے پہلے انہوں نے سندھ کے تین بزرگ شعراء پر علیحدہ علیحدہ کتابیں (سوانح) لکھی، جن میں شاہ۔ سچل۔ اور سامی ہے، یہ تصانیف سندھی ادب میں اپنی نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ رسالہ ہندوستان کتاب گھر بمبئی پبلیکیشن کی طرف سے شائع ہوا۔ یہ رسالہ مختلف نسخوں کے مقابلے میں اچھا چھپا ہے، اس میں سب سے نمایاں چیز یہ ہے کہ رسالہ کے تلفظ موجودہ رسم الخط میں دیئے ہیں۔ رسالہ میں ابیات دو کالم میں دیئے ہیں۔ مرتب ایک پر لکھتے ہیں۔

"ہند اور سندھ کے عالموں، بزرگوں اور ادیبوں اور شائقوں کی خدمت میں شاہ لطیفؒ کا رسالہ کمال ادب سے پیش کرتا ہوں"

کلیان آڈوانی نے رسالہ کی ترتیب ڈاکٹر گربخشانی اور غلام محمد شاہوانی کے رسالوں کی طرح قائم کی ہے۔

۲۴۔ برٹش میوزیم لنڈن والا رسالہ۔ مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ۔

سندھ کے مشہور ادیب جناب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے سندھ کے عوام کی دیرینہ خواہش کو پورا کیا بڑی محنت سے انڈیا آفس لنڈن کے کتبخانہ میں موجود رسالہ کو بھٹ شاہ ثقافتی مرکز کمیٹی کی تجویز کے تحت ۱۹۶۹ء کو شائع۔ رسالہ کی تصحیح میں برٹش میوزیم لنڈن کے انڈیا آفس کے کتبخانہ میں نمبر SIND. 3 ۔ کتابچہ اور مسودہ نمبر NO.Or.2987 سے یہ رسالہ موجود ہے اس نسخہ کے ۲۸۹ صفحات ہیں جو کسی نے شمار کرکے یہ تاریخ 14.Feb.1886 لکھدی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۸۸۶ء سے پہلے انڈیا آفس کے کتبخانہ میں موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ نسخہ ہر کے دو نسخوں میں سے ایک کا نقل ہے۔ یہ نسخہ شاہ بھٹائیؒ کے اور نسخوں کی ترتیب سے مختلف ہے۔ رسالہ کی شروعات سرکلیان کی جگہ سرسنی سے کی ہے۔ اس نسخہ میں دوسرے شعراء کا کلام بھی موجود ہے۔ تلفظ کے لحاظ سے یہ نسخہ ہی ہے بہرحال شاہ بھٹائیؒ کے اس نسخہ کی سندھ والوں کو ضرورت تھی۔ جو رسالہ کی تحقیق میں بڑا کارآمد ثابت ہوگا۔

سوانح:۔ سندھ کی مایہ ناز شخصیت اور لاثانی ادیب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ سندھی ادب کے معماروں میں سے ایک ہے۔ اُن کی گرانقدر شخصیت پر سندھ کو بجا طور پر فخر ہے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی علی محمد خان لغاری بلوچ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ولادت تعلقہ سنجھورہ کی ایک بستی جعفر خان جمالی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں ہوئی نوشہرو فیروز اسکول سے ۱۹۲۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرکے ڈی۔ جے۔ سندھ کالج سے ۱۹۲۸ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پاس کیا ۱۹۴۵ء کو تعلیم کے شعبہ میں کولمبیا یونیورسٹی امریکا سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وطن واپس ہوکر سندھ گورنمنٹ سیکریٹریٹ میں ملازمت شروع کی۔ ۱۹۵۲ء میں سندھ یونیورسٹی میں شعبہ تعلیم اور سندھی ادب کے سربراہ ہوئے۔ آج سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ پر فائز ہیں

ڈاکٹر صاحب کو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے والہانہ عقیدت ہے۔ بھٹ شاہ ثقافتی کمیٹی کے بہت عرصہ تک اعزازی سیکریٹری ہوکر رہے۔ بھٹ شاہ پر شاہ بھٹائیؒ کے سالانہ عرس بڑے اہتمام سے منانے میں بڑی کوشش رہتی ہے۔ شاہ صاحب کے ۲۰۲ سال برسی پر ۱۹۵۴ء میں "یادگار لطیف" کمیٹی کی طرف سے مرتب کیا۔ آج تک شاہ بھٹائیؒ کے کلام اور فلسفہ پر بڑی تحقیق کرتے رہتے ہیں۔ اور تحقیقاتی مقالات لکھتے رہے ہیں۔ جن کی مدد سے شاہ لطیف بھٹائیؒ پر مزید تحقیق کرنے کی راہیں ہموار کردی ہیں۔

۲۵۔ رسالۂ شاہ عبداللطیف بھٹائی (منظوم اردو ترجمہ)

سندھ یونیورسٹی کی طرف ۱۹۵۳ء میں ایک جامع اسکیم بنائی تھی، جس میں شاہ بھٹائی رح کے کلام کا اردو ترجمہ اور سندھی زبان میں جامع لغات تیار کرانی تھی۔ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آخری منظوری دی گئی، اور یہ کام سندھ کے نوجوان شاعر شیخ مبارک علی آیاز کے سپرد کیا گیا۔ شیخ ایاز سندھی اور اردو زبانوں کے شاعر ہیں، چونکہ یہ کام ایک قومی فریضہ ہے اس لئے سندھ کے بہت سے بزرگوں نے اس کام کو سرانجام کرنے میں کوشش کی جن میں پیر حسام الدین شاہ راشدی، مرحوم مخدوم امیر احمد صاحب نے شاہ بھٹائی کے ابیات کا اردو نثر میں لفظ لفظ ترجمہ کیا، جو بذات خود مشکل کام ہے اردو کے مشہور شاعر مرحوم حفیظ ہوشیارپوری نے ترجمہ کو دیکھا، اور محترمی جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی نے مسودہ کی مصنف وغیرہ کو دیکھا اور پریس کاپی تیار کرائی۔ رسالہ کی ترتیب شروع میں ڈاکٹر کریمخانی کی خاطر رکھی اور آخر میں مختلف رسالوں سے استفادہ کیا۔

ترجمہ ادب کی مشکل صنف ہے شاہ بھٹائی رح کے کلام کا ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے رسالہ کے ترجمہ سے متعلق یہ کہنا کافی ہے کہ شیخ ایاز نے ترجمہ کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، وہ رسالہ کے مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوگا۔ در اصل شاعری احساس اور جذبہ کا نام ہے اگر ترجمہ میں وہ احساس اور کیفیت نہ رہی تو اصلی شاعر کا مفہوم ختم ہو جائے گا۔ شاہ لطیف بھٹائی رح کے ظاہری مفہوم اور شعر کا ترجمہ تو ہو سکتا ہے لیکن ان کے احساس اور کیفیت کا ترجمہ کرنا مشکل ہے۔ بحرحال شیخ ایاز کا ترجمہ ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس بات کی خوشی ہے کہ حضرت شاہ بھٹائی رح کے پیغام کو ہمارے ہم وطنوں کے سمجھنے کے لئے یہ نمونہ قدم رہے گا۔ رسالہ کے شروعات میں مترجم نے عالمانہ مقدمہ لکھا ہے، شاہ لطیف بھٹائی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ جن میں سوانح، سماجی پس منظر، شاہ کے صوفیانہ نظریات، شاعرانہ ماورائیت، عوامی کہانیاں، مختلف سُر، سندھی کافی کی ارتقا، شاعری اور تنقید، ترجمہ کی اہمیت یہ مقدمہ ۹۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ رسالہ جون ۱۹۶۳ء کو سندھ یونیورسٹی کی طرف سے شایع ہوا۔

سوانح مترجم:۔

شیخ مبارک علی بن شیخ غلام حسین، شکارپور سندھ میں ۱۹۲۳ء میں تولد ہوئے شکارپور کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں بڑے صاحب دل اور صاحب نظر شخصیتیں پیدا ہوئیں، جنہوں نے زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں حیثیت حاصل کرکے اولیت کا درجا حاصل کیا شیخ ایاز بھی اس زمین پاک کا فرزند ہے۔ جنہوں نے سندھی اور اردو ادب میں نمایاں حیثیت حاصل کرلی ہے۔ شاعری میں گیتوں اور آزاد نظم سے مشہور ہوئے، ان کے گیتوں میں سندھ کی رومانی کیفیت چھلکتی ہے شاعری کے علاوہ اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ اور اپنے تنقیدی سے مشہور ہیں۔

شیخ ایاز کی ابتدائی تعلیم شکارپور میں ثانوی تعلیم گورنمینٹ ہائی اسکول میں پوری کرکے، شکارپور کے کالج میں شروع کی لیکن جلد ہی کراچی جاکر ڈی۔ جے۔ سندھ کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا، ایل۔ ایل۔ بی کرنے کے بعد سندھ سیکرٹریٹ میں ملازمت شروع کی یہ ملازمت چھوڑ کر کراچی میں وکالت شروع کی، کراچی سے سکھر منتقل ہوئے اور آج تک سکھر میں وکالت کر رہے ہیں اور بہتیری وکیلوں میں شمار ہوتے ہیں۔

شکارپور میں تعلیم کے دوران شعر و شاعری سے شوق ہوا چند ہم خیال دوستوں سے مل کر ادبی سرکل کی بنیاد رکھی، جن میں لعل محمد لعل، نعیم صدیقی، مرحوم احسان احمد بدوی، مرحوم رشید لاشاری، نارائن شام قابل ذکر ہیں۔ ایاز کے شعر "ادیب سندھ" اور "سندھو" رسالوں میں شایع ہوتے تھے شیخ ایاز نے ترقی پسند شاعری کو فروغ دیا۔ اور وقت کے ماحول کی عکاسی ان کی شاعری میں نمایاں ہے سندھ کے نوجوان طبقے کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ایاز نے اردو زبان میں بھی شاعری کی ہے جس سے اردو ادب میں نمایاں جگہ حاصل کی ہے۔ اردو میں ایک شعر کی کتاب "بوئے گل و نالۂ دل" مشہور ہے۔

باب پنجم

شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سندھ کے بزرگ و شعرا کرام

جن سے متاثر تھے

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے سندھی معاصر شعرا میں بزرگ پیشرو بھی تھے اور ہمعصر بھی۔ اس بابرکت دور میں سندھ پر اسلام کے آفتاب کی روشنی چمکی اور وہ سندھ میں پیدا ہوئیں۔ جن کے علم و فضل سے تاریخ اور تذکروں کے صفحات بھرپور نظر آتے ہیں۔ جن کے روحانی تزکیوں سے ہر دور اور اعلیٰ نظر آتا ہے گیارہویں صدی ہجری میں سندھ کے سب سے عظیم صوفی شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ تھے۔ وہ زمانہ بڑا معجزہ تھا۔ سندھ کے گوشہ گوشہ سے روحانی جلال اور جمال کا منظر نظر آتا تھا۔ سندھ کی عظمت تھی۔ شاہ لطیف بھٹائیؒ کی غیر فانی شخصیت اس وقت سندھ کا سنگار بنی۔ اس لئے شاہ لطیف کو سمجھنے کے لئے یہ بیحد ضروری ہے کہ آپ کے دور کے صالحین کا ذکر کیا جائے جن سے آپ متاثر تھے یا وہ متاثر تھے۔ ان کے روحانی فیوض سے سندھ کا ذرہ ذرہ سیراب ہو رہا تھا۔ سندھ کے بزرگوں کی فہرست طویل ہے۔ ان میں مخدوم عنایت اللہ صوفی شہید۔ سید عنایت اللہ رضوی۔ صوفی عیسیٰ۔ مخدوم محمد معین ٹھٹوی۔ حضرت شاہ قمر اللہ علوی اور سید قدس شاہ جلالیؒ مخدوم عنایت اللہ صوفی شہید۔ سید عنایت اللہ رضوی۔ صوفی عیسیٰ۔ مخدوم محمد معین ٹھٹوی۔ حضرت شاہ قمر اللہ علوی اور سید قدس شاہ جلالیؒ

ان بزرگوں کے عظیم کارناموں سے سندھ کا ذرہ ذرہ بیدار ہو چکا تھا۔ ان کے روحانی برکتوں اور ہدایات سے سندھ کے غیور عوام اسلام کے پیرو رہے۔ اگرچہ محمد بن قاسم فاتح سندھ کی آمد سے سندھ باب الاسلام بنا تھا ان بزرگوں کی رہنمائی سے سندھ دارالاسلام بن گیا۔

مخدوم شاہ عنایت اللہ صوفی شہید

صالحین میں سے مخدوم شاہ عنایت صوفی کا درجہ بلند ہے۔ صوفی متعدد اپنے وطن ٹھوک میرانپور میں یاد الٰہی میں مشغول رہے۔ اس وقت شاہ جہاں کی حکومت کم عمری سے شاہ نوجوانی میں ہی کی محبت میں وطن چھوڑ کر جدرا نامی گاؤں چلے گئے۔ وہاں ایک خدا رسیدہ بزرگ امیر عبدالملک کی ملک صحبت نصیب ہوئی۔ عرصے کے بعد وطن واپس ہو کر ٹھوک میرانپور میں قیام کیا جس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ جب وقت بد و زمیندار حسد کی آگ میں جلنے لگے اور حکومت سے ساز باز ہو کر درویش کو تکلیف دینے لگے۔ اس وقت اللہ کے نیک محمد اعظم خان جو بڑا مملکت تھے اور زمینداروں کے لئے دہشت تھا۔ ہندوستان کے مغل بادشاہ فرخ سیر سے اس خدا رسیدہ درویش کے خون بہانے کی اجازت حاصل کر لی۔ ۱۱۳۰ھ میں آپ کو شہید کیا گیا۔ اس کے بعد اس خواص بحر حقیقت کے سر مبارک کو ٹھٹہ کی گلیوں میں تشہیر کیا گیا۔ مرزا مظہر جان جاناں نے اپنے شہید بزرگوں کے لئے فرما گئے ہیں:

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اس واقعہ کے وقت شاہ بھٹائیؒ کی عمر ۱۸ سال تھی اور شاہ صاحب کی شاعری کا چرچا عام ہو چکا تھا۔ لیکن انہوں اس حادثے کا ذکر اپنے کلام میں نہیں کیا۔ البتہ ایک بیت سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے۔

آج نہ اوطاقن جے طالب تنوارین

اڏيسي اُتي وبا، مڙهيون موڪ ملهارين

جي جيءَ کي جياوين سي لاهوتي لدي ويا

اج اہ مکانوں میں دوست نہیں رہے جن کی طلب ہے وہ مردمی اُٹھ کر چلے گئے۔ اُن کی نالی جگہوں دلکش دل نواز اُٹھتا ہے

جن کے سخن دلوں کو زندہ کرتے تھے وہ لاہوتی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔

شاہ صوفی نے سندھ میں تصوف کا ایک نیا ورق پلٹا تھا، ان کے خیالات کے بعد سندھ میں بڑے صوفی شاعر پیدا ہوئے، جن میں چلی سرمست اور قادر بخش بیدل جیسے عارف کامل ذکر ہیں۔ شاہ صوفی فارسی اور سندھی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کی مثنوی سیر نامہ (فارسی) کا ذکر فقیر قادر بخش بیدل نے اپنی فارسی مثنوی دلکشا میں کیا ہے، جس کا انتخاب اپنی تصنیف سندالموحدین میں بطور تبرک دیا ہے:- [1]

من بغیر تو نہ بینم در جہاں — قادرا پروردگارا جاودان

چون بجز تو نیست در ہر دو جہاں — لاجرم غیرت نباشد در میان

من ترا دانم وہی بینم ترا — خود ترا کے غیر باشد اے خدا

اول و آخر ای احد — ظاہر و باطن و بیحد

ہم نہان و ہم عیان پیدا توئی — ہم درون گنبد خضرا توئی۔

آپ نے وحدانیت کا نعرہ لگایا، جس سے اکثر وقت کے علماء کرام ناراض رہتے تھے، میر علی شیر قانع نے آپ کی تاریخ شہادت نکالی ہے۔

ماقتلوہ یقینا بل رفع — آہ مظلوم حق

میاں شاہ عنایت اللہ رضوی [2]

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بزرگ پیشرو ہمعصر سید شاہ عنایت اللہ رضوی کا خصوصیت سے شمار ہوتا ہے۔ شاہ عنایت رضوی اور شاہ لطیف ایک وقت سندھ کو اپنے شعر و سخن سے نوازتے رہے۔ شاہ عنایت اللہ رضوی شاہ صاحب سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ اپنی بزرگی اور علمی فضیلت سے اشخاص میں تھے۔ چنانچہ شاہ بھٹائی [3] میر علی شیر قانع نے تاریخ تحفۃ الکرام میں شاہ خیرالدین شاہ جیلانی قدس سرہ کے مرید ہونے کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں:

شاہ عنایت رضوی بن سید نصیرالدین شاہ خیرالدین شاہ جیلانی قدس سرہ کے مریدوں میں سے تھے، اور درویش صدو، درویش حبیب بن پلی اور سید عبدالوہاب رضوی کی خدمت میں رہ کر بھی فیض حاصل کیا تھا۔

اس مختصر احوال سے شاہ عنایت اللہ رضوی کی زندگی کے حالات پر کوئی زیادہ روشنی نہیں پڑتی، لیکن قیاس کے طور پر ان تھوڑی سی سطروں سے کچھ نہ کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں۔

سندھ میں سید رضوی خاندان کے نسب کا سلسلہ حضرت امام علی نقی رضہ سے جا ملتا ہے۔ سادات کی اس شاخ سے ایک بزرگ امیر قمر مکی مکہ شریف سے ہجرت کر کے سندھ میں آئے تھے اور ۱۲۶۰ عیسوی میں سید صاحب نے بکھر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ کی اولاد، سب سے پہلے روہڑی اور بکھر میں آباد ہوئی، بعد میں سندھ کے دوسرے شہروں میں پھیل گئی۔

شاہ عنایت کے آباؤ اجداد بکھر کے رہنے والے تھے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے آپ کے دادا سید نصیرالدین بن سید اسمٰعیل شاہ بکھر سے ہجرت کر کے نصیر پور (ضلع حیدرآباد) میں مقیم ہو گئے۔ صاحب تحفۃ الکرام کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سید نصیرالدین سلسلہ قادریہ میں بکھر کے مشہور بزرگ حضرت شاہ خیرالدین شاہ جیلانی کے مرید تھے۔ شاہ عنایت اللہ رضوی کی ولادت نصیر پور میں سال ۱۰۲۵ھ [3] ہجری میں ہوئی۔ آپ علوم متداولہ میں بڑی دسترس رکھتے تھے قادریہ طریقہ کے علاوہ سہروردیہ طریقہ پر بھی بیعت رکھتے تھے۔

---

[1] تذکرہ لطفی تاریخ ادبیات سندھ۔ جلد اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۲۶۷

[2] تاریخ تحفۃ الکرام مصنف میر علی شیر قانع۔

[3] میاں شاہ عنایت مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ صفحہ ۳۱

آثارِ قلندری کے مصنف نے صاف لکھا ہے کہ وہ سہروردی طریقہ کے تھے، جس کے ثبوت میں ایک مختصر روایت لکھی ہے

روایت ہے حضرت شاہ عنایت اللہ رضویؒ نصرپوری کو حضرت سیّد یا پیر مخدوم سیّد بھاون شاہ ملتانی نے فرمایا، آپ کی امانت اس بزرگ کے پاس ہے، جس کا ابھی تک اس جہان میں ظہور نہیں ہوا ہے۔ شاہ عنایت اللہ نے عرض کیا، جس بزرگ کا ابھی تک ظہور نہیں ہوا ہے میں ان سے کس طرح ملاقات کرونگا۔ سیّد بھاون شاہ نے فرمایا، تم شاہ محی الدین جیلانی اولیاء کے مقام پر جاکر اعتکاف میں بیٹھو، تھوڑے وقت میں ایک گھوڑے سوار ان نشانیوں سے منظر آئیں گے تمہیں اس راہ کا پتہ بتادیگا ان سے باطنی فیض بھی حاصل ہوگا۔ شاہ عنایت رضوی سکھر اس جگہ پر پہنچ کر ورد وظائف میں مشغول ہوگئے۔ ایک دن جب کہ آسمان غبار آلودہ تھا، ایک گھوڑے سوار نورانی لباس میں ملبوس دکھائی دیا۔ وہ ان کو دیکھکر بہت خوش ہوا، اس بزرگ کی آپ نے قدم بوسی کی اور بڑا فیض حاصل کیا۔ واپسی کے وقت شاہ عنایت رضوی نے آپ کا اسم مبارک دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا میرا نام قائم الدین ہے۔ آپ کے ظہور ہوا ہوں

آپ کے کلام میں شیخ صدرالدین عارف ملتانی اور شیخ رکن الدین ملتانی کی تعریف انداز سے موجود ہے۔ شیخ صدرالدین ملتانی کی تعریف میں فرماتے ہیں،

منھنجو پیر ملتان ۾ صدرالدين سچي ،

نگر تنھن نوريءَ جو، رهنتي — ري ،

پيشي بک پڳي ، ڏسندي، ساڻ ڏاتاري ،

ملتان ميں ميرا پير صدرالدين ، سچ ميں آتا ہے ،

اس نورانی ہستی کا شہر رحمت الٰہی سے معمور ہے ،

اے میری ہم جولیاں اس سخی کے دیکھنے سے روحانی بھوک مٹ جاتی ہے ،

شاہ لطیفؒ کی طرح شاہ عنایت اللہ رضویؒ بھی بڑے سیاح تھے، وہ بارہا ملتان گئے تھے۔ اور زیریں سندھ میں سمندر تک سفر کیا تھا تھرپارکر علاقہ سے تو انہیں خاص طور پر رغبت تھی۔ آپ اپنے دور کے بلند پایہ شاعر تھے، لیکن شاہ بھٹائی کے ہمعصر ہونے سے آپ کی شہرت کو بڑی چوٹ لگی۔ حالانکہ آپ کے کلام کا بڑا حصہ شاہ بھٹائی کے کلام سے مل گیا ہے۔ اگر شاہ عنایت کسی اور دور میں پیدا ہوتے تو وہ اپنے وقت کے شاعر امام سمجھے جاتے۔ شاہ بھٹائیؒ کی وجہ سے شہرت نہ ہو سکی۔ بالکل اسی طرح جیسے فارسی زبان میں حضرت حافظ شیرازی اور خواجو اور انگریزی ادب میں شیکسپیئر اور مارلو۔ حالانکہ مارلو فن شاعری اور ڈرامہ نگاری میں شیکسپیئر سے کسی بھی صورت میں کم نہ تھا۔ مارلو نے ڈرامہ "تیمور لنگ" اور فسٹس دو بلند پایہ ڈرامے لکھ کر انگریزی ادب میں ڈرامہ نگاری کی ایک جدید راہ قائم کی تھی۔ لیکن شیکسپیئر کی بڑھتی ہوئی شہرت نے مارلو کو گوشۂ گمنامی میں رکھا۔

شاہ عنایت اللہ رضوی حقیقت میں شاہ بھٹائیؒ کے پیشرو تھے۔ شاہ عبدالکریم بلڑیؒ کے بعد ایک سو سال کے عرصہ میں سندھی شاعری کا میدان خاموش نظر آرہا ہے۔ حالانکہ شاہ عنایت، شاہ لطیف سے عمر میں کافی بڑے تھے اس معمر شخصیت کے کلام کا اثر شاہ بھٹائی پر ہوا تھا۔ کیونکہ وہی خصوصیتیں شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں موجود ہیں جو شاہ عنایت کے کلام میں ہیں۔ شاہ لطیف کے رسالے میں ایسے ابیات موجود ہیں جو آپ نے شاہ عنایت کے تتبع میں کہے ہیں۔ "وائی" کے اولین موجد بھی شاہ عنایت رضویؒ ہیں۔ ان حالات کے مدنظر ہم آپ کو شاہ لطیف کا عظیم پیشرو کہہ سکتے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام میں شاہ بھٹائی کے رسالے کی طرح آئینِ سرّ موجود ہیں۔ اور اکثر عنوان بھی وہی ہیں آپ کے کلام میں محبت سوز و گداز موجود ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱؎ آثارِ قلندری صفحہ ۱۰۱ ، بحوالہ تذکرہ لطیفی جلد اول صفحہ ۵۹۴

۲؎ حضرت شاہ محی الدین شاہ جیلانی کا مقام سکھر پرانا میں واقع ہے۔

لگنون لوه لهي پيا ۔ ٿيا بند بدا ۔

سو ۾ واءُ وصال جو عمري عانگ ملا

آئي پير عنايت چئي ۔ آهي لاهه صبا

ستي سنجهه سيا ۔ ملندءِ مٽ ملير ۾ ۔

میرے جسم سے فولادی زنجیر اتر گئی اور مجھے قید سے رہائی مل گئی ہے ۔ مجھے وصال کی نوید حاصل ہوئی ہے ۔ اور زندگی کی رات معلوم ہو رہی ہے ۔

شاہ عنایت کہتا ہے اُٹھو وقت یہ امید دلبر موجود ہے ۔ اے عصمت مآب عورتے آج یا کل تیرے عزیز تجھے ملیر میں مل جائینگے

تمڙو ڪينجهر جي ڪين ٻين جهڙي سونهن سنڌ ۾ نه

طول تنهنجي سان هنئن، راڻيون اچن نه راس ۔

مورچل مقام آهي تماچي ماڻي ۔

کینجھر کے کنارے پر ایسا کوئی نہیں جو اُس کے حسن سے مقابلہ کر سکے اُس کے حسن، قد و قامت سے راہوں کی مشابہت نہیں ہو سکتی ۔

تماچی خود اُس کے اوپر اپنے چاقوؤں سے چمکتا جلا رہا ہے ۔

وائي

جو نڪس ماڻ پنهنوار جي ٿر ويان پاڻر ويان ۔ ۲

شال نه ٿيان هڪدم ويڙهيچڻا تار

جي ٿر ويان پاڻر ويان ۔

نان ڪور نه ڪرين ساڻيه جا سنگهار

جي ٿر ويان پاڻر ويان ۔

ديي آءُ هلن ۾ واسيان پنهنجا ماڻ

جي ٿر ويان پاڻر ويان ۔

الهي عنايت سين سوبل لهنم سام ۔

جي ٿر ويان پاڻر ويان ۔

میں تھرمک جاؤں اور پاڑمک جاؤں اپنا مال میں پنوھار سے کہہ دونگی

خدا کرے کہ میں اپنے عزیزوں سے جدا نہ ہو جاؤں ۔ میں تھرمک جاؤں اور پاڑمک جاؤں

میرے دل سے وطن کی یاد ۔ فراموش ہو نہیں سکتی ۔ میں تھرمک جاؤں، پاڑمک جاؤں ۔

میں اپنے وطن میں جاکر ۔ بالوں کو صاف کرونگی ۔۔۔ میں تھرمک جاؤں پاڑمک جاؤں ۔

فرمایا عنایت کی اپنے کرم سے جلد خبر گیری کر ۔ میں تھر جاؤں پاڑمک جاؤں ۔

---

۱ یہ بیت سندھ کی ایک مشہور کہانی "نوری جام تماچی" سے تعلق رکھتا ہے ۔ تماچی سمہ خاندان کا ایک بادشاہ تھا ۔ نوری ایک بھرندتی، کینجھر ضلع ٹھٹھہ کے گرد نواح میں ایک جھیل ہے جہاں نوری کی محبت میں جام تماچی گرفتار ہوا تھا ۔ ۲ تھر مارئی کا ملک ہے پاڑ تھر کا ایک گاؤں ہے یہ مارئی سے تعلق رکھتی ہے ۔

میون عیسیٰ :-

میون عیسیٰ بھی شاہ عنایت رضوی رح کی طرح شاہ عبداللطیف بھٹائی کے پیشرو بزرگ اور ہمعصر ہیں۔ حالا تعلقہ کے رہنے والے تھے۔ روایت ہے کہ شاہ بھٹائی بچے ہی تھے تو اتفاقاً میون عیسیٰ آپ کے گاؤں میں آئے۔ جب ان کی نگاہ اس ہونہار بچے پر پڑی تو فرمایا۔

"اس بچے سے وہ گل کھلیں گے، جس کی خوشبو سے سارا جہان مہک اٹھے گا"

میون عیسیٰ اپنے دور کے بڑے شاعر تھے۔ ان کی ایک یادگار تصنیف "میون عیسیٰ کی سندھی" سے مشہور ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام بہت شیریں اور سلیس ہے۔ جس میں تصوف کے باریک نکتوں کو سادہ طور پر سمجھایا گیا ہے۔ مقرے اور دادو ہوتا ہے کہ میون عیسیٰ ۱۱۲۳ھ ہجری میں گزرے ہیں۔ ان کی زندگی کا پوری طرح احوال ہمیں ملتا صرف یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنوب سندھ کی طرف سے اپنے مرشد سے ملنے کے بعد، دریا سندھ سے سفر پر چلے جب ان کی کشتی ماتوٹھ میں لنگر انداز ہوئی تب مرشد نے ارشاد کیا کہ تمہاری سکونت یہاں ہے۔ مرشد کے فرمودہ سے انہوں نے وہیں سکونت اختیار کرلی اور مخلوق خدا کی خدمت کرتے رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد مریدوں نے انہیں حالا لے گئے۔ جہاں وفات پائی۔ قادریہ طریقہ سے واسطہ رکھتے تھے اس لئے کلہوڑہ حکمران بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آپ کے کلام میں ایک سو حرف موجود ہے یہ ابیات اپنی نوعیت سے بہت طویل ہیں۔ چنانچہ شاہ لطیف رح کے پیشرو تھے۔ اسلئے انہ کے کلام کا شاہ لطیف پر بڑا اثر موجود ہے۔ مثال :-

میون عیسیٰ :-

رات سھاڻي پون سنڌين ، پسي پڌرو پنڌ

هل نہ رسين موت کي ، پيين جانب جت

هڪڙو ڏسو ڪٽ ، جيئن واهين ويسري ،

چاندنی رات ہے اور زمین ہموار، صاف میدانوں کو اچھی طرح دیکھ، چل اور منزل کو طے کر اپنے دوست کو دیکھ

سہار اور ناملے کے ناپ کی باتیں نہ کر، اس فکر میں فراموشی سے کام نہ لے۔

شاہ لطیف رح

رات سھاڻي پون سنڌين ، پنڌ وڏو پنڌ ،

هلندي هيبين ڏي ، هرها موڻ نہ هنڌ ،

پنڌڻ سوئي پنڌ ، جو پهچا ڏي پرئين کي ،

چاندنی رات ہے اور زمین ہموار ہے میدانوں کی طویل راہ۔ اے اونٹنی، دوست کی طرف چلتے ہوئے اپنی گردن کو نہ موڑ

کوئی ایسی تجویز نکال جس سے ہم دوست کے پاس پہنچ سکیں۔

میون عیسیٰ کے کلام میں بڑی حلاوت سوز و گداز سمایا ہوا ہے۔ ان کا شمار کلہوڑہ دور حکومت کے بہترین شعراء میں سے ہوتا ہے۔ میون عیسیٰ کے کلام کو ۱۳۱۲ھ ہجری تاریخ ۲۵ ماہ ربیع الاول میں سید شیر محمد شاہ عیسیٰ محمد پوترہ نے جمع کیا تھا، اور حافظ رکن الدین نے طبع کیا۔

تذکرہ لطیفی جلد اول مصنف مرحوم پیر و فقیر لطف اللہ بدوی صفحہ ۵۷۰

حضرت شاہ فقیر اللہ صاحب علویؒ شکارپوری

حضرت حاجی شاہ فقیر اللہ صاحب علوی کلھوڑہ دور حکومت کے مشائخ میں بڑے رتبے کے مالک تھے۔ آج بھی آپ کا اسم گرامی بڑی عزت اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی سید عبدالرحمان علوی بن سید شمس الدین علوی تھا۔ شاہ فقیر اللہ علویؒ کی ولادت افغانستان کے مشہور شہر جلال آباد کے نزدیک حصارک کے گرد نواح کے ایک گاؤں روتاس میں تقریباً ۱۱۰۰ھ میں ہوئی۔ آپ کے خاندان کا سلسلہ حضرت امام محمد حنیفہؒ سے جا کر ملتا ہے جو کہ علوی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ظاہری علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد روحانی فیض حاصل کرنے کے لئے حضرت شاہ محمد مسعود دائم پشاوری بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لاہور کے ایک کامل بزرگ حاجی سعید لاہوری کی بابرکت صحبت سے ظاہری و باطنی فیوض سے مالا مال ہو کر اپنے وطن افغانستان واپس چلے گئے۔ لیکن افغانستان میں بدامنی اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ آپ نے وہاں سے ہجرت کر کے حج کے ارادے سے نکلے ۱۱۳۰ھ میں قندھار کے راستے سندھ میں تشریف لائے۔ شکارپور سندھ کی آب و ہوا پسند آئی اور شکارپور کو اپنا وطن بنا کر سکونت اختیار کی۔ آپ کے دم سے شکارپور نقشبندی سلسلے کا بڑا مرکز بنا۔

شکارپور میں سکونت کے بعد ٹھٹہ گئے جہاں مخدوم محمد ہاشم ٹھٹویؒ سے حدیث کی سند اور طریقت کی اجازت حاصل کرلی۔ آپ وحدت الوجود کے عقیدے پر ایمان رکھتے تھے، جس کے بانی حضرت شیخ محی الدین ابن العربیؒ تھے۔ ٹھٹہ میں قیام کے دوران مخدوم محمد معینؒ سے آپ کی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ جن کے نتیجے میں آپ سے پرخلوص محبت کا رشتہ استوار ہو گیا۔ اور ان کے عقیدے "ہمہ اوست" کے حامی بن گئے۔ لیکن آپ "وحدت الشہود" اور "ہم از اوست" کے قائل تھے۔ قیاس یہ ہے کہ آپ کی ملاقات حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے مخدوم محمد معین ٹھٹویؒ کے بیان کے مطابق ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت شاہ لطیف بھٹائیؒ کی عمر چھیالیس سال تھی۔ شاہ صاحب مخدوم صاحب کی صحبت کے لئے اکثر ٹھٹہ جایا کرتے تھے۔

آپ کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے، حج سے فارغ ہو کر سورت بندر میں مقیم ہوئے اور وہاں سے پھر حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ آپ نے سات مرتبہ حج کیے۔ آخری حج سے واپس ہو کر شکارپور آئے اور جاتی دروازہ کے بیرون (موجودہ علوی محلہ) میں مقیم ہو گئے۔ آپ کی روحانیت کا چرچا عام ہوا۔ اور فیض حاصل کرنے کے لئے لوگ متوجہ ہوئے اور ارادتمندوں میں داخل ہوئے۔ سندھ کے حاکم میاں نور محمد کلھوڑہ کے فرزند میاں غلام شاہ آپ کے معتقد تھے۔ ریاست قلات کے والی میر نصیر خان نوری بھی مریدان خاص میں سے تھے۔ روایت ہے احمد شاہ ابدالی پانیپت کی لڑائی سے پہلے شکارپور سے گذرے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہوئے۔ حاجی صاحب نے نصرت کے لئے دعا کی تھی۔ اس طرح ان کا بیٹا تیمور شاہ بھی والد کے نقش قدم پر چلے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بڑے عالم و فاضل اور روشن ضمیر و قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کثیر التعداد تصانیف کے مالک تھے۔

مشہور تصانیف یہ ہیں:-

۱۔ منتخب الاصول، ۲۔ قطب الارشاد، ۳۔ طریق الارشاد، ۴۔ فتوحات الغیبیہ فی شرح عقائد الصوفیہ، ۵۔ فتح المجید فی مدارج التکمیل ۶۔ وثیقۃ الاکابر، ۷۔ فوائد فقیر اللہ علوی، ۸۔ شرح قصیدہ بانت السعاد، ۹۔ قصیدہ مبرورہ، ۱۰۔ ملفوظات، ۱۱۔ مکتوبات شاہ فقیر اللہ، ۱۲۔ ملفوظات و عملیات، ۱۳۔ شرح ابیات مشکل مثنوی۔

تاریخ تحفۃ الکرام میں حاجی فقیر اللہ علوی کا ذکر اس طرح آتا ہے:-

"حاجی فقیر اللہ از وارد الست امام زمان دراز شد کہ انجا صاحب مرجع انام می باشد، سلسلہ مشیخت و معرکہ را با قصی غایہ رسانیدہ الحق در فضیلتی نیکو وارد حکام انجا بقدم ارادت در خدمتش سلوک دارند و پادشاہ شناس است در امر و نواہی مسعودی سعی دارد و بفیض ظاہر و باطن گروہ معتقد و اُمی"

۱۔ شاہ فقیر اللہ جلال آبادی (رسالہ سروش فارسی) مرتبہ آغا شاہ جیسی خطاط ۱۲ جلد دوم مارچ ۱۹۵۸ء، ۲۔ تذکرۃ الحق جلد اول صفحہ ۲۲۸

۳۔ مکتوبات۔ حضرت شاہ فقیر اللہ علوی مطبع اسلامیہ پریس لاہور۔ ۴۔ تاریخ تحفۃ الکرام مصنف میر علی شیر قانع۔ جلد سوم صفحہ ۱۳۴

باہر سے وارد ہوئے تھے۔ لیکن طویل عرصہ سے یہاں کے لوگ خاص و عام آپ کی طرف رجوع ہیں۔ پیری مریدی اور تعلیم کے سلسلہ میں آپ نے انہیں حد تک پہنچا دیا ہے۔ بدرک، صاحب حال اور بڑی فضیلت، اعلیٰ صفات کے مالک ہیں۔ وہاں کے حاکم اُن کی خدمت میں اور حلقہ ارادت میں ہیں۔ وہ بادشاہ کو پہچانتے ہیں۔ اور امر و نواہی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ لوگ آپ کے بڑے معتقد ہیں۔

حاجی صاحب نے اسلام کی بڑی خدمت انجام دی۔ روایت ہے آپ کو ۱۱۵۰ھ مطابق ۱۷۳۷ء میں شکارپور، سندھ کی طرف ہجرت کرنے اور قیام کرنے کا الہام ہوا تھا۔ حاجی صاحب کے خاندان کے ایک بزرگ میر جمال الدین علوی اپنے بیاض میں رقمطراز ہیں[1]

"حاجی نقیر اللہ شاہ تقریباً در ۱۱۵۰ھ در شکارپور سندھ آمد و متوطن شدند"

اس وقت شہر شکارپور میں بڑی کثیر تعداد میں غیر مسلم رہتے تھے۔ حاجی صاحب کی روحانی فیض و برکت سے انہیں دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ موجودہ شیخ خاندان کے بزرگ بیشتر ہندو بھائی اور دیگر ہندو مسلمان ہوئے تھے۔

بالآخر بعمر ۳ سفر ۱۱۹۵ھ ہجری مطابق ۱۷۸۱ء کو شکارپور میں رحلت فرمائی۔ آپ کے ایک مرید و شاگرد سید محمد وفا لکھوی نے تاریخ وفات اس شعر میں قلمبند کی ہے، جو کہ آپ کے مزار مبارک پر کندہ ہے

ولی و غوث خدا حاجی نقیر اللہ
شدہ بخلد بریں نشیں الی الابد
وفا مہ و شب و تاریخ و سال وصال
بگو سوم صفر و نصف لیلۃ الاحد
۱۱۹۵ ہجری

آپ کا مزار مبارک شکارپور شہر میں جھانگی دروازہ کے اندر وہ علوی محلہ میں واقع ہے جس پر ایک عالیشان کاشی کا گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ جو غالباً تیمور شاہ بن احمد شاہ ابدالی نے تعمیر کرایا تھا۔ بعد میں میر علی نواز علوی نے توسیع کیا۔ جو مرجع خاص و عام ہے۔ آپ عظیم شاعر تھے۔ فارسی، عربی، پشتو، اور اردو زبان میں شعر موجود ہے جو فقر و فنا سے بھرپور ہے۔ چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

چون ز اسباب جہان بگذری۔ سرو سامان گردی
سینہ گنجینہ اسرار خدا میگردد
زنگ ز آئینۂ دل بریاضت بردار
عکس حالت پذیرد چو جلا میگردد

جب اس جہان کے اسباب سے تعلق ہو گئے۔ تب خدا تعالیٰ کے اسرار و رموز کا دار بن جائے گا۔ اپنی محنت سے دل کے آئینہ کا زنگ اتار دے

کیونکہ جب آئینہ صاف اور روشن ہوتا ہے تب ہی اس میں اچھا عکس نظر آتا ہے

آپ کی ایک غزل کے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

مصدر فیضے کہ عالم را تر و تازہ نمود — فی الحقیقت ہست چون مرآت در جسم شہود
ہے پوست از ہے بیا شاہد نمی گردد دریں — یاد آن جا ہے مگر عقل صوفی در ربود

---

[1] بیاض میر جمال الدین علوی شکارپوری (قلمی نسخہ) [2] قطب الفرد الحاج شاہ نقیر اللہ علوی مضمون نگار پروفیسر امین اللہ علوی رسالہ الرحیم سندھی ستمبر ۱۹۷۱ء

[3] تذکرہ لطفی جلد اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی۔

مناجات عربی زبان کے چند شعر نقل کیئے جاتے ہیں :-

اَحمد اللہ العلی ذوالجلال — با النعم وبعد ونما فی کل حال

ثم الصلوٰۃ العزیز المقتدر — دائما کانت علی الغیر البشر

یا الٰہ الخلق مولانا القدیم — ربنا الرحمان رؤف یا رحیم

قد صرفت العمر فی قبل وقال — ضاع عمری فی قباحات الخیال (الخ)

قصیدہ

ایا محبوب سبحانی محی الدین جیلانی — آیا مطلوب یزدانی — محی الدین جیلانی :

ایا منظور، پیغمبر گلے از باغ ان سرور — زتو رونق پذیرافتر — محی الدین جیلانی .

سرپا فیض رحمانی، کمال جاہ انسانی — مقدس سر ربانی — محی الدین جیلانی .

زہے محبوب سبحانی بملک دین مسلمانی — صمت شاہ مردان — محی الدین جیلانی (الخ)

تاریخ بیست نہم ۲۹ ذی القعدہ سنہ ۱۱۶۳ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

کہ درحرم محترم بیت اللہ شرفہا اللہ تعالیٰ، درحاشیۂ طواف مواجہ رکن شامی تالیف این مناجات بانجام رسیدہ. در آمروز کہ این مناجات گفتہ شد چون این بیت سحاب کرم امروز ساری سرم گفتہ شد مرائے تفاول گفتم کہ این مناجات مقبول است امروز باران خواہد بارید، بمقدر ایزدی رعد بغرید و باران باریدن گرفت .

ای سحاب کرم امروز بباری بسرم — تا بخشکی نشود روضۂ ام از بی عملی

مناجات

عمرمن رفت بتحصیل قباحات مدام ، — گنہ ادم بکرم سید تا فی خذلی

مالتف القلب الی الغیر دلی تترکنی . — فی فلاۃ ہکذا کنت دان فی الفلی

این فقیرست بعاجز و بیچارہ چنان — دستگیرش نبود جز تو مخفی نہ جلی

متحیث آمد است نزد تو فقیر اللہ — سعی فرما بکرم بہر خدا در پہلی . الخ

حضرت مخدوم محمد معین ٹھٹوی رح

حضرت مخدوم محمد معین ٹھٹوی کلہوڑہ دور حکومت کے بڑے جید عالم اور صوفی تھے، آپ علامہ زمان تھے، ظاہری تعلیم مخدوم عنایت اللہ ٹھٹوی رح سے حاصل کی اور باطنی فیض حضرت ابوالقاسم نقشبندی ٹھٹوی سے حاصل کیا . صاحب تحفۃ الکرام لکھتے ہیں :-

" آپ کے والد بزرگوار نامی گرامی مخدوم محمد امین بن مخدوم طالب اللہ قاضی جو سندھ میں روپاہ کے رہنے والے تھے، جہاں سے ہجرت کرکے ٹھٹہ میں مقیم ہوئے . مخدوم محمد معین ٹھٹہ میں پیدا ہوئے . آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم مخدوم عنایت اللہ ٹھٹوی سے حاصل کی . خدا تعالیٰ جل جلالہ نے اس دانے والا صفات میں سبھی علوم منقول و معقول کو جمع کیا تھا . اپنی کمالات علمی کے باعث علامہ دہر مشہور ہوئے . مخدوم ابوالقاسم نقشبندی کے حلقہ مریدی میں داخل ہوئے . زندگی کے آخری زمانہ میں سید عبداللطیف بارک سے دوستی

لہ بیاض لطفی مرتب مخدومی مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی (قلمی نسخہ) لہ تحفۃ الکرام میر علی شیر قانع صفحہ ۲۲۹

اور عقیدتمندی پیدا ہوئی مخدوم جان محمد ہاشم ٹھٹوی سے علمی باتوں پر اکثر بحث ہوا کرتی تھی۔ آپ کثیر التصانیف تھے، وقت کے حاکم آپ کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ سماع دوست تھے، اور علم موسیقی کے جاننے والے۔ شعر بھی آپ کی یادگار ہیں۔ فارسی شعر میں "تسلیم" سندھی اور ہندی زبان میں "بیراگی" تخلص کرتے تھے۔ آپ نے ۱۱۶۱ھ ہجری میں وفات پائی تھی۔ آپ کی تاریخ وفات محمد حسن ٹھٹوی نے موزون کی ہے۔

قطرہ در بحر واصل شد

معین الدین احمد رفت حد حیف
۱۱۶۱ھ ہجری

حضرت مخدوم نعمت اللہ نے فرمایا ہے

شفیع تو رسول
۱۱۶۱ھ ہجری

محمد پناہ رجا نے بھی اس طرح تاریخ وصال نکالی تھی۔

نابی شد او کشف ال محمد معین اوست
۱۱۶۱ھ ہجری

آپ کی بلند مقامی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ آخری دنوں میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اپنے گاؤں میں خاموشی اور فقر اختیار فرمایا تھا۔ "چلیں اپنے دوست کا آخری دیدار کر آئیں" شاہ بھٹائیؒ ٹھٹہ تشریف لے گئے، وہاں سماع کی محفل منعقد ہوئی مخدوم محمد معین بھی اس محفل میں شامل ہوئے۔ عین اسوقت جبکہ محفل شباب پر آئی تو مخدوم صاحب وہاں سے اٹھ کر اندر حجرہ میں چلے گئے، اور وہیں جان بحق ہوئے۔ شاہ بھٹائیؒ کو بہت ملال ہوا۔ آپ نے جنازہ نماز پڑھائی، میت مبارک کو دفن کرنے کے بعد جب وطن واپس ہو رہے تھے، تو فرمایا تھا

"ٹھٹہ میں ہمارا آنا صرف اس دوست کے لئے ہوتا تھا۔ اس کے بعد ہمارا یہاں آنا موقوف ہوا"

آپ باوجود نقشبندی طریقہ پر عامل تھے۔ لیکن سماع کی مجلس میں بھی شریک رہتے تھے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ آپ نے بہت سی تصانیف چھوڑی ہیں۔ اب وہ تقریباً نایاب ہو گئی ہیں۔ جن میں یہ مشہور ہیں:۔

رسالہ فی تحقیق اہل البیت، ۲۔ رسالہ در بحث تناسخ۔ ۳۔ رسالہ فی اثبات اسلام ابی طالب۔ ۴۔ قرۃ العین فی احکام علی الامام الحسین ۵۔ رسالہ فی اثبات الکلام الاحدیث العراۃ

ایک تصنیف رسالہ اویسیہ فارسی میں ہے جو مخدوم صاحب نے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے مذہبی سوال پر ان سے اویسی سلسلہ کی تعلیق کے بارے میں لکھی تھی۔

حضرت شاہ فقیر اللہ صاحب علوی غفار پوری سے آپ کے مراسم تھے آپ نے جو مکتوب جان صاحب کو لکھے تھے ان کا ذکر اپنی تصنیف مکتوبات میں دیا ہے۔ اور مخدوم صاحب کا ذکر بھی کیا ہے جو اس طرح مخاطب کیا ہے۔ "از مکتوبات قدسی آیات طالبان خدا حضرت ایشان ماکر بنام مخدوم محمد معین تتوی صدور یافتہ"

آپ علم تصوف، علم حدیث اور دیگر علوم و فنون کے سرچشمہ تھے۔ ٹھٹہ میں ایک مدرسہ چلاتے تھے جس میں خود تعلیم دیتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مریدوں میں تھے۔ مخدوم صاحب کے بڑے شاگرد گذرے ہیں جو اپنے وقت کے مشہور عالم و فاضل تھے جن میں میر نجم الدین عزلت، مولوی محمد صادق، علامہ محدث محمد حیات سندھی، جعفر شیرازی شرف الدین علی، اور میر مرتضیٰ سیوستانی قابل ذکر ہیں۔ آپ نے سندھی کلام کا آج کہیں بھی پتہ نہیں۔ البتہ فارسی میں کلام موجود ہے۔ ایک شعر نقل کیا جاتا ہے

سگت را خون دل عادم کہ با من آشنا گردد
ندانستم زبخت بد کہ او دیوانہ خواہد شد

---

[1] تذکرہ لطفی جلد اول صفحہ ۶۹۹۔ [2] مکتوبات حضرت شاہ فقیر اللہ علوی مکتوب ۱۰ تا ۲۵ تک۔ صفحہ ۱۰۶

[3] جو فیاضے سندھ مرتب اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۲۴۴

صاحب تکملہ مقالات الشعراء نے مخدوم محمد معین کے ان الفاظ میں تعریف کی ہے ،

"عمدۃ العلماء الربانیین ، قدوۃ المفسرین والمحدثین المخدوم محمد معین قدس سرہ ،"

مخدوم ضیاء الدینؒ

مخدوم ضیاء الدینؒ صاحب فضیلت اور بڑے عالم و عامل گذرے ہیں، آپ مخدوم عصمت اللہ کے شاگردوں میں سے تھے، مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی آپ کے شاگرد تھے، آپ کی ولادت ۱۰۹۱ھ ہجری میں ہوئی تھی، اور وفات ۱۱۷۹ھ ہجری میں اسی ۸۰ سال کی عمر میں ہوئی۔

حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹویؒ[1]

حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹویؒ سندھ کے مشاہیر علماء میں سے تھے۔ ایسی شخصیتوں پر سندھ کو فاخر ہے۔ مخدوم صاحب فریشی خاندان کے فرد تھے، آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی مخدوم عبدالغفور تھا، یہ خاندان ٹھٹھ کے گرد و نواح کے رہنے والے تھے۔ مخدوم صاحب کی ولادت ۱۱۰۲ھ ہجری مطابق ۱۶۹۳ء کو ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے والد کے یہاں ہوئی، مزید تعلیم ٹھٹھ میں مخدوم سعید کے یہاں ہوئی اور تعلیم کی تکمیل مخدوم ضیاء الدین کے یہاں ہوئی اور شرف دستار بندی حاصل کی تعلیم کے دوران آپ کے والد کا انتقال ہوا۔ والد کے انتقال کے بعد ہرام پور کے گاؤں کی طرف ہجرت کی جہاں درس و تدریس کا کام شروع کیا۔ لیکن وہاں کے لوگوں کے حسد کی وجہ سے مجبوراً ہجرت کر کے ٹھٹھ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ جہاں اپنے علم و فضل سے وقت کے بڑے علماء میں شمار ہونے لگے، آپ نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ شریعت کے پابندی پر چلنے کی دعوت دیتے رہے، اور بدعات کے خلاف زبردست جہاد شروع کیا۔ ٹھٹھ اس زمانے میں علم و فضل کا مرکز تھا، مخدوم صاحب کی علمی شہرت دور دراز مقامات پر پہنچ گئی تھی، ہزاروں کی تعداد میں طلباء فیض حاصل کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وقت کے حاکم میاں غلام شاہ کلہوڑہ بھی آپ کے معتقدوں میں شامل ہو گئے۔ اس وقت ٹھٹھ میں شیعہ مذہب زور پکڑ رہا تھا، کچھ عالم تعصبی مذہب رکھتے تھے، شہر میں قبر پرستی کا رواج تھا، اور بدعات کا بھی بڑا زور تھا، مخدوم صاحب نے کوشش کر کے ان بدعتوں پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے، سندھ کے حاکم میاں غلام شاہ کلہوڑہ سے ان بدعتوں کے خلاف ایک پروانہ حاصل کر لیا، جس کا فارسی متن مندرجہ ذیل ہے :-

عمال و کارپردازان حال و استقبال متعلقہ این جانب بدانند کہ حسب مرقوم جناب مخدوم محمد ہاشم در باب ابطال ترویج مقدمات اعلام و منع ماتم و تابوت وغیرہ بدعات ایام عاشورا و منع شرب و جمع مسکرات و قمار بازی و لولی بازی و زنان ماشاطہ و مخنثان و منع رفتن زنان مسلمین در مقابر و کوہستان و باغات زنان و مردان از عبادت در وقت تعزیت و منع مصوری از صور ذی الارواح و منع ہنود از سر برہنہ کردن زنان و چادر بازار و کوچہا و دکانہا۔ و منع مسلمین از گرفتن لحیہ قبل القبض و کشیدن حلقہ ریش و گذاشتن بروت، و منع ہنود از صولی و بکت و سرود و مزامیر دھول و نواقیس و سجدہ پیش اصنام و دریا بطریق علانیہ زجر و توبیخ شدیدہ نمودہ قدغن بلیغ نمایند کہ احدی از رعایا متعرض و مرتکب حرمات و بدعات نشدہ متنبہ گردد و نیز مسلمانان را در باب صلوٰۃ و صیام و سائر عبادات مالیہ و جانیہ تاکید اکید بعمل آرند کہ احدی از ارتکاب ترک آن نمایند درین باب تاکید اکید دانستہ حسب المسطور بعمل آرند و بابت مداہنت بر ذمہ خود دانستہ تخلف نورزند فقیر

تاریخ ۲ شہر شعبان ۱۱۷۴ھ ہجری۔

اس حکم نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹھٹھ میں تاہی زمانہ سے شیعہ مذہب کی بدعات کا رواج تھا، نشیدار منشیات کا استعمال بکثرت ہوتا تھا، عورتیں مزاروں پر بے تکلف جایا کرتی تھیں، وہاں بدکار عورتیں بھی رہتی تھیں وغیرہ۔

میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے آپ کی علمیت و قابلیت کی قدر کر کے آپ کو ٹھٹھ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا ۱۱۷۵ھ ہجری کو حج کرنے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے

---

[1] اخبار الوحید سندھ آزاد نمبر کراچی ۱۵ جون ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۲-۲۳۔

وہاں بڑے بڑے علماء دین سے ملاقات کی جیسے شیخ عبدالقادر صدیقی مالکی، شیخ عبدہ بن علی مصری، شیخ محمد ابو طاہر مدنی اور شیخ علی بن عبدالملک دراوی، جن سے حدیث اور دیگر علوم میں سندیں حاصل کرلیں، جن کو اپنے مشہور مصنف "اتحاف الاکابر" اور "ذبدہ" میں جمع کیا تھا۔ آپ کی ایک تصنیف کے حاشیہ میں دکھایا گیا ہے کہ آپ کو تاریخ ۱۲ رجب ۱۱۲۶ھ ہجری بروز جمعہ مدینہ طیبہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باسعادت کا شرف حاصل ہوا۔ حج سے واپسی کے دوران سورت بندر میں ایک بزرگ حضرت سید محمد سعد اللہ کے مبارک ہاتھ پر بیعت کرکے خلافت کا حلقہ حاصل کیا۔ اس سفر کے بعد باقی عمر خدا تعالیٰ کی یاد اور تصنیف و تالیف میں گذاری۔ آپ کی تصنیفات کا انداز تقریباً ڈیڑھ سو کہا جاتا ہے جو عربی، فارسی اور سندھی زبانوں میں موجود ہیں۔ ان میں بہت سی تصنیفات اب تک شائع نہ ہوسکی ہیں۔ سندھی زبان آپ کی مادری زبان تھی۔ اس میں آپ کی مشہور تصنیف "نافع الاسلام" ہے، جس میں آپ نے اسلامی عقائد کو بڑی توضیح اور تشریح سے پیش کیا ہے۔

تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف کی روایت کے مطابق مخدوم محمد معین اور مخدوم ہاشم ٹھٹوی کے درمیان کچھ علمی اختلافات تھے، لیکن اس حقیقت کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ دین اسلام کی خدمت کے لئے آپ نے جو کوششیں کی تھیں وہ کبھی بھی فراموش کی نہیں جا سکتیں۔ میر علی شیر قانع لکھتے ہیں:[1]

"دین مبین کی تقویت کے لئے جو کچھ اس زمانے میں ہو رہا ہے وہ آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ دین اور مشرکوں پر آپ کا عمل جاری ہو رہا تھا۔ آپ کے ایام میں بہتیروں نے ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔ وقت کے بادشاہوں مثلاً نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی سے آپ کی خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ آپ کے ارشاد کے مطابق، تقویت دین کے لئے احکام کا اجرا ہوتا تھا۔"

شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ نے اپنی تصنیف "شاہ بھٹائی"[2] کا احوال میں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ آپ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے "مخدوم صاحب خود شاہ صاحب پر تشریف لے گئے تھے اور سماع کی مجلس کو منع کرانے کے لئے دوسرے علماء بھی ساتھ لے گئے تھے۔"

میر عبدالحسین خان سانگی نے اپنی تصنیف "لطائف لطیفی"[3] میں لکھتے ہیں کہ جب شاہ بھٹائی کو علماء کے آنے کا پتہ ہوا، تو احتراماً اپنے فقیروں کو ارشاد فرمایا، ان سازندوں کو کسی کمرے میں بند کرتے رکھو، علماء دین تشریف لا رہے ہیں۔ ملاقات کے بعد شاہ بھٹائی نے فرمایا:

"ایک ایسا پودا جو خاص و عام کے نزدیک ہے، لیکن پانی نہ ہونے کی وجہ سے خشک ہونے لگا ہو۔ اگر اس پودے کو کسی پلید تالاب سے پانی دے کر ہرا اور تروتازہ کیا جائے تو کیا اس پودے کو ایسے چھوڑا جائے گا کہ وہ سوکھ کر مر جائے۔ علماء نے یک زبان ہو کر کہا: اس پودے کی حفاظت کے لئے اگر پانی ہی ہے، اپنانا تو لازم ہے کہ خاص و عام کے نزدیک ہے۔ شاہ صاحب نے یہ جواب سنکر فرمایا، میرے دل میں عشق حق کا ایک پودا ہے جس کے سرسبز اور شاداب رکھنے کے لئے سماع پانی کا کام دیتا ہے۔"

روایت ہے، اس مکالمے کے بعد وہی سازندے احتراماً کمرے میں بند کر دیئے گئے تھے، وہ باہر نہ آئے۔ اس بات پر علماء کرام بہت خفا ہوئے، اور کہا کہ ہم جس چیز کو بند کرانے کے لئے آئے تھے، وہی ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ شاہ لطیف نے فرمایا، میرا اس میں کوئی دخل نہیں ہے، آپ خود جا کر دیکھیں، وہ تو خود بخود بند رہے ہیں۔ حقیقت حال معلوم کرنے کے معلوم ہوا تو بات سچی نکلی۔"

اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بات کی بنیاد صرف خوش اعتقادی پر رکھی گئی ہے، کیونکہ صوفیوں کے یہاں سماع کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مخدوم صاحب خود ایک بڑے عالم تھے، ان کو سماع کے متعلق پوری پوری خبر تھی۔ شاہ بھٹائی کے یہاں سماع کی مجلس بڑی پابندی اور ادب سے ہوا کرتی تھی۔ خبر نہیں اس میں کون سی بدعت سمائی ہوئی تھی، جو کہ مخدوم صاحب صرف سازو سرود بند کرانے کے لئے بھٹ شاہ پر تشریف لے گئے تھے۔ دوسری طرف سازوں

---

[1] تاریخ تحفۃ الکرام میر علی شیر قانع۔ [2] احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی مرتبہ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ مرحوم

[3] لطائف لطیفی - مصنف میر عبدالحسین خان سانگی۔

کا خود بہ خود پتا جاتا ہے جو طلب بات ہے واللہ اعلم بالصواب۔

مخدوم صاحب اس علمی نسبت کے مالک تھے جو آج ان کی تصنیفات سے بڑے بڑے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ مخدوم صاحب ایک بلند پایہ شاعر بھی ہیں آپ کے کلام میں دین کی تبلیغ کے عنصر ملتے جاتے ہیں۔ آپ کی ایک مشہور تصنیف "قصہ اسدہ" مشہور ہے جس سے آپ کے وطن دوست ہونے کی ایک روشن مثال ملتی ہے۔ مخدوم صاحب نے ۱۱۷۴ھ ہجری مطابق ۱۷۶۰ء میں ستر برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔ آپ کو مکلی کی پہاڑی پر دفن کیا گیا۔ آپ کے ایک شعر کی تصنیف "نما الاسلام" سے ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔ جس سے اسلام کے عقائد کا بڑی تفصیل سے پتا چلتا ہے

سب سارھون، تنھن صاحب کي جوڙيا جنھن جهان۔

عرش خلقيائين هيٺ، زمينون ۽ آسمان۔

آپ هيائين تارن سان رحمتون روشنان۔

پيدا هيائين قدرت سان هوڙين لک انسان

هي ڪافر هيائين، تن منجهان هي پڻ مسلمان۔ (الخ)

"سب توصیف اس صاحب (رب) کی ہے۔ جس نے جہانوں کو پیدا کیا، عرش و کرسی زمین و آسمانوں کو بنایا۔

اپنی رحمت سے آسمان میں تاروں کو روشن کیا، اپنی قدرت سے اس نے لاتعداد انسان پیدا کئے، ان میں کو کافر تو ان کو مسلمان کیا"

یہ پوری تصنیف آزاد نظم میں ہے اور بڑی شستہ سندھی میں لکھی گئی ہے۔

حضرت سلطان الاولیاء خواجہ محمد زمان قدس سرہ۔

سلطان الاولیاء حضرت خواجہ محمد زمان قدس سرہ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی شیخ حاجی عبداللطیف نقشبندی تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا کر ملتا ہے۔ آپ کا خاندان ٹھٹہ کے نواری کی سمتی میں رہتا تھا۔ جو عہد خلیفہ ہارون الرشید کے دور خلافت میں عرب سے جنگ کرتے سندھ میں الرٹھٹہ میں آباد ہوا تھا۔ سومرہ اور سمہ کے دور حکومت میں ملک سے آمد و رفت انتہائی دشوار ہو گئی تو خواجہ ٹھٹہ کو چھوڑ کر کچھ (رنگستان) میں جا کر سکونت اختیار کر لی لیکن روحانی تعلقات سندھ سے قائم رہے۔ ۹۱۰ھ ہجری مطابق ۱۵۰۴ء میں مریدوں کی منت سماجت پر واپس وطن واپس گئے۔ خواجہ صاحب تاریخ ۲۲ ماہ رمضان المبارک ۱۱۲۵ھ ہجری مطابق ۱۷۱۳ء کو تولد ہوئے۔ آپ کی ولادت کی تاریخ ابجد کے حساب سے قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے نکلتی ہے

"اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ"

"تحقیق وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے"

آپ کی ابتدائی تربیت اپنے والد بزرگوار کے زیر نظر ہوئی۔ انہیں سے قرآن مجید کو حفظ کیا۔ ظاہری علوم کی تحصیل مخدوم محمد صادق تھیسدی سے ہوئی، وہاں عربی اور فارسی علوم کی تعلیم مکمل کر لی۔ تحصیل علوم کے بعد ٹھٹہ کے ایک کامل بزرگ خواجہ ابوالمساکین نقشبندی کے مریدوں میں داخل ہوئے۔ مرشد کی فیض پرور نظر سے آپ کو خلافت کا اعزاز حاصل ہوا۔ خواجہ ابوالمساکین نے آپ سے خوش ہو کر اپنے ہاتھوں سے طریقت کے تعلیم کی سند لکھ دی جس کا متن یہ ہے[1]

ويقول الشيخ محمد: لما كان الآخ في الله محمد الزمان سلك في سلك الارادة وصحب مع المسكين صحبة كثيرة اجزته بتعليم الطريقة وشرط الاستقامة على الشريعة والطريقة والسلام۔

(شیخ محمد کہتا ہے: چونکہ خدا تعالیٰ کی راہ میں میرے بھائی محمد زمان مریدی میں شامل ہوئے ہیں۔ اور اس مسکین کی صحبت میں بہت وقت گذارا ہے، اس لئے، ان کو طریقت کے تعلیم کی اجازت دے دی ہے اس شرط پر کہ آپ شریعت و طریقت پر قائم ہونگے۔ ..... والسلام

---

[1] ابیات سندھی۔ مرتب علامہ شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ مرحوم حاشیہ ط۔ ج

مرشد نے اپنی دستار مبارک اُتار کر آپ کے سر پر رکھی اور اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ خواجہ صاحب کی بیعت کریں۔ آپ کے مرشد حج کو جانے کے وقت خواجہ صاحب کو اپنی مسند پر بٹھا کر گئے۔ آپ کے والد بزرگوار نے ۱۱۴۹ھ ہجری مطابق ۱۷۳۶ء میں رحلت فرمائی۔ آپ نے اُس وقت قدیم لنواری کو چھوڑ کر حدید لنواری میں منتقل ہو گئے جس کو آپ نے خود آباد کیا تھا۔ آپ یہاں بیٹھ کر لوگوں کو فیض پہنچاتے رہے۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی، زندگی کے آخری ایام میں خواجہ صاحب کی ملاقات کے لئے لنواری تشریف لائے تھے۔ حالانکہ خواجہ صاحب نے ظاہری علوم کی تحصیل شاہ بھٹائی کے ایک مرید مخدوم محمد صادق نقشبندی کے یہاں حاصل کی تھی، لیکن اس نوجوان عارف کو دیکھنے کے لئے شاہ صاحب دور دراز سفر طے کر کے لنواری شریف تشریف لے گئے تھے۔ جب آپ حجرہ کے دروازہ پر پہنچے تو ایک خادم کو اندر آنے کی اجازت کے لئے بھیجا۔ خواجہ صاحب نے کہا، شاہ صاحب سے کہو ذرا "صرف ایک ہم استقبال کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ شاہ بھٹائی نے خادم سے دریافت کیا "آپ کیا کر رہے ہیں۔ خادم نے جواب دیا خاموش بیٹھے تھے۔ شاہ بھٹائی نے کہا اس صورت میں خبر نہیں کب فارغ ہوں گے اور ہماری طرف متوجہ ہوں گے۔ تب خود اندر تشریف لے گئے۔ ملاقات کے دوران شاہ صاحب نے سوال پوچھا "فنا کے بعد بھی کوئی علم ہے" خواجہ صاحب نے جواب کے بجائے سوال کیا۔ "فنا سے پہلے بھلا کیا ہے" یہ سن کر شاہ صاحب نے عرض کیا، ارادہ ہے کہ آپ کا مرید ہو جاؤں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "سماع ہماری طریقت میں سوائے کسی خاص موقع کے سوائے حرام ہے"۔ شاہ صاحب نے فرمایا "پوری زندگی سماع میں گذری ہے، آپ اس کو ترک کرنا محال ہے"۔ پھر کافی وقت تک آپس میں باتیں کی جب شاہ صاحب نے اجازت چاہی۔ تب خواجہ صاحب نے آپ کو خلافت کی چادر عنایت کی۔ کہتے ہیں شاہ صاحب نے وصیت فرمائی تھی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو یہ چادر کفن کے اوپر رکھی جائے۔ ملاقات کے بعد شاہ صاحب جیسے خواجہ صاحب کی شان میں کہتے تھے،

مون سين ڏٺا ماڻ، جنين ڏٺو پرين کي،

تنهين سندي ڪاڪري نہ سگهان ڳالهڙي.

"ای میری ماں! میں نے دیکھا ہے اُنہیں، میں نے دوست کا دیکھا جمال، یہ حقیقت ہے کہ میں اُن کی عظمت کا بیان کر نہیں سکتا"

کہتے ہیں آخری زندگی کے ایام میں آپ نے حجرہ بنوانے میں بڑی جلدی کی۔ اور جب حجرہ تیار ہو گیا، تب خود اُس میں رہنے لگے۔ کسی اور کو بغیر وضو کے اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ اکثر تمام رات حجرہ میں رہتے تھے۔ کہتے ہیں ان دنوں اکثر حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معنوی ملاقات کا شرف حاصل ہوا کرتا تھا۔ لیکن دوستوں سے فرماتے تھے ہر جمعہ کی رات سو مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھیں۔ ۱۱۸۸ھ ہجری میں آپ کی بیماری نے شدت اختیار کر لی۔ ماہ رمضان میں آپ بستر سے اُٹھنے کے قابل نہ رہے۔ وفات سے چند ساعت پیشتر آپ نے اس بیت کی تکرار کرتے رہے۔

اوڏڻ اوڏي آءُ تو کي لاکي هو ڏيو.

لهي تو شاهه سندو متي ماصرو

"اے اُوڈن (مٹی اُٹھانے والی) قریب آجا، تجھے سردار لاکھے نے طلب کیا ہے۔ تاکہ تیرے اُوپر جو خاکبازی کا معاملہ ہے وہ اُتر جائے۔"

حافظ شیرازی نے اس قبیل میں فرمایا ہے۔

این جان عاریت کہ بحافظ سپرد دوست

روزی ببینم آرا تسلیم وے کنیم

یہ اشعار جان جس کو دوست نے حافظ کو سپرد کی ہے۔ ایک دن اُسے دیکھنے دیکھتے ان کے سپرد کر دینگے۔

تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف نے حضرت خواجہ محمد معصوم کے روحانی رتبہ کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

تاریخ تحفۃ الکرام ۔ صفحہ ۱۶۴۔

"میاں محمد رمضان، مشہور مرشد میاں ابوالقاسم نقشبندی اور محمد نقشبندی ٹھٹوی کے مرید تھے، بڑے باعظمت، سلسلہ نقشبندی کے مریدوں میں مرجع اور صاحب کرامت بزرگ تھے، بدین کے قریب موضع لواری میں سکونت اختیار کی تھی۔ اور ایک زمانہ کو اپنے دریائے فیض سے سیراب کرتے تھے۔ لاتعداد لوگوں کا اعتقاد ہے کہ یہ اپنے عہد میں بے مثل تھے۔ بظاہر آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کے باوجود، ان کا لنگر جاری رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک گروہ حقیقت کو سمجھے بغیر ظاہر کو دیکھ کر ان پر طعن کیا کرتے ہیں۔ انہیں ایام میں اس دار فانی سے رحلت ہو کر داعی حقیقی سے جا ملے ہیں۔ آپ کا سن وفات ۱۱۸۸ھ ہجری ہے۔"*

صحیح تحقیق کے رو سے آپ نے ۲ ذوالقعدہ ۱۱۸۸ھ ہجری مطابق ۱۷۷۴ء عیسوی کی صبح صادق کے وقت رحلت فرمائی۔ اس وقت عمر ۶۳ سال تھی۔ تاریخ وصال اس قطعہ سے نکلتی ہے جسے سید غلام حسین حضروی نے موزوں کیا ہے۔

هردو عالم شده است عرض بتو
کن قبول از یکی که به دانی
گفت آواز جواب وهم تاریخ ...
به زهی فنا وصال عرفانی.
۱۱۸۸ھ ہجری

آپ کے ابیات کو ایک مرید و خلیفہ حضرت مخدوم عبدالرحیم گرہوڑی نے ملفوظات کے سلسلہ میں جمع کیا تھا۔ اور ان کے ساتھ ساتھ ماہی زبان میں شرح بھی لکھی۔ شمس العلماء ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم نے بڑی کاوش سے ان کتابوں کا سراغ لگایا۔ متن اور شرح کا ترجمہ اپنی عالمانہ مقدمہ کے "ابیات سندھی" کے نام سے شائع کرایا۔ خواجہ صاحب کی زندگی کا احوال تذکرہ نقش ملفوظ اول میں مخدومی مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی سے بھی تفصیل سے دیا ہے۔ اس کے علاوہ الحاج ڈاکٹر ہوچمند گرغانی نے بھی اپنی تصنیف "لنواری جا لعل" میں ذکر کیا ہے۔

رسالہ ابیات سندھی کا شمار تصوف کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ جس میں انتہائی پیچیدہ مسائل کو سادہ اور عام فہم انداز میں حل کیا ہے۔ جس سے آپ کے اعلیٰ فکر اور بلند تخیل کا پتہ ملتا ہے۔ آپ خلیفہ مخدوم عبدالرحیم گرہوڑی نے ایک ابیات سے متعلق یہ رائے دی ہے۔

(ان ابیات میں جو صوفیانہ نکتے بیان کیے گئے ہیں، وہ ایک طالب کو مشاہدۂ الٰہی کا ذوق پیدا کرنے کے لئے ہیں۔ اور یہ ان کے مقاصد میں شامل ہیں)

یہ تصنیف، آغاز سے لے کر انجام تک تصوف کی تلقین سے پُر نظر آتی ہیں۔ مثال دیئے جاتے ہیں۔

فعل شریعت، حب طریقت، هيون حقيقت هوءِ
معرفت نالو آهه پيرو ٿئ پار. سيئ

"فعل شریعت کے مطابق ہونا چاہئے، خلق خدا کی محبت طریقت ہے اور قلب حقیقت کا آئینہ ہونا چاہئے۔ معرفت نام ہے خدا کے عظیم کی طرف جانے کا"

سچيءَ ڏوجهن ۔ تن ڏسڻ نيرگناهه ،
جنين لڌيه راه ، ويڻ تنين ته ٿيو ،

جنہوں نے محبوب کو دیکھا، ان کے لئے غیر کی طرف نگاہ اٹھانا گناہ ہے۔ جن کو مراد مسلم مل گئی، ان کے لئے بھٹکنا دھر مقتل ہو گیا۔

محب جهڙي آهه حقيقت حبيب جي
نكو چئو سوڻي ، نسو سلو تا
شفق جي ساجا ، جامع ليل و نهار هو .

میرے دوست کی حقیقت کتنی عجیب ہے۔ یہ لوگ اپنے خالق کو کہتے ہیں یہ ہی مخلوق۔ اس کی مثال تو شفق کی سی ہے جو اس کو دن سمجھے یہ ہی رات بلکہ لیل و نہار کا جامع کہلائے
(حضرت سندھی)

فقیر صاحبڈنہ فاروقیؒ

فقیر صاحبڈنہ فاروقیؒ، خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن خطاب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔ فقیر صاحبڈنہ فاروقی کے آباؤ اجداد نے حجاز سے ہجرت کرکے عراق میں سکونت اختیار کی تھی، جن میں حضرت شیخ شہاب الدین اپنے علم و فضل اور سیاست کی وجہ سے مشہور ہیں۔ عراق کے مشہور والی حجاج بن یوسف ثقفی نے سندھ دیبل کے واقعہ کے بعد سندھ پر دوبارہ فوج کشی کا ارادہ کیا تو انہوں نے اپنے عزیز محمد بن قاسم و اباڈا ہرتے مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ جب اس فوج کے ساتھ جہاد کی خاطر شیخ شہاب الدین بھی سندھ میں آئے۔ دیبل کی فتح کے بعد جب سندھ فتح ہوا تو شیخ شہاب الدین بھی سندھ میں مقیم ہوئے اور سیوہن سے ہجرت کرکے تھر کے ایک گاؤں لڈبی میں سکونت اختیار کی۔ فقیر صاحبڈنہ فاروقی اس گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اس کامل درویش کی پیدائش ۱۱۱۰ ہجری مطابق ۱۶۹۷ء تھا۔ آپ کو بچپن میں ہی محمد حافظ کے لقب سے پکارتے تھے۔ اسی گاؤں میں اپنی تعلیم حاصل کرلی۔ آپ کی طبیعت کا رجحان فقر اور تصوف کی طرف مائل ہوا۔ حضرت عبداللہ قادری دہلوی کی مریدی میں داخل ہوئے۔ اپنی زندگی کا طویل عرصہ عبادت الٰہی اور نفس کے تزکیہ میں گذارا۔

روایت ہے فقیر صاحبڈنہ نے ایام جوانی میں کلہوڑہ حکمران کی ملازمت اختیار کی تھی، لیکن جلد ہی ملازمت سے بیزار ہوگئے اور ترک ملازمت کرکے گوشہ نشینی اختیار کی۔ آپ نے ایک مرید دراز ونڈیرو نے ایک نئی بستی، دراہ کے نام سے آباد کی۔ آپ لڈبی سے ہجرت کرکے دراہ میں آکر مقیم ہوئے جہاں ۱۱۸۸ھ میں وفات پائی۔ آپ کو دو فرزند تولد ہوئے، ایک میاں صلاح الدین اور دوسرا میاں عبدالحق۔ میاں صلاح الدین، حضرت عبدالوہاب سچل سرمستؒ کے والد تھے۔ سچل سرمست کی ولادت ۱۷۳۹ء میں ہوئی تھی اور آپ کی تعلیم و تربیت اپنے دادا میاں صاحبڈنہ فقیر کے زیر نگرانی ہوئی۔ یوں کہ آپ کے والد کا عین جوانی میں انتقال ہوا۔ میاں عبدالحق کا فقر میں بڑا مقام ہے۔ وہ سچل سرمست کے مرشد تھے۔

روایت ہے، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اکثر فقیر صاحبڈنہ سے ملاقات کرنے دراہ آتے تھے۔ اس وقت سچل سرمست کی عمر سات سال کی تھی۔ شاہ لطیفؒ نے جب اس نونہال بچہ کو دیکھا تو فرمایا "تم نے خود بگڑی چھڑیا ہے اسکا ڈھکنا یہ بچہ اتارے گا" آگے چل کر یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

فقیر صاحبڈنہ اپنے وقت کے قادر الکلام شاعر تھے۔ لیکن آپ کے کلام کا بڑا حصہ مرور ایام کے باعث ضائع ہوگیا ہے۔ پروفیسر لطف اللہ بدوی مرحوم کی تحقیق کے مطابق آپ کے کلام (کافیوں) کی طرز اور ان کی بندش کو دیکھکر ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ کافیوں اور صاحبڈنہ کی کافیوں میں کوئی اتنا فرق نظر نہیں آتا۔ شاہ لطیفؒ فقیر صاحبڈنہ کے کلام سے واقف تھے یا نہ لیکن صاحبڈنہ فاروقی آپ سے ہمعصر تھے، ہوسکتا ہے کہ فقیر صاحبڈنہ پر شاہ صاحب کے صوفی شعراء کے کلام کا اثر ہو، بہرحال کافی کی صحیح تاریخ مرتب کرنے کے لئے اس حقیقت کو غور سے دیکھنا ہوگا۔ آپ کا جو تھوڑا سا شعر باقی رہ گیا ہے ان سے آپ کے بلند مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثال پیش کئی جاتی ہیں۔

پاڻ پنهنجو پاڻ ڀي، جن پيو نا پيهي،

صاحبڈنہ صورت جي، عل تنهين عيهي،

تنهنکان وهاي، ويٺي، چپ چنبيڊي راتڙي،

(جنہوں نے خود کے اندر داخل ہوکر خود کو دیکھا ہی نہیں، صاحبڈنہ کہتا ہے، انہیں صبح صورت کو کوئی جڑی ہی نہیں، ان کی رات بیکار خیالات میں ضائع ہوگئی۔)

فکر فرحي جي آنٽي ڀير مراقبو،

دلبن جي درياه ۾، ٿيي ڏٺي سي،

سي سهي پريان پن، ٿنڊ عادت ٿيي،

(جنہوں نے فکر کی فرحی کو سامنے رکھا، اور ہر وقت مراقبہ میں گذارا، انہوں نے دل کے دریا میں جو کچھ دیکھا ہے، وہ سوچے میں اپنے دوست کو دیکھتے ہیں، نیند کی عادت ہے۔)

نہ تذکرہ لطفی جلد اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۵۶۵۔

حضرت مخدوم شہید عبدالرحیم گرھوڑی قدس سرہ۔

حضرت مخدوم عبدالرحیم گرھوڑی[1] کا شمار سندھ کے بڑے جید عالموں، مشائخ اور صوفیوں میں ہوتا ہے۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی مخدوم محمد اللہ تھا، اور وہ ذات کے مگرمچھ تھے۔ آپ کی ولادت عالباً ۱۱۵۲ھ کو خیرپور میرس کے ایک شہر امیرور میں ہوئی۔ بچپن میں آپ کی تعلیم و تربیت اچھی طرح ہوئی، گرھوڑی علوم ظاہری علوم سے آراستہ تھے اور روحانیت کی طرف بھی آپ کا رجحان تھا اس وجہ سے روحانیت میں فیض حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ کچھ عرصہ شہید عنایت اللہ صوفی کے خلیفہ میاں ابن سمی اوڈھار کی صحبت میں تھوک میرپور کی درگاہ میں رہ کر گذارا۔ اس سمی سے آپ کو لنوارہ جانے کا مشورہ دیا، اس کے بعد خیرپور سے ہجرت کرکے گرھوڑ (ضلع تھرپارکر) میں سکونت اختیار کی اور وہاں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ آپ جید عالم اور سلسلہ کے بہت متوقین تھے۔ خواجہ محمد زمان[2] کی زیارت اور لنوارہ شریف کو جانا بھی ایک اتفاقی واقعہ ہے۔ اس زمانہ میں سندھ کے اولیاء خواجہ محمد زمان کے فیض کا چرچا عام تھا، ان کے روحانی فیض کی خوشبو مخدوم تک بھی پہنچ چکی تھی۔

روایت ہے ایک مرتبہ ظہر کی نماز کے لئے وضو کر رہے تھے کہ دور سے ایک مسافر نے سلام کرکے گھوڑے کو باندھنے کی اجازت طلب کی تاکہ وہ بھی وضو کرکے نماز پڑھ لے۔ نماز کے بعد آپ نے مسافر سے سفر کی روئداد معلوم کی۔ مسافر نے جواب میں کہا میں لنوارہ شریف اپنے مرشد کی خدمت کا رہا ہوں۔ مسافر جانے لگا تو مخدوم صاحب نے حضرت خواجہ کے لئے ایک پیغام دیا جو اس طرح تھا۔

"اپنے پیر سے یہ دریافت کرنا کہ وہ راستہ جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (معراج شریف) آسمان کی طرف تشریف فرما ہوئے تھے، وہ صرف آپ کی ذات گرامی کے لئے مخصوص تھا یا دوسروں کے لئے بھی کھلا ہوا ہے، صوفی کے عروج اور ترقی کا سلسلہ نبی سے کیوں کہ عروج کی انتہا جو ہے نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج مبارک کی کیفیت پر ختم ہو چکی ہے۔"

مرید یہ پیغام لے کر خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچے لیکن آپ کے دیدار میں ایسے محو ہو گئے کہ پیغام دینا بھول گئے۔ جب واپس ہونے لگے تب خواجہ صاحب نے مرید سے پیغام کے بارے میں کہا مرید کو مخدوم صاحب کا پیغام یاد آیا اور پورا کا پورا عرض کیا۔ جواب میں خواجہ صاحب نے فرمایا۔ ان سے کہنا:۔

"جب بغداد کے سلطان کے لئے دجلہ ندی پر پل بنوائی گئی تھی، تو سب سے پہلے اس پل سے سلطان گذرے تھے، وہ پل اب تک قائم ہے اس سے خاص و عام گذرتے ہیں لیکن اپنے مرتبہ اور درجے کے مطابق۔"

مرید نے جب یہ جواب سنا تو گرھوڑی صاحب بلا تاخیر لنوارہ شریف تشریف لے گئے۔ اور خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہو گئے۔ اور بڑا رتبہ حاصل کیا۔ خواجہ صاحب کے بڑے خلیفہ تھے۔ مخدوم صاحب کی سوانح پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے وقت میں دین کی بڑی خدمت کی۔ بڑے مبلغ تھے، آپ نے شرک اور بت پرستی کو ختم کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دی، کیوں کہ آپ کی شہادت بھی اسلام کی تبلیغ کے لئے جہاد کرتے ہوئے ہوئی۔ مخدوم صاحب، اپنے مرشد سے فیض حاصل کرکے گرھوڑ پہنچے۔ اس وقت سے اتنے ملال میں آ گئے کہ خود کو درجہ کی بلندی سے گرا سمجھتے اور یہ بیت بار بار ورد زبان رہتا تھا

فرزند بی بی فاطمہؓ جا، ناحق حسن حسین۔

دیو و لنڈی سین، پاسو پٹ نہ کوڑیاں۔ اللہ اکبر، عوفی تکبیر۔

"حضرت بی بی فاطمہؓ کا فرزند، کس طرح ناحق قتل ہوا، جب تک اس کا بدلا نہ لے لیں تب تک آرام سے نہ سوئیں گے۔ اللہ اکبر۔ تکبیر ہے:۔

یہ کہہ کر پانی کا بھرا ہوا کوزہ اپنے سر کے اوپر ڈالتے تھے پورا پانی سر میں جذب ہو جاتا تھا۔ جب یہ حقیقت لنوارہ شریف پہنچی تب ہدایت ملی وہ اس وقت

---

[1] کلام گرھوڑیؒ مرتب علامہ ڈاکٹر عرس محمد داؤد پوتہ صفحہ ۱۰۔ [2] تذکرہ لطیفی جلد اول مصنف پیر سراج اللہ ندوی صفحہ ۶۵۶

[3] ایضاً ——— بروایت سنگھار فقیر صفحہ ۱۶۔ ———

جلال میں ہے۔ کوئی بھی ان کے نزدیک نہ جائے ورنہ اگر کوئی نقصان نہ کر بیٹھے۔ آپ کو کیلا کے بیجا "دنیا کے رسومات کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیئے" مرشد کا پیغام سن کر
رنج کم ہوا۔ اور کہنے لگے میرا ارادہ تھا کہ شیطان کو اس دنیا سے نکال کر باہر کروں لیکن اجازت نہ ملی۔

حضرت مخدوم عبدالرحیم گرموڑی" بڑے صاحب تھے۔ وقت کے علماء سے بڑے مناظرے کئے آپ کی زندگی میں آپ سے بڑے کارنامے ہوئے تھے۔

۱۔ کارنامہ:۔ آپ نے پیر پتھورہ کی گرجا (چرچ) کو ختم کرکے خود جاکر اُن کی مزار پر قبہ تعمیر کرایا اور اذان دی تاکہ عوام سمجھے کہ پیر پتھورہ مسلمان تھے نہ کہ ہندو
جیسے کہ ان کے مرید منگھوار قوم سمجھتی تھی پیر پتھورہ حضرت غوث علاؤالدین ذکریا ملتانی کے مرید اور بڑے صاحب کرامت تھے۔

۲۔ کارنامہ:۔ شیدو خان محمد کے نزدیک ایک درخت کے دو شیطان تھے، جس میں جادوگر مکین تھے۔ وہ لوگوں کو مسلمانوں کو لگاڑتے رہتے تھے۔ مخدوم
صاحب نے اپنے دو مریدوں کو وہاں یہ ہدایت دیکر بھیجا کہ ان درخت کے تنوں کو کاٹ دو جس میں دو سانپ نکلینگے اگر دونوں کو تم نے مار ڈالا تو وہاں شیطان کام
نہ ہوگا۔ اگر جادوگر جاگ گئے تو وہاں سے بھاگنا ورنہ جان کا خطرہ ہوگا۔ میں رسی کو تنگ کرنے نہیں اٹھاؤنگا۔ مرید دونوں آدمیوں نے موقع پر پہنچ کر
آپ کے حکم مطابق ایک تنے کو کاٹا جس سے ایک سانپ نکلا چنانچہ اسکو وہیں مار دیا۔ لیکن دوسرا تنا کاٹا تو اس میں سے بھی سانپ برآمد ہوا
لیکن جادوگر جاگ اٹھے۔ مرید وہاں سے نکل کر بھوڑ پہنچے۔ آجکل اس جگہ جبلہ لگتا ہے جسے آدی کا جبلہ کہتے ہیں

۳۔ کارنامہ:۔ یہ سب سے بڑا کارنامہ تھا جو راہ اسلام اور دین کی بقا کے خاطر انجام دیا۔ جس میں تعداد نے بھی ہوئی۔ یہ ایک مہادیو کی مڑھی تھی جس کا ذکر
سرگذشت فقیر نے مرغوب الاصحاب اور فردوس اعمار میں کیا ہے۔ مڑھی نیپور ریاست کے ضلع میں ایک گاؤں منھونگو میں تھی، کہتے ہیں
یہ مڑھی ۵۰۰ ہجری میں بنی تھی۔ مڑھی کی بنیاد ڈالنے والا منگاھل نے کر نکلا تھا۔ جس جگہ پانی نہ ہو اور تو اس میں منگاھل کے برابر ہوگا وہاں مڑھی
بنائیں گے۔ بڑی تلاش کے بعد اس جگہ کا پانی برآمد ملا اور وہاں مڑھی بنائی گئی۔ اس مڑھی کی وجہ سے اسلام کو بڑا نقصان ہو رہا تھا کیونکہ مڑھی کا صیبت
ہندوؤں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ بارہ سو سال سے مڑھی کا صیبت ہندوؤں کے دل پر تھا۔ جو کہ بڑی طاقت والا مہاراج تھا، جس کے ہزاروں ہندو اور مسلمان
معتقد تھے۔ مخدوم گرموڑی" کو اس بات کا بہت رنج تھا، اور یہی تمنا تھی کہ کسی طرح سے اس بدعت کو ختم کردیں۔ گرموڑی صاحب نے ایک دن عام منادی کرادی کہ کوئی
غازی ہے جو جہاد فی سبیل اللہ میں شہید ہونا پسند کرے۔ اس اعلان پر باصر محامد آپ کا ساتھ دینے کے لئے حاضر ہوئے۔ گرموڑی صاحب کی دعا سے ٹالپوروں کو
حکومت ملی تھی۔ لیکن افسوس سردار ماں سے مدد نہ ملی۔ جواب میں کیلا کے بھیجا۔ اب اور صیبت دونوں مقرر ہیں ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اور منیت تو بلائے
بیجا مگر نہ کی لڑائی سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس طرح مجاہدوں کی مختصر جماعت شہر کے قریب پہنچی تو دیکھا کہ ایک اشکول کھوم رہا ہے جو شہر میں گشت
کرکے گوشت گیہوں، چاول، گھی وغیرہ جمع کرکے بڑی دیگ میں ڈالتا رہتا تھا۔ جب میں خبر سنی کہ لاتعداد افراد کے کھانے کے باوجود اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی
گرموڑی صاحب نے اپنے ہاتھ سے خنجر نکالکر اس حکم دیا کہ کشکول کو آگے جانے نہ دے چاہے کشکول ادھر ہی جاتا تھا۔ صرف اس تعاقب کرنا تھا۔ اور اسے مار مار کر آگے
بڑھنے سے روکتی تھی۔ کشکول واپس جاکر مہاراج کے قدموں میں گرا۔ جب سوامی کو اس بات کا پتہ ہوا تو بات سمجھ گئے۔ لیکن صاحب نہ سمجھا کہ ایک درویش سے
لڑائی۔ کیونکہ اُن کی دعا سے سرداروں کو حکومت ملی تھی۔ صدیوں نے بڑی منت کی اور بے شمار دولت حاضر اور حسین عورت پیش کی لیکن محامد نے جواب میں
اسلام قبول کرلو لیکن سوامی نے اسلام قبول کرنے سے انکار کردیا۔ تو آپ چند شرائط قبول کرنے کو کہا۔ اور ان کی عدم قبولیت کی صورت میں یہ تنبیہ کردی اگر کوئی
شرط تمہیں قبول نہیں تو فیصلہ تلوار کریگی۔ شرائط مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ صدیوں کا سردار ہمارے پاس آجائے ہم اسے چالیس راتیں ایک جگہ مقرر ہونگے جس میں کوئی کجڑکی نہ ہوگی۔ دروازہ مقفل ہوگا یا جس مسلمانوں کا نمائندہ بن کر اس طرح تمہارے
پاس رہوگا۔ جس فریق کا آدمی مرجائے وہ دوسرے کا مطیع ہوجائیگا۔

۲۔ دونوں کا لشکر ایک مقرر جگہ پر آمنے سامنے رہیں اور ہندوؤں کے سردار سپہ سالار کشتی لڑیں جو ہارے وہ مطیع ہوجائیں۔

۳۔ سوامی اور مجھے ایک ہی کانٹے سے تولا جائے۔ حالانکہ میں اس سے بہت کمزور ہوں اگر اس سے ورزن زیادہ ہوا تو وہ اسلام قبول کریں یا میں ہندو بنجاؤنگا

۴۔ ہندو اپنے ہتوں کے سامنے راگ رنگ کی رسمیں ادا کریں جب جوش میں آجائیں تو میں بھی سچا وہاں پہنچ جاؤں گا۔ مجھ پر تصوف چلائیں یا میں اپنے ذکر کے حلقہ میں
سنگ ماؤں سمجھا اور اکیلا آپ قدم قدم سے دور کھڑے رہیں۔ وہ از خود کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو کر اسلام میں داخل ہو جائیں گے

۵۔ آخری شرط جہاد سے جنگ کے لئے میدان آئے ہوئے ہیں۔

اس پیغام نے مخدوم صاحب نے اپنے آپ کو کئی دنوں تک رب میں دن رات کے مناجات سے پوچھا اگر مخدوم چار شرائط قبول نہ کریں تو پھر کیا صورت ہے سننے کیا
فلاح صاحب آنند کا فرائت صلاح "گرھوڑی صاحب نے کہا تو ہم شہید ہو کر دفن ہو جائیں۔ ہندوؤں نے ایک بھی شرط قبول نہ کی تب گرھوڑی صاحب نے ان سے کہا
اپنا کنکول منگوا کے ان سے پوچھو، جب اس سے پوچھا گیا تو وہ خاموش رہا گرھوڑی صاحب نے کہا میرے اس پیالے (جھولی) سے پوچھو، تو پیالے سے آواز آئی "دین دین"
سامعین سے کہنے لگا پیالہ دین دین کی آواز آ رہی ہے۔ سب ایک دم حق حق کی آواز اٹھنے لگی دین کر دو دوست، دوستی جاں پر لے گئے۔ آپس میں مشورہ
کرنے کے لئے اشارے چاہیں، تو اسی میں مرہٹوں کا آپس خط ملا جس سے وہ خبردار ہو گئے اور کمک کے لئے تیار ہو گئے۔ دشمن کے لشکر کی تعداد زیادہ تھی،
حاضرین صرف سترہ تھے، سوائی دت گرھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھا مخدوم صاحب نے اپنے ساتھی سے کہا اس پر بندوق چلاؤ تو صرف ایک گولی
لگی سے سوائی گھوڑے سے گر گیا، اور اس کا پاؤں رکاب میں پھنس گیا، ہندوؤں کے لشکر نے اسے اسی حالت میں دیکھا تو اس پیچھے سے دوڑے تو مانند حملہ
ہوا دشمن کے لشکر نے مخدوم صاحب پر حملہ کیا دن سے آپ جب زخمی ہوئے بقول علامہ ڈاکٹر نوید مرحوم کے آپ جنگ میں شہید ہوئے، لیکن
ڈاکٹر سید خان نوید کی تحقیق کے مطابق، مخدوم صاحب جنگ میں شہید نہ ہوئے تھے۔ بلکہ میدان جنگ سے بعد اس پہاڑی کی چوٹی پر سوار ہو کر نو دشمن
کے دو آدمیوں نے زیارت کے لئے آپ کو زخمی کر دیا تھا۔ اپنے زخموں کے باوجود مخدوم صاحب کے جسم مبارک سے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرا سوائی کی فوج پر
خدائی مصیبت نازل ہوئی، اور پورا لشکر تباہ ہو گیا۔ مخدوم صاحب کے ساتھ اصحاب شہید ہو گئے۔ مخدوم صاحب نے اپنے رفقاء کو حکم دیا اس بت خانہ کو توڑ کر
مسمار کر کے اس جگہ مسجد تعمیر کریں چنانچہ جب یہ سب انتظام ہو گیا، تب چند دن کے بعد مرشد فرمائی، اور شہادت کا جام پی لیا۔

آپ کی جسمانی مبارک کو گرھوڑی میں لا کر دفن کیا۔ مرغوب الاحباب کے مولف کی ایک قلمی سے آپ کی تاریخ وفات نکالی گئی ہے جس کے آخری شعر نکلتی ہے۔

زدست ساقی دہر آنہ رین دیر — مئی تلخ شہادت دکشیدہ

چوں تاریخ معالش جستم از دل — جواب آمد بحق خلوت گزیدہ۔

۱۱۹۲ ہجری۔

یہ واقعہ ۱۱۹۲ ہجری مطابق ۱۷۷۸ء میں ہوا، اس وقت آپ کی عمر چالیس برس تھی، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ملاقات گرھوڑی صاحب سے ہوئی تھی۔ علامہ ڈاکٹر دانو دیوانہ اپنی
تالیف کلام گرھوڑی میں دو روایتیں دی ہیں

پیالہ جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ وہ پیالہ شاہ بھٹائی کی معرفت ملا تھا۔ ایک مرتبہ شاہ لطیف نے اپنے مقبروں سے کہا امانت آ گئی ہے جس کو نکالنے کو
مالک نے پاس بھیجا ہے۔ شاہ بھٹائی مقبروں کو ساتھ لے کر ایک کونے میں پر کھڑے ہوئے تو اس کا پاؤں اوپر آ گیا، جس کی سطح پر پیالہ نیچے رہا تھا
جسکو نکال کر بڑے احترام سے حضرت مخدوم گرھوڑی کے پاس بھیج دیا۔ اس کے ساتھ ایک عصا اور تلوار بھی تھی۔ تلوار پر پیتل ہے۔

دوسری روایت ہے کہ

ایک مرتبہ شاہ عبداللطیف بھٹائی "گرھوڑی صاحب گاؤں کے نزدیک ایک مسجد میں علماء اور دیگر مریدوں اور افراد کے ساتھ فروکش تھے، اس مجلس
میں مخدوم گرھوڑی صاحب بھی موجود تھے، اتنے میں عشاء کی نماز ادا ہوئی، لوگوں نے سارے مبارک امام شاہ صاحب سے فرمائی، اقتدا میں

کلام گرھوڑی، مرتب ڈاکٹر مرحوم عمر بن محمد دانو دیوانہ صفحہ ۶

ایضاً " " " " ۶۱

سب علماء تھے، پہلی رکعت میں قرأت کے بعد رکوع کے وقت اپنا رخ حرم کی طرف کر دیا اس طرح ہر رکعت میں اپنا رخ نبی
سمت میں پھرتے رہے، اور آخری رکعت قبلے کی طرف کر کے نماز پوری کر دی۔ مقتدی تو پہلی رکعت میں جماعت کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے،
صرف مخدوم گرھوڑی نماز میں شامل رہے۔ جماعت ختم ہونے کے بعد علماء نے شاہ صاحب کی اس عجیب روش پر اعتراض کیا اور سبب پوچھا
ان کے ساتھ گرھوڑی صاحب نے بھی پوچھا کہ تم کیوں نماز میں شامل ہوئے [illegible] شاہ
صاحب کیا کریں، کیونکہ تمام رکعتوں میں ملائکہ بعد اللہ شریف کے مختلف صفتوں میں لاکر [illegible] کے بعد شاہ صاحب بھی مجبوراً
اپنا رخ اس کے مطابق تبدیل کرتے رہیں، اس لئے عازم دونوں کی قبول ہوئی۔ ... واللہ اعلم بالصواب

شاہ لطیف کی وفات ۱۱۶۵ھ میں ہوئی تھی، اور مخدوم صاحب کی ولادت غالباً ۱۱۵۲ھ میں ہوئی تھی۔ مخدوم صاحب کی اس وقت عمر تیرہ یا چودھ سال ہوگی
اس عمر میں پیالا اور مار کے واقعہ گذرے۔ ان روایتوں کو دیکھ کر کہا جائے گا، اگر یہ روایتیں صحیح ہیں تو ہم ان دونوں بزرگوں کے روحانی عظمت کا اندازہ آسانی سے
لگا سکتے ہیں۔ گرھوڑی صاحب حقیقت میں بچپن سے ہی روحانیت کی طرف مائل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مخدوم گرھوڑی کو شاہ لطیف کی شخصیت اور کلام سے بڑی عقیدت تھی، اور
شاہ صاحب کی شان میں ایک بیت آپ کے دماغ میں نظر آتا ہے، جس سے آپ کی عقیدت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

آھي عبداللطيف تي رحمتمند رحمان،

جوڙيو جنهن قرآن، سنڌيءَ ۾ صحيح ڪيو.

"شاہ عبداللطیف پر رب رحیم کی رحمت ہے، جنہوں نے قرآن پاک کو سندھی زبان میں صحیح نظم کیا۔"

مخدوم صاحب ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کے کلام تصوف کا ایک بڑے پایہ کا موجود ہے کلام کے علاوہ آپ کی مندرجہ ذیل تصنیفات موجود ہیں، جن میں
۱۔ نتیج الفضل جو مرشد کے کلام کی شرح مجموعہ ہے، یہ کلام سندھی زبان میں تھا لیکن گرھوڑی صاحب نے عربی زبان میں ترجمہ کیا ۲۔ شرح ابیات سندھی۔ ۳۔ رسالہ گل عالم (فارسی)
۴۔ مکتوبات (فارسی) جو کہ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کا اختصار ہے ۵۔ مجموعہ سندھیات۔ مخدوم صاحب کا سندھی کلام اور کلمات جمع ہیں۔ ان میں رسالہ
حقیقت محمدی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آپ کے کلام میں سرمستی اور روانی کمال درجہ کی ہے۔ آپ عاشق رسول تھے، محبت صوفیاء کے [illegible] تھی۔ حضور کی شان مبارک میں [illegible]

وصف جنهن وڻنه جي مثو موين نه آهي،

مدح ۾ محبوب جي ماڻڪ هيرا ناهي

حقيقت حبيب جي عجب حجرئ آهي.

جامع ليل نهار کي جئن شفق جي ساڃاهه.

ترجمہ:۔ محبوب کے توصیف کی کوئی حد نہیں، آپ کی تعریف میں بڑے بڑے فصاحت زبان ہیں۔ حبیب کی حقیقت حجرت میں ڈالی ہے آپ لیل و نہار کے وقت شفق کی طرح عیاں ہیں۔

آپ کے کلام میں سوز و گداز موجود ہے، وحدت الوجود اور خودی کا فلسفہ صوفیائے کرام اور قرآن پاک سے ماخوذ کئے ہیں۔ آپ احتساب خودی کا نادر مثال ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

اے ایمان والے تم پر خودی کی حفاظت فرض ہے، اگر تم ہدایت پر ہو، تو وہ شخص جو گمراہ ہے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تم سب کو اللہ کے پاس جانا ہے
اور وہ تمہیں تمہارے اعمال پر مطلع کر دے گا تاکہ ان کے مطابق جزا و سزا مل سکے (سورۃ مائدہ آیت ۱۵)

وحدت الوجود کا مقصد اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

صورت و معنیٰ میں کوئی فرق و چاہ ۔

ہو نہ سیاہی، من ری، صبح مور نہ موجود آہ

کتی جوہر کوئی، کتی، عرض ہے آہ

حقیقت ہیکلف، پر نالوں سے نام ہو ۔

صورت اور اس کی معنیٰ میں کوئی فرق نہیں ہے، وہ خدا اس (انسان) کے سوا پہچانا نہیں جا سکتا، لیکن وہ موجود کہاں، وہ کسی جوہر میں ہو
کسی جگہ عرض، حقیقت ایک ہے، لیکن اس کے اسماء کی کوئی حد نہیں ہے ۔

سید میر علی شبر قانع :-

سید میر علی شبر قانع سندھ کے رند علوی، بزرگ، مورخ، محقق، شاعر اور سندھ کے نام کو روشن و زندہ کرنے والے ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب ٹھٹہ کے خاص سید شکر اللہ شہاری سے ملتا ہے، جو شاہ بیگ ارغون کے زمانہ میں تیراہ سے بکھر سندھ میں ہجرت کر آئے تھے، مرزا شاہ حسین ارغون کے دور حکومت میں بڑے خاص مقرب ہوئے تھے۔ آپ کے دادا سید صفی اور اعلیٰ درویش گذرے ہیں، میر علی شبر کے والد کا نام گرامی سید شہر اللہ تھا، جو ۱۱۲۰ھ میں وفات پا گئے تھے۔ میر علی شبر قانع کی ولادت ۱۱۲۰ھ میں ہوئی جو اس آیت کریمہ

"خلق انسانا من السلالہ"

آپ کی ابتدائی تعلیم بہتر طریقہ سے بہترین اساتذہ کے زیر نگرانی ہوئی، ان میں میاں نعمت اللہ میاں محمد صادق اور مرزا محمد معصوم قابل ذکر ہیں، جو دینی اور دنیوی علوم کے بڑے کامل اور عقلمند عالم تھے، مقالات الشعراء میں لکھتے ہیں :-

"فقیر بخدمت ہر دو صاحبان نسبت تلمیذی دارد۔"

میاں نعمت اللہ سے آپ نے میزان صرف سے لے کر شرح ملا تک تعلیم حاصل کی، ظاہری علوم سے بہرہ ور ہو کر باطنی علوم سے حصول کے لئے علامہ مخدوم محمد معین ٹھٹوی کی طرف رجوع ہوئے اور سندھ پر اپنی قابلیت کا سکہ جمایا، آپ کو بارہویں برس کی عمر میں شعر و شاعری سے رغبت ہوئی اور اشعار کہنے لگے اوائل جوانی میں آپ ساڑھے چار اشعار موزوں کئے تھے، یہ پورا دیوان آپ نے دریا میں ڈال دیا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد پھر سے شعر و سخن کا شوق ہوا، یہ شوق میر حیدر الدین اویسی کامل کی صحبت میں ہوا شعر میں "مظہری" تخلص اختیار کیا، اس وقت آپ کی عمر مالاً ۱۵ سال تھی، شعر کے ساتھ نثر میں بھی لکھتے تھے۔

آپ کی شہرت اس وقت کے دوست دمساز بادشاہ میاں غلام شاہ کلہوڑہ تک پہنچی، جس نے میر صاحب کو اپنے خاندان کی تاریخ لکھنے کے لئے ملازم مقرر کیا، آپ نے "شاہنامہ فردوسی" کی طرز پر لکھنا شروع کیا، لیکن تاریخ مکمل ہو نہ سکی، اس لئے حیدرآباد سے واپس ٹھٹہ چلے آئے اور مستقل ملازمت سے فراغت حاصل کر لی، لیکن میر صاحب نے حکمران خاندان سے خوشگوار تعلقات قائم رکھے جس کی وجہ سے وقتاً فوقتاً وظیفے اور دیگر سہولتیں ملتی رہتی تھیں۔ سیاسی طور پر اس وقت سندھ عجیب افراتفری کے دور سے گذر رہا تھا۔ نادر شاہ کی آمد اور لوٹ مار سے سندھ کی آزادی ختم کر دی تھی، میاں غلام شاہ کے دور حکومت میں کافی اطمینان تھا، لیکن بعد میں قتل و غارت کی بازار گرم تھی، ظلم کا دور تھا، بے پناہ لوٹ مار کی وجہ سے اتنی دہشت پھیلی ہوئی تھی کہ عام زندگی معطل ہو گئی تھی، اسی ایام ابتلا و مصائب میں میر علی شبر قانع نے اوج کمال حاصل کیا، ان تمام مکائد اور سیاسی اور ملکی تباہ کاریوں کے پیش نظر آپ نے اپنی زندگی تصنیف و تالیف کے مشغلہ میں گذاری علم ادب سے وابستگی کی وجہ سے دوسرے مشاغل کی طرف رجوع نہ ہوئے، تھوڑے عرصہ کے لئے صورت اور جام نگر کی طرف سفر پر گئے تھے، جہاں سخن سے بزرگوں سے ملاقات کی تھی، جن میں خاص طور پر شیخ اعظم ٹھٹوی ۔

---

[1] مقالات الشعراء مرتب میر علی شبر قانع صفحہ ۲۹۰

[2] رسالہ مہران ۱۹۵۶ء جلد ۲۔ مقالہ نگار پیر حسام الدین شاہ راشدی صفحہ ۱۳۸

میر صاحب کو اس وقت کے بڑے بڑے علماء کی صحبتیں میسر ہوئی ہیں مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی، مخدوم محمد معین ٹھٹوی، مخدوم صبغۃ اللہ، میاں نعمت اللہ، میاں محمد صادق فرزند ابوالحسن، تولچند آزاد، شنوک رام عطارد ٹھٹوی اور محمد پناہ رضا قابل ذکر ہیں ان میں اکثر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے دوست، مرید اور معتقد تھے، شاہ بھٹائی سے ملاقات اپنے استاد مخدوم محمد معین ٹھٹوی کے ہمراہ ہوئی ہوگی کیونکہ شاہ صاحب اکثر مخدوم صاحب کی ملاقات کے لئے ٹھٹہ آیا کرتے تھے، آپ کے بزرگانہ اور مشفقانہ عظمت کو دیکھکر قائل ہوئے ہوں گے، اس لئے آپ کو مارک کے لقب سے ذکر کیا ہے۔ میر صاحب نے ان علماء اور شعراء کی صحبتوں اور ادبی محفلوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی صلاحیتوں کو نکھارا۔ میر صاحب کو تاریخ نویسی میں الہامی دسترس حاصل تھی، شاعرانہ صنائع کے وہ صرف ماہر ہی نہیں بلکہ موجد بھی تھے۔ میر صاحب کا ایک مشہور مصرعہ ہے، جس کے حروف کو اگر مختلف دائرے کے اندر لکھا جائے گا تو یہ مصرعہ دس مختلف عروضی بحروں پر موزوں ہو جائے گا، وہ اس طرح ہے "بردر تو دولت تو آمدہ" اس مصرعہ کا ابجد کے حساب سے عدد ۱۱۸۰ بنتا ہے۔ میر صاحب نے اس مصرعہ کے لئے ایک رباعی موزوں کی تھی جو کہ اس کی شرح ہے۔[1]

تاریخ کہ بصنعتش بودہ دست

این دائرہ عجیب بر بست،

یک مصرعہ بحر دہ دور درج

تاریخ چنین کم از کسی ہست۔

مقالات الشعراء میں اس طرح تحریر کرتے ہیں۔[2]

"فقیر در صنعات غریبہ و ایجاد آں بفیض الہام دستی تمام حاصل ست اگر بشرح آں پرداز و نسخہ علاجہ وا باید"

میر علی شیر قانع منشیاً حسب اہل بیت تھے، لیکن صحابہ کرام کی شان میں عداوت کرتے تھے، اصل تشیع کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے ایران کے شیعہ بزرگوں کے حالات زندگی اپنی تصنیف "مجالس المومنین" میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ میر صاحب کی دوسری تصنیفات "اعلام عم"، "زبدۃ العاقب" اور مناقب کی کثیر تعداد ملتی ہیں۔ میر صاحب کے آخری ایام بڑی تکلیف سے گذرے ۱۲۰۲ھ میں ایک مہلک بیماری سے دوچار ہوئے جو طاعون لبوا ثابت ہوئی۔ آخر ۱۲۰۳ھ میں چونسٹھ برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔ بقول پیر صمام الدین شاہ راشدی۔[3]

"افسوس، اس عظیم المرتبت عالم، ادیب، شاعر، مورخ کی سامت، تاریخ وفات کسی نے بھی محفوظ نہ کی اور کسی نے کوئی کتبہ مزار پر نصب نہ کیا"

آخر فرزند غلام محمد ٹھٹوی نے "البت علیہ الرضوان" سے سال وصال کی تاریخ برآمد کی ہے۔ میر صاحب کے فرزند میر غلام علی مائل نے "البشرہ بالجنۃ النعیم ابداً" تجویز کیا تھا میر علی شیر قانع کے تصانیف کثیر التعداد ہیں، میر صاحب کے سندھ والوں پر بڑا احسان ہے تاریخ تحفۃ الکرام، حالانکہ یہ کتاب مقالات الشعراء کے بعد ۱۱۸۱ھ میں مکمل کی تھی، اس ضخیم کتاب سے آپ کی تاریخ دانی سے گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ میں اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو سندھ کی تاریخ نامکمل رہتی۔ یہ تاریخ تین جلدوں میں ہے پہلی جلد میں تاریخ انبیاء علیہ وسلام، مکہ، خلفائے راشدین، اسلام کے حالات موجود ہیں، دوسری جلد میں "ہفت اقلیم" کے ہیں جن میں ابتدائی اقوام سے اسلام تک حالات درج ہیں اور اسلامی معارف کی مختصر تاریخ بھی شامل ہے۔ جلد سوم میں سندھ کا مفصل تذکرہ موجود ہے جو سندھ کے لئے بڑی اہمیت والا حصہ ہے۔ سندھ کے تمام مشاہیر اور شہروں و بزرگوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ تاریخ نہ ہوتی تو بہت سے حالات گوشۂ گمنامی میں ہوتے۔ اس عظیم کتاب کے اختتام پر ایک قطعہ موزوں کیا تھا، جو اس طرح ہے:

---

[1] مقالات شعراء — مصنف میر علی شیر قانع — پیر صمام الدین شاہ راشدی

[2] ایضاً — " — " — "

[3] ایضاً — " — " — "

شکر خدا که تذکرهٔ تحفة الکرام ۔ اندر سه جلد یافته تزئین احتشام ۔

هر جلد اوست روضهٔ اخبار دلکشا ۔ نظاره کیش مفت شود دیده شام

قانع اگرچه نیست سزاوار فکر خیر ۔ لیکن بفیض اجل خبر یافت این مرام

باشد کنند اهل دلش یاد بعد مرگ ۔ یعنی که یادگار نکو ماند مستدام

سال تمامیت چو نمود از خود سوال ۔ اینک چه منتخب ز دل آمد مرا پیام

۱۱۸۱ھ

شکر خدا که یافته تزئین انتخاب

این تحفة الکرام با ذین انتخاب

سال تمامیت چو نمودم ز دل سوال

هاتف زده ندا که نوائین انتخاب ۔

۱۱۸۱ھ

اس جلد کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے وسیع المطالعہ تھے۔ اس جلد میں سندھ کی مفصل تاریخ دی ہے۔ بقول ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے[1] "میر علی شیر قانع نے سندھ کے بادشاہوں اور امیروں و بزرگوں کے حالات کو تاریکی سے بچایا ہے" گویا یہ جلد کتاب کی جان ہے۔ تاریخ تحفة الکرام کو ۱۳۰۴ ہجری مطابق ۱۸۸۳ء میں مطبع ناصری بمبئی نے طبع کیا۔ دوسری کتاب جو زیادہ مشہور ہوئی وہ ہے "مقالات الشعرا" ۱۱۷۴ھ ہجری۔ میر علی شیر قانع نے اس نیم تاریخی کتاب میں سندھ کے فارسی گو شعرا کے حالات اور شعروں کو جمع کیا ہے۔ یہ سرخوش اور خان آرزو کی تصنیفات سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کی عبارت سے مصنف کی انشاپردازی ظاہر ہوتی ہے۔ میر قانع نے مختلف شعرا کے کلام کا موازنہ مقالات رنگ میں کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۱۶۹ھ ہجری لکھنا شروع کی اور پانچ سال کی مدت کے بعد ۱۱۷۴ھ میں مکمل کی۔ ان دو عظیم تاریخوں کی وجہ سے قانع کا نام زندہ جاوید ہو گیا۔ مقالات الشعراء کو پیر حسام الدین شاہ راشدی نے اپنے عالمانہ مقدمہ اور حواشی کے ساتھ ۱۹۵۷ء کو سندھی ادبی بورڈ کے معرفت شایع کرایا۔ اس انمول کتاب کی اشاعت سے سندھ کے قدیم شعراء کرام کا تذکرہ پھر صدیوں تک زندہ ہو گیا۔ ان کتابوں کے علاوہ میر علی شیر قانع نے بہت سی کتابیں لکھی تھیں جن میں خاص یہ ہیں:

۱۔ مختار نامہ۔ ۲۔ دیوان قانع۔ ۳۔ مکلی نامہ۔ ۴۔ مثنوی قضا و قدر۔ ۵۔ زین الافکار مثنوی۔ ۶۔ کان جواہر۔ ۷۔ کامیں و کامروپ مثنوی۔ ۸۔ تاج کلہوڑہ ماندان۔

میر علی شیر قانع اپنے دور کے خاد الکلام شاعر تھے۔ مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی نے اپنے ایک مقالہ میں تحریر فرمایا ہے:

"ایران میں نظامی گنجوی نے خمسہ لکھ کر آنے والے شعراء کو طبع آزمائی کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ خراسان میں مولانا عبدالرحمان جامی اور ہاتفی نے۔ ہندوستان میں خسرو اور فیضی نے اپنے اپنے رنگ میں لکھا۔ اسی طرح سندھ میں میر علی شیر قانع اور میر محمد معصوم کھرل نامی نے بھی خمسہ لکھ کر سندھ کا نام روشن کیا ہے۔ قانع کو اس قسم کی شاعری کا سندھ میں موجد مانا جاتا ہے"

میر علی شیر قانع کو علم عروض پر بڑی دسترس تھی۔ افسوس کہ آج ان کا دیوان موجود نہیں ہے۔ اگر وہ موجود ہوتا تو ایک نقاد اس کی صحیح قدر و قیمت کر سکتا۔ آپ کے کلام کا مختصر انتخاب "محک خسروی" کتاب میں موجود ہے۔ چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:-

غزل

بعین جرعہ مستیوان شد حل مشکلہا ۔ الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

قدم زن از سراے تن برون زین کاروان گنبد ۔ جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

بکوشے عشق آمانش ز بیند زین سبب دیرد ۔ کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا

---

[1] شاہ عبداللطیف اے بھٹائی ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے۔ [2] میر علی شیر قانع مقالہ نگار مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی رسالہ ماہ نو کراچی جون ۱۹۳۹ء۔

بشعر عشق چرا در بدر کنی مارا — چنین بس است که گشتم بچشم تر محتاج ۔

ہمیشہ خون جگر خود دنش بود عادت — کسے کہ غنچہ صفت شد بمشت زر محتاج

نگاہ عشق بہر خام پخت می سازد — بآفتاب بس قانعاً شمر محتاج

محمد محسن ٹھٹوی ؒ

محمد محسن ٹھٹوی بن نور محمد بن محمد ابراہیم بن محمد یعقوب ٹھٹوی سندھ کے باکمال فارسی شعراء میں سے تھے۔ ان کے والد ریشم کا کاروبار کرتے تھے۔ محمد محسن بچپن سے شعر و شاعری کی طرف رجوع ہو گئے تھے۔ میر لطف علی خان والی ٹھٹہ کی صحبت میں آپ کے افتادِ طبع اصلی رنگ میں ظاہر ہوئی اور فارسی زبان کے صف اول کے شاعر مانے گئے۔ ان کی شہرت سندھ کے حدود سے نکل کر دہلی اور دکن تک جا پہنچی۔ شروع میں ہر مقبل اصفہانی سے جو کچھ وقت ٹھٹہ میں مقیم تھے شعر کی اصلاح لیتے تھے۔ پوری زندگی فارغ البالی اور شاعرانہ وضع میں گذاری۔ اہل بیت کے متوالے تھے۔ منقبت اور مدائح میں آپ کے بے نظیر قصائد اور مثنوی موجود ہے۔ وقت کے حاکم میاں نور محمد کلہوڑہ نے ان کی استعداد کی قدر کرتے ہوئے وظیفہ مقرر کیا۔ تسنیفات میں عقد دوازدہ گوہر طراز دانش، دیوان، قصائد، اعلام، ماتم، بیاض، محک کمال، مشہور ہیں۔ میر علی شیر قانع نے ان کے شعر کا انتخاب "مقالات الشعراء" میں دیا ہے۔ جس سے چند مثال نقل کیے جاتے ہیں۔

محسن از عشق تو در پیری خواہد توبہ کرد — میکشی ہر چند در شباب باشد بہتر ست ۔

من عقد دوازدہ گوہر ست ۔

علی مقصود از ترتیل آیت — امیر المومنین شاہ ولایت ۔

اگر از علم عین خود ستاند — یقین کز علم غیر از لم نماند ۔

وگر لام خود از اسلام گیرد — تمام از ما بقی صورت پذیرد ۔

بی نصیبان راز دنیا بہرہ حسرت بردن ست — مار را جز خاک خوردن قسمت از گنجینہ نیست

اہل معنیٰ را عرق در منزل حاصل ست — سیر لعل بہر سیر آفرین جز زینہ نیست

محمد محسن ٹھٹوی میں عالم شباب میں ۲۰ شوال ۱۱۶۳ھ ہجری مطابق ۱۷۵۰ء میں انتقال کر گئے۔ آپ کے فرزند غلام علی مداح نے تاریخ وفات اس آیت مبارکہ سے نکالی تھی۔

ان رحمت اللہ قریب من المحسنین

۱۱۶۳ھ ہجری

میاں سرفراز خان کلہوڑہ ؒ

میاں سرفراز خان کلہوڑہ اپنے وقت کے بڑے علم دوست، علم و فضل میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ فارسی زبان پر آپ کو بڑا عبور تھا۔ حکومت کی جوابداری کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے علاوہ تھے خود تو بڑے عالم تھے، لیکن آپ کا دربار بھی علماء و شعراء سے مزین تھا۔ علمو بڑے انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔ سندھ کے مشہور شاعر و مورخ میر علی شیر قانع اور شیخ کرام عطارد، آپ کے درباری حیثیت رکھتے تھے۔ بچپن میں آپ کی تعلیم شاہانہ طریقہ پر ہوئی۔ میر غلیم ٹھٹوی سے بڑا دوستی کا رشتہ تھا۔ مولوی مداح کے شاگرد رشید تھے۔ حضرت شاہ فقیر اللہ علوی اور مخدوم محمد معین اور مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی سے قریبی تعلقات تھے۔ علمو بات شاہ فقیر اللہ علوی میں بہت

اخبار الوحید اسپیشل ایڈیشن (سندھی) سندھ آزاد نمبر ۱۹۳۶ء

مقالات الشعراء مرتب پیر صلاح الدین شاہ راشدی صفحہ ۲۰۷

سے خطوط آپ سے منسوب ہیں، لیکن اپنی ناخریدکاری کی وجہ سے بہت دنوں سے ہاتھ دھو بیٹھا اسیر ہونے کے بعد تعقیب کر دیئے گئے فیروز شاہ کے زمانے میں سندھی زبان میں بھی شعر کہا تھا۔ جس میں عام طور پر مداح (مناقبات) جو کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں ہے جس میں اپنی دکھی زندگی کا ذکر کیا ہے۔ آپ سندھی زبان میں مداح کی صنف کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کے فارسی شعر میں بڑی لطافت اور سوز موجود ہے ایک غزل نقل کی جاتی ہے۔

تو ای مرغ چمن شاد می کن
بزندانِ قفس هم یاد می کن
تو چونا گل نشیمن هم نگاهی
بدام افتادهٔ صیاد می کن
تو چون بر شاخ گل باشی نوا سنج
بیادِ ما دمے فریاد می کن
تو چون پرواز گیری در گلستان
زبانی بستهٔ من یاد می کن
تغافل چند اے سرو سرفراز
ز بندم بالطف آزاد می کن

سندھی کلام مداح سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

بسم اللہ گب اللہ، محمد شاہ کر پناہ پرین تون،
منھنجی درگاہ عیم آہ منی راہ رسین سون،
پلا جام من غلام سندھ سوال مشیج تون۔

بسم اللہ۔ یا محمد رسول اللہ صلعم خدا تعالیٰ کے واسطے مجھے اپنی پناہ میں لے لیں، میں نے آپ کی حضور میں اپنی فریاد پیش کی ہے، مشکل راہ میں میری مدد کر
آقا اس غلام کے سوال کو سن لے۔
شریعت و طریقت حقیقی نصیب آسان کیے،
حقیقت و معرفت سندھی نگاہ حقیقی تون
پلا جام من غلام سندھ سوال مشیج تون

شریعت اور طریقت حقیقی نصیب کر، حقیقت اور معرفت کے پہچاننے کی نگاہ نصیب ہو، میرے آقا اس غلام کے سوال کو سن لے۔

یہ مداح بہت طویل ہے اور بحر طویل میں لکھی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کو مداح کی صنف کا سندھی شاعری میں موجد سمجھا جاتا ہے۔ اس مداح کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ سرفراز خان طلبوڑہ نے سندھی زبان میں اور بھی شعر کہا ہوگا لیکن افسوس اسکا ملنا بہت مشکل ہے ہو سکتا ہے مرور ایام نے اس کو برباد کر دیا ہو۔

مداح (مناقبات) سندھی شاعری میں بہت مقبول صنف ہے، یہ عوامی شاعری ہے جو مقبول عام ہوئی۔ میاں سرفراز خان طلبوڑہ نے اس صنف کو ایجاد کیا، بعد میں سندھ کے اکثر شعرا نے اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ مداح میں اکثر شعرا نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں تعریف کی ہے شعراء نے بزرگوں کی شان میں بھی مداح لکھی ہیں۔ سندھ کی آدھی شاعری میں مداح کو قصیدہ کی منزل حاصل تھی۔

حضرت محمد بقا شاہ راشدی قدس سرہ ۔

سندھ میں راشدیہ خاندان کے بانی حضرت بقا شاہ راشدی، سید علی مکی کی اولاد میں سے تھے، جو بزرگ عباسیہ دور خلافت میں سندھ میں تشریف فرما تھے۔ اس وقت سندھ کے اندر بے چینی پھیلی ہوئی تھی، خاص طور پر دلوارہ ایک سفاک اور ظالم راجا موجود تھا، جو اپنے ظلم و تشدد کی وجہ سے مشہور تھا، جس حرکتوں کو دیکھکر آپ نے وطن واپس جانے کا ارادہ ترک کر کے راجا دلوارہ کا مقابلہ کیا اور ہمیشہ کے لئے سندھ کو اپنا وطن بنا لیا۔ اور سندھ کے نزدیک نگاری میں سکونت اختیار کی آپکا خاندان بڑی عزت اور توقیر سے دیکھا جاتا ہے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے سید ہیں۔ سید بقا شاہ راشدی کی ولادت رسولپور میں تھی۔ سنہ ۱۱۳۴ ہجری کی ہوئی آپ نے ایک جگہ سے تعلیم حاصل کی تھی، جہاں بھی علم کا گہوارہ معلوم ہوا وہاں حصول تعلیم کے لئے پہنچ جاتے تھے، اور اس طرح بہت علم کے حصول میں مشغول رہے اور شہادت بھی اسی شغل کی وجہ سے ہوئی۔

روایت ہے، ایک مرتبہ آپ اپنے سر پر کتابوں کی بھاری گٹھڑی لیکر جا رہے تھے ڈاکوؤں نے گٹھڑی کو دیکھکر مال و دولت کے شبہ میں آپ کو شہید کر دیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۲ سال تھی۔ آپ کے نعش مبارک کو شیخ طیب کے گاؤں تعلقہ ہیرو ہری میں دفن کیا گیا۔

آپ کی تاریخ وفات اس قطعہ سے نکلتی ہے جو آپ کے مرقد مبارک پر نصب کی ہوئی ہے۔

چوں سید محمد بقا شد شہید۔ ملامت زد رحمت الاہی چشید۔

بسی بود نافع بہر خاص و عام، کزو زندہ طالب خدا شد رسید

خود سال تاریخ او در دلم بگفتا بدر ہ شہادت رسید

سنہ ۱۱۹۸ ہجری

آپ فارسی اور سندھی زبانوں کے بہت شاعر تھے۔ سندھی کا کلام زیادہ دستیاب نہ ہو سکا ہے تھوڑے کلام کو دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا زیادہ علم ہوگا۔ آپ کے کلام میں بڑی سادگی اور روانی موجود ہے۔ مثال پیش کی جاتی ہے:۔

سج لھي سانجھي ٿي، پکي پيا وٽين

اڏرهنيڙا پوئنر ٿي، له پر هٿين

ٿوري ڏينهن گهٽين، ٿينده ميڙو سچٽين

سورج غروب ہوگیا، شام ہوگئی، پرندے درختوں میں چہچہا رہے ہیں۔ اے دل تو بھی سورج کی طرح اور دوست کی منزل پر جانے کے لئے چند روز کے بعد آخر تیرا وصال دوست سے ہو ہی جائیگا۔

احسان لانگاہ ۔

سندھ کے مرثیہ گو شاعر احسان لانگاہ حالا شہر (ضلع حیدرآباد) کے رہنے والے تھے، آپ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے معاصر تھے۔ جہاں تک مرثیہ نگاری کا تعلق ہے سندھ کے ابتدائی مرثیہ گو شعراء شاہ بھٹائی کی فہرست میں، شاہ صاحب کے رسالہ میں سرکیڈارو کے عنوان سے کافی ابیات مرثیہ کے انداز میں موجود ہیں۔ حالانکہ جدید محققین کی رو سے بعض محققین سرکیڈارو کو شاہ صاحب کی تصنیف نہیں مانتے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکیڈارو کے ابیات حضرت شاہ لطیف بھٹائی کی ہی تصنیف ہے۔ مرثیہ نگاری اپنی جگہ ایک فن ہے، شعر کے اصناف میں مرثیہ نگاری کو جو درجہ ہے وہ کسی صنف میں موجود نہیں ہے۔ جناب پروفیسر لطف اللہ بدوی مرحوم مرثیہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

۱۔ تذکرہ لطفی جلد اول مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۲۰۳۔

۲۔ انوار منارہ سندھ (چار سندھ نمبر) مقالہ "راشدی خاندان" مقالہ نگار، پیر حسام الدین شاہ راشدی ۲۱ فبروری ۱۹۲۵ء مدیر پیر علی محمد شاہ راشدی

۳۔ کیڈارو سرکیڈارو دیپک راگ کی ایک شاخ ہے، یہ سنسکرت شبد کیدار کی بگڑی صورت ہے جسکی معنی جنگ کا میدان ہے اس میں مرثیہ اور رزمی شاعری ہوتی ہے۔

"جذبات غم، جس میں شاعری کا اصل روح ہوتا ہے، وہ جیسی دوسری شاعری میں کم ملتا ہے، مگر مرثیہ میں اول اور آخر تک ہوتا ہے"

اردو شاعری مرثیہ نگاری میں مشہور ہے۔ اردو شاعری میں مرثیہ نگاری کب شروع ہوئی اسکا اندازہ لگانا البتہ مشکل ہے۔ لیکن مختلف تذکروں کی ورق گردانی سے ہمیں اندازا ہوتا ہے، کہ میاں مسکین غالباً سب سے پہلے شاعر تھے، جس نے مرثیہ کی شاعری کو اپنایا۔ سودا نے ان کے لئے کہا ہے :-

اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا

پھر کوئی نہ پوچھے، میاں مسکین کہاں ہے۔

اردو کے مرثیہ گو شعراء میں مرزا رفیع سودا کا نام لیا جاتا ہے۔ مگر سودا طبعاً خوش باش اور بے فکر انسان تھے۔ اس لئے وہ رنج والم کے اثر سے متاثر ہونا جانتے ہی نہیں تھے۔ اس لئے ان کے مرثیہ میں جذبات کا فقدان ہے۔ مرحوم پروفیسر احسان احمد بدوی کی تحقیق کے مطابق :-

اردو میں مرثیہ نگاری کی صنف کو جس کے ہاتھوں عظمت حاصل ہوئی تھی، وہ تھے انیس کے خاندان کے فرد، میر انیس کے اس شعر "پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فن کو گویا مذہبی فرض سمجھا جاتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی چیز کو مذہبی رنگ دیا جائے۔ تب اس میں جذبات اور احساسات کی پوری ترجمانی ہوتی ہے۔ میر ضمیر اور میر خلیق سے مرثیہ بتدریج ترقی کرتا ہوا میر انیس اور مرزا دبیر تک پہنچا تب ان میں جوہر پیدا ہوا، اور دنیا کی دوسری شاعری پیدا نہ کر سکی"

سندھی زبان میں شاہ لطیف بھٹائی نے اس فن کو فروغ دینے کے لئے ایک وسیع میدان چھوڑا ہے آپ کے ابیات (مرثیہ) میں مقامی رنگ کے ساتھ ساتھ قوت بیان اور سوز گداز بھی موجود ہے۔ شاہ بھٹائی کے بعد احسان لانگاہ اور مراد فقیر اور فتح فقیر نے شاہ بھٹائی کی تقلید کرتے ہوئے مرثیہ نگاری کو فروغ دیا۔ آگے چل کر مخدوم عبداللہ ہوتی، سید میر شاہ پردیسی، اور سید ثابت علی شاہ اور حضرت سچل سرمست نے اس صنف کو عروج پر پہنچایا۔

احسان لانگاہ کے کلام پر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا بڑا اثر نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ احسان لانگاہ کے ابیات میں ایک وجدانی کیفیت جھلکی ہوئی نظر آتی ہے۔ بحرحال احسان لانگاہ، مرثیہ کی صنف میں طبقہ اولیٰ میں آتے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد کسی زمانے میں ملتان پر حکومت کرتے تھے۔ جب حکومت جاتی رہی تو وہاں سے ہجرت کرکے حالی سندھ میں آکر مقیم ہوئے۔ احسان لانگاہ نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان مبارک میں مرثیہ گوئی میں انتہا کردی ہے۔ امام صاحب کے جان نثار ساتھی حر کے متعلق کہا ہے :

حر علي آيو، ما بخشي مردانو۔

اينديءِ چيئن امام کي جنگ پريءِ جانو

آهيان عاشق اگ جو پتنگ پروانو۔

مان سرسانو، گهوٽ مٿا نهين گهوريو۔

دلیر مردانہ وار صف سے باہر نکل آئے۔ امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں جھک کر عرض کی۔

میں پروانہ کی طرح آگ کا عاشق ہوں، یہ سر میں آپ جیسے نوشہ پر قربان کرتا ہوں۔

آپ کے فرزند اسماعیل لانگاہ بھی مرثیہ گو شاعر تھے انہوں نے عین عالم شباب میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ امام صاحب کے مخدوم صاحبزادے اصغر کی شہادت پر اس طرح لکھتا ہے

اصغر جي اڏسرا ۾ دل هي ڏاهون

ناگهه ويٺي نڪتو، اصغر ساٿ آهون

ميڪائيون واهون، مون سڀا ٿورت ڏاهه

اصغر کے ماتم میں میرا دل، آہ وفغاں میں مبتلا ہے۔ ناگہانی طور پر میرے سینے سے فریاد نکلتی ہے۔ اصغر دوست اور یاروں کا ذکر کر رہا ہوں۔

صوفی مدن بگٹ :-

صوفی مدن بگٹ ایک صاحب درویش گذرے ہیں، صوفی مدن شاہ لطیف بھٹائیؒ کے مرید تھے اور آپ کے اصلی وطن کوٹڑی مغل کے رہنے والے تھے، اور شاہ صاحب کی خدمت میں اکثر آکر رہتے تھے، ایک روایت ہے، شاہ صاحب نے ایک مرتبہ مدن بگٹ سے سوال کیا۔

حشر ویل حساب ۾ ڪافر ڪيئن ڪندا؟

(روز محشر کو جب حساب ہوگا تو کافر کیا کرینگے)

اس عجیب سوال کو سن کر مدن صوفی نے عرض کیا، قبلہ اس سوال کا جواب کسی اور وقت میں عرض رکھونگا، کچھ عرصے کے بعد ایک دن اتفاقاً شاہ بھٹائیؒ کو کسی کام سے دریا کا سفر کرنا تھا، اور مدن صوفی بھی ہمراہ تھے، جب آپ دریا سندھ کے کنارے پر پہنچے تو ناخدا اپنی کشتی کو آگے دھکیل چکا تھا، مدن صوفی نے اُسے کہا اگر میں بھی سوار ہو سکوں تو میں دگنا کرایہ دونگا، ناخدا نے اس لالچ میں آکر کشتی کو واپس کنارے سے لگایا، دونوں کو کشتی میں سوار کرکے منزل کی طرف چل دیئے اور دوسرے کنارے سے لگایا، اس وقت مدن صوفی نے شاہ بھٹائیؒ سے عرض کی، قبلہ کچھ عرصہ پہلے آپ نے ایک سوال مجھ سے پوچھا تھا، "روز محشر کو جب حساب ہوگا تو کافر کیا کرینگے" آپ کے اس سوال کا جواب آج مل گیا، اور یہ شعر کہا:-

"ڪٽ جنهيءَ جو ڏينهن سي پهرين پتڻ پار پيا"

"جس کے ہاتھ اسلام کٹا وہ ہو (جس میں) گناہوں سے پاک ہیں، وہ پہلے وقت میں پتوار کو پار کرکے منزل پر جا پہنچے گا۔"

مدن صوفی سندھی زبان کے اچھے شاعر تھے، اُن کے کلام پر شاہ بھٹائیؒ کا رنگ نظر آتا ہے جو کہ اس بیت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

حال پڻ حال ڏٺي، آج پڻ ڏينهن پيو،

مڙهي ۾ مدن چوي، ڏسجي ڪانگ ويو،

جنهن ۾ ماڻ پيو، سا واري رهندي ڪيترو۔

کل کا دن کل تھا، اور آج دن اور ہے، مدن کہتا ہے اس مڑھی (جسم) کے اندر پرندا (روح) رہ کر اُڑ گیا،

جس کا وقت آپہنچا، وہ اس راہ پر کتنا وقت ٹھہرے گا

مخدوم ابو الحسن سندھیؒ :-

مخدوم ابو الحسن سندھی ٹھٹہ کے رہنے والے تھے، آپ کا شمار سندھ کے نامور علماء دین میں ہوتا ہے، آپ اپنے وقت کے جید عالم و فاضل تھے، ۱۶۵۰ء کے بعد نواب خدا اللہ کے دور حکومت میں بغداد سے ایک بزرگ شیخ یوسف الدین بغدادی جو قطب ربانی حضرت شیخ سیدنا عبد القادر جیلانیؒ میں سے تھے، سندھ میں ٹھٹہ کے شہر میں تشریف لائے تھے۔ اپنے وجود مسعود سے غیر مسلم، اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگئے، نو مسلم کی اتنی بڑی تعداد کو اسلامی اصولوں اور قوانین سے واقف کرنا اور زبانی وعظ و نصیحت کرنا کافی نہ تھا۔ مخدوم صاحب نے بڑی محنت سے عربی اور فارسی زبانوں کے حروفوں کو ملا کر ایک سندھی رسم الخط تیار کی، چنانچہ سندھی زبان کو اپنی کوئی رسم الخط نہ تھی، مخدوم صاحب اس رسم الخط میں ایک فقہ کی کتاب لکھی، جو "مقدمہ الصلوٰت" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب ۱۱۱۲ھ ہجری مطابق ۱۷۰۰ء میں مکمل ہوئی، اُسی رسم الخط کو مخدوم ضیاء الدین نے بھی اختیار کیا، آگے چل اس رسم الخط کو بڑا فروغ ملا، حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ، مخدوم محمد ہاشم ٹھٹویؒ اور دیگر تمام بزرگوں نے اپنایا، مخدوم صاحب ٹھٹہ میں مذہبی علوم کے ساتھ اس کا بھی درس دیتے تھے، چنانچہ یہ سندھ میں پہلی نثر کی کتاب ہے، جسکو عبد الحسن کی سندھی کہتے ہیں، اس کے بعد سب سے پہلے نثر میں قرآن پاک کا ترجمہ لکھا گیا، جس کو شاری شہر کے ایک بزرگ مخدوم عزیز اللہ (متوفی ۱۲۷۲ھ ہجری) میں لکھ کر تیار کیا تھا۔[۲]

---

[۱] سندھی ادبی تاریخ حصہ اول مرتب مرحوم محمد صدیق میمن صفحہ ۱۱۳۔ [۲] انوار الوحید سندھ آزاد نمبر صفحہ ۱۲

مخدوم صاحب کرامت بزرگ تھے۔ آپ نے شعر بھی کہا جو ہندی دوہوں کی طرز پر ہے۔ تاریخ تحفۃ الکرام میں ایک روایت آئی ہے۔

"گویند شخصی از معتقدان ایشان روزی نالہ و گفت، خدمتگار نواب شہادت خان برخاستہ آمد رسیدہ حکما درمی آید و بار نمی شنود هرچه میخواهد میکند برحال زار من رحم کرده فرمود تا ایشان تا تدارک بنم آنگاه پسر خواهر مکوچ خود مسمی عبدالله را گفت در خدمت پیر بشتابد۔ بروید پیغام و سلام من بدهید تا تدارک ان ظالم کند چون ایشان رفتند و عرض کردند و صبح پس آمد بدبخت الظالم در وقتی که بخانه مرد مذکور می آمد بران ارادہ بول پس دیوار نشسته پالیش بلغزید و بر میخی که در زمین زده بود شکمش خورده برقید و اشاس در دم جان را خورده بود"

کہتے ہیں کہ آپ کے مرید نے آپ سے آکر شکایت کی کہ نواب شہادت خان کا ایک خدمتگار رات کو نشہ میں میرے گھر میں جبراً داخل ہوتا ہے اور میری بیوی کے ساتھ بیٹھ کر جو اس کا جی چاہتا ہے کرتا ہے اُس کے حال پر رحم فرماتے ہوئے انہوں نے فرمایا اس کا تدارک کرتے ہیں۔ اور اپنی بیوی کے بھائی میاں عبداللہ سے کہا کہ پیر بھٹ کی خدمت میں جاکر میرا سلام کہنا اور اس ظالم کی تدارک کے لئے پیغام دینا۔ انہوں نے جاکر سب حقایق سلام پہنچایا صبح کو واپس آکر دیکھا کہ وہ شخص اس مرید کے گھر سے نکل کر جا رہا تھا راستے میں پیشاب کرنے کے لئے دیوار کی آڑ میں بیٹھ رہا تھا کہ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ ایک کھونٹے کی جا گرا جو زمین گڑی ہوئی تھی، جس کے لگنے سے اس شخص کی آنتیں باہر نکل آئیں اور وہیں مرگیا۔"

مخدوم صاحب ایک اہل نظر درویش تھے۔ آپ کی بہت سی تصنیفات موجود ہیں۔ مقدمۃ الصلوٰۃ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس کتاب کو مثنوی کی طرز پر لکھا ہے لیکن اس میں عروض کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ ایک بیت نقل کیا جاتا ہے۔

سر و باري آب سين ڪبي مک ڪنن

اِيءِ هريون آنگريون ڦيري ڪنن ۽ جن،

منهون ساري وضو بڻن، دل ۾ دمانون

تہ مولو مرجي مون ڏي، خالق خطائون (الخ)

سر کو پانی سے آلودہ کرکے، کانوں کو پانی سے مسح کیجئے، اس پانی سے تر انگلیوں کو گردن کے گرد پھیری چاہئیں وضو کی سنتوں کو یاد کرنا چاہئے اور دل میں دعائیں پڑھنی چاہئیں تاکہ خدا تعالیٰ ہماری خطاؤں سے درگزر کرے

شعر میں بہ طرز فارسی اور عربی شاعری کی تقلید نظر آتی ہے، شاید مخدوم صاحب نے فارسی زبان میں فقہ کی کتابوں کے مثنوی کی طرز پر لکھکر اپنی نصیحت کو بھی اس رنگ میں پیش کیا ہے۔ بہرحال مخدوم نواصی سندھی زبان میں شعر کے موجد تھے، جن کی دانشمندانہ کوششوں سے سندھی زبان مختلف منازل کو طے کرکے آج اس منزل پر پہنچی ہے کہ جہان دنیا کی اور مہذب زبانیں پہنچی ہیں۔

مخدوم عبدالرؤف بھٹی [1]

مخدوم عبدالرؤف بھٹی سندھ کے شاعر ہیں جنہوں نے سندھی زبان میں موزوں شاعری کی آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی مخدوم محمد عربھٹی ہالا حویلی کے بھٹی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بھٹی وہی ہیں کہ راجا حادم کے بیٹے بھوپت کی اولاد میں سے تھے جو ہندوؤں کے مشہور اوتار رام چندر کی اولاد میں سے بتایا جاتا ہے۔ اس خاندان سے ارجن نامی راجکمار جو جیسلمیر کے راجا تھے، مخدوم شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانیؒ کے ہاتھ پر بیعت ہو کر مسلمان ہوئے تھے۔ ان کا اصلی نام عبداللہ رکھا گیا اور بعد میں بڑے صاحب کمال بزرگ بن گئے۔ اور حضرت غوث بہاؤالدین ذکریا کے خاص خلیفہ ہو کر سندھ میں ماڑی محمد خان کے نزدیک ہالا میں مقیم ہوئے

---

[1] تاریخ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۲۲۵ [2] مقدمۃ الصلوٰۃ مصنف مخدوم ابوالحسن سندھی

مخدوم عبدالرؤف سندھی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد بڑے بزرگ تھے۔ مخدوم صاحب بچپن سے ہی عشق الٰہی کی طرف رجوع تھے اپنی ریاضت اور کرامت کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ میاں نور محمد کلہوڑہ آپ کے خاص معتقد تھے۔ مخدوم صاحب کا پورا کلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف (مولود) اور محبت سے پر ہے۔ آپ کی یہ آرزو تھی کہ مدینہ منورہ میں وفات ہو، اللہ تعالیٰ نے یہ درخواست قبول فرمائی اور آپکی خواہش پوری ہوئی۔ جب دوسری مرتبہ حج کو گئے تو وہاں انتقال کیا۔ اس وقت آپ کی عمر ستر برس کی تھی۔ آپ شاہ عنایت[2] کے ہمعصر تھے۔ شاہ صاحب سے ایک سال بعد وفات کی فی شیخ عبدالرحیم نے تاریخ وفات نکالی تھی

کان ولیا مرؤف الحق

۱۱۶۶ ہجری

پروفیسر احسان احمد بدوی مرحوم کی تحقیق کے مطابق ۱۱۰۰ لکھتے ہیں:-

"مخدوم عبدالرؤف بھٹی سندھ میں پہلی شخصیت تھے، جن کا کلام علم عروض کی پابندی اور موزونیت میں نظر آتا ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ موزوں شاعری کا آغاز سندھی زبان میں ان سے ہی شروع ہوا۔ آپ کے جو بھی (مولود) نعت کلام موجود ہے وہ علم عروض پر ہے"

منا را میر مرسل جا ڈسان شل ڈھہہ سب ڈوری

علي حالا متيا ميسا، انڑپور کي چڈيان اوري

پيان پائي سندھ زمزم، چڈيان احرام آت چوري،

مدينہ ميں وت صلا تھکي پنجاہ ڪنھن ڏوري

سید المرسلین کے گنبد جارت کے میدار کو کاش میں اس تھر پیادہ چل کر دیکھوں، اپنے دلن حالا اور میسا کو خبر داد کیکر انڑپور کو بھی آگی چھوڑ دوں کاش میں آپ کے مدینے میں زمزم کا پانی پیتوں اور وہاں اپنے احرام کو کھولدوں، یا میرے رب مجھے مدینے کے مہربان کے پاس حاضری پہنچا دو۔

شیخ عمر:-

شیخ عمر لس بیلہ کے رہنے والے تھے، تشنا میں سندھ سے شیخوں کا ایک قبیلہ ہجرت کرکے لس بیلہ پہنچا تھا اور وہیں سکونت اختیار کی۔ لس بیلہ خلافت عباسیوں کے دور حکومت میں ایک جداگانہ ریاست تھی۔ جہاں جام حکمران تھے۔ اسی شیخ خاندان سے دو بڑے بزرگ شاعر شیخ عمر اور انکا بیٹا شیخ ابراہیم ہی گذرے ہیں جو بڑے نکتہ سنج اور نکتہ داں تھے۔ شیخ عمر بڑے عابد شخص تھے۔ لس بیلہ میں اپنے علم و فضل سے خلق خدا کی خدمت سرانجام کر رہے تھے۔ اوتھل شہر میں ایک بڑا مدرسہ چلاتے تھے۔ پوری زندگی درس و تدریس میں گذار دی۔ آپ نے سندھی زبان میں کلام چھوڑا ہے جسے دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سندھی ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ چونکہ شیخ عمر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ہمعصر تھے اس لئے ان کے کلام پر شاہ بھٹائی[1] کا اثر نظر آتا ہے۔ ایک جگہ شاہ صاحب کے رنگ میں کہتے ہیں:-

جاگڻ منجھان جس، سي ساهن نہ ملي.

ستان وٺا سمر جئي، پٽ تنبن پس

جگ ۾ آئي جس، جي ڏيئن اوجاگو ايئن ڪي.

شب بیداری سے نفع حاصل ہوتا ہے، نیند کرنے سے دوست نہیں ملتا۔ عمر کہتا ہے جو گئے ان کے میدانوں کو جاکر دیکھو

اس جہان کے اندر آپ نافع ہوگا جو اپنی آنکھوں کو بیدار کرتا ہے۔

---

[1] کلام سانگی مرتب مرحوم پروفیسر احسان احمد بدوی صفحہ ۱۳۔

[2] بیلاشن جا پول مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ صفحہ ۱۰۔

وطایو فقیر :-

کلہوڑہ دور حکومت میں ایک عجیب شخصیت "وطایو فقیر" کے نام سے گذرے ہیں، جو ٹھٹہ کے رہنے والے تھے۔ وہ مجذوب، صاحب کرامات، سالک اور کامل بزرگ تھے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ہمعصر تھے۔ انکی شخصیت کو ہندوستان کے شیخ چلی، اور ترکی کے ملا نصرالدین سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔ تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف میر علی شیر قانع نے آپ کے لئے لکھا ہے۔ [1]

"وطایو مجذوب سالک کامل در جا بیخود وقت بمرتبہ عرفان رسیدند۔"

"وطایو سالک کامل تھے اور وقت کے مجذوبوں میں صاحب عرفان شمار ہوتے تھے"

ان کی دلچسپ اور پُر مصلحت کہانیوں کو سندھ میں بڑی اہمیت اور شہرت ہے۔ صاحب تذکرہ لطیفی نے ایک عجیب روایت لکھی ہے جس سے آپ کے بلند درجہ کا پتہ چلتا ہے۔ [2]

مخدوم حمزہ واعظ کی وفات کے دن ایک شخص مکلی کی زیارت کے لئے جا رہے تھے۔ اس وقت وطایو فقیر مکلی سے ٹھٹہ واپس ہو رہے تھے۔ ایک اور مجذوب فقیر مکلی کی طرف جا رہے تھے، وطایو فقیر نے اس مجذوب شخص سے کہا جلدی واپس ہو جا، آج حمزہ واعظ نے وفات پائی ہے، اور سید الرحمٰن ان کے جنازہ نماز کی امامت کے لئے تشریف فرما ہو رہے ہیں۔ مکلی جانے والا شخص اسی جگہ سے واپس ٹھٹہ ہوئے۔ ٹھٹہ پہنچ کر دیکھا کہ واقعہ مخدوم حمزہ نے وفات کی ہے۔ جنازہ نماز ہو رہا ہے، وہ شخص جلدی سے جا کر پہلی صف میں کھڑے ہوئے۔ آخری ثنا امام کی تکبیر سے پہلے غیب سے آواز آ رہی تھی"

وطایو فقیر کے درویشانہ قصے اور کہانیاں مشہور ہیں، جن میں سے ایک کہانی نقل کی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ وطایو فقیر کے پاس ایک روپیہ تھا، اور وہ کسی سفر پر جا رہے تھے۔ اسے روپیہ کو سنبھالنا مشکل نظر آیا۔ آخر یہ فیصلہ کیا اور روپیہ کو ایک جنگلی پودے کے نیچے دفن کر کے چلا گیا اتفاقاً ایک شخص اسی مکان رفع حاجت کے لئے بیٹھا، اور اس روپیہ سے شی اتر گئی اور ظاہر ہو گیا۔ اس شخص نے روپیہ تو حاصل کر لیا لیکن سوچنے لگا یہاں ضرور کوئی خزانہ مدفون ہے لہٰذا اس نے زمین کو کھودنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ پودا جڑ سے اکھڑ گیا اور اسی کچھ بھی حاصل نہ ہوا وہ ناامید ہو کر چلا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد وطایو فقیر اسی راستہ سے واپس لوٹ رہے تھے تو اسے روپیہ یاد آ گیا۔ جب انہوں نے روپیہ کے نشان جگہ پودے کو ایک طرف زمین پر مرجھایا ہوا پایا۔ تو اسے بہت افسوس ہوا۔ لیکن فوراً آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر زبان حاضر سے کہا۔ "شکر ہے بارب! یہ اچھا ہوا کہ روپیہ میرے پاس نہ تھا ورنہ میری بھی اس پودے جیسی حالت ہوتی۔"

اس قسم کی بیشمار کہانیاں اور مزاحیہ قصے اس زندہ دل شخصیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان نثری کہانیوں کے علاوہ کچھ اشعار بھی آپ سے منسوب ہیں مثال ہے

قبلہ دینو کوہ ہے جو دنیا میں دلیل
من جڑا تلیل ھوندا من جھان چہ

"جنڈ دینو کنوئیں میں بیٹھ کر یہ خیال کرتا ہے کہ میری طرح کوئی ضخیم اس جہان کے اندر بہت کم ہوں گے"

---

[1] تاریخ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۲۵۵

[2] تذکرہ لطفی جلد سوم اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ ندوی صفحہ ۶۹۶۔

حصۂ چہارم

باب اوّل

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور سندھ کے معاصر اُردو شعرا

"شاہ بھٹائی کا دور"

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ (۱۱۰۲ھ - ۱۶۸۹ء تا ۱۱۶۵ھ - ۱۷۵۲ء) سندھ کے اُن جلیل القدر برگزیدہ شخصیتوں میں سے ہیں جنہوں نے سندھ کی تہذیب و ثقافت مذہب اور زبان پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ آپ سندھی شاعری میں غزل کی صنف رکھتے ہیں۔ سندھی زبان کو جس طرح اوج و کمال پر پہنچایا۔ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ کا شمار دنیا کے عظیم ترین شعرا کی صف اول میں ہوتا ہے۔ آپ کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ الہامی تھی۔ یہ واحد مفکر تھے جن کے افکار نے ایک ادبی تاریخ کو جنم دیا۔ آپ کے ادبی کارنامے سے سندھی ادب میں ایک عظیم باب کا اضافہ ہوا۔

شاہ بھٹائیؒ کا دور ایک پرآشوب دور تھا ایک طرف سندھ میں سندھی زبان اپنی ارتقائی منازل طے کر کے عروج پر پہنچی تھی، تو دوسری طرف ہندوستان میں اُردو زبان ہندی سے ہندوی اور اردو معلیٰ تک بتدریج ترقی کر رہی تھی۔ اردو کے عظیم شعرا خواجہ میر درد ۱۱۲۳ھ - ۱۱۹۹ھ، میر تقی میر ۱۱۲۵ھ - ۱۲۲۵ھ اور میر محمد رفیع سودا (۱۱۲۵ھ - ۱۱۹۵ھ) اردو زبان کی نشوونما اور ترقی کے لئے کوشاں تھے۔ یہ مغلیہ سلطنت کے تابعدار سلطان محی الدین اورنگزیب عالمگیر کا زمانہ تھا جب شاہ بھٹائیؒ کی ولادت ہوئی تو اس وقت اورنگزیب عالمگیر کے جلوس کا ۴۵ واں سال تھا۔ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے زمانے میں خلق خدا امن و اطمینان کی دولت سے مالا مال تھی جس کی وجہ سے سندھ میں بھی اطمینان اور سکون تھا۔ چونکہ سندھ کا علاقہ دہلی کی دارالحکومت سے وابستہ تھا، سندھ میں جو گورنر آتے رہے وہ اپنے اہل و عیال، امراء و شعرا اور درباریوں کو بھی ساتھ لاتے تھے جو اپنی زبان اور ثقافت کو بھی ساتھ لاتے تھے جس سے سندھ میں ہندوی اور اردو معلیٰ کی نشوونما ہوئی۔ سندھ کا جیسلمیر، دکن اور گجرات سے بڑا رابطہ قائم تھا گجرات کے لوگ سندھ میں بستے تھے اور سندھ سے اکثر لوگ ہجرت کر کے ہندوستان میں جا کر بستے تھے اس طرح اس باہمی میل جول و حرکت سے قدیم اردو شاعری کی نشوونما سندھ میں ہی ہوئی

اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ سلطنت کے نئے تاجدار وہ کے زوال کی وجہ سے برصغیر میں افراتفری پھیل گئی دوسری طرف مختلف علاقوں میں ادب اور فکر کی نئی راہیں پیدا ہوئیں۔ چونکہ ہندو پاک میں بڑے عالمین اور بزرگان دین موجود تھے جنہوں نے وقت کی رفتار سے علم ادب اور زبان کو بڑا فروغ دیا۔ مختلف علاقوں کی زبانوں میں نیا اسلوب پیدا ہوا اس زمانہ میں سندھ کے دور افتادہ علاقہ میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ جیسا عظیم صوفی شاعر پیدا ہوا۔ دکن میں ولی، دہلی مظہر جان جاناں - میر تقی میر، مرزا سودا، خواجہ میر درد شمالی ہند میں بستی زبان کے عظیم شاعر خوشحال خان خٹک اور پنجاب میں حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر، شیخ عثمان، شیخ حنیف، مولانا عبدی اور شیخ ابوالعزیز محمد حاصل جیسے بزرگ شعرا پیدا ہوئے۔ جیرت کی بات یہ ہے کہ یہ شعرا ہندو پاک کے مختلف علاقوں میں رہتے تھے اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور دور رہتے تھے لیکن ان کے خیالات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور ان کے معاصر شعرا کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سندھی اور اُردو زبانوں کی ماہیت اور ارتقائی ترقی پر غور و فکر کریں تاکہ دونوں زبانوں کے مشترک ہونے کا اندازہ ہو جائے۔ سندھی اور اُردو زبانوں میں مشابہت اور مناسبت پائی جاتی ہے ان زبانوں میں بعض الفاظ، تشبیہات، استعارات اور کنایہ بھی یکساں نظر آتے ہیں۔

سندھی زبان — جہاں تک سندھی زبان کا تعلق ہے یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ صوبہ سندھ قدیم ثقافتی ورثہ کا مالک ہے مولانا ابو ظفر ندوی نے

---

1. Lingnistic Survey of India by G A Grierson Vol. 1 Page - 30.

اپنی تصنیف "تاریخ سندھ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ آریہ قوم سے پہلے سندھ کے پرانے باشندے اس ملک کو کیا کہتے تھے اس ملک تاریخ کی زبان اس سوال کے متعلق خاموش ہے۔ آریہ قوم نے جب سندھ کی وادی میں قدم رکھا تو بڑے دریا کو دیکھ کر اس کا نام سندھو رکھا، کیونکہ سندھوؤں کی زبان میں سندھو دریا کو کہتے ہیں اس سندھو دریا کی مناسبت سے پورے ملک کا نام سندھ اور زبان کو سندھی کہا گیا ہندوؤں کے مذہبی کتب ویدوں میں سندھ کو دریا کہتے تھے اس کا اصلی نام سرسوتی تھا جس کی تعریف اس شعر کی صورت میں کی ہے

"سرسوتی آئی ہے، شور و شغف کرتی ہوئی، غذا لیتے ہوئے، ہمارے لیے حصن حصین ہے، بدنیل کا قلعہ ہے، مثل ایک سورما کے جو اپنے رتھ کو دوڑاتا ہو وہ سندھو (ندی) سری کے ساتھ آئی ہے دوسری ندیاں پیچھے رہ جاتی ہیں"

موئن جو دڑو کے آثار قدیم جو اس سرزمین میں پائے جاتے ہیں محققین کے نزدیک آج سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے کے آثار ہیں جو مصر اور عراق کے قدیم ترین تمدن کے ہم عصر سمجھے جاتے ہیں تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیح آریہ قوم کے قبیلے وسط ایشیا یا کسی اور مقام سے نکل کر وادی سندھ میں آکر آباد ہوئے۔ ایران کے ہخامنشی بادشاہ دارائے سندھ کو فتح کرلیا اور ایک مدت تک یہ صوبہ نقش فرمانروا کے زیر حکومت رہا، ۳۲۹ قبل مسیح سکندر اعظم نے ایران کو فتح کرکے بعد میں سندھ میں داخل ہوا تو اس کو ملتان سے بھی آگے فتح کرلیا سندھ سے واپسی کے بعد یہ صوبہ موریہ خاندان کا جزو بن گیا بعد میں یونان کے باختر خاندان کا تسلط رہا۔ یہاں تک کہ سن آمد کے بعد خلافت بنی عرب نوجوان جنرل محمد بن قاسم نے ۹۳ ہجری میں سندھ کے ساحلی شہر دیبل کو فتح کرلیا اور ملتان تک فتح حاصل کرکے۔ اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی اس وقت سے ۱۲۰۰ ہجری تک سندھ پر مختلف مسلمان خاندان حکومت کرتے رہے۔

جہاں تک برصغیر کی زبانوں کا تعلق ہے یہ داستان بھی تاریخ کے ساتھ ساتھ قدیم ہے آریہ کے متعلق تاریخ کی تحقیق ابھی تک تکمیل تک نہ پہنچ سکی ہے کہ آریہ حقیقت میں کس سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کا اصلی وطن کونسا تھا؟ تاریخ نویس ان کو ارکٹک کے رہنے والے سمجھتے ہیں۔ کچھ وسط ایشیا اور سائبیریا کے باشندے کہتے ہیں پروفیسر فائیلس اپنی کتاب میں ان کا وطن ہنگری لکھتے ہیں۔ پروفیسر جیکشر جی ان کا اطلاق ناروے پر کرتے ہیں لیکن آریہ کے قدیم کتابوں میں ان کے اصلی وطن اور آمد کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اسی حالت میں ان کے اصلی لسانی مسئلے کو حل کرنا نہایت مشکل ہے آریائی زبان کا پہلا مستند نقش رگ وید (۱۰۰۰ ق م) میں ملتا ہے رگ وید کے مختلف حصوں میں کہیں قندھار کے راجا دیوی داس کا ذکر ملتا ہے تو کہیں سندھ کے راجا سوردا س کا بیان نظر آتا ہے۔ ہیکڈ و بانڈ تاریخ سنسکرت ادب میں لکھتے ہیں:۔

"ویدک زبان پراکرت اور موئن جو دڑو کی زبان کے اختلاط سے بن گئی ہوگی۔ آریہ حکومت کے عروج کے زمانے میں ویدک زبان گروہ بندی میں آگئی تھی، جس کی اس طرح تقسیم کیا گیا ہے

اودیچ = یہ زبان شمال اور مغربی ہندوستان کی زبان تھی۔ مدھ دیش = یہ زبان انبالہ سے لے کر الہ آباد تک بولی جاتی تھی۔

پراچیہ = مشرقی ہندوستان کی زبان تھی۔

ان زبانوں میں اودیچ کو فوقیت حاصل تھی، کیونکہ یہ قدیم اور معیاری زبان تھی اور آہستہ آہستہ جب آریائی تہذیب کا مرکز شمال مغرب کے دیش سے مدھ دیش بنا تو وہاں کی زبان کو بھی معیار حیثیت حاصل ہونے لگی بعض آگے چل کر سنسکرت شدہ بن گئی اور اس زبان ہی کو سب سے اعلیٰ زبان سمجھا گیا برہمنوں کی سخت گیری نے اس میں کسی تبدیلی کی اجازت نہ دی کیونکہ یہ زبان برہمن، بادشاہ، وزیر اور امیروں کے سوا کسی اور کو بولنے کی اجازت نہ تھی۔ عوام نے مجبوراً ایک ایسی زبان بولنے لگے جس کو سنسکرت کی بگڑی صورت کہا گیا جو کہ پراکرت یا عوامی زبان کے نام سے مشہور ہو گئی۔

تاریخ سندھ مصنف مولانا سید ابوظفر ندوی

ویدک ہندو۔ مبڈیم۔ نریٹ۔ اے۔ راگوزن مترجم مولوی عبید احمد انصاری صفحہ ۲۳۔

ڈاکٹر بیمز اپنی مختصر تصنیف میں سنسکرت کے عروج و زوال پر لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی سب سے قدیم اور ماندہ و بدکہ زبان ہے اور تحریری سنسکرت کی سب سے زیادہ قدیم صورت ہے جس کو کلاسیکل سنسکرت اور بعد میں پراکرت یعنی نگری زبان کہا گیا۔ پراکرت کی ایک شاخ ماگدھی ہے جو موجودہ بہار میں بولی جاتی ہے جو گوتم بدھ کی مادری زبان تھی، جب بدھ دھرم کا پرچار ہوا تو یہ زبان مقدس بن گئی ۵۴۳ ق م میں جب یہ زبان سلون (لنکا) میں پہنچی تو اس کو پالی کہا گیا پراکرت کا اثر مندرجہ ذیل زبانوں پر براہ راست ہوا ہے۔ ہندی سندھی۔ مرہٹی، گجراتی، بنگالی، اسامی اور کشمیری وغیرہ

گریرسن۔ ڈاکٹر بیمز کے خیالات کی تائید کرتا ہے اور صاف الفاظ میں کہتا ہے۔

لہندا (پنجابی) اور سندھی انڈین آریہ زبان، ان مخصوص گروہوں سے تعلق رکھتی ہیں جس میں بہت سی وہ زبانیں موجود ہیں جو ڈراوڈک (دراوڑی) زبانوں میں موجود ہے جس میں کشمیری زبان خاص اہمیت رکھتی ہے۔

عرب فتوحات سے پہلے عربی زبان سندھ میں آچکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سندھی زبان نے آہستہ آہستہ عربی زبان کے لفظوں کو اپنا لیا تھا۔ عرب فتوحات سے پہلے عرب کے سیاح اس بات کا ذکر کرتے ہیں۔ سندھ کے ساحلی حصوں میں سندھی زبان کے ساتھ عربی زبان بھی بولی جاتی تھی، خصوصاً منصورہ اور دیبل کے شہروں میں۔ ابن حوقل مشہور سیاح نے اسکا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ابوریحان بیرونی اور اصطخری۔ جن کو سلطان محمود غزنوی کے دربار میں بڑی عزت حاصل تھی، جنہوں نے سلطان مسعود کا زمانہ بھی دیکھا تھا، انہوں نے ۱۰۱۰ء سے ۱۰۲۹ء کے درمیانی وقت میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی، وہ سنسکرت کے عالم بن گئے تھے۔ البیرونی نے لسانیاتی تحقیقات کا بڑا حصہ اپنی تصنیف کتاب الہند میں دیا ہے چونکہ اس سیاح کی سیاحت کا دائرہ سندھ اور پنجاب تھا، اسلئے اُس کی تصنیف میں جو لفظوں کی فہرست نظر آتی ہے، اس کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جو الفاظ استعمال ہوتے تھے وہ آج بھی سندھی زبان میں عام مروج ہیں۔ عربوں کے آنے کے بعد سندھی زبان نے عربی زبان اور اسلامی تہذیب کا اثر لیا جو آگے چل کر موجودہ سندھی زبان کی صورت اختیار کی۔

اردو زبان

لسانیات کے ماہروں کے سامنے اردو زبان کے ارتقا کا یہ پیچیدہ مسئلہ ہے کہ اردو زبان کا مرکز کہاں تھا۔ اس پر ہر ایک کی مختلف رائے ہے۔ پروفیسر ہاشمی کا خیال ہے اردو زبان نے پہلے جنوبی ہندوستان میں جنم لیا۔ مولانا امتیاز علی عرشی کا خیال ہے کہ اردو کی ابتدائی نشوونما میں دکنیوں کا بڑا حصہ ہے۔ حافظ محمود خاں شیرانی کا نظریہ ہے اردو زبان کی ابتدائی ترقی پنجاب میں ہوئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی تصنیف سے لکھتے ہیں کہ اردو سے پہلے سندھ میں بھی ان نظریات کے رو سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اردو زبان کی ارتقائی ترقی مختلف صوبوں کی اصلی پراکرت زبانوں سے مل کر ہوئی جس میں ہندی زبان خصوصیت سے بھوجپوری علاقوں میں عام مروج تھی۔ جس میں عربی اور فارسی زبانوں کے جبل شامل ہوئے اردو بنی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بھی سید سلیمان ندوی کی تائید کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ سندھ میں اردو کی ترقی ہوئی۔ لیکن بعد میں مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں۔

تذکرہ لغت حصہ اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ ندوی۔ ۲ حاشیہ جلد ۲۔

۳ Linguistic Survey of India VOL VIII by Sir Jorge Grierson. ۴ AL-Hind .. Al Beruni.

۵ بعنوان اردو مولف حافظ محمود شیرانی مرحوم ۶ سندھ کے قدیم اردو شعرا مرتب مناف جعفری (مقدمہ)

۷ اردو زبان کی ساخت میں افغانوں کا حصہ۔ رسالہ معارف مئی ۱۹۴۹ء۔ مقالہ نگار مولانا امتیاز علی عرشی

۸ It is agreed that a language was certainly developing in Sind, but it was not Urdu, It was the earlier form of Language (Hindustani Phonetics P. 17) by Dr Mohinddin Qadri Zor

"اردو کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا کام نہیں ہے بلکہ مختلف قوموں اور کے میل جول کا ایک ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے"

سید سلیمان ندوی ایک اور مقالہ "ہندوستان میں ہندوستانی" میں فرماتے ہیں[1]

"سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ گذر چکا ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں الگ الگ بولی تھی، مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں، اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں، اس کا پہلا، اس وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا"

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد صاحب کا خیال ہے کہ[2]

"اردو زبان اول لین دین، نشست برخاست کی ضرورتوں کے لئے پیدا ہوگئی، ہندوؤں کے ساتھ، ہندی مسلمان جو اکثر ایرانی یا ترکستانی نسل سے تھے، ہندوستان کو وطن اور اس کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے یہ ہی ظاہر ہے کہ جس طرح زمین سے روئیدگی کے بغیر رہ سکتی، اس طرح کوئی زبان زبان سے شاعری کے بغیر رہ سکتی۔ محمد شاہی دور تھا، اور عیش و عشرت کی بہار تھی ان شرفا کو خیال آیا ہوگا کہ جس طرح ہمارے بزرگ اپنی فارسی کی انشاپردازی میں گلزار کھلاتے تھے۔ اب ہمارے یہی زبان ہے ہم بھی اس میں کچھ رنگ دکھائیں"

ان بزرگوں کے مختلف نظریات پر ہم ہندوستان میں اردو کی نشوونما جو مختلف علاقوں میں اس پر بحث کرتے ہیں۔

سندھ میں اردو اور سندھ کے اردو شعرا

سندھ کا علاقہ پاک و ہند کا پہلا خطہ ہے جہاں سب سے پہلے عربوں کی آمد ہوئی، جب محمد بن قاسم نے پہلی صدی ہجری ۹۳ھ مطابق ۷۱۱ء میں سندھ کو فتح کیا، اور مسلمانوں کی حکومت کا آغاز کیا۔ تو سندھ کی حکومت کا تسلط بڑے عرصہ تک عربوں کے ہاتھ میں رہا۔ اسلام نے آتے سے سندھ باب الاسلام کے شرف سے مالا مال ہوا، اور اسلامی ثقافت کا گہرا اثر قبول کیا۔ چونکہ اسلام کی تبلیغ یہاں سے شروع ہوئی۔ تو اس عہد میں بڑے علماء اور صالحین پیدا ہوئے۔ جن کی وجہ سے سندھ دارالعلوم والادب بنا۔ تین سو سال کے طویل عرصہ کے بعد پنجاب میں مسلمان فاتحوں نے فتوحات حاصل کیں ان فاتحوں کا علمبردار سلطان محمود غزنوی تھا۔ ان کے بیٹے سلطان مسعود نے مسلم حکومت کا آغاز کیا۔ چونکہ وہ حصہ بھی اس زمانے میں سندھ کا حصہ تھا۔ اس لئے سندھ پر بھی ان فاتحین کا براہ راست اثر رہا۔

جہاں تک سندھ میں اردو زبان کا تعلق ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان دونوں زبانوں کا آپس میں گہرا تعلق رہا ہے لیکن اس کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اردو کی ساخت عربوں کے سندھ میں اقتدار و اختلاط نے کس قدر اضافہ کی لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان اور ہندوؤں کی زبانوں کی اجنبیت بڑی حد تک دور ہوگئی تھی یہ اثر سندھ اور ملتان پر ہی ہوا تھا کیونکہ عربوں نے باقاعدہ یہاں اگر حکومت اختیار کی تھی، بلکہ ہو سکتا ہے کہ تمام سندھ سے بیشتر ہندوستان کے حصوں کو مدد ملی۔

یہ حقیقت مسلم ہے کہ سندھی زبان کا اردو زبان سے تعلق بہت قدیمی ہے۔ سندھ میں اردو زبان کے نشان دسویں صدی ہجری میں نظر آتے ہیں۔ سندھ کے اسی دور کو مورخوں نے نظر انداز کیا ہے۔ سندھ نے جہاں دنیا کو پہلے سق سکھائے وہاں اردو زبان کی بھی بنیاد رکھی، اور اس اردو پر آج دنیا ناز

---

[1] نقوش سلیمانی، مصنف علامہ سید سلیمان ندوی مقالہ ہندوستان میں ہندوستانی صفحہ ۳۱

[2] آب حیات مصنف شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین آزاد دہلوی صفحہ ۲۹

کرتی ہے تاریخ شاہد ہے کہ سندھ میں سب سے پہلے تہذیب اور تمدن کا چراغ روشن ہوا۔ ہندوؤں کے قدیم کتاب ویدوں سے پتا چلتا ہے کہ آریہ ورش نے سندھ کو "صدھو" کا نام دیا تھا۔ یہ پہلی سرزمین ہے جہاں سامی اور آریائی زبانوں کا میل ہوا۔ یہاں اردو زبان کے آثار نمودار ہوئے۔ مغربی ہندوستان کی زبان ہندی سے یہاں سے عربی اور فارسی زبانوں کا اثر لیا۔ کسی ملک کے ادب پر نظر کرنے سے اندازہ ہوگا کہ ادب کی شروعات شاعری سے ہوئی سندھ میں عربی، فارسی، سندھی، ہندی، سرائیکی اور اردو شاعری سے ادب کی شروعات ہوئی اردو شاعری کے قدیم نشانات نظر آتے ہیں۔ جسے دیکھکر کہا جائے گا کہ دکن کے ساتھ ساتھ سندھ نے بھی اردو زبان کی توسیع و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ جو کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ تحقیق سے پتا چلتا ہے۔ سندھ میں اردو شاعری کو دکن کے پہلے صاحب دیوان شاعر بادشاہ علی قطب شاہ سے متعارف کرایا۔ جس کا دور غالباً ۱۵۸۸ء تھا۔ علی قطب شاہ کے مراسم بکھر کے ایک بزرگ میر حاصل بکھری سے تھے۔ اس کے پاس اکثر آتے جاتے تھے۔ اس بزرگ سے مل کر بکھر میں اردو شاعری کی بنیاد رکھی ہوگی۔[1]

دسویں صدی ہجری میں سندھ کے بہت سے شعراء کا سراغ ملتا ہے جنہوں نے فارسی، عربی سندھی کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی شاعری کی ہے گیارھویں صدی ہجری میں سندھ کے اردو شعراء بکثرت نظر آتے ہیں۔ ان شعراء میں ملا عبدالحکیم عطا ٹھٹوی (۱۰۲۰ھ - ۱۱۲۰ھ) کو اولیت حاصل ہے

ملا عبدالحکیم عطا ٹھٹوی اپنے دور میں فارسی زبان کے بہترین شعراء میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ عطا نے بڑی عمر پائی میر علی شیر قانع نے مقالات الشعرا میں لکھا ہے عطا نے شہنشاہ شاہجہان کے دور حکومت سے لے کر محمد شاہ کے دور حکومت تک کا زمانہ دیکھا۔ ان کی شاعری کا آغاز ۱۰۶۰ھ ہجری سے شروع ہوا۔ اس زمانے میں ہندی شاعری پر فارسی شاعری کا اثر ہو چکا تھا اور اردو شاعری دکن سے دہلی نہ پنجاب میں اردو شاعری کا ابتدائی دور تھا۔ اور سندھ میں اردو شاعری شروع ہو چکی تھی عطا کے فارسی دیوان کے آخر میں ایک اردو کلام نظر آتا ہے۔ جسے دیکھکر دکن کی شاعری یاد آجاتی ہے عطا کے اردو کلام سے چند نمونے کے طور پر مثال دیئے جاتے ہیں۔

"عطا" خبطا کہاں خاموش رہنا — سخن گو از زبان بر گوش رہنا
چو مجنون ذوفنون راز اینجا — کہ بی پروا ز خود بیہوش رہنا
ز خود خون جگر پیتا و جیتا — بعہد و داغ ہم آغوش رہنا
مسافر را ہمین آب و غذا خوش — کز اشک و آہ دوشا دوش رہنا
چون گل رنگ حنا بندی بریزد — چو نیلوفر کہ نیلی پوش رہنا

بہر دم آدمی بیچارہ بی تاب
بغمہا غوطہ نوشا نوش رہنا

دوسری مثال

عبار فقر مرا روپ رو رنگ بصورت — چہ کلمگ امتہ کہ از تھوک جوگیاں مارت
بہ سبہ سوھنہ بھر دیکھا نہ دکھہ دنیا — ز دل تکلتہ نہ بدا لھو سمج ای درت
بہ اصل ترمی نہ سیبا (سیاں باند دست) — کہ داب مردم دا ساھل درد سبرت

---

[1] ملا مسکین قدری۔ سندھی ادب نمبر شمارہ ۶ صفحہ ۲۷ ۱۹۷۳ء مقالہ اردو پر قدیم سندھی کا اثر" مقالہ نگار ڈاکٹر اسد اللہ شاہ حسینی صفحہ ۳۴

[2] دیوان عطا۔ مرتب سید محمد مطیع اللہ راشد ہالا پوری۔ سندھی ادبی بورڈ [3] مقالات الشعراء۔ مصنف میر علی شیر قانع۔

[3] دیوان عطا صفحہ ۲۵۹۔

میر صدر الدین امورا (۱۱۰۰ھ / ۱۶۸۸ء تا ۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۱ء) میر صدر الدین امورا خانوادہ امیر خانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے وقت کے بڑے فارسی گو شاعر تھے۔ ان کا تخلص کامل تھا۔ فارسی کے علاوہ سندھی اور اردو زبانوں میں بھی شاعری کی تھی، کامل حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے ہم عمر اور ہمعصر تھے ان کی زندگی کا مختصر احوال ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے "سندھ میں اردو شاعری"[1] کی کتاب میں دیا ہے ان کی ایک اردو غزل دی جاتی ہے

پیارے لڑکے ہمیں ستانا کیا — پھر گھڑی لڑکے روس جانا کیا
پھر سجن پاس سج چلے ہیں کیوں — بات ہے سچ ہمیں بتانا کیا
یو جلا کیل میں یو جانا ہوں — اے شمع روپنگ اُڑانا کیا
یار جانا کی بات جانی ہے — یہ نہ جانے تو پھر نہ جانا کیا
دلبری میں سکھو سو کچھ ناہیں — دل چرانے میں دل چرانا کیا
شمع کہتی جلی جلی بتیاں — کاٹنا سر جلا جلا نا کیا
تیغ غمزے کی زور کامل پر — جو بہانا تو پھر بھانا کیا

میر محمود صابر رضوی میر محمود صابر سید رضوی خاندان سے تھے۔ ان کا اصل وطن آسر آباد ایران تھا۔ ان کے دادا نے ایران سے ہجرت کرتے ہندوستان آکر جہان آباد میں سکونت کی تھی۔ وہاں سے دہلی چلے آئے۔ اور ۱۱۱۵ھ میں سید محمود تولد ہوئے۔ ان کے والد نے برادری سے سندھ کی راہ سفر اختیار کیا۔ جب ٹھٹہ پہنچے تو شہر سندھ آگیا اور وہیں جانے کا ارادہ ترک کر کے سندھ کو اپنا وطن بنایا۔ میر محمود صابر کو ٹھٹہ میں مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی اور مخدوم محمد معین ٹھٹوی جیسے بزرگوں کی صحبت نصیب ہوئی۔ ان کی صحبت میں رہکر شعر و شاعری شروع کی۔ فارسی شاعری میں کمال حاصل کیا۔ ابتدائی اردو معلیٰ سے پہلے ہی واقف تھے۔ اور مخدوم محمد معین کی صحبت میں اردو شاعری بھی شروع کی۔ حالانکہ ان کے دور میں ولی دکنی کی شاعری کا چرچہ سندھ میں ہو چکا تھا۔ ولی کی شاعری سے متاثر ہو کر ان کی تعریف میں یوں کہا ہے:

سن رخمد ولی کا دل خوش ہوا ہے صابر — ہنار فکر روشن سے اوازی سے مانند

صابر کے اردو کلام میں شوخی پائی جاتی ہے اور ابتدائی اردو شاعروں میں افضل سمجھا جاتا ہے صابر شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ اور دہلی کے اکثر استاد شعراء کے ہمعصر تھے۔ ان کے کلام سے ایک غزل نقل کی جاتی ہے:

تجھ زلف کے چھوتے ہی ہر کون سلجھے گا — اس زہر بھری اٹ کو ہر کون سلجھے گا۔
ابرو کی کمان کھینچ جو تو لگا گھونگٹ — ملکاں کے حدف اک تیر کون سکیے گا
ہیں کاتب قدرت خط باقوت کے سراں — تقصیر ترے جس کی سر کون سکیے گا۔
تجھ چہرہ کی رنگ دیکھ کلی شرم سوں مانکی — اس طرۂ کی سج دیکھ اکر کون سکیے گا۔
ہے فتنہ گری کام تیری شوخ بنگہ کا — غمزہ کے مقابل ہو جھکر کون سکیے گا۔
ہر موج ہے تجھ عشق کے دریاؤ کی خونخوار — غیر از کشتی سوف کے نیز لون سکے گا
ناحق ہی تجھ در کے بکھاری ہو رہینگے — اغیار سوں ہر بات میں لڑ کون سکیے گا
صابر ہے تیرے عشق میں مشہور دگر نہ — تجھ نقد سے دم عشق کا بھر کون سکیے گا۔

---

[1] "سندھ میں اردو شاعری" مولف ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ — مہران آرٹس کونسل حیدرآباد سندھ صفحہ ۹ - ۱۵

میر حفیظ الدین علی میر حفیظ الدین، میر حمید الدین ابوتراب کامل کے مجتبیٰ تھے کامل کی انہوں نے بڑی تقلید کی ہے، اس لیئے ان کے کلام میں وہی رنگ موجود ہے۔ میر علی شیر قانع نے مقالات الشعرا میں ان کے متعلق لکھتے ہیں [1]

در رسمی لطائف و غرایب شعر بزبان سندی، صرو ثانی است معاصرانرا کہ وی دیدہ۔

وکمت والہیات و نکات ہندی می بندد فہم ان ہمہ کس از قبیل دشوار

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

اپار ہو اکھٹا پار لیئے ہے — سرکا بنا تو آکی سوتی سلونی اچھے۔

دوسری مثال:

پیلے ہے کیوں کنارے موتا ہیں بھر کا — چونی چھوڑی۔ ہی باتیں موتی تو دیکھ لڑکا۔

روحل فقیر ۱۱۳۲ھ - ۱۱۹۴ھ روحل فقیر کا درجہ سندھ کے اعظم شعرا میں کیا جاتا ہے۔ اس کی ولادت تھر کے علاقہ میں ۱۱۳۲ھ میں ہوئی۔ والد کا نام تاھو تھا، اور ذات کے رنگریز تھے۔ ابتدا میں روحل فقیر کی تعلیم ہندو پنڈتوں سے ہوئی۔ بعد میں اسلامی درسگاہوں میں تعلیم مکمل کی۔ جوانی میں کلہوڑہ بادشاہ کی ملازمت اختیار کی تھی۔ لیکن مسان سرفراز کلہوڑہ کے عہد میں بڑھتی ہوئی بدامنی اور بے چینی سے دلبرداشتہ ملازمت چھوڑ کر حج کے لیئے چلے گئے۔ حج سے واپسی پر شاہ عنایت صوفی شہید کے فرزند صوفی عزت اللہ کے مرید ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد مرشد کے ارشاد سے صوفی سندھ کی طرف کوچ کیا۔ اور ایک غیر معروف مقام پر اقامت کی جس کو کنڈاڑی کا نام دیا۔ روحل کا سندھی کلام ایسا ہی ہے جیسا سرانکی اور ہندی کلام ہے۔ کلام کا موضوع تصوف ہے۔ جس میں وحدت الوجود کا فکر موجود ہے۔ کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

سگرو جی میں سرن تمہارے آیا۔

من میں متا رہی نہ کاؤ — درد مٹا سکھ پایا۔

گیان سورج گھٹ نیتر ہوتا — اکھنڈ جوت رنگ لایا

جی کارن جگ پھرت اداسی — سو گھٹ نیتر پایا

جنم مرن کا سنا بھاگا — چیتن سون چت لایا

پارس سے جب پرچا لاگا — لعل امر بھنڈ کایا۔

اگم دیس کو انتر مارگ — سنگر سوہ بتایا

"روحل" رتن امر نک ملیا — بھاگ پراپت پایا

حضرت حاجی شاہ فقیر اللہ علوی حاجی فقیر اللہ صاحب علوی کا ذکر "شاہ لطیف کے معصر سندھی شعراء" کے باب میں تفصیل سے دے چکا ہوں۔ حاجی صاحب اپنے وقت کے بڑے بزرگ کامل ولی اور عارفین عرف سادوں کے بلند پایہ شاعر تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اردو زبان میں بھی شعر کہا ہے۔ حالانکہ آپ کا اردو کلام اتنا دستیاب نہیں ہو سکا، لیکن جو کچھ بھی حاصل ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ کے دور

---

[1] مقالات الشعرا — میر علی شیر قانع — کنڈاڑی شہر۔

[2] کنڈاڑی والوں کا کلام (سندھی) مرتب مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی مطبع (سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ) صفحہ ۱

[3] ایضاً۔

افتادہ شہر شکارپور سے اس قدیم زمانے میں اردو کی صدا بلند ہوئی۔ آپ کے اردو کلام میں وہ شستگی نہیں ہے، مگر قدیم دہلی اور دکن کی ریختہ شاعری کے مقابل ہو سکتا ہے۔ حاجی صاحب نے اپنی زندگی بہت سفر کئے۔ قول صاحب تذکرہ لطیفی حاجی صاحب ۱۱۳۰ھ ہجری میں قندھار کے راستے سندھ میں آکر شکارپور شہر کو پسند کرکے سکونت اختیار کی۔ شکارپور شہر کی خوش نصیبی ہے کہ حاجی فقیر اللہ صاحب جیسے عالم بسل کی پاک زمین سے پیوند خاک ہیں۔ حاجی صاحب کئی مرتبہ حج بیت اللہ کو گئے سفر کے دوران ٹھٹہ کے علاوہ سورت بندر میں بھی اکثر قیام فرماتے تھے جہاں بڑے بڑے بزرگوں سے راہ و رسم حاصل کی تھی۔ ٹھٹہ کے اکثر بزرگ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی، مخدوم محمد معین ٹھٹوی اور دیگر عالموں سے ملاقات رہتی تھی جن کی صحبت میں اردو زبان میں بھی ناصحانہ کلام کہا۔ آپ کی اردو کو یہاں دیا جاتا ہے۔

مناجات

شمس الضحیٰ بدر الدجیٰ ارحم نبی المجتبیٰ
کان دما بحر عطا ارحم نبی المجتبیٰ

سرتا قدم پر از گناہ آکر پڑا تیری پناہ
کر لطف کی مجھ پر نگاہ ارحم نبی المجتبیٰ

سر پر گنہ کا بوجھ ہے۔ بھاری بڑا چون کوہ ہے
تجھ باجھ کس مجھ چھوٹ ہے ارحم نبی المجتبیٰ

سب عمر در حرص و ہوا کی صرف ناور در بلا
گر مغفرت کی مجھ پر عطا ارحم نبی المجتبیٰ

دے استقامت دین میں رکھ اس شیطان لعین میں
راسخ قدم مکین میں ارحم نبی المجتبیٰ

دل مان سے نور کیا، بد راہ سے گوشہ کیا
محکم یقین اس سے دیا ارحم نبی المجتبیٰ

علم و عمل، عفت ادب، نقوی دیانت روز شب
کر پھر اس احقر طلب ارحم نبی المجتبیٰ

جب موت کا پیالہ پیوں، دن حشر کے بھر کر جیوں
گر چول سے بچلا ہوں ارحم نبی المجتبیٰ

جب نزع سکتی کو نہ، گھبرا پڑے سے دن سونہ
تب چاقو دے عیسیٰ کوں ارحم نبی المجتبیٰ

اے سرور سالار دیں، اے رہبر اصل یقیں
اے شاہ خیر المرسلیں ارحم نبی المجتبیٰ

روز قیامت سر بسر ہوگا، پر از خوف و خطر
کر اہل محشر پر نظر ارحم نبی المجتبیٰ

عصاں کا جو راج ہے، آں پر بڑا کوتاہ ہے
دامن گنے کی لاج ہے ارحم نبی المجتبیٰ

ہے گدا کا بادشاہ، در آپ کے پر داد خواہ
ہم باجھ ناجیں عفو خواہ ارحم نبی المجتبیٰ

از سختی روز حشر، جوں سیر گردد ہر سقر
دامن نگوں کے غور کر ارحم نبی المجتبیٰ

اے داد خواہ انس و جاں، ہر صدا ہو مہرباں
ہو عفو ہر عاصیاں ارحم نبی المجتبیٰ

ہو کام ہے دارین میں، گذراں ہو سکے جن میں
کر بخشش طرف میں ارحم نبی المجتبیٰ

آیا فقیر از صدق دل گو ہے گناہوں میں خجل
خواہ ہر او زحق بھل ارحم نبی المجتبیٰ

---

۱ یہ مناجات حضرت حاجی فقیر اللہ شاہ علوی نے حج کے موقعہ پر لکھی تھی۔ جس کے لئے خود لکھتے ہیں تاریخ سنہ پنجم ۲۹ ذی القعدہ سنہ ۱۱۶۳ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کہ در حرم محترم بیت اللہ شریف اللہ تعالیٰ در حاشیہ مطاف مواجہ رکن طائی تالیف مناجات "بیاض لطف" رحم پروفیسر لطف اللہ بدوی مگاہ اصل متن میں لکھا ہوا ہے در اصل لفظ گناہ ہے۔ باجھ قدیم اردو لفظ ہے جس کی معنیٰ "بغیر" ہے

بگرداب عصیاں فرو رفت خاطر — بلطفت ازیں ورطہ بردار بردار
مرا نفس و شیطان و راہم ببردہ — شب و روز ہے اندر اصرار اصرار
بروز جزا گر کریں سوال ہم سے — تلطف شہا راہے درکار درکار
بچشم کرم گر کنی یک نگاہے — شود جملہ آساں بے دشوار دشوار
تجھے نور کا رنگ اپنا دکھا دو — شود جسم و جان جس سے انوار انوار
ہمہ را بود یک جہت قبلگاہی — مرا قبلگاہست دلدار دلدار
تمہارا حوالی نہیں کوئی خالی — کر امداد یا شاہ مختار مختار

غرۃ ربیع الاول ۱۱۹۴ھ

حکمت گیتا۔ سندھ میں قدیم اردو کا ایک اور مرقع ملتا ہے جو ایک ہندو اسامی گولا پتداس نے حکمت گیتا کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا ہے۔ جس کے شروع میں اور آخر کے صفحات پر فارسی کے ساتھ ہندی اور اردو زبان میں کچھ کلام دیا ہے۔ جس کی تاریخ کتابت پانزدہم ربیع الثانی ۱۱۲۵ ہجری دیا ہے۔ حالانکہ شعر میں بہت سی غلطیاں ہیں لیکن سندھ میں قدیم اردو کی بھی دہانی ہو جاتی ہے۔ نظم کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

یہ عرض بحر آمیز من سن کان دھر بہر خدا — بیکس بھیا ہوں کہ نہیں غمخوار اب غیر خدا
پابند قسمت کا رہوں بیدل بہت جانے خدا — از یاوری بختم اگر دل میں مہر ڈالے خدا
یا غور کن یا د وداع خلق خدا ملک خدا

طاقم جو شد طاقت سے لینا آگر دے — موسے او جا بہت، سوں سے یم چشم سہہ ترب بھے
چو ترشقت سوں کیے مخلوک گشتم مفلسی — حالت سوناوں کہہ کسے بہ گفت کی داند کسے
یا غور کن یا د وداع۔ خلق خدا ملک خدا۔

کل میں رہے پہاتے جبکے تن پر تکاری منہ کے — جہارے سارے نس چکے سینے سے آکیوتیں لگے
از بس حیا کہنا سکے و زکینہ گردوں بدمگے — گنتیم ہوں ہو کے بکے آدس کر یانوں لگے
یا غور کن یا د وداع۔ خلق خدا ملک خدا۔ (الخ)

مراد فقیر ۱۱۴۲ھ - ۱۲۱۱ھ | مراد فقیر، وصل فقیر کے مرید اور قریبی عزیز تھے اور جیسے ان کے ساتھ رہتے تھے۔ مراد فقیر کے والد کا نام محمد حیات تھا۔ ان کی ولادت ۱۱۴۲ھ میں ہوئی تھی۔ مراد فقیر اپنے دور کے بڑے شاعر تھے۔ ان کا سندھی، ہندی، مراٹھی اردو زبانوں میں کلام موجود ہے۔ کلام سے یہ اشعار دے رہا ہوں۔

کیوں اوسے نہ کیوں جاوے — آپ ہیں ہی پر آپ نمایے
جیوں ساگر پر ایک ترنگا — ایت ایک اور جوا ہو رنگا۔

اس طرح بارہویں صدی ہجری میں سندھ میں اردو شاعری کو بڑا فروغ ملا۔ کلہوڑہ فرمانروا کا دور تھا۔ حاکم خود بھی ادب نواز تھے۔ اس لئے شاعروں کی پرورش میں سندھی فارسی اور اردو زبانوں کو بڑی ترقی ہوئی۔ یہ سندھ کا سنہرا دور تھا۔ جس میں اردو شعرا پیدا ہوئے جن میں سید ثابت علی شاہ، محمد عظم تنوی، حضرت بیدل، حضرت مروت، میر کرم علی خاں، میر غلام علی مائل، حضرت قادر بخش بیدل روہڑی، ان بزرگوں نے اردو شاعری کو عروج پر پہنچایا۔ جس کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں سندھ نے بھی اردو کی نشوونما میں حصہ لیا۔

رسالہ ہندوستان کراچی جنوری - دسمبر ۱۹۶۲ء مدیر - اے - ق - کاروانی - ۲ کنڈیری والوں کا کلام مرتب مرحوم پروفیسر لطف اللہ ندوی۔

سچل سرمست ۱۱۵۲ھ — ۱۲۴۲ھ

• عارف حق آگاہ سالک مسالک حضرت حافظ عبدالوہاب فاروقی سچل سرمست بن میاں صلاح الدین بن حضرت فقیر صاحبڈنہ فاروقی رح فضل و کمال شاعر و بزرگ تھے۔ آپ کی ولادت ۱۱۵۲ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں درازہ شہر میں ہوئی۔ آپ کا خاندان امیرالمومنین حضرت عمر بن الخطاب فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ جد امجد حضرت شیخ شہاب الدین فاروقی فاتح سندھ محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ میں آئے۔ محمد بن قاسم نے جب سیوہن کو فتح کیا تو شیخ موصوف کو وہاں کا نواب مقرر کیا۔ آپ نے ۱۳۴ھ میں وفات پائی۔ اس خانوادہ فاروقی میں سے مخدوم نورالدین اپنے علم و فضل سے مشہور ہوئے یہ خاندان سیوہن سے ہجرت کرکے کاکڑی کے شہر میں آباد ہوا۔ حضرت مخدوم بہاءالدین ذکریہ ملتانی رح جب سندھ میں تشریف لائے تھے تو آپ نے فاروقی خاندان کے بزرگوں سے بھی ملاقات کی تھی۔ اس خاندان نے اپنی گنبٹ اور رانی پور کے درمیان علاقہ کی جاگیر اپنے دو لائق خادم دراز و ڈیرا اور کاچھن و ڈیر کے سپرد کر دی۔ جنہوں نے علحدہ علحدہ اپنے ناموں پر گاؤں آباد کیئے۔ کاچھن کا گاؤں آباد نہ ہو سکا۔ لیکن دراز کا گاؤں آباد ہوا، جو درازہ کے نام سے مشہور ہوا۔ فاروقی خاندان کاکڑی شہر سے ہجرت کرکے درازہ میں آکر مستقل سکونت اختیار کرلی۔ درازہ شہر کو شہرت دینے والے حضرت میاں صاحبڈنہ فاروقی تھے۔ فقیر صاحب کو دو فرزند تھے، بڑے کا نام میاں صلاح الدین اور چھوٹے کا نام میاں عبدالحق تھا۔ سچل سرمست کے والد میاں صلاح الدین عین جوانی کے عالم میں وفات کر گئے، اور سچل سرمست کی تعلیم و تربیت میاں صاحبڈنہ کی نگرانی میں ہوئی ظاہری علوم کے ساتھ انہوں نے قرآن پاک بھی حفظ کرلیا۔

روایت ہے کہ جب سچل سرمست سات برس کے تھے تو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی[1] رح آپ کے جد بزرگوار حضرت صاحبڈنہ کی ملاقات کے لئے درازہ میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے نونہال سچل کو دیکھ کر فرمایا تھا، "تم نے جو دیئلی چڑھائی ہے اس کا ڈھکن یہ بچہ اتارے گا" شاہ بھٹائی رح کی پیشینگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ فقیر صاحبڈنہ کی وفات کے بعد سچل سرمست کی تربیت ان کے چچا میاں عبدالحق کے ذمہ ہوئی۔ فارسی کے ساتھ روحانی فیض بھی حاصل کیا۔ سچل سرمست اپنے چچا میاں عبدالحق کے ارادتمندوں میں داخل ہو گئے۔ چچا کو بھی اپنے بھتیجے سے بے حد محبت تھی سچل ایک پرخلوص مرید کی طرح اپنے مرشد کی شان میں فرماتے ہیں[2]

گر بگوئی می شوم واقف ازان اسرار راز — پس کوکن با صدق دل روئی بسوئے شہر دراز
ہست آنجا پیر عبدالحق عارف اولیا — می کند آگہ سر وحدتش مسکیں نواز
در رضای دوست صابر شاکران مرد خدا — در نیاز ست باہمہ امار و دنیا بی نیاز
جز خدا ہرگز نداند ہیچ موجودی دگر — ہست آن سلطان حقیقت در دو عالم سرفراز
آشکارا و نہان شو از غلامانش غلام
باب عشق و معرفت را بر ہمہ کردہ است باز

---

[1] حضرت شاہ عبداللطیف رح نے ۱۷۵۲ء میں وفات فرمائی تھی۔

[2] دیوان آشکار (فارسی) حضرت سچل سرمست رح طبع منشی بشن لال صاحب محلہ گنج لکھنو صفحہ ۶۴ —

میاں عبدالحق کی صحبت میں رہکر آپ نے روحانی مدارج طے کیئے۔ اور حال و قال دونوں میں طرۂ امتیاز حاصل کیا۔ آپکی پوری زندگی جذب اور حال میں گذری اُسی وجہ سے سرمست کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کی زندگی عبادت الٰہی اور گوشہ تنہائی میں گذری سچل سرمست کی ملاقات حضرت حکم الدین سلانی چشتی بہاولپوری سے ہوئی۔ جس نے اس کی حالت بدل ڈالی اور رات دن سماع میں مشغول رہنے شعر و شاعری کا شوق ہوا۔ آپ کے کلام میں صرف قال نہیں ہے بلکہ حال بھی ہے۔ سچل سرمست پہلا شاعر ہے جسنے قدیم شاعری کے ساتھ سندھی شاعری میں غزل کی شروعات کی۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے بعد سچل سرمست کا اسم گرامی امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

سچل سرمست نے بڑی عمر پائی۔ نوے برس کی عمر میں رمضان المبارک ۱۲۴۲ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور درازہ میں مدفون ہوئے۔ آپ کی مزار مرجع خلائق ہے جہاں ہر سال رمضان المبارک میں بڑے اہتمام سے عرس ہوتا ہے۔ کسی شاعر نے آپ کی تاریخ وفات اس طرح لکھی ہے

آفتاب اوج عشق
۱۲۴۲ھ

درازہ کے صوفیانہ مکتب فکر نے صحیح معنی میں روح رواں سچل سرمست تھے انہوں نے اسلامی تصوف کو ایرانی رنگ نہ صرف پیش کیا بلکہ ایرانی شعراء سے بھی بہت آگے نکل گئے حرارت کے دلسوز کا ان پر بڑا اثر تھا۔ سچل سرمست کے کلام میں وہی رنگ جھلکتا ہے جو سندھ کے عظیم شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر یہ بیت دیا جاتا ہے:[1]

کٹي ساڻ کٹي، جا آنہ ٿين ملڪ ملير کان
مٿي تان مارئي جي ۔اُما لخطو کين لٿي۔
لوئي سندي ليج کان ڏکيان ڀيٽ نہ ٿي۔
ڏيٽ سورن جي سٿي، نہ ٿي ڏو راپين ڏکوئيو۔

"مارئی اپنے ساتھ جو پشمین چادر لے آئی ہے، وہ ایک گھڑی کے لیئے بھی ان کے سر سے جدا نہ ہو سکی اس لوئی (پشمی چادر) کی عزت اور ابرو کی وجہ سے وہ ریشم اوڑھ نہیں سکتی یہاں تم نے مجھے مارا ہے اور وہاں مجھے طعنے دیکر دکھ دیا جاتا ہے"

سچل سرمست صفت زبان شاعر مشہور ہے اور کثیر التعداد تصانیف چھوڑیں۔ فارسی شاعری میں اپنا تخلص آشکار کرتے تھے باقی زبانوں میں سچو۔ سچل۔ اور سچڈنہ تخلص اختیار کیا ہے۔

سچل سرمست نے اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے، جو اس وقت کے لحاظ سے اعجاز کا درجہ رکھتا ہے، کیونکہ اس وقت اردو شاعری اپنی ابتدائی منازل طے کر چکی تھی۔ اردو شاعری کے مشہور شاعر سراج الدین علی خان آرزو کی وفات کے وقت آپکی عمر ۱۰ سال تھی۔ اردو زبان کے مشہور عالم و شاعر نیم امروہی نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے "سچل سرمست نے جو غزلیں صوفیانہ طرز میں پیش کی ہیں وہ آج بھی مقبول ہیں" سچل سرمست اپنے میں اردو کا بلند پایہ شاعر تھا۔ اس زمانے میں بیشمار شان میں مشہور، استاذہ شعرا ان کے ہمعصر تھے۔ ان میں مصحفی۔ انشاء۔ نظیر اکبر آبادی۔ رنگین اور نصیر قابل ذکر ہیں۔ آپ کی اُردو شاعری میں حالانکہ پختگی نہیں ہے۔ لیکن وہ قدیم دکنی اردو سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ چند اشعار دکنی شعرا کا ملاحظہ ہو

---

[1] نخلستان گورنمنٹ کالج شکارپور میگزین ۱۹۶۹ء مقالہ حضرت عبدالوہاب فاروقیؒ مقالہ نگار راقم الحروف

بیمار ہوں تیرے برہ کا چھوٹن مرا مشکل ہوا
یہ درد مرا دیکھ کر افلاطوں لایعقل ہوا
اے یار تو آتا نہیں مجھ پر شفا بخشش کرو
اس درد میرے کی دوا آنا تیرا اک پل ہوا۔

سلطان عبد اللہ قطب شاہ کا کلام ملاحظہ ہو:۔

گلشن سے تو پیارے۔ بلبل ہے دل ہمارا
رنگ باس دونوں، تجھ میں پھل ہے پھلیا ہوا۔

ولی دکنی کا اردو غزل دیا جاتا ہے:۔ [1]

اہل گلشن پر تیرے قد نے جب امداد کیا — اولاً سرو کو غلامی سے نے آزاد کیا
اس کی تعظیم ہوئی اہل چمن پر لازم — بلبل باغ نے جب مصحفِ گل یاد کیا
روز ایجاد تیری چشم سوں اے نورِ نظر — حسن کے فرد پر دیوانِ ازل صاد کیا
سب سوں ممتاز ہوا سلسلۂ معنی بیں — دل دیوانے کوں جب عشق نے ارشاد کیا۔
سینۂ بلبل و قمری کوں کیا محشر میں درد — جب کہ اس سرو نے سیرِ گل و شمشاد کیا۔
آج مجھ یاد آئے دلبر شیریں حرکات — آہ کوہ دل کے اوپر تیشۂ فرہاد کیا
اے ولی جب سوں کیا عشق تحصیل جنوں
روح مجنوں نے اپس کا مجھے استاد کیا۔

اسطرح سچل سرمست کی اردو شاعری کو دیکھکر دکن اور قدیم دہلی کے اردو شعرا کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سچل سرمست کا کلام جرمے پایان ہے۔ اردو میں جو آپ کا کلام ہے وہ حقیقت میں اس سے ان کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں کرتی۔ البتہ وہ اردو کے لئے ایک قابل صد افتخار سرمایہ ہے کہ سندھ کے دور افتادہ علاقہ میں وادی مہران کے عظیم صوفی شاعر نے اپنی کرم نوازی سے۔ اُردو میں طبع ازمائی فرماکر اردو کی شوونما اور اشاعت میں حصہ لیا۔ آپ کے اردو کلام کی مثالیں دی جاتی ہیں:۔ [2]

کیا کروں میں جو مرا کوئی اختیار نہیں — ساتھ رہے، آج مرے پاس وہ دلدار نہیں۔
نبض کو دیکھ کے مایوس افلاطوں بھی ہوا — کہدیا صاف کہ یہ مست تو ہوشیار نہیں۔
تجھ کو تو درد نہیں، یار نے سچل سے کہا — میں نے رو رو کے کہا۔ تجھکو اعتبار نہیں۔

---

[1] دکن میں اردو ۔ مولف نصیر الدین ہاشمی صفحہ ۲۵۰
[2] سندھ میں اردو شاعری مولف ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ مہران ارٹس کونسل حیدرآباد ۱۹۶۷ء

غزل

ایک دن بازار اندر دیکھا عجب نظارا ۔
طفلان کے ہاتھ میں ، ایک بلبل ہوا بیچارا ۔
پر وہ بال رشتہ اندر اس کا کیا تھا محکم
تڑپن سے وہ نہ چھوٹا کرتا تھا لاکھ پکارا
ہم حال اس سے پوچھا کہ بلبل ہمیں سوں
کس حال میں پڑا ہے ، چھوڑا چمن ہزارا
ہنس ہنس کے گویہ بولا ، تجھکو خبر نہیں ہے
عاشق کا حال جو ہے ، وہ حال ہے ہمارا
دم عشق جس نے مارا ، اس کے گلے میں رشتہ
سر جان اس پر صدقہ "سچو" سریر سارا ۔

غزل

میرے پاس کہ ری قاضیا کیسا تمہارا کام ہے — تجھکوں کتابوں کی خوشی ، مجھکوں سارا ماتم ہے
ڈالیں کتابوں کا ورق عاشق ، عشق کی آگ میں — میرا نام ایک یاد کر یہی دوست کا پیغام ہے
اُسکی مجھ مجھکوں لیا کہتے ہو تم تم کتاب پڑھ — میرے گھر اُسی محبوب کے آنے کا آج انجام ہے
ایکدم بھلانا یار کوں نا عشقوں کا کام ہے — سجدہ سہو اُسکو نہیں جسکا عشق امام ہے
رہے نیکنامی تم لئے ای عشق سیں بے خبر — تیری جماعت کے آگے برہ سارا بدنام ہے
یہیں درد سر مطلب ہوا مرشد ہم کوں یوں کہا — بن عشقِ سچو یار کے کیا کفر کیا اسلام ہے

غزل

بہتر ایسی زندگی — بن عشق ہے شرمندگی ۔
جسکو سجن کا درد ہے ، روشنت اُسکی زرد ہے — اِس امّ جگت سوں مرد ہے صف عاشقاں کے مرد ہے
عاشق اول جس غم ہوا ، دونوں جگت ایکدم ہوا — دن رین اس ماتم ہوا ، کیوں آب آگم ہوا ۔
برہ ظاہر بدنام ہے باطن میں کیا یہ کام ہے — ناصبر نا آرام ہے وہ داس اُس ماتم ہوا ۔
یہ عشق عجب آفات ہے نا کشف یہ کرامات ہے — تقویٰ نہ کوئی طاعت ہے ، جس میں نہ مرجومات ہے
وہ ایک دم دیوانگی گم کر نہ یہ فرازنگی — یہی اصل ہے مردانگی ، بن عشق ہے بیگانگی ۔
کردیں بدل زنار پر یہ ہی حال ہے ہوشیار پر — منصور ہو چڑھ دار پر کہہ انا الحق سو خار پر
سُولی اوپر منصور ہے ، منظور ہے مشہور ہے — مئے پی کے ہوئے مخمور ہے ، اُسکا عجب مذکور ہے
باری برہ کا بار ہے ، سر عاشقاں سینگار ہے — "سچو" کے سر خمار ہے ، یہی عشق کا اسرار ہے ۔

باب دوم

اُردو زبان کی ابتدائی نشوونما

سندھ میں عربوں کی فتوحات کے بعد ایک مدت تک اُنکا اقتدار رہا۔ جس سے مقامی زبان پر بڑا اثر رہا۔ عربی زبان سندھ کے حدود سے نکل کر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلی اور وہاں کی زبانوں پر اپنا اثر جمایا۔ عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ سندھی میں شامل ہونے لگے۔ اس سے پنجاب بھی متاثر ہوا۔ اُردو کی ساخت میں عربوں کے سندھ پر اقتدار نے کس قدر اعانت کی۔ اور تمام سندھ کے حصوں سے اردو زبان کو مدد ملی ہوگی۔ محمود غزنوی کے حملے کے بعد اُن کا سیاسی مرکز وہ علاقہ تھا جو لاہور سے لے کر دہلی آگرہ اور متھرا تک تھا۔ پنجاب میں غزنوی حکومت کا اقتدار استقراراً دو سو برس تک رہا۔ اس عرصے میں ہندوؤں کی زبان پراکرت ہندی جانتا تھا۔ مسلمانوں سے تعلقات بڑھانے اور فارسی زبان سیکھی۔ مسلمانوں نے بھی ہندی زبان جان لی اس طرح اس وقت کے فارسی شعراء کے کلام میں ہندی الفاظ شامل ہونے لگے بلکہ اس زمانے کے مشہور فارسی زبان کے شاعر مسعود بن سعد کے محمد عوفی نے اپنی مصنف لباب الالباب میں لکھا ہے کہ عربی فارسی کے علاوہ اس کا ہندی زبان میں بھی کلام موجود تھا۔

مسلمانوں کے ہندوستان میں وارد ہونے کے وقت، ہندوستان کی عجیب حالت تھی، ملک، مختلف حکومتوں میں بٹا ہوا تھا ہر حکومت کی زبان بھی جدا جدا تھی۔ مسلمانوں کی زبان عربی مذہبی زبان تھی۔ علمی زبان فارسی اور ترکی تھی اس سے روزمرہ کی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن دفتر، فوج اور دربار کی زبان فارسی تھی۔ لیکن زندگی اور حکومت کی ضرورتیں انہیں عام لوگوں کی زبان کو استعمال کرنے پر مجبور کیا۔ اس طرح عام لوگوں کے لئے بھی ہوا کہ وہ اپنی بات سمجھ آنے والوں کو سمجھانے کے لئے ان کی زبان کو استعمال کرنا شروع کیا۔ محکوم زبان کا اصلی زبان تعدی سے میل کے بعد ایک نئی زبان وجود میں آئی جو "ہندوی" کہلاتی رہی بعد میں جب شاعری میں استعمال ہوئی تو ریختہ کے نام سے مشہور ہوئی جس سے مراد ملی جلی زبان ہے جسکو آگے چل کر ہندوستانی زبان رکھا گیا۔ یہ زبان رفتہ رفتہ اُردو معلیٰ کہلانے لگی اور عرصہ کے بعد معلیٰ نکل گیا اور اُردو رہ گئی جو مقبول عام ہونے لگی۔ شہنشاہ اورنگزیب کے عہد تک اُردو نام کی زبان کسی تحریر میں نظر نہیں آتی۔

اُردو زبان پنجاب و سندھ میں بنی، جس نے دہلی میں ایک حالت میں ملی زبان کا روپ اختیار کیا صوفیوں، درویشوں اور سلطنت دہلی کے لشکروں کے بدولت، گجرات، دکن، پنجاب، اور دوسرے علاقوں میں پہنچی اور بڑی تیزی سے پھیلی اس سلسلہ میں سب سے پرانی تحریر مراٹھی دیہوں کی ہے جو انہوں نے سات صدی کے دیپاوٹ میں دی ہے یہ کتابے ۱۲۵۱ء میں شروع کی اور ۱۲۷۱ء میں لکھ کر ختم کی لکھتے ہیں۔

"صدقے اُردو کی زبان کی، بزرگوں نے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوہگی ہے۔ انہیں کے راجا برجا قدیم سے وہاں رہتے تھے۔ اور اپنی بھاکھا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی امیزش پائی آخر امیر تیمور نے دہلی کے گھرانے میں اس ملک نام نہاد، سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ اس کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔"

حاجی امداد اللہ تھانوی کی سوانح حیات میں پروفیسر محمد انوار الحسن صاحب کہتے ہیں۔

۱۔ خطبات مسعود۔ مقالہ نگار۔ عبدالحمید۔ مطبوعہ پاکستان۔ ادارہ۔ مطبوعات پاکستان کراچی۔

۲۔ باغ و بہار۔ قصہ چہار درویش۔ مولف میر امن دہلوی مرحوم عطا حسین خان۔ مطبع یا ادارہ لاہور صفحہ ۱۱۔

ان امور کے علاوہ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت معلوم ہوئی کہ ۱۲۶۵ھ میں حالی نے آج سے ایک سو نو سال پہلے اردو کو ہندی کے نام سے یاد کیا ہے گویا اردو کو اس دور میں ہندی کہتے تھے ملاحظہ ہو یہ شعر۔[1]

کیا میں نے ہندی ملا کر کچھ اور ۔۔۔۔۔ کہ تا خاص اور عام سمجھیں بغور۔

مرزا نثار علی بیگ (مدرس اول آگرہ کالج) نے اپنی کتاب رسالہ قواعد اردو حصہ سوم میں اردو زبان کی ماہیت کے تحت ۱۸۶۹ء میں لکھتے ہیں[2]

اُردو کے معنی پادشاہی لشکر کے ہیں۔ چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں بادشاہی فوج کو اردوی معلیٰ لکھا ہے، لشکر کے سپاہی جو ایران اور توران کے ملکوں کے رہنے والے تھے، سودا سلف خریدنے کے لئے دہلی کے بازاریوں کے ساتھ جس میں اکثر ہندو تھے، جن کی زبان ہندی بھاشا تھی، فارسی ہندی آمیز بولنے لگے، رفتہ رفتہ شاہجہان کے عہد تک یہ زبان غلط ملط ہوکر ایک نئی زبان بن گئی اور اسکا نام اردوی معلیٰ سے منسوب ہوکر زبان اردو ہوگیا اور کثرت استعمال سے لفظ معلیٰ دور ہوکر صرف اس زبان کا نام اردو رہ گیا۔

ایک مستشرق عالم ٹی گریہم بیلی اپنی تصنیف "اُردو ادب" میں اردو کے متعلق لکھتے ہیں:[3]

اُردو لفظ اصلی ترکی زبان کا ہے، جسکے معنی لشکر یا چھاؤنی کے ہیں۔ انگریزی ادب میں (ہورڈی HORDE) کہتے ہیں جو ساتھ کہا گیا۔ مسلمانوں کے لشکر یا چھاؤنی کی جگہ دہلی تھی جو ۱۱۹۳ء سے لیکر آگے بھی رہی۔ اردو جو اردو معلیٰ کہلاتی، جس کی معنی اعلیٰ لشکر کی تھی، اس کا اعتراف ہے۔ یہ لشکر فارسی زبان بولتا تھا۔ اور شہر کے رہنے والے ہندی بولتے تھے۔ کوئی سبب نہیں کہ دہلی کی اصلی زبان اس حالت میں رہے۔

اردو ترکی زبان کا لفظ ہے اور چھاؤنی کا مترادف ہے۔ اردو معلیٰ شاہی فرودگاہ کہلاتی ہے شاہجہان نے نئی دہلی آباد کی تو لال قلعہ اور اس کے حوالی علاقہ اس ممتاز لقب سے پکارا گیا مغل شہنشاہ کی ذات مرکز ہوا کرتی تھی۔ لوگ رہنے سہنے بلکہ ہر چیز میں ان داتا کی نقالی کرنے میں فخر سمجھتے تھے، الغرض متذکرہ بالا بیانات میر امن کے بیان سے کئی مشابہت رکھتے ہیں۔ سیر المصنفین میں مولوی محمد یحییٰ تنہا نے ان بیانات کی تصدیق اس طرح کی ہے۔

رفتہ رفتہ عہد شاہجہان میں آگرہ کے عالم دلی سردار السلطنت قرار پائی۔ شہنشاہ۔ ارکان دولت وہاں رہنے لگے اہل سیف اہل قلم۔ اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو بمعنی فرودگاہ یا لشکر آتا ہے۔ چونکہ اُردو کے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ اس لئے وہاں کی بولی کا نام بھی اُردو ہوگیا۔ اور یہ زبان خاص و عام میں شاہجہان کے اردو کی طرف منسوب و مشہور ہوگئی"

مولوی محمد حسین آزاد کی آب حیات اور اس کے بعد کے تمام تذکروں میں مرکزی خیال وہی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو دراصل ایک مقامی محاورہ کا نام ہے۔ جس نے دلی کے لال قلعہ اور اس کے آس پاس کے چند محلوں میں پرورش پائی اور شعر و شاعری کے پروان چڑھ کر ہندوستان کے تمام حصوں کی ادبی زبان بنی، ظاہر ہے کہ جب تک کسی زبان کی جڑیں قوم کی تہذیبی اور روحانی روایات میں پیوست نہ ہوگی، اور جب تک اس کی بنیاد کسی زندہ

---

[1] حیات امداد (حاجی امداد اللہ تھانوی) مرتبہ محمد ابراہیم انور صفحہ ۱۲۲

[2] رسالہ قواعد اردو حصہ سوم مصنف مرزا نثار علی بیگ۔

[3] Urdu Literature, (The Heritage of India Series) by T. Grahame Bailey P. 5

[4] سیر المصنفین جلد اول مصنف مولوی محمد یحییٰ تنہا صاحب، عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور صفحہ ۲۹۔

زبان پر نہ ہو جو کسی خاص گروہ یا طبقے تک محدود نہیں بلکہ عوام میں بھی رائج ہو۔ اس وقت تک وہ عمومی مقبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔ حکمرانوں کے دور اُردو ادب کے فروغ میں اس وقت مسلمان صوفیوں اور فقیروں کا ہی ہاتھ تھا، جو اپنا پیام اس ملک کے عوام تک پہنچانا چاہتے تھے۔ یہ درویش عربی فارسی اور ترکی کے عالم تھے، لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ اپنے روحانی پیغام کو ہندوستان کے عوام تک پہنچانے اس لئے انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے علوم، مذہبی اور فلسفہ حضرات کو جاننا ضروری ہے۔ چنانچہ مسلمان علماء نے سنسکرت اور دوسری زبانوں کا مطالعہ کیا۔ اس کھڑی بولی میں فارسی الفاظ کی آمیزش کے ساتھ سب سے پہلے فقرے اور اشعار مشہور صوفی بزرگ بابا فرید گنج شکر سے منسوب ہیں۔ آپ نے اس زبان کو ہندی یا ہندوی کہا۔ شیخ بہاؤ الدین باجن (۱۳۰۸ء) نے اپنی تصنیف خزائن رحمت "حضرت بابا فرید گنج شکر" کے یہ دو بول نقل کئے ہیں، جو ہماری رائے کو مستند کرتی ہے[1]

۱۔ راول دیول بھی نہ جانے ۔۔۔ بھاٹا پہنہ روکھا کھائے

ہم درویشنہ رہے ریت ۔۔۔ پالی لوریں اور صدیت

۲۔ جسکا سائیں جاگتا ۔۔۔ سو کیوں سوئے داس

ایک اور مثال نظر آتا ہے۔

سندری سکھی پریم کی بتیاں ۔۔۔ یوں مل رہیں جوں دودھ پتیاں

حضرت شیخ بوعلی قلندر (۱۳۲۳ء) کا امیر خسرو سے یہ کہنا، "ترکا کچھ سمجھ لیجئے" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بزرگ بھی مقامی زبان سے واقف تھے۔[2]

امیر خسرو (۱۲۵۲ء تا ۱۳۲۵ء) سے پہلے شاعرانہ مہموں نے سترہویں صدی میں جدید اُردو اور ہندی رسمہ شاعری کا جنم داتا مانا گیا ہے امیر خسرو دہلی کے سلطان کی دربار سے تعلق رکھتے ہوئے بھی ہندوستان کے بڑے عالم، شاعر، ماہر موسیقی، درویش اور صوفی تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے محبوب مرید تھے۔ امیر خسرو نے نہ صرف ہوائی لطائف اُردو میں مرتب کئے، بلکہ فارسی اور ہندی کی مخلوط شاعری کا بھی تجربہ کیا۔ انکی ایک مشہور مثال یہ ہے[3]

زحالِ مسکین مکن تغافل دراے نیناں بنائے بتیاں،

کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں،

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں، تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں،

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر۔

نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں۔

اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کے کلام کے مثالیں نقل کیگئی ہیں۔ سب سے قدیم کلام ایک مستند بیاض میں سے ملا ہے، جس میں میراں جی شمس العشاق[4] اور اُن کے بیٹے اور بعض مریدوں کا کلام بڑی احتیاط سے جمع کیا گیا ہے اس کا سنہ کتابت ۱۵۶۸ء ہے

ہندوستان کے بادشاہ محمد تغلق نے دلی شہر کی آبادی کو دولت آباد لے کر بسایا۔ جس میں تقریباً دو لاکھ کے قریب لوگ دلی کو چھوڑ کر دولت آباد میں آباد ہوئے۔ اس غیر معمولی تبدیلی کی وجہ سے دلی والوں کی زبان میں بھی تبدیلی آگئی، جس کی بنا پر ان کی زبان فارسی رسم الخط میں لکھی گئی اور قلیل

---

[1] اُردو دائرہ معارف اسلام، زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب لاہور جلد دوم کراسہ ۶، صفحہ ۳۳۵

[2] ایضاً

[3] علم ثقافت (ثقافت ہندوستان میں) مصنف عبدالمجید سالک، صفحہ ۵۳۹، [4] دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۳۳۰

عرصہ میں عروس کی اختیار کر چکی، یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس زبان نے دلّی میں جنم لیا وہ دکن میں جا کر ادب اور انشاء کا رتبہ حاصل کیا۔ ہندی یا ہندوی غیر تعلیم یافتہ عوام میں استعمال ہوتی رہی۔ اور یہ زبان ادبی درجہ حاصل کر نہ سکی تھی۔ صرف وہ لوگ جن کا تعلق عوام سے تھا، وہ اس زبان کو استعمال کرتے تھے۔ اردو نثر میں سب سے پہلے ایک رسالہ دلّی کے ایک مشہور بزرگ حضرت سید محمد یوسف الحسینی المعروف گیسو دراز بندہ نواز نے اسلام کی تعلیم و تبلیغ کے سلسلے میں نکالا جس کا نام "معراج العاشقین" [1] غالباً ۱۳۹۸ء میں لکھا گیا۔ آپ تبلیغ کے سلسلے میں دلّی سے گجرات ہوتے گئے۔ آپ کی وفات گلبرگہ میں ہوئی۔ ۱۴۹۵ء میں شاہ میراں جی شمس العشاق کی "شرح مرغوب القلوب" [2] ملتی ہے جس کی زبان بھی معراج العاشقین کی طرح ہے۔ میراں جی کے صاحبزادے شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری نے نظم و نثر میں کتابیں لکھی تھیں آپ کی وفات ۱۵۸۲ء میں ہوئی۔ سترہویں صدی کے اوائل میں صوفیاء اور مشائخ کے لکھے ہوئے مذہبی رسالے ملتے ہیں۔

دکن میں اُردو

جہاں تک موجودہ تحقیقات کا تعلق ہے، اس امر کی تحقیق ہوئی ہے کہ اگرچہ دکنی اُردو کی سب سے قدیم کتاب "نصرتی" کی مثنوی ہے لیکن اُردو کو مستقل طور پر ادبی صورت دینے کی فضیلت، گجرات کو حاصل ہے اور یہ صوفیاء کرام کی بدولت نصیب ہوئی [3]

ہندوستان کے مسلمان بادشاہ علاؤالدین خلجی سب سے پہلے بادشاہ تھے جس نے دکن پر حملہ کیا۔ اور اس کے بعد گجرات پر فتح حاصل کی جس سے دلّی کی سلطنت کی طرف سے صوبیدار مقرر ہوئے۔ صوبیدار کے ساتھ لشکر مختلف پیشہ ور ملازم، معاصیں عالم کثیر تعداد میں اپنے اہل و عیال کے دکن اور گجرات پہنچے اور اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائے، گو یہ دلّی کا تقاضی اثر اس علاقہ پر ہوا۔ دہلی سے جو زبان دکن میں گئی تو ان کی دو شاخیں ہو گئیں، وہ زبان جو صوبے کی طرف کو گئی اس کو دکنی بگڑی کہا گیا۔ جو گجرات کی طرف گئی اس کو گجراتی کہا گیا۔ لیکن زبان دراصل ایک تھی۔

اُردو زبان کا دوسرا بڑا مرکز بیجاپور تھا۔ جہاں عادل شاہی سلاطین کی زیر سرپرستی، ان زبانوں کو فروغ حاصل ہوا۔ سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں قدیم اردو کا خاصا رواج ہو گیا۔ اور یہ سرکاری دفاتر میں بھی پہنچ گئی۔ بادشاہ خود بھی شاعر تھے اور موسیقی کے دلدادہ تھے۔ اس نے ایک کتاب "نورس" فن موسیقی پر لکھی۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی وفات کے بعد محمد عادل شاہ (۱۰۲۷ھ - ۱۰۶۰ھ) کے عہد میں اُردو کا رواج بڑھتا گیا اس عہد میں اردو کے تین شاعر گذرے ہیں۔ ۱۔ مقیمی (میر امقیم خاں) ۲۔ ملک خوشنود ۳۔ رسمی (کمال خاں)۔ محمد عادل شاہ کے بعد علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ - ۱۰۸۲ھ) کے عہد میں دکن میں اُردو کی خوب فروغ ہوئی۔ بادشاہ خود بھی اُردو کے شاعر تھے اس لئے انہوں نے اردو کی طرف خاص توجہ دی اس کا تخلص "شاہی" تھا اور شعر میں کلیات موجود ہے۔ جس میں اردو اور ہندی کلام موجود ہے۔ اس دور کا سب سے بڑا شاعر نصرتی تھا، جو علی عادل شاہ کے دربار کا ملک الشعراء تھے۔ نصرتی کی یہ مثنوی نہ صرف دکن کے ادب میں وقعت رکھتی تھی بلکہ اُردو ادب میں بھی بڑی جگہ رکھتی ہے۔ اس عہد کا ایک اور بڑا شاعر سید میراں شاہ ہاشمی گلبرگہ میں ہوا جو مادر زاد نابینا تھے۔ ان کی مثنوی یوسف زلیخا بہت مشہور ہے۔ سید ہاشمی نے اُردو زبان میں غزلیں بھی لکھیں تھیں جس میں ریختہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس طرز کا کلام لکھنے والا یہ پہلا شخص تھا۔ کلام کی مثال یہ ہے۔

جانا ہو اے مسافر رہنے کی ہی کچھ خبر ہے آیا اتا کدھر ہوں جانا سو کیو کدھر ہے

دن بھی رہا ہے تھوڑا آتی ہیں نیند ہو کے ہوتے مگر ہے نس پر ہیں بھی سے خطر ہے

۱۔ رسالہ نیا ادب بمبئی۔ مقالہ اردو ہندی ہندوستانی۔ مقالہ نگار سجاد ظہیر صفحہ ۵

ایضاً۔ " " " صفحہ ۳۔ اُردو معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب جلد دوم کراچی ۶ صفحہ ۳۳۹

۴۔ دکن میں اردو مصنف صبیر الدین حامی۔ صفحہ ۱۹۴۔

نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اُردو "کھکر" اس موضوع کی تکمیل کردی۔ مگر ان کی طرز بیان نے اس مسئلہ کو ضرور دلچسپ سوال بنا کر دیا ہے۔ اور مرحوم حافظ محمود خاں شیرانی نے "مقالات" میں اُردو "کھکر" ثابت کیا ہے کہ اُردو کی جنم دکن میں نہیں ملک پنجاب میں ہوئی ہے

اُردو کا ایک اور مرکز گولکنڈہ قطب شاہی کا دارالحکومت بھی تھا۔ قطب شاہی بادشاہ علم و ہنر کے بہت قدردان تھے بالخصوص اس خاندان کے پانچویں بادشاہ، سلطان محمد قلی قطب شاہ ۹۸۸ھ کے عہد میں ملک بڑا خوشحال تھا اس لئے علم، فن، اور ادب میں بھی بڑی ترقی کی شاعری کو خاصا فروغ حاصل ہوا۔ بادشاہ خود بھی شاعر تھے اُن کا کلیات بھی موجود ہے۔ جس میں غزل، قصیدہ، مثنویاں، مرثیہ کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اُن کے کلام میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو آگے چل کر اُردو ادب میں موجود ہوئیں۔ سلطان قلی قطب شاہ کا منتخب کلیات جدید طرز پر مرتب ہوا تھا، جس میں جو اردو عربیات موجود ہیں ان میں ہندی اسلوب بیان پایا جاتا ہے۔ جس کو اُن کے جانشین بھتیجے محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ - ۱۰۳۵ھ) نے مرتب کیا۔ وہ خود بھی شاعر تھے، اور "ظل اللہ" تخلص کرتے تھے اُن کا بیٹا عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر تھے اور ان کا دیوان موجود ہے قطب شاہی دور کے تین شعراء قابل ذکر ہیں ۱۔ وجہی جو دکن کے ممتاز شاعر تھے۔ اُن کی دو نظمیں اُردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ۱۔ نظم قطب مشتری جس کے پس پردہ محمد قلی شاہ کی داستان عشق لکھی ہے اور انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شایع ہوئی ہے۔ ۲۔ "سب رس" دکن کے شاعری کا سہ پارہ ہے ۲۔ شاعر غواصی ۱۰۳۵ھ جسکو سلطان عبداللہ کے عہد میں بڑا تقرب حاصل تھا۔ شاہی سفر کی حیثیت سے بیجاپور روانہ ہوا اس کی دو مثنویاں سیف الملک و بدیع الجمال، دوسری طوطی نامہ، غواصی کا ایک دیوان بھی موجود ہے ۳۔ شاعر ابن نشاطی، جس کی مثنوی "پھول بن" ایک عارضی مثنوی سانیں کا ترجمہ ہے۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد پانچ سنی خود مختیار سلطنتیں قائم ہوگئیں جس میں قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی، اور برید شاہی ان سب حکومتوں نے اُردو زبان کی سرپرستی کی نظام شاہی حکومت کے دور میں ایک شاعر کا سراغ ملا ہے، جس کا تخلص اشرف تھا۔ اس نے ایک مثنوی حضرت امام حسین علیہ وسلام کے مصائب اور حالات کربلا معلوم کیجئے اشرف سید علی نامی کے سلطان شکل آسای قندھاری متوفی ۸۴۳ھ کے بھانجے تھے۔ کلام[2]

اللہ واحد جس سمان — جس بھر سرجا جھوٹس آسمان

چندر سورج تارے دیکھ — بادل بجلی مینہ اچھوک

نبی محمدؐ حق رسول — کیتا جن یہ فقر قبول

دونہوں جگ اسرور سبھر — جن کون چاروں یار وزیر

"بوبکر صدیق ایک سرا — عمر خطاب بھی دوسرا۔ الخ"

اس مثنوی کی زبان سادہ ہے حالانکہ یہ بہت قدیم ہے۔ مگر اب اور دکن میں اُردو کی ترقی و فروغ کا یہ تذکرہ شہنشاہ اورنگزیب کے عہد تک پہنچتا ہے، سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ بتدریج ہندی کے نامانوس الفاظ کم ہوتے گئے۔ اور ان کی جگہ عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظوں نے جگہ لی کیونکہ اردو شاعری کے تمام اصناف فارسی شاعری کی مرہون منت ہیں۔ اور ان کے ادا کرنے میں بھی فارسی زبان کی تقلید کی گئی ہے اورنگزیب عالمگیر کے آخری دور حکومت میں اردو ادب کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ولی دکنی کا اندھیاں تھنڈھا اورنگزیب کی وفات کے ایک سال بعد یعنی ۱۱۱۹ھ ہجری میں ہوئی۔ اس سے چند سال پہلے ۱۱۱۲ھ میں وہ دلی آیا تو اہل دلی ان کے کلام کو سن کر بہت محظوظ ہوئے اور اسکا رنگ اتنا مقبول ہوا کہ وہاں کے لوگ بھی اس کی طرز میں غزل کہنے لگے اس سے پہلے شمال ہند میں کوئی غزل گو شاعر نظر نہیں آتا۔

---

[1] طوطی نامہ فارسی زبان کے مشہور شاعر ضیاء الدین نخشبی کی فارسی مثنوی طوطی نامہ کا ترجمہ ہے۔ دکن میں اردو مصنف نصیر الدین ہاشمی صفحہ ۲۲۲

[2] دکن میں اردو صفحہ ۲۲۳

ولی کو بھی دلّی کی زبان کا بڑا اثر ہوا۔ ولی چونکہ مدت کا شاعر تھا، اس لئے ان کی زبان میں لطافت اور بیان میں لذت اور روانی پائی جاتی ہے۔ تصوف کے لگاؤ سے اس کے کلام میں درد پیدا ہوا۔ اس نے فارسی اور ہندی الفاظ کا موزوں تناسب قائم رکھا۔ اگرچہ ان کے کلام میں بلند پروازی نہیں ہے تاہم پستی بھی نہیں ہے۔ دلی میں ولی کے ہمعصر اور بھی شاعر تھے، ان چند شعراء کے نام قابل ذکر ہیں۔ مثلاً کہ آمین گجراتی۔ جس کی مثنوی یوسف زلیخا مشہور ہے۔ انہوں نے یہ مثنوی ۱۱۱۱ھ میں لکھی تھی۔ مثنوی کسی فارسی مثنوی کی نقل ہے۔ نمونے کے طور پر چند شعر دیئے جاتے ہیں:۔

دیکھی صورت عزیز مصر کی جب ۔۔۔ پڑی دھرتی اوپر پچھڑا سے کر تب

کہ واویلا کہ واویلا کر دائی ۔۔۔ بخت رتب نے میرے اوندھی لکھائی

وہ تو کچھ اور تھا ایتو ہے کچھ اور ۔۔۔ ایتو دشمن رہے اس دوست کے ہور (الخ)

۲۔ قاضی محمود بحری ان کی مشہور مثنوی سن لگ ۱۱۱۱ھ میں تصنیف کی گئی ہے۔ بحری کی زبان صاف نظر آتی ہے۔ مثال یہ ہے

اے روپ ترا رتی رتی ہے ۔۔۔ پربت پربت پتی پتی ہے

اٹ اے قلم اس گھڑی نہ گھر جائیں ۔۔۔ سک لعت نگر کی سیر کرائیں۔

ہے نام واحد نشان احمد ۔۔۔ سرفی سواحد ہے بیان احمد۔

۳۔ وجیہ الدین وجدی: یہ صوفی منش شاعر تھے۔ ان کی تین مشہور مثنویاں موجود ہیں۔ جن میں سب رس، قطب مشتری، اور تحفۂ عشق شامل ہیں۔ حضرت فریدالدین عطار کی مشہور مثنوی منطق الطیر کا ترجمہ ہے۔ شعر کا نمونہ دیا جاتا ہے

واہ واہ اے ہدہد ہادی راہ ۔۔۔ ہے تجھے معلوم سب وادی کی راہ

ہے سبا کے شہر پر تیرا گزر ۔۔۔ کیا سلیمان کو دیا تو خوش خبر

تا تجھے ہے تاجداری ساز دار ۔۔۔ جب سلیمان کا نوج ہوا زار دار (الخ)

شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز محمد شاہ بادشاہ متوفی ۱۱۶۱ھ کے وقت میں ہوا۔ اس وقت تک دلّی میں ولی دکنی کا دیوان پہنچا تو غزل گوئی کا چرچہ شروع ہو گیا۔ ولی دکنی کا دیوان دیکھ کر دلّی سے بھی غزل گوئی شروع کی۔ خود اردو معلی کے ناخداؤں، ساہراؤں اور سلاطین نے بھی اس زبان میں شعر کہنا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دلّی کے اس شاہی علاقہ کو ادب میں مرکزیت بھی حاصل ہو گئی۔ جب کسی الفاظ یا محاورے کو اردو معلی "اصطلاح اہل اردو" متعارف اردوی بادشاہی اصطلاحی شاہجہاں آباد عرف اردوی بادشاہی کہہ دیا گیا۔ جان اوزو (۱۱۵۶ھ - ۱۷۴۳ء) نے ایک کتاب "نوادر الالفاظ" کے نام سے لکھی تو اس میں مسلواسع پیانبوری کی اردو لغت، غرائب اللغات جس حیثیت قاطع کے طور پر بھی مذکور بالا الفاظ استعمال کئے ہیں۔ انشائے دریائے لطافت میں لکھا ہے

جمیع فصاحت و معدن بلاغت کہ زبان تمام مشہور بہ اردو ست۔ سواری بادشاہ ہندوستان کہ تاج فصاحت بر سر ادی زیبد چند امیر و مصاحب شان و صحبت جگر و جندرن قابل از قسم و خام و کہن ہر لفظی کہ در ین استعمال یافت اردو زبان شد۔

جب اردو شاعری نے عوامی رنگ حاصل کیا اور زیادہ مقبول ہوئی تو جو لوگ محاورہ اردو معلی سے ناواقف تھے محبوراً اس کو اپنایا اور اپنا کلام اصلاح کے لئے دکھانے اس طرح اردو شاعری میں نیا رنگ پیدا ہوا۔ دلّی کے بہت سے استاد لکھنؤ گئے تو وہاں بھی اس خاص محاورہ کی قدر کی گئی۔

دکن میں اردو ۔۔۔ مصنف نصیر الدین ہاشمی ۔۔۔ صفحہ ۲۶۱

ایضاً ۔۔۔ ۲۶۴

ایضاً ۔۔۔ ۲۷۲

پورب والے لوگوں پر جو حکومت کرتے تھے وہ خود حاکم نہ تھے بلکہ وہ دلّی کے بادشاہ کے تابع تھے، اور مغل بادشاہوں کے طور و طریقہ سے واقف تھے دلّی کے شعراء ان کی حضور میں تقرب حاصل کرتے تھے اور ان کی ادبی مجلسوں کو گرماتے تھے۔ بلکہ غلامانہ زندگی بسر کرتے تھے، زبان کے معاملے میں انہوں نے محاورہ اردو معلیٰ ہی کے اتباع کو اپنا شاہی شان سمجھا۔ شاعری شروع کی تو اس میں بھی دلّی والوں کو استاد بنایا، اس طرح اردو معلیٰ کا محاورہ لکھنؤ میں بھی زبان زد ہوگیا۔ مگر کچھ تو لفظی طوالت کے باعث اور کس قدر دلّی کی سیاسی قوت نے انحطاط سے معلیٰ کا لفظ بول چال میں کم ہونے لگا اور صرف اردو رہ گیا۔ اس عہد کے مشہور غزل گو شعرا جنہوں نے اردو زبان میں باقاعدہ شاعری شروع کی تھی وہ یہیں۔

شاہ مبارک آبرو۔ شیخ شرف الدین مضمون۔ غلام مصطفیٰ خاں یکرنگ۔ شاہ حاتم۔ خان آرزو۔ اشرف علی خان فغان۔

مرزا مظہر جان جاناں۔ میر محمد رفیع سودا، میر تقی میر۔ خواجہ میر درد۔ سید میر سوز۔ اور انعام اللہ خان یقین۔

اسی دور میں سندھ کے اندر حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ سندھی شاعری کو عروج پر پہنچا رہے تھے۔ اس لئے شاہ بھٹائیؒ کی شاعری کو سندھی زبان کی شاعری کا کلاسک (CLASSIC) کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ آپ کے کلام میں وہ سبھی خوبیاں موجود ہیں جو کہ دنیا کے مہذب اور بڑے شعراء میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے نے اپنی تحقیقی مقالہ "شاہ عبد اللطیف آف بھٹ" میں ایک باب دیا ہے جسکا عنوان ہے "کلاسک کا جنم" (The Birth of a Classic) ڈاکٹر مورلے کے خیال کے مطابق "سندھی زبان میں کلاسک" نے اس وقت جنم لیا جب حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کا رسالہ وجود میں آیا۔ اردو کے متعلق لکھتے ہیں"

It was not surprising that Urdu was regarded till Seventeenth Century as a barbararous and uneducated tongue unfit for the game of Poetic impiration.

"اس میں کسی حیرت کی بات نہیں ہے کہ اُردو کو سترھویں صدی عیسوی تک کوئی قدر نہ تھی، مگر اُسکو وحشی اور ناتربیت یافتہ زبان سمجھا جاتا تھا۔ جو کہ شعر و شاعری کے لئے موزوں نہیں تھی"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اردو شاعری سے واقف تھے یا نہیں یا اُردو شعرا کے کلام سے واقف تھے؟

شاہ صاحب کے دور میں اردو، اُردوی معلیٰ اور ہندوی کہلاتی تھی، جس سے آپ کو واقفیت تھی۔ لیکن اپنے کلام میں اسکا ذکر نہ کیا کیوں کہ سوائے عربی کے مقصود، قرآن پاک کی آیات اور حدیث کے اور کسی زبان کو تضمین نہیں کیا مگر اپنے عظیم کلام میں عربی فارسی سنسکرت ہندی، بلوچی۔ سرائیکی۔ پنجابی زبانوں کے الفاظوں کو کثیر تعداد میں استعمال کیا ہے۔ وہ الفاظ جو آج بھی اردو زبان میں مروج عام ہیں وہ آپکے الفاظ آپ کے کلام میں موجود ہیں۔ آپ نے اس دور کے اردو شعراء کا کلام سنا اور اثر بھی قبول کیا، کیونکہ آپ کے درگاہ میں ہندوستان کے مشہور موسیقار رہتے تھے۔ اور آپ کا سفر کے سلسلے میں ہندو جوگی ماتروں سے صحبت رہی۔ کیپ گجرات جیسلمیر جوناگڑھ بھی تشریف لے گئے جہاں کی قدیم زبانوں سے واقف ہوئے تھے۔ ملتان پنجاب کا بھی سفر کیا۔ اس طرح شاہ صاحب اردو کی ابتدائی صورت سے واقف تھے۔ اور بہت سے مشہور بزرگ شعراء سے ملاقاتیں کی ہوگی اور ان سے متاثر ہوئے ہونگے۔ شاہ بھٹائی کی مریدی کا سلسلہ نہایت وسیع تھا۔ وقت کے راجا اور بادشاہ بڑی عقیدت رکھتے تھے جس اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اردو کی ابتدائی شکل و صورت سے واقف تھے۔

Shah Abdul Latif of Bhit by Dr: H·T·SORLEY Page. 207

باب سوم

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شاعرانہ خصوصیات

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ دنیا کے عظیم شعراء میں سے ایک ہیں۔ ہر دور کے شعراء اپنے ملک کے مختلف حالات اور اثر کے ماتحت خیال آرائی کرتے ہیں۔ صوفی شعراء نے اللہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں سرشار ہوکر عشق حقیقی کے رموز کو بیان کرتے ہیں۔ شاہ بھٹائیؒ وہ شاعر تھے۔ جن کے کلام میں شاعری کے کل صفات موجود تھے۔ آپؒ نے ہر پہلو کو اپنے کلام میں پیش کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شاہ صاحب کے اسے ہی ابیات موجود ہیں جن کے تخیل پر آج تک دنیا کا کوئی شاعر پہنچ نہ سکا ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُسے ہر مذہب و ملت اور ہر طبقے کے لوگ بڑے ذوق و شوق اور عقیدت سے پڑھتے ہیں سندھ کے لوگوں کے دلوں پر ان کا کلام مستولی ہے اور شاہ بھٹائیؒ اپنے کلام کی وجہ سے لامانی شہرت کے مالک ہیں۔ شاہ بھٹائیؒ شعر کے فن کی خوبیاں اور شاعرانہ استعداد میں نہ صرف سندھ کے شعراء سے سبقت لے گئے، بلکہ دوسری زبان میں بھی شاعروں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام میں تعقل فکری جمال، واقع نگاری انسان کے حقیقی حسن کا اسلوب بیان پیش کیا ہے۔ جس میں تشبیہات کی سادگی اور صنائع بدائع کی عمدگی موجود ہے وہ دوسرے شعراء میں نہیں ملتی۔ سندھ کے اس صوفی شاعر کے کلام میں ان معانی خصوصیات میں فن کی لطافتوں کا اتنا متوازن امتزاج ہے کہ زبان سندھی نہ جاننے والا بھی شعر سنتا ہے تو اس کے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کے افکار کی وسعت ان کی بلندی اور گیرائی بے پایاں ہے شاہ بھٹائیؒ کی زندگی میں ہی اُن کے کلام اور پیغام کا اثر نمودار ہوگیا تھا سندھ کی تاریخ اس تاثیر کا ایک کرشمہ سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ، فکر و ادب میں کوئی ایسا شاعر اور مفکر پیدا نہ ہوسکا۔ جس کا فکر اس قدر ہمہ گیر ہو کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی ایسا اہم پہلو نہیں چھوڑا جس کے متعلق کوئی حیات آفریں کا حل پیش نہ کیا ہو۔ شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں خود شناسی بھی ہے تو خدا شناسی بھی ہے۔ اُردو ادب کے مشہور نقاد و مدبر عظیم شاہ بھٹائیؒ کے کلام کے متعلق لکھتے ہیں۔

> سندھ میں جو مقبولیت شاہ صاحب کے کلام کو حاصل ہے۔ اس کے مقابلہ اردو شاعری میں کسی حد تک کوئی شاعر کرسکتا ہے تو وہ غالب اور اقبال کرسکتا ہے۔ لیکن غالب اور اقبال کی مقبولیت ایک خاص طبقہ تک محدود ہے۔ اور شاہ صاحب کی مقبولیت کسی طبقہ یا علاقہ تک محدود نہیں ہے

سیاسی و تاریخی نقطہ نظر سے شاہ صاحب کی زندگی کا پس منظر انتشار اور آزادی کا ایک ملا جلا مرقع تھا۔ ان کے گرد پیش کی زندگی سیدھی سادی دیہاتی زندگی تھی۔ شاہ بھٹائیؒ کے کلام کی بنیاد صوفیانہ نظریہ ہے۔ لیکن اس صوفیانہ فکر کے لئے انہوں نے سترھویں صدی کے آخر کی دیہاتی زندگی کے سادہ وجدانی پہلوؤں کے پیکر سے مدد لی ہے۔ شاہ بھٹائیؒ نے سندھی زندگی کے جن خاص رسموں کو اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے وہ اپنی جگہ پر مستند ہیں۔

شاہ بھٹائیؒ کی زندگی میں سادگی اور احساس کا خلوص موجود ہے۔ شاعرانہ جمال کی تلازمگی اور اُن سب چیزوں پر چھائی ہوئی ہے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے۔ وہ سندھ کے ہر طبقہ خیال کے لوگوں کے محبوب ہیں آپ نے دیہاتی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا جو آپ کے کلام کا مرکزی خیال بنا۔ جس کی وجہ سے آپ قادر الکلام اور فطرت کے مصوروں میں ایک سمجھے جاتے ہیں۔ جن کو لسان العصر کہا جاتا ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کا رتبہ نہ صرف سندھ کے ہمعصر شعراء میں بلند ہے بلکہ اس دور کے اُردو شعراء میں بھی بلند ہے کیونکہ آپ کا کلام ہر حالت میں اُردو شعراء کے کلام پر فوقیت رکھتا ہے۔ اردو شاعری پر فارسی شاعری کا بڑا اثر ہے۔ اس لئے ہر اُردو زبان کا ایک نقاد

ماہنامہ روح ادب شمارہ نمبر ۱۵، ۱۶، بابت ماہ مئی، جون ۱۹۵۳ء۔ مقالہ "سندھ کا عوامی شاعر" مقالہ نگار وقار عظیم، صفحہ ۱۰۴۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی تحریر فرماتا ہے[1]

ہماری اردو زبان کی شاعری جو سراسر فارسی شاعری کے سمع سے پیدا ہوئی، اپنے ابتدائی حالات میں عشق و محبت عاشق و معشوق و دیگر لوازمات عاشق کے وہی سانچے، وہی تصورات اور وہی معیار رکھتی ہے جو ایران میں اس وقت رائج تھے

چونکہ اُردو شاعری فارسی شاعری کی مقلد تھی، اس لئے اردو شاعری غزل سے شروع ہوئی۔ لیکن شاہ مشتاق غزل کے شاعر نہ تھے۔ اردو شاعری کا پہلا دور، سندھی شاعری کا مکمل متوسط اور عروج کا دور تھا۔ حالانکہ غزل کی ابتدا ہو چکی تھی۔ لیکن شاہ صاحب کی شاعری وہی قدیم شاعری تھی، جس میں تغزل کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اس دور میں مختلف شاعری کے اسلوب متعارف ہو چکے تھے۔ اور ان میں بھی شاہ بھٹائی کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔

شاہ بھٹائی کی شاعری کا دور ۱۱۱۲ھ سے ۱۱۶۰ھ تک تھا۔ ہم یہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ شاہ بھٹائی، اُردو شاعری کے اولین دور کے شعراء مثلاً۔ ولی دکنی، شاہ مبارک آرزو، سراج الدین خاں آرزو، ظہور الدین حاتم، مرزا مظہر جان جاناں، میر درد، میر تقی، اور سودا کے ہمعصر ہے۔

سندھی اردو الفاظ میں مشترک شباہت

شاہ بھٹائی کے کلام پر ہندی شاعری کا بڑا اثر نظر آتا ہے اور ہندی ویدانت کا اثر بھی پایا جاتا ہے۔ شاہ بھٹائی کے رسالہ پر نظر کرنے سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ آپ اُردو کی ابتدائی صورت سے واقف تھے۔ آپ نے اپنے کلام میں اپنی سندھی الفاظ کے ساتھ سنسکرت۔ اپبھرنش۔ پراکرت۔ ہندی، گجراتی، مرہٹی، سرائیکی، بلوچی۔ پنجابی، عربی اور فارسی الفاظ کثرت سے استعمال کیئے ہیں۔ اُردو زبان میں بھی عربی۔ فارسی۔ ہندی۔ گجراتی اور سنسکرت کے الفاظ موجود ہیں لسانی روابط کے اعتبار سے اُردو سندھی کے مشترک اور مشابہ ایسے الفاظ دیئے جاتے ہیں جن کو شاہ بھٹائی نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے۔ ان کی صورتیں ایک جیسی ہیں۔ ان کی معنی میں بھی یکسانیت ہے مثالیں یہ ہیں۔

سندھی الفاظ	اُردو الفاظ	سندھی الفاظ	اُردو الفاظ	سندھی الفاظ	اُردو الفاظ	سندھی الفاظ	اُردو الفاظ
۱۔ قائم	قائم	۱۷۔ شاکر	شاکر	۳۳۔ خوب	خوب	۴۱۔ آرل	ارل
۲۔ قدیم	قدیم	۱۸۔ سلوک	سلوک	۳۴۔ طالب	طالب	۴۲۔ جمال	جمال
۳۔ واحد	واحد	۱۹۔ شاعر	شاعر	۳۵۔ مفتی	مفتی	۴۳۔ غلت	غلت
۴۔ حکیم	حکیم	۲۰۔ کنارہ	کنارہ	۳۶۔ حجاب	حجاب	۴۴۔ عرفان	عرفان
۵۔ ایمان	ایمان	۲۱۔ پری	پری	۳۷۔ میثاق	میثاق	۴۵۔ رباب	رباب
۶۔ لسان	لسان	۲۲۔ عال	کل	۳۸۔ گڑکیون	کھڑکی	۴۶۔ تراب	تراب
۷۔ فائق	فائق	۲۳۔ بالم	بالم	۳۹۔ رمز	رمز	۴۷۔ ضمون	ضمن
۸۔ حق	حق	۲۴۔ کام	کام	۴۰۔ جتن	جتن	۴۸۔ پرسیر	پریم
۹۔ وصال	وصال	۲۵۔ کپور	کافور	۴۱۔ پھاٹ	پھاڑ	۴۹۔ تمہاری	تمہاری
۱۰۔ فراق	فراق	۲۶۔ دیپو	دیپ	۴۲۔ سالم	سالم	۵۰۔ ہندی	ہندی
۱۱۔ فرمان	فرمان	۲۷۔ کوٹل	کوٹل	۴۳۔ دکان	دکان	۵۱۔ سامی	سامی
۱۶۔ کاتب	کاتب	۲۸۔ معمور	معمور	۴۴۔ لوہ	لوہا	۵۲۔ پان	پان

[1] دلی کا دبستانی شاعری مصنف ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ دوسرا باب۔ صفحہ ۲۲ انجمن ترقی اُردو ہند دہلی۔

سندھی	اُردو	سندھی	اُردو	سندھی	اُردو	سندھی	اُردو	سندھی	اُردو
۵۳۔خالی	خالی	۵۴۔بود	بود	۵۵۔عشرت	کثرت	۵۶۔مشاهده	مشاهده	۵۷۔قاتل	قاتل
۵۸۔ارواح	ارواح	۵۹۔دار	دار	۶۰۔جناب	جناب	۶۱۔جام	جام	۶۲۔سوری	سولی
۶۳۔راڻ	راڻ	۶۴۔بات	بات	۶۵۔بازی	بازی	۶۶۔فکر	فکر	۶۷۔درشن	درشن
۶۸۔سانا	سانا	۶۹۔سنسار	سنسار	۷۰۔چندن	چندن	۷۱۔قصر	قصر	۷۲۔اُور	اُور

اس طرح پورے رسالے میں ایسے ہزاروں الفاظ ملیں گے جو مشترک اور متبادل صورتوں میں موجود ہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوگا کہ شاہ لطیفؒ اردو زبان کی ابتدائی لسانی صورت سے واقف تھے لیکن پھر بھی اپنے کلام سندھ کے عوامی زبان سندھی میں پیش کیا۔

وطن کی زبان سے محبت

حضرت شاہ لطیفؒ بڑے وطن دوست تھے۔ انکو اپنے وطن عزیز کی ہر چیز سے محبت تھی۔ اسلئے اپنا کلام بھی سندھی زبان میں پیش کیا اور اپنے عالی درجہ کی وطن پرستی کا ثبوت دیا۔ یہ بڑی قومی خدمت تھی جو آپ نے انجام دی۔ شاہ صاحبؒ اس مطربہ کو تقویت پہنچانے کیلئے سندھی محاورہ، تشبیہات اور سندھ کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنے کلام فارسی زبان کے اشعار کو تضمین نہ کیا۔ سوائے ایک شعر کے[2] خدا تعالیٰ اور رسول اللہ کے سعادتمند اور نیک بندے کی حیثیت سے الٰہی رموز کو سمجھانے کے لئے قرآن پاک اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اپنے کلام میں تضمین کیا۔ اور ساتھ ساتھ اپنے شاعرانہ فکر سے ان کی معنی و تشریح بھی دی

شاہ صاحبؒ کے زمانے میں سندھ کے علاقہ کی قیادت مذہبی اور مغرور حاکموں کے ہاتھ میں تھی۔ "الناس اعلیٰ دین ملوکھم" کے قول کے مطابق عوام بھی گمراہ ہو رہا تھا۔ جن کے ہاتھوں میں اقتدار ہوتا ہے، وہ ہی تہذیب اور تمدن، معاشرے اور سیاست، علم و ادب اور اخلاق کو بنانے اور بگاڑتے ہیں۔ سندھ کے حالی کلہوڑہ تھے جو پہلے سرتھ بعد میں حاکم۔ عالم عامل تھے لیکن عمل کے بغیر۔ اس لئے ان کے تعلقات دوسرے بزرگوں اور عالموں سے ناخوشگوار تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے، کہ ان کا اقتدار، جاہ جلال قائم رہے۔ شاہ عنایت صوفی کی شہادت اور شاہ عبداللطیفؒ سے دشمنی اس دور کی مثالیں ہیں۔ ان حاکموں کی مادری زبان فارسی تھی، لیکن شاہ صاحبؒ نے ان حاکموں کے سخت رویے کا آگے سر نہ جھکایا۔ ملک سندھ کے عوام میں ایک نئی روح بھر دی۔ سندھی زبان کو زندہ جاوید بنا دیا جو لوگ فارسی کو اپنی زبان پر ترجیح دے رہے تھے۔ ان کو اس طرح تلقین فرمائی ہے۔

جي فارسي سکيو، گولو توءِ غلام
جو ٻڌو ٻن ڳالين، سو ڪين چائي چام
اُيون تان آب گهري، ڪيو تان طعام
اي عامن سندو عام، خاصن منجهان نه ٿئي

جس نے فارسی سیکھی وہ ناقص غلام رہ گیا۔ جو ان باتوں میں الجھا، وہ کس طرح بادشاہ کہلائیگا۔
پیاسی کو دھیتہ پانی کی ضرورت ہوگی اور بھوکے کو طعام کی، ان سب چیزوں کا میسر ہونا عوام پر ہے
اور خاص کچھ بھی نہیں۔ جانئے۔

۱۔ رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ جلد اول دوم۔ سوم مرتب ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی

۲۔ یہ مصرع شہید صوفی شاہ عنایتؒ کی ہے پورا شعر اسطرح ہے۔

سر در قدم یار فدا شد چہ بجا شد این بار گران بود ادا شد چہ بجا شد۔

یہ اشعار اس زمانے کی علامات دہشت کے خلاف آواز تھی۔ شاہ عنایت صوفی ایک انقلابی شاعر ہے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے دباؤ ماحول سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے اپنی آواز کو بلند کیا، اور سندھی زبان کو عوام کی زبان تھی۔ اس میں اپنا پیغام دیا جو مقبول عام ہوا

شاہ عنایتؒ کے کلام میں ان کی شخصیت سمایا نظر آتی ہے جتنی شاعر کی شخصیت اُسکے کلام میں نمایاں ہوگی اتنا ہی اُن کا اثر ہوگا اور لوگ اُن کے کلام اور شخصیت سے متاثر ہونگے۔ شاعر کا کلام اگر کوئی حیثیت رکھتا ہے تو صرف تاثیر کے لئے۔ اور ادب کے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے۔ شاعر اپنے کلام میں تصوف کے باریکیوں اور رموز کو بارکیبی سے پیش کرتا ہے۔ کیونکہ تصوف کے فلسفہ کو عوامی زبان میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ شاہ عنایتؒ کا کلام اس حدیث مبارک کے معنی اور مطابق ہے :-

"من عرف نفسہ فقد عرف ربہ"

(جسنے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا)

شاہ عنایتؒ نے بھی اپنے تزکیہ نفس کے لئے ریاضتیں کرکے اس منزل پر پہنچے اور انسان ادب کی تخلیق کے باعث بنے۔ شاہ عنایتؒ کا کلام دو حصوں میں منقسم ہے۔ الاصلاح، ۲۔ دانشات۔ الاصلاح کا تعلق فلسفہ روحی، توحید اور رسالت مآب کی محبت۔ دانشات کا واسطہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی حقوق سے ہے۔ شاہ عنایتؒ کا پیغام ان دونوں عنوان سے بھرپور ہیں جن کی آپ کلام میں وضاحت کرتا ہے، کیونکہ الاصلاح کے اشتراک عمل سے ملک میں امن قائم ہوتا ہے۔ شاہ عنایتؒ نے سندھی تصوف و تصوف کا دلکش منظر اپنے مخصوص کہانیوں کے ذریعہ پیش کیئے ہیں۔

شاہ عنایتؒ ایک عظیم شاعر کے علاوہ برگزیدہ شخصیت اور محبوب سالک بھی تھے۔ آپ نہ صرف مداح، مصلح اور عارف تھے بلکہ قطب الاقطاب بھی تھے، جو قطب الارشاد اور قطب تکوین ہوتا ہے۔ قطب الارشاد وہ بزرگ ہوتے ہیں جو عوام کی اصلاح، تعلیم اور نفوس کی تربیت کرتے ہیں۔ وہ انبیاء علیہ السلام کے خاص پیرو اور نائب ہوتے ہیں۔ قطب تکوین وہ بزرگ ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے حکم سے کسی خاص دنیا کے حصہ کے لئے ہوتے ہیں جو عوام کی اصلاح معاش اور دفع بلیات کی کوشش کرتا ہے۔ ان سب سے بڑھکر قطب الاقطاب ہوتا ہے جس کے سپرد کائنات کی حکمرانی ہوتی ہے۔ شاہ عنایتؒ قطب ارشاد کے علاوہ قطب تکوین بھی تھے اس لئے تمام موجودات کو محض پہچانتے تھے سر سارنگ میں فرماتے ہیں۔

ست

موتي ماڻڪ جي، واري هيائين وائ

وڃون ڏسڻ آئيون، چوڏس ڀي چوٽار

هي آئيون استنبول ڏي، هي مڙيون مغرب پار

هي چڪن چين ڀي هي، ٿيا سمرقند ۾ سار،

هي رُمي ويهون روم ڀي هي ڪابل هي قندهار

هي دلي، هي دکن هي، گجرات منئ گرنار

هيئن جنهي جهمرمڻان، ڏٺا بيڪانير بڪار

هيئن پڄ پڄا ٿو، هيئن ڏٺ ڪلهين ڏار

هيئن اچي عمرڪوٽ ۾ ڏسڻا ڏيهار

مانيم سدائين ڪرين منئ صف سنگار

دوست تون ڏاڍي! عالم سڀ آباد ڪرين.

حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ نے اسلام کے عظیم انقلاب کو رحمت کے بادلوں سے تشبیہ دے کر فرمایا ہے۔

بادل لوٹ کر برسات کو برسانے کے لئے اپنی باری پر آ گئے۔

بادل جب برسانے کے لئے آئے۔ تو چاروں طرف بجلی کی چمک سے روشنی پھیل گئی۔

کچھ بادل استنبول کی طرف گئے۔ تو کچھ مغرب کی طرف برسانے کے لئے گئے

تو کچھ چین کی طرف برسانے کے لئے گئے۔ اور کس نے سمرقند کی جانب خبر لی

کچھ تبریز سے روم کی طرف گئے۔ کچھ کابل اور قندھار گئے۔

کچھ دلی، دکن گئے تو کسی نے گرنار کے طرف برسانا شروع کیا۔

بادل جوش میں آ کر جیسلمیر گئے۔ تو وہ بیکانیر میں بھی دریائی پیدا کی۔

بادلوں نے کچھ کچھ کو بھگو کر ٹھٹھ کے اوپر برسانا شروع کیا

بادلوں کے سلسلوں نے عمرکوٹ پر آ کر برسات برسائی

اے میرے رب تو ہمیشہ سندھ کے اوپر اپنی رحمت برسا کر ارزاں کر دے

اے مالک! سندھ کے ساتھ پوری دنیا اور عالم کو شاد اور آباد کر دے۔

باب چہارم

سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی مختصر سیاسی اور معاشی حالات

اردو شاعری کی ابتدائی نشو و نما کے وقت ہندوستان، سیاسی اور معاشی اعتبار سے بڑے مصائب میں مبتلا تھا۔ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ سیاسی افراتفری اور زبوں حالی کے ساتھ عوام مصیبت میں گھرے ہوئے تھے۔ معزول شہزادوں میں جاہ طلبی شروع ہوئی۔ شہزادہ محمد معظم کابل سے آکر اپنے بھائی کو آگرہ کے نزدیک شکست دی اور شاہ عالم بہادر شاہ کے نام سے ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷۰۷ء کو تخت پر بیٹھا۔ لیکن اپنے آباء اجداد کے وقار کو برقرار رکھ نہ سکا۔ اس کے عہد میں کوئی خاص ترقی نہ ہوئی ۱۱۲۴ھ میں وفات کی۔ اس کی وفات کے بعد اسکا لڑکا جہاندار شاہ عیش و عشرت گہوارہ جیسے حکمران رہا۔ اس نے سلطنت مغلیہ کے تین صدیوں کی عزت اور آبرو کو ایک طوائف لعل کنور کے قدموں پر نچھاور کردی۔ وہ میدان جنگ سے ایسا بھاگا، جسکا پھر کہیں پتا نہ چلا۔ فرخ سیر بادشاہ بنے جس نے اپنے بدولت مغلیہ سلطنت کا وقار قائم رکھا۔ لیکن وہ درباریوں کے سازش کا شکار ہوا۔ فرخ سیر کی حکومت کی مدت سات سال رہی۔ اس کے عہد میں شاہی دربار میں مدبروں اور عقلمندوں کا ایک قابل قدر اجتماع ہوگیا تھا۔ نظام الملک آصفجاہ کی سیاست، امیر الامرا سید حسین علی خان کی فراست اور امیر و فضلاء کی خردمندی، اگر یہ سبھی متحد ہوجاتیں تو کیا عجب تھا کہ مغلیہ حکومت کی وہی شان و شوکت دوبارہ نظر آتی۔ لیکن درباری آپس کی فتنہ انگیزیوں میں مبتلا رہے جس سے تباہی ہوئی، اور فرخ سیر سیدوں کے ہاتھوں ۱۷۱۹ء میں قتل ہوئے، جس کے بعد سات ماہ کے عرصے تک دلی کے تخت پر سید برادران کے بعد دیگر بیٹھے جن میں رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ تھے۔ اتفاق سے یہ دونوں بھائی ایک ہی سال میں مرگئے۔ نو تخت وارث شاہ جہان ثانی ہوئے۔ اس حکومت صرف تین ماہ چند دن رہی کیونکہ وہ اسہال کی بیماری میں مبتلا ہوگئے تھے جسمانی تکلیف کے علاوہ مارہٹہ کے اقتدار کا بھی ذہنی صدمہ ہوا، اور زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا۔ اور وفات کر گئے۔ تین ماہ کے اندر کچھ کر نہ سکے۔

۱۷۱۹ء میں محمد شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ بہت بیش بیدار اور عاقل بادشاہ تھا۔ ان کی عقلمندی کی وجہ سے امیر اُمرا آپس میں حسد کرنے لگے بادشاہ معمولی قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں آگئے۔ رشوت ستانی و عیاری کی بازار گرم رہی۔ مغلیہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی تھی۔ ریاستوں کے گورنر خود مختار ہوگئے۔ ہندو مسلمان اور غیر طاقتیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مطلب یہ کہ اس طویل عرصہ میں وہ تمام سامان ایک ایک کرکے جمع ہوگیا تھا، جسے اس عظیم الشان سلطنت کو نیست و نابود کیا جاتا۔ مغلیہ دربار میں اکبری عزم کے بجائے شبنم و بیجان کی بدمستی تھی۔ جہانگیری انصاف کے بجائے ظلم و تشدد کا دور تھا۔ عالمگیری جاہ و جلال و خدا پرستی کے بجائے بیبسی اور بیکسی و عسرت کا مظہر تھا۔ خود غرض امراء اور درباریوں میں نہ قوت کی پاکیزگی تھی نہ مقصد کی یکجہتی۔ جو باقی رہی سہی قوت تھی وہ بھی نادر شاہ کی خونریزی، مرہٹوں اور روہیلوں کی سرکشی سے جاتی رہی۔ اس طرح ایک شاندار تہذیب و تمدن کا جنازہ نکل گیا۔

محمد شاہ کے آخری عہد میں مرہٹوں نے شمالی کی طرف سے پیش قدمی کی ۱۷۳۱ء میں محمد شاہ نے مرہٹوں سے عہد نامہ کیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ پیشوائی کی موت کے وقت تک جو بھی علاقہ مرہٹوں کے قبضہ میں تھا وہ ان کو دے دیا جائے۔ اور دکن کے چھ صوبوں سے حق وصول کرنے کا حق ان دیا جائے۔ ۱۷۴۷ء میں مرہٹوں نے شاہجہان آباد سے دور تک علاقہ پر حملہ کرکے لوٹ لیا۔ مرہٹوں نے دہلی کے قریب پہنچ کر کالکا کے محل کو لوٹ لیا، جس میں بہت سے ہندو اور مسلمان بے گناہ مارے گئے۔ دارالسلطنت اس وقت فوج سے خالی تھی۔ محل سے رعیتوں کی ٹولیاں فریاد لے کر بادشاہ کی خدمت میں پہنچیں تب اس نے خبر بادشاہ کو چونکا ہوا کہ غنیم سر پر آپہنچا ہے۔ بادشاہ کے حکم سے دس پانچ امیر معمولی فوج لے کر نکلے اور نالہ کٹورہ پر لڑائی ہوئی اور شاہی فوج کو شکست ہوئی۔ شکست کھا کر فرار ہوگئے۔ اس اثنا میں مرہٹوں کی یلغار کی خبر سن کر برہان الملک اور دوسرے امیر دلی پہنچے تو مرہٹوں کو ان کی آمد کا ایسا خوف ہوا کہ وہ ریواڑی کی راہ گجرات اور مالوہ کی طرف بھاگ گئے۔

[illegible]

[illegible] کے سامنے پیش کیا گیا۔ جہاں بادشاہ کی بہادری کا [illegible] بادشاہ نے اپنے ساتھ [illegible] عزت کی۔ [illegible]

[illegible] کو معاف کر دیا [illegible] کی سلطنت آپ کو [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے اردو شعراء

[illegible]

[illegible]

[illegible] جاں دار اورنگ زیب

[illegible] کرنا

[illegible] نام سید شاہ حسین [illegible] شعر و شاعری [illegible] مشہور [illegible] منصور [illegible] مشہور [illegible]

[illegible]

[illegible] گیا [illegible]

[illegible]

[illegible] شاعر [illegible] نظام [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] مطابق [illegible] نظام [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اورنگ زیب [illegible] مشہور [illegible] نظام [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] مطابق [illegible] جنگ [illegible] نظام [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ڈاکٹر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ولد دکنی کا کلام معروف کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

غزل

[illegible] کی محبت [illegible] کہوں گا
[illegible] حالات سے کہوں گا
[illegible] کی
[illegible] کہوں گا
[illegible] کیا ہے [illegible]
[illegible] حالات سے کہوں گا
[illegible] چراغ
[illegible] کہوں گا

غزل

[illegible] آیا
[illegible] آیا
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کہوں گا
[illegible]
[illegible]
[illegible]

غزل

[illegible] کو اگر [illegible] کہو — [illegible] کا [illegible] رکھو
[illegible] — [illegible] کہو
[illegible] — [illegible] رکھو
[illegible] کہوں گا
[illegible] رکھو

باب پنجم

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور معاصر اُردو کے شعرا

(دہلی کے ہمعصر شعراء)

مماثلت

ولی دکنی کے دہلی پہنچنے کے بعد وہاں کے ادبی ماحول میں عجیب انقلاب پیدا ہوا، اور وہاں میں غزل گوئی کی تحریک پیدا ہوئی۔ حالانکہ اُس وقت معلیہ حکومت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ اورنگزیب عالمگیر تک مغل تخت شاہی کا نام تھا لیکن بعد میں جو بھی تاجدار بنے وہ بہت کمزور پڑ گئے۔ ۱۷۰۷ء سے لیکر ۱۷۱۹ء تک مختلف حکمران تبدیل ہوئے۔ وہ بھی خانہ جنگی اور دوسری محاذ آرائیوں سے دوچار ہوئے۔ ۱۷۱۹ء میں محمد شاہ بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ لیکن وہ بھی کوئی اچھے تاجدار ثابت نہ ہو سکے اُن کے دورِ حکومت میں بیرونی حملوں نے دہلی کو تاراج کر دیا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ شعر و شاعری اور فنونِ لطیفہ کے دلدادہ تھے۔ اس دور کے شعراء کرام کی سرپرستی کرتے تھے۔

اس انقلابی اور ہنگامہ آرائی کے دور میں دہلی کے ادبی ماحول کو بڑی ضرب لگی۔ کیونکہ بڑے بڑے اساتذہ اور اہلِ سخن دہلی کو خیرباد کہکر ہندوستان کی دوسری جگہوں پر چلے گئے جس سے دہلی کا ادبی ماحول بڑا متاثر ہوا حالانکہ اس دور سے بڑے اصحابِ سخن پیدا کیئے۔ جن میں اوّلین دور کے شعراء میں سے معزالدین مظطرب۔ خیرالدین خان امید۔ سلیمان علی خان۔ سعد اللہ گلشن۔ مرتضیٰ خان فراق۔ شمس الدین فقیر۔ عبدالقادر بیدل علی قلی خان تعریم قابل ذکر ہیں جو فارسی اور اُردو زبان میں شعر کہتے تھے۔ یہ وہی دور تھا جس میں وادیٔ سندھ کے دور افتادہ علاقہ میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سندھی زبان میں اپنی شاعری سے جادو جگا رہے تھے۔ نہ دہلی سے سروکار۔ اُردو زبان کی شاعری کو بلندی پر پہنچانے میں انہیں مصروف تھے ان معاصر شعراء نے مسلمانوں کو خدا تعالیٰ اور حضور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتاتے ہوئے راہِ صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت کی۔ ان شعراء کرام کا احترام اُن کی وفات کے بعد سے آج تک اسی طرح کیا جاتا ہے۔ جس طرح اُن کی حیات میں کیا جاتا تھا ان شعراء کے رہن سہن میں اختلاف تھا۔ اُن کا رنگ اور لباس بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ اس دوری اور طبعی و جغرافیائی اختلافات کے باوجود اُن کے خیالات میں نمایاں مماثلت پائی جاتی ہے۔

شاعر اپنے جذبات و احساسات اور فرقت کے الم انگیز لمحات اور ان سے مرتب شدہ واردات قلب کو اپنے اشعار میں بیان کرتا ہے دل کی بے چینیاں الفاظ کا لباس پہن کر اشعار کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ یہ ترکیب اور معنی خیز جذبات حقیقی شعر کی خالق ہوتی ہے۔ شعر میں یہ کیفیت رنج و الم کی آمیزش کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ اگر شاعر اپنے ذاتی تجربات اور انفرادی محسوسات کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کر دے کہ ہر پڑھنے والا اسے اپنی بات سمجھے وہ شعر پڑھ کے چونک اٹھے اور دل کو محسوس کرنے لگے یہی وہ شعر ہے جو اس نے کہا ہے۔ یہی شاعری کامیابی کی دلیل ہے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شاعری میں یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے جو اس دور کے اکثر اُردو شعراء میں بھی پایا جاتا ہے اس وجہ سے اُن کی شاعری میں جادو کا اثر ہے۔ دنیا میں بہت سے بڑے شاعر گذرے ہیں اُن کے کلام میں ہمگیری عنصر جذبات اور ہر طرح انداز بیان کا یہی عنصر پایا جاتا ہے اگرچہ انہوں نے اظہار خیال کے لئے علیحدہ اسلوب اختیار کئے ہیں۔ یوں تو متعدد شعراء حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے معاصر شعراء ہیں۔ مگر ان سب کا ذکر طوالت کے پیش نظر دینا مشکل ہے لیکن اُن کے مشہور ہمعصر اور صاحبِ اُردو شعراء کو شاہ عبداللطیف کے کلام کے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ ان شعراء کے منتخب اشعار کا آپ کے کلام سے موازنہ کیا گیا ہے تاکہ اردو داں طبقہ اس حیرت انگیز وحدتِ خیال۔ یکساں فکر اور عمل کی جھلک دیکھ سکیں۔ ان تمام شعراء کے کلام کے تقابلی مطالعہ سے اس دور کے ذہنی رجحانات اور معاشی زندگی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

شاہ بھٹائیؒ نے جس زبان میں اپنا کلام پیش کیا ہے، وہ بلاشبہ ایک مخصوص علاقہ تک محدود ہے لیکن اُنہوں نے جس اُنس و محبت کا پیغام دیا ہے اس کی افادیت اور وسعت عالمگیری حیثیت رکھتی ہے۔ شاہ بھٹائیؒ اور اُردو کے ہمعصر شعرا کا ذکر اس طرح ہے۔

ولی دکنی :-

ولی دکنی کا تفصیل سے ذکر پہلے آچکا ہے۔ اُنہوں نے دہلی میں اگر اُردو شاعری کی نشوونما کی تھی۔ اس لئے وہ اُردو شاعری کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔ دہلی کی پوری ادبی فضا شاعری کے نغموں سے گونجنے لگی تھی۔ ولی دکنی طبقۂ اوّل کے شعرا میں سے ہے۔ اُن کی ولادت ۱۰۷۹ھ میں بتائی جاتی ہے اور شاہ بھٹائیؒ کی ولادت ۱۱۰۲ھ میں ہوئی تھی۔ اس حساب سے ولی، شاہ بھٹائیؒ سے ۲۳ سال بڑے تھے۔ ان دونوں شعرا کے کلام میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ولی دکنی اللہ تبارک و تعالیٰ کے حمد میں کہتے ہیں:

الٰہی یا الٰہی یا الٰہی تجھے ساجے جگت کی بادشاہی

ولی ہے یوں سبب خالی بہانہ، اس کا کام ہے دینا دلانا۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ نے اللہ تعالیٰ کی توصیف کی ہے اس میں انکساری کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے فرماتے ہیں:

اللہ جئین نالو، تئین موں وڈو آسرو

خاوند تنھنجي گھاند جو پرو پلن نہ کو

نالو رب سندو، رحیو آھي روح ۾

یا اللہ جتنا تیرا بڑا نام ہے، اتنی ہی مجھے تجھ میں امید ہے۔

یا الٰہی تیرے صبر (رحم و کرم) کی کوئی حد نہیں ہے

یا رب تیرا ہی نام ہمیشہ میری روح میں سمایا ہوا ہے۔

ولی دکنی محبوب کی تعریف اسطرح کرتے ہیں:

جب صنم کو خیال باغ ہوا — طالب نشۂ فراغ ہوا۔

فوج عشاق دیکھ ہر جانب — نازنین صاحب دماغ ہوا۔

ماں سیں تجھ لباں کے سرخ ہوا — جگر لالہ داغ داغ ہوا۔

دل عشاق کیوں نہ ہو روشن — جب خیال صنم چراغ ہوا

اے ولی گلبدن کوں باغ میں دیکھ

دلِ صد برگ باغ باغ ہوا

شاہ لطیف بھٹائیؒ نے اسی خیال میں محبوب خدا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں آپ کے حسن و رخسار اس طرح کرتے ہیں۔

کٹي نیٹ خمار ماں، جان عباڻون ناز نظر

سورج شاخون جھکیون، کماڻ کمر

تارا کتیون تاڻب تیا، دیکھندي دنبر

جھڪيو تبو جوھر، ھاڻ ٻي جمال سين

میرے محبوب نے جب خمار آلودہ نظریں اُٹھائیں تو اسے دیکھکر سورج کی روشنی مدھم پڑگئی اور چاند مرجھا گیا
ستارے ان کے حسن کی تاب نہ لاکر غائب ہوگئے بلکہ پورے جہان کا جوہر ان کے حسن وجمال کے آگے ختم ہوگیا۔

وؔلی کہتے ہیں ــــ وؔلی اس گوہر کا حیا واہ کیا کہنا
میرے یہاں اسطرح آوے ــــ
جون سیج میں راز آوے

شاہ لطیفؒ اس خیال یون ادا کرتے ہیں۔ پیتمانی مہ پرین جی پلائی جا پیر
اُگی اُھنیون جی ڈیہ پا پوھی پیر۔
قمر پاڑی ھیر، شمس سپرین سین۔

میرے محبوب کی صورت میں اچھائی اور حیا کے آثار ہیں۔ عاشقوں کے گھر بڑے کرم سے قدم لے کر آتے ہیں
سورج اور چاند کی کیا مجال ہے کہ وہ انکی ہمسری کرسکیں۔

وؔلی کہتے ہیں ــــ براگی جو کہلاتے ہیں گھر بار کرنا کیا
ہوئی جوگن جو کسی پی کی اُسے سنسار کرنا کیا۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ فرماتے ہیں ــــ واري ويراگين کي ويل جي وساريج
قدم ڪاپڙين جا ايلائي لميج
پرت پسو پٽ جي وڃڻ کي وجيج
ماتو ڏيئن مڙ ميج، آئُ نہ جئيندي ان ريءُ

"بیراگی کی اگر مدد کرنا، اس کے مشکل وقت نہ بھلانا۔ ان جوگیوں کے قدم تک کوشش کرکے پہنچنا (قدم حاصل کرنا)
جو بیراگی جو مرشد کی طرف گئے ہیں ان کی راہ پر چلنا، دن رات ان کی طرف چلتے رہنا میں ان کے بغیر زندہ نہ رہوں گی۔"

وؔلی دکنی نے فرمایا ہے ــــ
کیوں عاشقاں کی صف میں پائیں وہ سرخروئی
جن کی انکھیاں کے اوپر خون جگر نہ آیا

عشق میں تفریق نہیں ہوتی۔ جس نے فرق رکھا وہ محبوب کے وصال سے محروم رہیگا۔ شاہ بھٹائی وؔلی کے خیال کی وضاحت کرتا ہے
ايڪ پيالو اڀ چڻا، عشق نہ ڪري ايڏن
ليڪا جي لڪ ۾ ڪي قرب رسندا ڪيئن
ڏٺ ڪيا ڏيئن، وانجيا پس اوصال کي۔

ساغر ایک ہو اور مے خوار دو عشق میں ایسا نہیں ہوتا۔
گنتی کرنے والوں میں جو ہوگا وہ محبوب کے وصل کو کیوں کر حاصل کریگا
خودی نے اُن کو اسطرح محبوب کے وصال سے محروم کردیا۔

شاہ ظہور الدین حاتم :- ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء — ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء

شیخ ظہور الدین عرف شاہ حاتم، اپنے دور کے بڑے شاعر تھے۔ شروع میں رمز تخلص کرتے تھے، دلی کے شعراء سے مانے تھے۔ اپنے شاگردوں کی وجہ سے مشہور تھے۔ حاتم کی ولادت شاہجہان آباد میں ۱۱۱۱ھ کو ہوئی اور ۱۱۹۷ھ میں وفات پائی۔ حاتم شاہ بھٹائیؒ کے ہمعصر تھے یعنی شاہ بھٹائیؒ سے ۹ سال بعد میں پیدا ہوئے اور ۳۲ سال زیادہ عمر پائی۔ حاتم کے دور میں اردو زبان صاف ستھری ہو گئی تھی۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ نظر آتا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے

شاہ حاتم نے فرمایا ہے:-

ہجر کی زندگی سے موت بھلی

کہ جسے سب کہیں وصال ہوا۔

شاہ بھٹائیؒ ہجر و وصال کے جذبہ کو اس انداز سے پیش کرتا ہے فرماتے ہیں:-

جي قيام مڙن تہ ڪر اُڏا سپرين۔

تہان پري سچو، واتا اِون وصال جون۔

اگر قیامت کے دن بھی محبوب کا وصال ہو جائے تو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں

لیکن اس سے بھی دور وصال محبوب ہو تو میرے لئے مبارک ہے۔

شاہ حاتم — ابر میں یاد یار آتا ہے

گریہ بے اختیار آتا ہے

اس خیال کو شاہ بھٹائیؒ پیش کرتے ہیں۔ جڏ نينهن نه لهي ڪڪر هون نه هوند

سارين سپرين کي لڙڪ ڳلن تي پون

ٿي هر موتي موڪن، جن ساڻ سپرين۔

محبوب کی یاد میں ابر آنکھوں سے نہیں اترتا، گرچہ آسمان پر بادل موجود نہیں ہے

دوستوں کو یاد کر کے اشک (آنسوں) گالوں پر ٹپکتے ہیں

وہ کیوں نہیں روئینگے جنکے محبوب دوست حاضر ہوں۔

شاہ حاتم کہتے ہیں:- محتاجگی سوں مجھکو نہیں ایک دم فراغ

حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا۔

شاہ بھٹائی فرماتے ہیں:- ٻي جو ڏٺ ڪري تہ ڏونگر ڏهرن ڏاڪڙو

ڇپرڪين ڏٺي، سوڪڙي سنس ٻي

سراج الدین آرزو

بیش رو شعرا میں قابل قدر صحبت اور دہلی کے شعرا کے سرپرست۔ اکثر شعرا کے اساتذہ۔ فارسی اور اردو دونوں میں ان کے شعر موجود ہیں۔ آرزو کا اصل وطن اکبرآباد تھا۔ ان کا انتقال ۱۱۶۹ھ کو لکھنؤ میں ہوا اور دہلی میں دفن کئے گئے۔ مرحوم لکھتے ہیں:

استادان ریختہ نیز شاگرد او جہت برائے تفنن طبع دوست ریختہ خود ہم فرمودہ

آرزو کی وفات سے ۴ سال پہلے شاہ لطیف بھٹائی کا انتقال ہوا تھا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

آرزو کہتے ہیں۔ آتا ہے نظر مجھ کو تیری برابری کو۔

کیا دن لگے ہیں، دیکھو خورشید ظہوری کو

شاہ لطیف بھٹائی فرماتے ہیں:۔ چندا تنھنجی ذات پاڑیان، ناں نہ پریں سین

تون اچی منجھ رات، سچی نت سوجھرو

اے چاند میں تجھے اپنے محبوب کے برابر نہیں سمجھتا

تم رات کو روشن ہوتے ہو لیکن میرا محبوب ہمیشہ روشن ہے۔

آرزو فانی زندگی کے لئے کہتے ہیں:۔ جان تم پر کچھ اعتماد نہیں

زندگانی کا کیا بھروسہ ہے۔

شاہ لطیف نے شعار زندگی کے لئے فرمایا ہے:۔ فانی ہی فانی دنیا ڈھیکڑو

ھوڈ ریو جانی، آھی سی سیکھن

یہ دنیا فانی ہے اس طرح پر کوئی اعتبار نہیں ہے یہ ایک دم کے برابر ہے

پھاوڑا اور شرکل ہر ایک سر پر آئیگا (قد ناپ کر قبر کھودی جائے گی۔

اشرف علی خان فغاں:۔ (۱۱۸۶ھ متوفی)

فغاں شاہ جہان آباد کے رہنے والے تھے۔ اور احمد شاہ بادشاہ کے زمانہ تک شاہی دہلی، نواب اسلوی سے کھرا کر مرشد آباد چلے گئے۔ جہاں سے اعظم آباد گئے اور وہیں انتقال کیا۔ ان کے کلام میں سوز و گداز موجود ہے۔ کلام یہ ہے

فغاں:۔ مجھ سے جو پوچھتے ہو تو ہر حال شکر ہے

یوں بھی گذر گئی مری وہ بھی گذر گئی۔

شاہ لطیف بھٹائی فرماتے ہیں:۔ نہ کاتی نہ کاتنی، نکو خود غلم ہو

اگ اُبتی لکھو، جت نہ سی باقی

جنھکی ڈیان دانھن، قلم قضا وھائیو

نہ تو صبح کا دوش ہے نہ ہی قلم کا گناہ ہے یہ تو تقدیر کا لکھا ہے جہاں کوئی پہنچ نہ سکتا

جو کچھ تقدیر کا لکھا ہوا ہے اُسے ہر حال میں شکر سے نبھانا ہے۔

تذکرہ شعرا اردو (فارسی) مولفہ میر حسن دہلوی صفحہ ۔ مطبع انجمن ترقی اردو دہلی۔

شیخ شرف الدین مضمون :-

آج شرف الدین مضمون، حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی اولاد میں سے تھے، حافظ محمد اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری میں کمال پیدا کر لیا تھا۔ مضمون نے درد شاہ رنگین سرخی خان آرزو کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ۱۲۳۵ھ میں وفات کی۔ کلام ملاحظہ ہو۔

مضمون :- میرا پیغام دھلی اے قاصد
کہو سب سے اسے جدا کر کے۔

شاہ عشائی فرماتے ہیں:- نئی نیند نج ایہ ادا قاصد۔ ساقی پرین سنیہو۔
پیرن دھی متر آم نراپون نہور کے بچ۔

اے قاصد میرا پیغام لے کر جا میرے محبوب کو دینا۔
اور پاؤں پر ہاتھ رکھ کر منتیں کرنا۔

مضمون :- جلا کشتی میں آگ سے جو وہ محبوب جاتا ہے۔
کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں، کبھو جی ڈوب جاتا ہے۔

اس حال کو شاہ عشائی نے اس طرح پیش کیا ہے۔ سبنی جوبن ڈینھن جدھن سجن سفر ھلیا۔
مونا مرن نہ سیوں ایل کرمان کیئن۔
مونکی چاڑھی چیئن، دیو وشجارہ اودھری۔

میرا محبوب ان جوبن (جوانی) کے دنوں میں سفر پر چلے گئے۔
اے میری ماں میرے رونے سے بھی وہ نہیں رکتے۔
وہ اس طرح چھوڑ کر بنجارے سفر پر چلے گئے

غلام مصطفیٰ خان بیکرنگ :-

غلام مصطفیٰ خان بیکرنگ شاہ مبارک آرزو کے دوست اور ہمعصر تھے۔ اپنے دور میں شعر و شاعری کے لئے بڑے احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ مثال

بیکرنگ :- کچھ بیکس بار جاتا ہے
دل سے صبر و قرار جاتا ہے

شاہ عشائی :- محبوب کے فراق کا غم اس طرح کیسا ہے
شاہ مصعب خان کی صورت بھلا نا مہر
ساجن کاہوں سنو، دوتہ سدس دیرھا
خان کو کوئی صیغت ہی ہے کیوں نہ میرا محبوب ملا کرے
میرے دل کا صبر و قرار جا کھا ہے میں اے ہر ایمن ہو دوں کی

مرزا مظہر جان جاناں ۱۶۹۸ء - ۱۷۸۱ء

مرزا جان جاناں کی ولادت ۱۱۰۱ھ کو علاقہ مالوہ میں ہوئی۔ آپ کے والد شمس الدین اورنگزیب عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ مرزا اپنے دور کے عالم، فاضل اور صوفی و شاعر تھے۔ آپ کے کلام میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ فارسی زبان کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ آپکا شعر شہرت دوام حاصل کر چکا ہے

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن ۔
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را ۔

مرزا نے ۱۱۹۸ھ میں شہادت پائی۔ اردو زبان کے استاد شعراء تھے۔ آپ کے اس عہد کے کثیر تعداد میں شعراء نے فیض حاصل کیا ہے۔ کلام کے چند مثالیں دی جاتی ہیں

مرزا مظہر :- ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا سخت جلاتی ہے بہار

شاہ لطیف فرماتے ہیں :- کفاف عاصیاں کرصو۔ چناتو جو ذاہ
منجھن کاہ ککوری۔ منجھن باغ بہار
عاشقی پی تنوار۔ تھو سڑدی جنت رو۔
کس طرف آنکھ کا پٹ کر کے لے جاؤں۔ ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی ہے
اُسی میں ہی جس کا کہ محل ہے اور اس میں ہی باغ و بہار ہے
میرے (محبوب) کے سوا اور کوئی بات میری زبان پر نہیں ہے ۔

مرزا مظہر :- گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا ۔

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں :- عین سانگھیم سپرین ا جاتوں عیم جال
سودا موت کی عال موتی منصن جے آئیون
محبوب کے الطاف کو سمجھنے میں میں نے بڑی غفلت برتی ۔
میرے محبوب (سوہنی) مجھے لوگوں ہی اس غفلت کی سزا مل گئی

شیخ محمد حاتم ۱۷۲۰ء - ۱۷۹۳ء ۔

شیخ محمد حاتم جالندھر کے رہنے والے تھے، عمر کا زیادہ وقت دہلی میں گذارا۔ آخر عمر میں رامپور چلے گئے جہاں انتقال کیا ۔

حاتم :- ہمنشیں ذکر یار کر کچھ آج
اس خطیب سے ہی پہلا ہے

شاہ لطیف :- یار سے پرین وت ناکئی سرین بجاء
اصی بیصن کان ذاہ، قادر تیل کنھن کی نہ کری ۔

یا تو محبوب کے پاس رہنا چاہئے یا اُن کا ذکر کرنا چاہئے۔ ان دونوں باتوں سے الگ خداوند تعالیٰ کسی کو نہ کرے ۔

میر عبدالحی تاباںؔ

میر عبدالحی تاباںؔ شاہجہان آباد کے رہنے والے تھے۔ خوبصورت اور صاحب جمال عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ تاباںؔ کے کلام میں بڑی لطافت موجود ہے۔ چند اشعار دیئے جاتے ہیں:۔

تاباںؔ تقدیر کے فلسفہ کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

میرا بس ہو تو ہرگز خط نہ آنے دوں ترے لیکن
لکھا قسمت کا کوئی بھی مٹا سکتا ہے کیا قدرت

شاہ لطیفؒ نے اس خیال کو بڑے جاذب انداز میں بیان کیا ہے فرماتے ہیں۔

قسمت قید عیاس ہئے تہ عیر اچي من کوٹ ہے
آئی لکي لوح جي صنع ڈیکاریم سیئ۔

قسمت نے مجھے قید و بند کیا ہے ورنہ کون اس قید میں آکر پھنسے
تقدیر نے مجھے یہ جگہ دکھائی ہے اسکے لکھے ہوئے کو کون مٹا سکتا ہے

تاباںؔ — مرتے ہیں آرزو میں اس وقت ان پہنچو،
— ٹک تم کو دیکھ لیں ہم جلدی جان پہنچو

شاہ لطیفؒ اس دانی جدائی کے کہتا ہے

— ڪنھن جنھن نیم ننڈلم، ہي مون واجھا ٹینڈیا نہ وڃو۔
جیکي منھي ڪنڊاہ، سو جانب ڪرھو جیئہ ہي۔

تجھے کس شوق نے روکا ہے میرے محبوب میری آرزو کرنے سے بھی نہیں آئے۔
— جو کچھ تجھے میرے مرنے کے بعد کرنا ہے وہ اگر جیتے جی میں کر۔

تاباںؔ — عشق کیا شے ہے کسی کامل سے پوچھا چاہئے
کس طرح جاتا ہے دل، بیدل سے پوچھا چاہئے۔
جس نے اس کا زخم کھایا ہو اُسے معلوم ہو
تیغ ابرو کی صفت گھائل سے پوچھا چاہئے۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں — محبت جي میدان جي سر جو سانگ ڪري۔
لاھي سر لطیف چئي، اگیان دوستن ڏي
عشق آھي نانگ، جنھ کاڏن کي پوي۔

محبت کے میدان میں سر کی بازی لگا، اور سرکٹ جانے کی پرواہ نہ کر۔
شاہ لطیف فرماتے ہیں سر تن سے جدا کرکے دوست کے آگے رکھ دے
عشق وہ سانپ ہے جسکی خبر ڈسے ہوئے سے پوچھو۔

مرزا محمد رفیع سودا ۱۱۲۵ھ - ۱۱۹۰ھ

مرزا محمد رفیع سودا کی ولادت ۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۳۰ء کو دہلی میں ہوئی ان کے والد محمد شفیع کابل اور اصفہان سے تجارت کے خیال سے ہندوستان میں آئے تھے۔ سودا نے ابتدائی تعلیم دہلی میں حاصل کی۔ شاعری میں ان کے استاد شاہ ظہور اللہ خاں حاتم تھے۔ سودا شاعری میں اتنے بلند ہو گئے کہ انکو تاج الشعرا کا لقب ملا۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد دہلی کو چھوڑ کر فیض آباد چلے گئے۔ شمس العلماء نواب امداد امام کا قول ہے "سودا اردو شاعری کے شیکسپیئر تھے۔ سودا ستر برس کی عمر میں ۱۱۹۰ھ کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ آپ کے کلام سے چند اشعار کا شاہ لطیف بھٹائیؒ کے کلام سے موازنہ کیا جاتا ہے دونوں شعرا کے کلام میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔

سودا کے کلام میں تصوف کی باریکیاں نمایاں نظر آتی ہیں کہتے ہیں۔

میں عاشق اپنا اور معشوق اپنا آپ ہوں پیارے
گیے بیدار اس جلس میں کا ہے شمع محفل ہوں

شاہ لطیف بھٹائیؒ کا تصوف عشق الٰہی سے سرشار ہے۔ اس جذبۂ عشق کو لے کر شعر کہتے ہیں۔ ان کا ہر شعر روح کو بیتاب کر کے خدائے واحد کی طرف لے جاتا ہے

پاڻ سين پاڻ کي۔ پاڻ ئي محبوب
پاڻ خلق خوب۔ پاڻ ئي طالب تن جو

اپنے آپ کو خود ہی دیکھتا ہے اور خود ہی اپنا محبوب ہے
خود ہی خوب پیدا کرتا ہے۔ خود ہی انکا طالب ہوتا ہے

مرزا سودا

ہنوز آئینہ گرد اس غم سے اپنے منہ پہ ملتا ہے
خدا جانے کہ کیا صورت ہے اس خاک میں گڑا یاں

انسان کی مستعار زندگی کا نقشہ کس خوبی سے بیان فرماتے ہیں۔۔

عڏهن ڳالهه هو گهوٽ۔ عڏهن مڙهه مقام ۾
واري سڏ وڃوٽ آمي اڏيندين حيرو

کبھی اے انسان تو دولھا بنتا ہے۔ تو کبھی میت بن کر قبر میں ہوتے ہو
اس ناپائدار دنیا میں کب تک تو ریت محل بناتے رہو گے۔

سودا کا ایک اور شعر ہے۔

غیرت عشق آگے اب سودا تو پروانے سے سیکھ
شمع سے اپنا بھی ملنا دیکھ جل جاتے ہیں یہ

اس خیال کو شاہ لطیفؒ نے بھی پیش کیا ہے

ٻيا پتنگ کان سندين ڪامڻ خبرون
آٿيو وجهن ڳڻ ۾ جيڻ پنهنجو جيو
جيئري حنين کي۔ لڳا نيرا نيه جا

عشق کی تپش پوچھنی ہے تو پروانے سے جلنے کی خبر پوچھو
وہ خود کو لے کر آگ میں اپنی جان ڈال دیتے ہیں
ان کو تو جیتے جی میں موت کے جالے لگے ہیں

سودا — آنکھوں کو تک سے مارتی ہیں راہیں
سبھی مسافروں کو دیتی ہیں نگاہیں

شاہ لطیف بھٹائی — اکثر ہیں اُسو، موتان پیچی نہ سکیو
آن وحی آزیوں سی جوڑ نہ ھاوو
ھشتو و ڈاروو، واٹوں ھلیو و ھلی

آنکھوں نے مجھ سے پوچھ کر محبت نہ کی تھی
وہ تو اس جگہ جا کر اٹکیں جہاں کہنے کی بحالی ہیں ہے
دل بیچارا اس محبوب کے راستے کو دیکھتے ہوئے غم کھاتا ہے۔
سودا انتظار کی کیفیت کو فریاد کی حد تک لے جاتا ہے فرماتے ہیں۔
سودا تیری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

شاہ بھٹائیؒ انتظار کی کیفیت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔
شمع پا رینديي شب برہ باکون کیبون۔
موت مان تي مينڌرا راتا کاون ٿيا
تنھنجي تات طلب کانگ اُڏايم ھاڻ جا۔
رات شمع کو جلاتی رہی اور صبح کو سورج طلوع ہوا
میرے محبوب (مینڈرے) تو واپس آجا میں تیرے انتظار میں مرتی ہوں
تیری طلب میں کاک کے کوؤں کو اڑاتی ہوں (پیغام بھیجتی ہوں)

سودا — دل سے خوش طرح مکان پھر بھی کہیں بنا ہے
اس عمارت کو تو ٹک دیکھ کے ڈھایا ہوتا

شاہ لطیف — پائي ڪان ڪمان ۾ ميان ماري نہ موت
موت مان آھين تون متان تنھنجوئي توکي لڳي
تیر کمان میں لگا کر اے دوست مجھے نہ مارنا
کیوں کہ تیرا وجود مجھ میں ہے کہیں وہ تیر تجھے نہ لگے

سودا — احسان ناخدا کے اُٹھائے میرے بلا — کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

شاہ لطیف کا توکل دیکھئے — سپني سبحان جي سڪ هوائي سڪ
تي حقيقي تسليم ۾ لاهي غم وهم
نہ قادر ساڻ ڪرم حاصل ڪرين ھاج تو۔

"ہر چیز کام سب پاک کے حوالے کر دے، اس حقیقت کو تسلیم کرلے اور فکر اور وہم کو چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ہر کام آسان کر دے گا"

میر تقی میر ۱۱۲۵ھ - ۱۲۲۵ھ

میر محمد تقی میر کی ولادت ۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۲۲ء (۱۷۱۳ء) میں ہوئی آپ کے والد میر محمد اللہ اکبر آباد سے رہنے والے تھے۔ نادر شاہ کے حملہ کے بعد دلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ چلے گئے۔ میر کا زمانہ اردو کے کمال کا زمانہ تھا۔ میر کے کلام پر دہلی کی غارتگری کا اثر نظر آتا ہے۔ اس وجہ سے ان کے کلام میں حزن و یاس، درد و الم اور سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ عوام کے بادشاہ مانے جاتے تھے۔ کلام پر سوداؔ کی اصلاح لکھنؤ میں ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں وفات کی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ——

میر تقی میر — کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کو تمہیں
ہے بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادان کا

اسی خیال میں شاہ لطیف کا شعر دیکھئے — عشق نہ آھی مانہ جئیں کینہ سن گیہو
جو ڈٹھی بھانڈی رہی ھو مبکانہ

سسی نیری پانہ، اُچل نہ آہ شئے۔

عشق کو بچوں کا کھیل نہیں ہے جسے نوجوان کھیلتے ہیں
برق دل جسم اور جان کے جلاب کو توڑ تا ہے
نیزے کی نوک کے سامنے اپنے سر کو جھکا دے تو آدمی ہو جائے

میر تقی میر — آنکھوں میں جیو مرا ہے ادھر یار دیکھنا
عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا

شاہ لطیف بھٹائی — اکین جی دیہ تا آئے ملہی دھیان
توکی ڈسی نہ ڈیہاڑ نہ ڈسی نہ ڈکھو۔

میری آنکھوں میں میرے محبوب تو لگ بیٹھ تو میں۔ لیکن ڈھانپ لوں
تاکہ تجھے زمانہ نہ دیکھے اور میں بھی کسی اور کو دیکھوں

میر تقی میر — ہم اسیروں کو جلا کیا جو بہار آئی نسیم
عمر گذری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا۔

شاہ لطیف بھٹائی — قربانیں ڈاہ میں وڈی وٹ جدا کیا۔
تن سکن عقبی ساہ ء آتا مینھ ملہی

شروعات سے ہی درخت کے تنے کو کاٹ کر اس سے جدا کیا۔
اس سوکھے تنے کو کیا معلوم کہ برسات برسی ہے

مذہب میں میر کی انتہا پسندی دیکھئے۔ فرماتے ہیں —
میر کے دین و ایمان کو کیا پوچھو ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب سے ترک اسلام کیا۔

شاہ لطیف بھٹائی فرماتے ہیں۔ نہ کو کفر نہ نکا مسلمانی من ۔

آیا آئین چون تہ پرین کجو پنھنجو ۔

نہ تو کفر سے کوئی کام ہے نہ تو مسلمان دل میں ہے۔

اوپر سے کہتا ہے کہ اے دوست تو مجھے اپنا بنا لے ۔

میر دوستوں کی جدائی میں جو اسے ابتدا ہی میں ہوئی۔ ملاحظہ فرماتے ہیں۔

میر۔ ابتدا ہی میں مر گئے سب یار۔

عشق کی کون انتہا لایا

شاہ لطیف اپنے دوستوں کے اٹھ جانے پر آنسو بہاتے ہیں ان کے سنگی اور میٹھی باتوں کو یاد کرتے ہیں اس طرح کی تصویر کھینچتے ہیں

آج نہ اطاق جی طالب تنوارین

اوسی آئی دیا مڑیون موں مارین ۔

جی جیئے کی جاپین سی لاھوتی لئی دیا

آج اس مسکن میں وہ دوست نہیں ہیں جن کے میٹھے بول سنتے تھے ۔

وہ دوست چلے گئے ان کی خالی جگہیں دیکھ کر بڑا ارمان ہوتا ہے ۔

وہ زندہ دل دوست اس دنیا سے کوچ کر گئے

میر کی تشبیہ ان کے کلام نازک پر نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں ۔

نازک ایسے کہ کی کیا کہیے ۔

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے ۔

شاہ لطیف کی تشبیہ ملاحظہ ہو۔ جھڑا گل گلاب جا قرا مثن دیس

جوتا نیل چنبیلیا ساما ہو اھسن

پسو سوفن سیئہ چٹی نیندن اچ نیش ۔

لال جی لیس آئی اکرنہ اچی ۔

جیسے گلاب کے پھول ہیں اسی رنگ کے لباس پہنے ہوئے ہیں لال چنبیلی سے نیل سے ہیں وہ نیند میں مست معلوم ہوتے ہیں

اس سے حسن کو دیکھ کر شاہ فرماتے ہیں دل میں رحم ہوتے ہیں سوتے کے لباس کو دیکھ کر کانٹے کے نیند میں مست معلوم ہوتے ہیں

میر بھی میر۔ سراپا میں اس کے نظر آتے تم

جہاں دیکھو اللہ ہی اللہ ہے ۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں ۔

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تیرا ہی جلوہ ہے

جس طرف بھی نگاہ اٹھاتا ہوں۔ اس طرف اے صاحب اللہ ہی اللہ نظر آتا ہے ۔

میر سوز :-

سید محمد میر سوز۔ والد کا نام سید ضیاء الدین تھا۔ میر سوز کی ولادت ۱۷۱۸ء کو دہلی میں ہوئی۔ اردو شاعری میں بڑا نام پیدا کیا۔ سوز خوش طبعی اور خاکساری کے باعث ہر دلعزیز تھے۔ دہلی سے لکھنؤ چلے گئے تھے جہاں ۱۲۱۳ھ میں فوت ہوئے

میر سوز

آپ ہی عاشق ہے، تو آپ ہی معشوق
پردے سے نکل بے شرم ساری کب تک

شاہ لطیف بھٹائیؒ

پاٹھیں پسی پالی، پاٹھیں محبوب
پاٹھیں خلق خوب، پاٹھیں طالب تن جو

خود ہی اپنے آپ کو دیکھتا ہے، خود ہی خود محبوب ہے
خود ہی اسے پیدا کرتا ہے، اور خود ہی اس کا طالب ہوتا ہے۔

میر سوز

تم بن ہے عذاب زندگی
ہے میری خراب زندگی۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ فرماتے ہیں:-

• سنئي سمريوم هوگئو پاڙو چن جو
هنئ وهاڻو پنو، هريو صت تيوم

سوتے ہی محبوب کی یاد آنے لگی۔ جس کے بغیر یہ زندگی عذاب ہے
جس کی یاد میں سر کے نیچے تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا ہے۔

میر سوز :-

رزق کا ضامن خدا۔ شاہد کلام اللہ ہے
تس پہ اپنی صورتوں سے روز حاجتمند ہیں۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں:

قسمت آندیون کونجڑیون وطن سنڌن ڙوه
هنصنجو هوفي ڏوه، رزق رازق صٿ جي

قسمت نے سارس (کونجیوں) پرندے یہاں لے آئی۔ ان کا وطن تو جبل ہے
اس میں کسی کا بے گناہ نہیں ہے۔ رزق کا ضامن تو خدا ہے۔

میر سوز نے محبوب کی دوری کو زمانے کا انقلاب تصور کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

یار بن دور جا ہے اللہ
کیا زمانے کا انقلاب ہوا

شاہ لطیف بھٹائیؒ ان لوگوں کی یاد میں فکرمند ہے جن کی فصلیوں سے یاس و غم میں پریشان ہے فرماتے ہیں:-

سداهي پرياڻ پانڌي پڪي لڌس
ماروڪٿي سان، ويڙا ترآهي۔

جن کے شان جیسے موجود ہے وہ دوست دور کہیں جا کر بسے
میرے قبیلے کی فصلوں کے مالک نے رگڑ چھوڑ کر نہر کی طرف چلے گئے

خواجہ میر دردؔ ۱۱۲۳ھ ـ ۱۱۹۹ھ

خواجہ میر دردؔ کی ولادت ۱۱۲۳ھ کو دہلی میں ہوئی۔ آپ کے والد سید خواجہ ناصر عندلیب اپنے دور کے بڑے بزرگ اور صاحب علم تھے۔ خواجہ میر دردؔ نے جوانی کی ابتدا میں سپہ گیری کی ملازمت اختیار کی تھی۔ بعد میں والد صاحب کے مشورہ سے نوکری چھوڑ کر عابدانہ زندگی بسر کی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد دہلی کے اکثر باشندے امن و عافیت کی تلاش میں دہلی چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن خواجہ میر دردؔ کی توکل، فقر اور رضا نے ان کی استقامت و استقلال میں کوئی جنبش پیدا نہ کی، وہ دہلی میں پرسکون رہے۔ خواجہ صاحب نے ۲۴ صفر بروز جمعہ ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۴ء کو دہلی میں انتقال کیا۔ یعنی شاہ لطیفؒ کی وفات سے ۲۲ سال بعد میں فوت ہوئے۔ خواجہ صاحب بزرگی اور شعر و شاعری کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کے کلام پر تصوف کا گہرا رنگ نظر آتا ہے اور کافی حد تک حضرت شاہ لطیف بھٹائیؒ کے کلام سے خیالات اور تخیل میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ چند مثالیں دی جاتی ہیں:۔

خواجہ میر دردؔ فرماتے ہیں:۔

مٹ جائیں سب ملک اُن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینہ کے سامنے جب آکے "ہو" کریں۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ اس خیال کو بڑے جاذب انداز میں بیان فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں:۔

آندر آئینو ڈسي پرين سو پسيج
اپني ڈاہ رسيج ۽ شاهده ماڻين۔

اپنے اندر دل کو آئینہ کے مانند کرکے محبوب کی صورت کو دیکھ۔
اپنی راہ پر گامزن ہو جا۔ تو تجھے محبوب کا مشاہدہ حاصل ہوگا۔

خواجہ میر دردؔ تصوف کے نکات کو اکثر اپنے کلام میں پیش کرتا ہے فرماتے ہیں:۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا۔
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا۔

شاہ لطیف کا کلام سراپا تصوف کے باریکیوں سے سرشار ہے اسی ذہن میں فرماتے ہیں:۔

ايڪ قصر ڏسڻ ڪئي، ڪشش ڳڙڪيون
جيڏانهن ڏسڻيان پڻ تيڏانهن صاحب سامهون۔

ایک محل جس کے اندر بیشمار دروازے اور کھڑکیاں موجود ہوں
جس طرف بھی دیکھتا ہوں، اس طرف صاحب (اللہ تعالیٰ) نظر آتا ہے۔

خواجہ میر دردؔ فرماتے ہیں:۔

مانندِ حباب آنکھ تو اے دردؔ کھلی تھی۔
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کو دم کا۔

بے ثباتی کے لئے شاہ بھٹائی فرماتے ہیں:۔

جرتي تو تو جلين لهرن ٻگي آڏ تيئي
تون پڻ آهين تڏين ڪو تيئين جهان۔

پانی کی سطح پر حباب لہروں کے لگنے سے ٹوٹ جاتا ہے
اے انسان تو بھی اس جہان میں حباب کی طرح کچھ دن کے لئے ہو۔

صوفیوں نے شمع و پروانہ کی طلب کو صرف کا مقام کہا ہے۔ جس میں حق کے طالب واپس صفی کی لوٹی دیر میں بنوں خواہ صرف دنیا سے ان کی یہ لفظ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

کاش تا شمع سے ہوتا گذر پروانہ
تم نے کیا قہر کیا! بال و پر پروانہ
شمع کے صدقے تو ہوتے ابھی دیکھا تھا اسے
پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثر پروانہ
گر ترا حسن برشتہ نظر آجائے اسے
تب رہے آگ میں سوز جگر پروانہ۔
کیوں اسے آتش سوزاں میں لیے جاتے ہے
سوجھتا ہی ہے تجھے کچھ نظر پروانہ
ایک ہی چھت میں لی منزل مقصود اس نے۔
رہرو، رشک کی جا ہے سفر پروانہ
شمع تو جل بجھی اور صبح نمودار ہوئی۔
پوچھوں اب درد میں کس سے خبر پروانہ

حضرت فریدالدین عطارؒ نے پروانہ کے ایثار کا بیان اسطرح کرتے ہیں ؛

یک شبی پروانگان جمع آمدند — در مضیق طلب شمع آمدند
جملگی گفتند می باید یکی — کو خبر آرد ز مطلوب آندکی
شد یکی پروانہ تا قصری ز دور — در فضای قصر یافت از شمع نور
بازگشت و دفتر خود باز کرد — وصف او بر قدر فہم آغاز کرد
ناقدی کو داشت در مجمع می — گفت او را نیست از شمع آگہی

ایک رات پروانے اکر جمع ہوئے، اور مجلس میں شمع کو ڈھونڈنے لگے۔ سب نے کہا ہم میں سے ایک کو جاکر مطلوب کی خبر لے آنی چاہئے۔ ان میں سے ایک نے محل سے دور سے شمع کی روشنی کو دیکھا، اور واپس آکر اپنی سمجھ کے مطابق اس حقیقت کا بیان کیا۔ اُن میں ایک نکتہ چین بھی تھا، جو انکے سردار بھی تھے۔ اس نے کہا اس کو شمع کی کیا خبر۔

شد یکے دیگر گذشت از نور در — خویش را بر شمع زد از دور در
دشت در کش کرد با آتش بہم — خویش را گم کرد با او خوش بہم
چون گرفت آتش ز سرتا پای او — سرخ شد آتش اعضای او
ناقد ایشان چو دید او را ز دور — شمع با خود کردہ ہمرنگش ز نور
گفت این پروانہ در کار است بس — کس نداند او خبردار ست بس

ان میں سے ایک اور اس روشنی کے دروازہ سے گذرا، دروازہ سے اندر جاتے ہی خود شمع کی آگ میں چلا گیا۔ آگ اسکے چاروں پھیل گئی۔ اور خود بڑی خوشی سے شمع کی آگ میں گم ہوگیا۔ اور آگ نے اسکے جسم کو لال کر دیا۔ نکتہ چین نے اُن کو دور سے دیکھ کر کہا (شمع نے اپنے نور سے اس کو ہم رنگ کردیا) کہ ایسے پروانہ کی ضرورت ہے، جس کے لئے یہ معلوم ہو نہ سکے کہ وہ باخبر ہے

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی عشقیہ شاعری درد اور یاس سے بھرپور ہے۔ پروانہ کے متعلق جو ابیات آپ نے بیان فرمائے ہیں وہ گویا خواجہ میر دردؔ اور فریدالدین عطارؔ کی نظموں کے اختصار ہے جن میں آپ نے اس حقیقت کے راز کو پر تاثیر تخیل سے بیان فرمایا ہے۔

پیچ پتنگن کي سندیون کامڻ خبردن
آئیو وجھن اگ ۾ جیئڻ پنھنجو جي
جیڪي جنین کي، لڳا نینڙا نینھن جا۔

پروانوں سے جاکر جلنے کی خبر پوچھ
جو اپنے آپ کو آکر آگ میں ڈالتے ہیں
کیونکہ اُن کو حیات میں عشق کے جالے گئے ہیں۔

دوسرا بیت یہ ہے:

پتنگ چاٽین پاڻ کي، تہ اچي اگ اُجاءِ
پچڻ گھٽا پچایا تون پچڻ کي ۾ پچا ۾
واقف تي وساءِ، آءٌ نہ ڏيجي عام کي۔

تم اگر اپنے آپ کو پروانے کہتے ہو تو آکر آگ کو بجھا دو
آگ نے تو سینکڑوں کو جلایا ہے تو آکر آگ کو بھی جلا دو
ہوشیار بن کر آگ کو بجھا دو یہ راز عام کو نہ بتانا۔

ایک اور شعر ہے:

پتنگن پُڇ ڪيو، مڙيا متي سچ
پسي لس نہ لچيا، مڙيا متي سچ
سدا ڳچين اگ، ڏيچارن وڃا ٿيا۔

پروانوں نے ارادہ کیا، سب آگ کے اوپر جمع ہوئے۔
وہ آگ کو دیکھ کر نہیں لرزے اور حقیقت (سچ) پر جل گئے۔
اس طرح اُن کی گردنیں بے آگ میں جل کر راکھ ہوئیں۔

ان تینوں شعراء کے کلام میں کتنی مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہیں۔ ان شعراء کے کلام کے تخیل میں بڑی مماثلت موجود ہے خواجہ میر دردؔ نے بے ثباتی کا نقش اسطرح کھینچا ہے فرماتے ہیں۔

اس زیست کا اعتبار کیا ہے
کوئی دم میں یہ زندگی ہوا ہے۔

شاہ بھٹائی رح فرماتے ہیں :-

فاني ني فاني دنيا دم سيڪڙو .

لٿي لوڙهه لٿن سين ، جو ٿيندو جاني .

دنیا یہ فانی ہے اور ایک ساعت میں ختم ہو جائیگی .

اے دوست تیری قبر میں مٹی کو لاتوں سے دبا کر بنائینگے .

خواجہ میر درد

ہو دے کب وحدت میں کثرت سے خلل

ہم جان گو دو ہیں ، پر ہم ایک ہیں .

شاہ لطیف فرماتے ہیں :-

وحدت تان ڪثرت ٿي ڪثرت وحدت ڪل

حق حقيقي ڪيڪڙو بولي ٻي ٻل .

هو هلا چو هل با الله سندو سچيڙ .

وحدت سے ہی کثرت ہے اور کثرت سے وحدت کل ہے .

اللہ تعالیٰ (معبود) ایک ہے اور دوسری بات زبان پر نہ لا .

یہ شور و غل باللہ اس دوست کا مظہر قدرت ہے .

خواجہ میر درد .

نہ گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار

کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں

شاہ لطیف فرماتے ہیں

ڪڏهن گاڙهو گوٽ ، ڪڏهن مڙهه مقام ۾

واريءُ سندو ڪوٽ ، آڏي اڏيندين ڪبتر .

تو کبھی دولھا بنتا ہے تو کبھی میت بن کر قبر میں دفن ہوتے ہو .

تو اس دیت پر کب تک محل بناتے رہو گے

خواجہ میر درد فرماتے ہیں :-

موت کیا آکے فقیروں سے تجھ لینا ہے .

مرنے سے پہلے ہی لوگ تو مر جاتے ہیں .

خواجہ حافظ شیرازی نے یہی تخیل پیش کیا ہے :- ہرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما .

شاہ لطیف بھٹائی رح فرماتے ہیں :- مرڻا آڳي جي مڙا ، سي مري ٿين ذات

موڻا سي حيات جيڻا آڳي جي جيڻا .

جو موت سے پہلے مرتے ہیں وہ دراصل مرتے ہی نہیں

وہ تو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور زندگی سے پہلے ہی حیات ہیں

ضیاء الدین ضیا

ضیاء الدین کی ولادت دہلی میں ہوئی، وہ سودا کے ہمعصر تھے۔ حوالی میں فیض آباد چلے گئے تھے وہاں سے لکھنؤ آئے اور وہیں انتقال کیا۔

ضیا نے فرمایا ہے:۔ برس اے ابر جتنا چاہے تو، اب تیری باری ہے۔

کبھی دل تھا، تو میں رو رو کے اک دریا بہاتا تھا۔

شاہ لطیف نے فرمایا ہے:۔ وسن اکڑیون جئن، جیئن صورت سکین مینھن۔

ڈھونڈ راتو ڈینھن، بس بودیون نہ کئی۔

جس طرح میری آنکھوں سے آنسو برستے ہیں۔ اے ابر تو اگر ان سے برسنا سیکھ

تو، تو دن رات برستا رہے اور دریا بہا دے۔

انعام اللہ خاں یقین

انعام اللہ خاں یقین شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ اور حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کے نواسے شیخ یحییٰ مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ بیس جوانی کے عالم میں شہید کیئے گئے تھے۔

یقین کہتے ہیں کہ تسخیر آئینہ کو آتی ہیں۔

دل سے نہ ہو جو کام آئینے سے کیا ہوگا۔

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں:۔ آندر آئینو ھوبی، پرین سو پسیج

اپنیءَ ساہ مسیج تہ شاھدو ماڻین۔

اپنی دل کو آئینہ کے مانند کرکے محبوب کا دیدار کر

ایسی راہ اختیار کر تاکہ تجھے مشاہدہ حاصل ہو سکے۔

یقین:۔ عاشق اور معشوق کی عالم سند کرتے ہیں سب

تجھ سے خونخوار کی طرز اور تجھ سے غم کھانے کی طرح

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔ عاشق یا معشوق جو وٹي ويھج ھنڌ

پيارينءَ پاڻيءَ، ميخانءَ جو منڌ

ڪيم ڪيئن ڪنڌ، اوڏوئي اُن کي۔

عاشق تو محبوب کی وہ راہ لے کر بیٹھ جا،

وہ تجھے خود بخود آکے میخانہ کا شراب پلادیگا۔

اس کے آگے جا کر اپنی جان مت چھڑانا۔

یقین:۔ ہمارے درد کی دارو اگر کچھ ہے تو دارو ہے ـــــــ یہ سب کچھ سن کے ساقی پی جانے کا کیا حاصل

شاہ لطیفؒ: توھیبہ توں طبیب تو درد جو دارو دوا آمن دل کي تنھنجون تنوارون

ڪيان ڀي ڪارون جئين ڀڪي پيئون نہ ڀئي۔

(تو حبیب ہے تو ہی طبیب ہے اور درد کی دوا ہے۔ میرے دل کی دوا تیری یاد ہے۔ میں تجھے پکارتی ہوں میرا علاج کسی اور کے ہاتھوں نہ ہو)

خواجہ محمد میر آثر :-

خواجہ محمد میر آثر، خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ میر دردؔ کی صحبت میں علم تصوف اور معرفت سے بہرہ ور ہوئے تھے۔ بھائی کی طرح درویشانہ زندگی بسر کی۔ اُردو زبان میں ایک چھوٹا سا دیوان اُن کا موجود ہے۔

آثر — تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں — پر ہمیں آہ کچھ خبر ہی نہیں۔

شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں :- سو ھي سو ھو، سو اجل سو الله

سو پرني سو پياه، سو ويري سو واهو۔

ہر جگہ اللہ کی ذات پاک موجود ہے اور ہر جگہ اُنکا جلوہ نمایاں ہے

وہی محبوب ہے جو ساتھ میں بھی موجود ہے وہی دشمن بھی ہے تو رہبر بھی

شیخ بقا اللہ بقاؔ :-

شیخ بقا اللہ اکبر آبادی پہلے حاتم سے اور بعد میں دردؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ اُن کے والد کا نام لطف اللہ تھا جو دہلی سے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ بقاؔ کا کلام ہجو گوئی کے لئے مشہور ہے۔ اُن کی وفات ۱۲۰۹ھ میں ہوئی۔

بقاؔ :- بقاؔ جو راہی ہوئے عدم کے، تو وقفہ ہرگز کرو نہ دم کا

یہ راہ ہستی کی پر خطر ہے، چلو یہاں سے قدم اُٹھائے۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ نے اس خیال کو بڑے جاذب انداز میں بیان فرمایا ہے۔

متان كٽي ڪٽ، جن ڪيو، سي رميون۔

ساجن سرهن سُرت وِڪان ۾ ڏيجو ڪٿو۔

جو اس فانی دنیا سے کوچ کرکے اس دنیا میں پہنچے

تو اس کو محبوب حقیقی ایک لحظہ میں ملے گا۔

سید سراج الدین سراج ۱۷۱۰ء - ۱۷۶۶ء۔

سید سراج الدین۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے وہ اپنے دور کے بڑے شاعر تھے۔ کلام میں تصوف کا رنگ موجود ہے۔ کلام یہ ہے

سراجؔ — وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا

کہ کتاب عقل کے طاق پر جیوں کی دھری تھی یونہی دھری رہی۔

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں :- صد کتاب و صد ورق در نار کن

خفتہ دل را یک دمے بیدار کن۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں :- اگر پڑھو الف جو ورق سب وسار

اندر تون اُجار، پنا پڑھندين هڪيڙا

سبق پڑھو الف کا اور دوسرے اوراق کو چھوڑ دے — اپنے سینے کو صاف کر تو کتنے اوراق پڑھو گے۔

سیّد میر حسن

سیّد میر حسن بن سیّد غلام حسین ضاحک ۱۱۳۶ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان خراسان کے دارالسلطنت ہرات سے ہجرت کرکے ہندوستان میں آیا۔ اس بزرگ نے ہرات سے ہجرت کی تھی وہ حضرت میر امامی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے بزرگ اور مورث اعلیٰ حضرت سیّد میر علی ہروی اُن کے چھوٹے فرزند حضرت سیّد حیدر شاہ اپنے والد کے ساتھ امیر تیمور کے حملہ کے وقت ہندوستان میں آئے تھے۔ اور والد سے اجازت لے کر ہندوستان کی سیاحت پر نکلے تھے اور سندھ میں آکر ہالا میں مقیم ہوئے وہیں شادی بھی کی تھی اُن کی اولاد سے سندھ میں میرن پوتا کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسی شاخ سے سیّد عبدالکریم بلڑی کی اولاد سے سندھ کے مشہور عالم شاعر اور صوفی حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ پیدا ہوئے۔ ان دونوں سادات کا شجرہ کسی منزل پر ضرور آپس میں ملتا ہوگا۔

سیّد میر حسن دہلی کے تباہ ہونے کے بعد والد کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے جہاں ضیاالدین ضیا کے شاگرد ہوئے۔ لکھنؤ میں آپ نے ۱۱۲۲ھ میں وفات پائی۔ میر حسن فارسی اور اُردو زبانوں کے بڑے عالم تھے۔ سیّد میر حسن اور شاہ لطیف کے کلام میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔

سیّد میر حسن

ثنا پہلے اس خالق پاک کو — دیا جس نے رتبہ کف خاک کو۔
اس خاک سے خلق آدم کیا — ہوا کرکے دم اس میں آدم کیا
پھر آدم کی خاطر بنایا جہان — عدم اور ہستی دو رویہ مکان۔

خداوند تعالیٰ کی حمد اور توصیف میں شاہ لطیف بھٹائیؒ نے اپنے کلام کی شروعات اس طرح کی ہے فرماتے ہیں

اوّل اللہ علیم اعلیٰ عالم جو ڈٹی،
قادر پنھنجي قدرت سين قائم آھہ قديم،
والي واحد وحده رازق رب رحيم
سوساراھ سچو ڈٹي چئي حمد حکيم
ڪري پاڻ ڪريم جوڙون جوڙ جهان جوڙ۔

اوّل اللہ علیم کی اعلیٰ ذات ہے جو مالک ہے پوری کائنات کا
قادر اپنی قدرت سے قائم ہے قدیم
وہ مالک واحد، وحدہٗ، رزاق اور رحم والا ہے
حمد و توصیف اس سچے مالک کی کریں جو حکمت والا ہے
رب رحیم پورے جہان کا والی اور شش جہات ہے۔

میر حسن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرماتے ہیں:

مرتبہ اس کا یہاں تک ہے بلند — عقل کل کی واں نہیں لگتی کمند۔
شافع محشر ہے وہ خیر البشر — ہو درود اس پر اور اس کی آل پر
وہ جو پیرو اس کے ہیں اور دوست دار — چار یار و چار یار و چار یار

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے چار یار کی محبت میں سرشار شاہ لطیف بھٹائی ؒ فرماتے ہیں:-

جوڑي جوڙ هان جي ، پاڻ هيائين پرواز

حامي هادي هاشمي ، سردارن سردار

سنهي سحابن سٺ ۾، منجهه مسجد مڙيدار

چارئي چڱا چوڌار ٿا، ميڪا مڙي حبيب سين .

اللہ تعالیٰ نے اس جہان کو پیدا کیا اور اس پر پھر پرواز کیا .

حامی ، ھادی ۔ ہاشمی اور سرداروں کے سردار کو پیدا کیا .

آپ اپنے دوستوں کے درمیان مسجد میں بہت اچھے لگتے ہیں .

چاروں یار اپنے حبیب گرد بیٹھے رہتے ہیں .

میر حسن فرماتے ہیں:- اس عشق میں جو قدم دھرے گا

جیتا نہ بچے گا وہ مرے گا .

شاہ لطیف فرماتے ہیں:- محبت جي ميدان ۾ ڪڏهين پوءِ هاميءَ .

چڏ اسانگا ارواح جا لاهوتي لاهيءَ

عشق نانگ آهي، خبر ڪاڻ ڪي پوي .

عشق کے میدان میں جو قدم لاکے دھرے گا

وہ اپنی زندگی کی امید کا سرا چھوڑ دیگا

عشق وہ سانپ ہے جس کی خبر اس سانپ کے ڈسے ہوئے سے پوچھو .

متاخرین شعرا کے کلام سے مماثلت

جہاں تک اُردو شاعری کی ترقی کا تعلق ہے، اس کی نشوونما میں متاخرین شعرا کا بڑا حصہ ہے۔ دہلی کی پریشان حالی کی وجہ سے وہاں کے ارباب و کمال شعرا و صوفی کے باکمال حضرات دہلی کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ روزگار اور قدردانوں کی تلاش میں ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرف ہجرت کر گئے چنانچہ لکھنؤ دہلی کے قریب تھا۔ اور وہاں کے نواب بڑے فراخدل اور علم و ادب کے سرپرست تھے۔ خاص طور پر آودھ کے نواب آصف الدولہ کی فیاضی بڑی مشہور تھی جنہوں نے دہلی کے اکثر شعرا کو اپنے یہاں روک رکھا تھا دوسری طرف لکھنؤ کے لوگ ہی ادب دوست تھے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر تھوڑے عرصہ میں لکھنؤ اردو ادب اور ثقافت کا مرکز بن گیا۔ اُردو شاعری نے اس جدید مرکز میں رہکر وہاں کے معاشرتی حالات کے مطابق چند اُنوکھی خصوصیات پیدا کرلیں۔ اس طرح لکھنؤ کا دبستان ادب دہلی سے بڑھ کر ممتاز ہوگیا اور زبان کی تبدیلی کی وجہ سے غزل میں نئی ہیئت اور نیا اسلوب پیدا ہوا۔

اس دور کی اُردو میر تقی میر، سودا، میر انشا، مصحفی، اور جرأت کی احسان مند ہے۔ جنہوں نے زبان کی مرصع سازی سے توسیع کرنے میں بڑا کام کیا حالانکہ یہ سبھی شعرا قدیم شعرا کے پیرو تھے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے کتنا سچ تجربہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں

"تاریخ ادب کا یہ دور قطعی طور پر پہلے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ ایک کے دوسرے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں اس دور کے شعرا اپنی جوانی میں شعرائے طبقہ سوم کے بوڑھے شعرا کے ہمعصر تھے۔ یہ ابھی جوان تھے۔ اور وہ کہنہ سال مشاق اور مشہور ہو چکے تھے۔ اسکے علاوہ زبان اور روش کے اعتبار سے بھی ان دو دوروں میں فرق پایا جاتا ہے بہت سے پرانے لفظ اور ترکیب متروک ہوگئیں۔ ان کی جگہ نئے لفظوں اور نئی ترکیبوں نے لے لی۔ اس معاملے میں شیدا آنشا کی بہت مضبوط ہے کہ انہوں نے اس کی ترقی اور توسیع کے لیے بہت سے نئے نئے تجربے کیے۔ مصحفی نے الفت پرانی روش قائم رکھی۔ رنگین آدمی رنگین تھے۔ انہوں نے ایسی رنگینی الگ کھادی آنشا اور رنگین نے مل کر ریختی ایجاد کی"

دہلی میں اس وقت ارمان و یاس کی شاعری تھی۔ تو لکھنؤ میں عیش و نشاط کے نغمے تخلیق ہو رہے تھے۔ ریختی شاعری کی ایجاد کی وجہ سے لکھنؤ میں عورتوں کی آرائش و زیبائش۔ اُن کی شرارتیں اور درباری شاعری کا پورا سامان نظر آرہا تھا۔ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش جیسے استاد شعرائے لکھنؤ میں شعر و شاعری کو عروج پر پہنچایا تو دہلی میں شاہ نصیر، ابراہیم ذوق، مرزا غالب اور مومن نے شاعری کو پھر سے ۔۔۔ ع ۔۔۔ ڈالا۔ ہاشمی صاحب[1] لکھتے ہیں

"زبان کا جہاں تک تعلق ہے ان بزرگوں نے اس میں مزید اصلاح اور درستی کی۔ اور جو نامانوس الفاظ باقی رہ گئے تھے، اُن کو متروک قرار دیا اور فارسی ترکیبوں کے ساتھ دہلی کے روزمرہ محاوروں کو اس طرح سمویا کہ یہ خوش نمائی اور شیرینی پیدا کردی۔ دہلی اور لکھنؤ میں اس دور میں دونوں جگہوں پر صفائی اور شستگی زبان کے لئے کام ہوا"

یہاں اُن متاخرین شعرا کے کلام کا موازنہ شاہ لطیف بھٹائیؒ کے کلام سے کیا جاتا ہے۔ حالانکہ شاہ بھٹائیؒ کے کلام کی بنیاد اُن کا صوفیانہ انداز بیان اور ہے اُن کے کلام کو سمجھنے اور اُن کے شاعرانہ محاسن سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمیں یہ بات ہر وقت مدنظر رہنی چاہیئے۔ شاہ بھٹائی صوفی شاعر تھے۔ تصوف و شاعری اس حد تک ان کی ذات اور شخصیت کا جزو بن گئے ہے کہ پڑھنے والا کلام کے کسی حصہ سے متعلق یہ اعلان سے یہ کہہ نہیں سکتا کہ یہ تصوف ہے یا عشقیہ شاعری ہے۔ بہرحال متاخرین شعرا میں مرزا غالب اور مصحفی کا کلام بڑی حد تک شاہ بھٹائیؒ کے کلام کے نزدیک نظر آتا ہے

---

[1] دہلی کا دبستان شاعری۔ مصنف ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب صفحہ ۹۰ انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۳۹ء

[2] ایضاً ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

مصحفی ۱۱۶۱ھ - ۱۲۴۱ھ

مصحفی کا نام غلام ہمدانی اور وطن کا اسم گرامی ولی محمد تھا وہ امروہہ کے ایک محلہ سادات میں پیدا ہوئے مصحفی کی ولادت ۱۱۶۱ھ میں ہوئی۔ بچپن
اپنے گاؤں ملک کوٹلہ میں گذارا جوانی دہلی میں رہے وہاں کی پریشان حالی سے تنگ آکر لکھنؤ چلے گئے وہاں مرزا سلیمان شکوہ کے یہاں ملازمت کی مصحفی اسے
دور کے باکمال حضرات میں تھے اُردو زبان کی اصلاح میں بڑا حصہ لیا مصحفی کی وفات ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۸۲۶ء میں ہوئی مصحفی شاہ صاحب کی وفات کے وقت
ان کی عمر چار سال کی تھی۔ شاہ نعمانؒ اور مصحفی کے کلام سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں

مصحفی :- کیا تجھ سے کہوں حال شہود عالم — کچھ ایک سی ہے بود نبود عالم
بس تو ہی تو پھرے تو ہو نادان — جو عین وجود حق وجود عالم

شاہ نعمانؒ اپنی حال کو بیان کیا ہے۔ — جن دیا یو وجود کی سی فانی تیا فی اللہ ہے
نہ فن قیام نہ قاعدہ، نکو کن سجود۔
ملا فن تیا نابود، تبدلا فن گئی یا بود کے۔
جس نے اپنے وجود کو فنا کیا۔ وہی اللہ کی ذات میں فنا ہوا۔
ان کے ساتھ نہ کوئی قاعدہ ہوگا اور نہ کوئی حساب لگایا جائے گا نہ وہ سجدہ کرتے ہیں

مصحفی اس فانی عالم سے کہتے ہیں

رہا ہے کون عالم میں سدا عالم یہ فانی ہے۔
گر آئے جاو بندے ہم بھی ایک دن عالم سے کیا ہوگا

شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں :- — فانی فی فانی، دنیا ڈھر میکتو
کتی لوڑہ کتن جن جو تو بندہ جانی۔
یہ عالم فانی ہے۔ جس میں کوئی بھی ایک دم نہ ٹھہر سکا۔
میرے دوست، موت کے بعد تیری قبر میں مٹی لاتوں سے دبا کر بنائیں گے۔

مصحفی کہتے ہیں :- — کل میں جو راہ اُسے پہچان رہ گیا۔
کچھ وہ بھی مجھکو دیکھ کے حیران رہ گیا۔

شاہ لطیفؒ کہتے ہیں — کالی گڈیو سوئن کاپڑی، بابو بیکار ہی
سائی سیلو سر تی، مالا موچوری
ڈیٹی ڈیکاری، ڈتی دل فقیر ویو۔
ایک جوگی راہ میں کل مل گیا۔
سر پہ تھی پیچیدہ پگڑی دلپذیر
اس پہ طرہ موتیوں کی تھی لڑی
کر گیا زخمی، نگہ سے دل فقیر

مصرعی

شبنم کا قطرہ ہی نہ فقط آب دیدہ تھا ۔

تربت پر میری گل بھی گریبا دریدہ تھا ۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں

پیئي جا پرپات، سا ماڪ ۾ پسو ماڻهه ۔

روئي چڙهي رات ڏسي ڏکوين کي ۔

صبح کے وقت جو شبنم گرتی ہے اُسے شبنم نہ کہو ۔

یہ تو رات کے رونے کے آنسو ہیں، جو غمگین لوگوں کے دکھ میں بہاتے ہیں ۔

مصرعی

مخلوق ہوں یا خالق یا مخلوق نما ہوں

معلوم نہیں مجھکو میں کون ہوں کیا ہوں ۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں

آئون سمهائي رات، توون ٻاڻ سڄاڻ سهرا،

اڏيون آڏيسين جيون - پرپاڻ ساري رات ۔

میں جیسا بھی ہوں تو میرے دوست مجھے پہچان

میری ہچکولیاں میں دوستوں کی یاد میں پوری رات جاگی ہوں ۔

مصرعی کہتے ہیں

گر ابر گھرا ہوا کھڑا ہے آنسوں بھی تلا ہوا کھڑا ہے

ہے موسم گل چمن میں ہر نخل پھولوں لدا ہوا کھڑا ہے

شاہ لطیف فرماتے ہیں

ميهان ۽ نيهان، پيئي اڪر هيڪڙو

وسڻا ڏيس ڪري ته ڪرڻي ٻيهان ۔

بادل (ابر) اور عشق میں کوئی فرق نہیں ہے

بادل برسنے کی تیاری کرے۔ اور میں آنسو بہاتا رہوں ۔

مصرعی

دنیا ہے سرائے فانی اس سے

چلنے کو مقام ہو چکا ہے ۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں

جوڳي جڳ ڇڏي، پُريا، پوربه پنڌ ڏي ۔

لاصوتي لطيف چئي - هليا لعل لڏي ۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوا إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ صاحب سين سڏي ۔

سهڻا اصيل، ڪين صڏي، صمه ڪي حيران ڪيو ۔

جو گی فقیر یہ جہان چھوڑ کر پورب کی طرف چلے گئے (وفات کر گئے)

وہ لاصوتی فقیر میرے دوست یہاں سے چلے گئے ۔

اللہ تعالیٰ انسان کو سلامتی اور آرام کے گھر کی طرف بلاتا ہے ۔

لیکن افسوس اس دنیا کی لالچ نے سب کو حیران کیا ہے ۔

نظیر اکبرآبادی ۱۷۴۰ء - ۱۸۲۵ء

نظیر کا اسم گرامی ولی محمد تھا۔ لیکن اپنے تخلص سے مشہور ہوئے۔ اُن کی ولادت ۱۷۴۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ جس میں اُنکے والد محمد فاروق کا انتقال ہوا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے جب دہلی پر حملہ کیا تو نظیر آگرہ چلے گئے اور وہیں اپنی زندگی کے آخری ایام میں مقیم رہے اور اسی اسلوب پایا جاتا ہے۔ اور اپنی شاعری میں انفرادی حیثیت کے حامل تھے۔ نظیر نے بڑی دراز پائی ۱۸۲۵ء میں وفات کی۔ نظیر کا کلام یہ ہے۔

ترے جمال کی سورج فلک نہ دیکھ سکا — کھلی نقاب رہی جب تلک نہ دیکھ سکا۔

تو وہ ہے نور سراپا کہ تیری صورت کو — بشر تو کیا ہے۔ مری جان ملک نہ دیکھ سکا

گلی کی خاک بھی ہو کر نہ ٹھہرنے پائے — یہیں تو آہ! فلک یاں تلک نہ دیکھ سکا۔

بہ ناتواں جون کہ آیا جو یار ملنے کو — تو صورت اُسکی اُٹھا کر پلک نہ دیکھ سکا۔

شاہ لطف بھٹائی اس مفہوم کو یوں واضح کرتے ہیں۔

کٹی نیڑ خمار ماہ جان کیائون نار نظر

سورج شاخون ھکیون کھائو قمر

تارا ھکیون تاڈب تیا ویکیندي دلبر

ڈکبو تیو جوھر، جانب جي جمال مین۔

میرے محبوب نے جب خمار آلودہ آنکھوں کو بڑے ناز سے اُٹھایا

تو سورج اور قمر نے اپنے شعاعوں کو کم کرکے روشنی کم کردی

ستارے میرے دلبر کے حسن کو دیکھ کر تائب ہو گئے۔

بلکہ پورے جہاں کا جوہر میرے محبوب کے جمال کے آگے معدوم پڑ گیا۔

نظیر برسات کا نظارہ یوں پیش کرتا ہے۔

کالی گھٹا ہے ہر دم برسے ہیں مینہ کی دھاریں

اور جس میں اڑ رہی ہیں بگلوں کی سو قطاریں

کوئل پپیہے کوکیں اور کوک کر پکاریں

اور مورمست ہو کر جوں کو کلا چنگاریں۔

شاہ شاہی فرماتے ہیں۔

ساونگ کی ساریں، ملتی ھو مرگھ مینھون

آئریون ابر آسرے تائیا تنواریں

سچون جي سمنڈ جون نئین سج نھارین۔

پلر پیاریں تہ سنگھارن سُک ٹئي۔

گرمی کی موسم میں برسات کو انسان جانور اور پرندے یاد کرتے ہیں

مرغ آبی ابر کے سہارے پر جیتے ہیں، ہرنے سورج نکلتے ہی آسمان کو دیکھتے ہیں

سیپ بھی سمندر کی سطح پر آکر آسمان کی طرف دیکھتی ہیں۔

اے مالک (پروردگار) برسات کا پانی برسا تو غریبوں کو خوشحالی ہو۔

نظیر کہتے ہیں ۔۔ محبوب قصر شکل جدے، شک سے دیکھیں

اس چہرۂ آواز میں وہ نقشا نظر آیا۔

شاہ لطیف چاند کو اپنے محبوب کے حسن کے مد مقابل نہیں لا سکتے ۔ فرماتے ہیں ۔۔

چنڈ تنھنجی ذات پاڑیان تان نہ پرین سین

لون اَچو منجھ رات سچڑ نت سوھرو

اے چاند میں تجھے اپنے محبوب کے حسن کے مد مقابل نہ کر سکتا

تو صرف رات کو روشن ہوتے ہو، لیکن میرا محبوب تو ہمیشہ روشن رہتا ہے۔

آب رضا کا قید بند سمت ہے نظیر اکبرآبادی اس کے متعلق کہتے ہیں ۔

ہم کو پھنسنا تھا قفس میں کیا گلہ صیاد کا ۔

بس ترستے ہی رہے ہیں اسے اور دانے کو ہم

شاہ لطیف بھٹائی کے مصرعے مولہ قَیْدُ الْمَاءِ اَشَدُّ مِنْ قَیْدِ الْحَدِیْدِ (پانی کا قید لوہے کے قید سے زیادہ) کی اپنے کلام میں بیان فرمائی ہے

فرماتے ہیں ۔۔

قَیْدُ الْمَاءِ حسنن جو، سو مون پانہ پیو ۔

حَبْسُ الْقَلَمِ بِمَا صَوَّحَ بَاتِنْ ۔ وصی قلم ولو ۔

اي قصا ڪو ڪنو حسن تر ماروان ماڻين

آب کا قید مجھے کھینچ کر لایا جو میری تقدیر میں لکھا ہوا تھا۔

تقدیر کے قلم نے جو کچھ لکھا وہ لکھ کر اپنی سیاہی خشک کر دی

یہ تو تقدیر کا کام ہے جو میرے عزیز قریب ہیں اور میں ان قیدیوں میں

نظیر اکبرآبادی فرماتے ہیں ۔۔

تاب اس کے دیکھنے کی نہ لائے چلے گئے

کیا کیا مزے جہان کے آئے چلے گئے ۔

شاہ لطیف بھٹائی نے اس خیال کو اپنے عظیم کلام میں اس طرح بیان فرمایا ہے ۔

گولیان ۽ گنڊيان ، ويا ويراڳي ڏکري

صحبت جا صنديان ، آئوتہ نہ جيئندي آن ۾ ۽

میں اس محبوب کو ڈھونڈتا ہوں جسکے دیکھنے کی تاب نہیں ہے وہ تو چلے گئے ۔

جن کے ساتھ محبت کی باتیں ہوتی تھیں ، میں ان کے بغیر زندہ رہ نہ سکوں گا

انشا اللہ خاں انشا ،

انشا اللہ خاں انشا بن حکیم ماشا اللہ نجف اشرف کے اصل باشندے تھے۔ جہاں سے اُنکے آباؤ اجداد عورت آباد دہلی میں آ کر مقیم ہوئے۔ انشا ۱۱۶۹ھ کو مرشد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ والد کی دہلی سے لکھنؤ چلے گئے اور وہاں نواب سعادت علی خاں سے دربار سے ملازمت کی۔ ذاتی حسد و خصومات کی وجہ سے انہیں لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ ۱۲۲۳ھ میں مرشد آباد میں فوت ہوئے۔ انشا اپنے دور کے بڑے عالم اور بعض تصانیف سے علاوہ علم ہیئت، موسیقی اور فن شاعری میں رانی کیتکی اور دریائے لطافت مشہور ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

انشا — اُن کی دھونی لگا در پہ تیرے خاک نشیں
راکھ جوگی کی طرح منہ پر ملے بیٹھے ہیں۔

شاہ لطیف — کالی گدڑیوں سوں کاپڑی۔ بابو رنگ پیوت
سریو سوں شکوت۔ جوگی سندی ذات کان

مل گیا کل راہ میں اک کاپڑی — جسم پر اُن نے نمایاں تھا بھبوت [1]
اس حمیدہ ذات سے حاصل ہوا — [illegible] شکوت

انشا — جو کوئی ہم سے ستم گشتوں کو عبث شاد کرے خفا کرے گا
یہی کہینگے کہ جاؤ صاحب خدا تمہارا بھلا کرے گا۔

شاہ لطیف — جانب اٹین نہ جگاء، حقین ماریو موتیو نہ پیچین۔
مرتی رت نہ سنجھری، سبک تنصبی جاء
اسان نہ توئی لاء، تی پریں پر چابوں ڈیوں۔

میرے محبوب تجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ ایک طرف تو مارتے ہو اور پھر پوچھتے بھی نہیں
یہاں تیری محبت میں ایک رتی خون کی بھی نہیں رہی۔
اس کے باوجود بھی ہم تو تیرے لئے دعا کرتے ہیں۔

انشا کہتے ہیں — بجلی نہیں چمکتی ہے آبر سے تجھ بن
پھرتی ہے لگے اڑاتی کالی بلا چمن میں۔

شاہ لطیف بھٹائی — جھڑ بیٹھوں نہ لھی۔ ڈھکے ڈھوں نہ ڈھوں
آکھوں برسات تھمتی ہی نہیں۔ ابر موجود ہو یا نہ ہو
ساریو میہوں کی لڑک گھلن تی پوں۔
محبوب کو یاد کرکے آنسو گالوں پر ٹپکتے ہیں۔

---

[1] اس بیت کا منظوم ترجمہ قبلہ بزرگوار مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی نے کیا ہے۔ مرحومہ رانی مسعودہ

جرأت :-

جرأت کا نام محمد امان تھا۔ دلی کے رہنے والے تھے۔ [illegible] کے نام سے مشہور ہوا۔ [illegible] کا نام حافظ امان تھا۔ [illegible] میں دہلی سے فیض آباد چلے گئے۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے ہوا۔ جوانی میں صحبت نے [illegible] اخلاقیات کی روش سے محروم ہو گئے۔ ۱۲۱۳ھ کو اللہ میں انتقال کیا۔ جرأت اپنے دور کے استاد شعرا میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کے ساتھ صوفیانہ رنگ بھی نظر آتا ہے۔

جرأت

اس سرائے دہر میں غافل تو اے جرأت نہ بیٹھ

ہو رہی ہیں چار سو جانے ہی کی تیاریاں۔

شاہ لطیف نے اس خیال کو اس طرح پیش کیا ہے۔

تتي ٿڌي ڇاه. ڪافي ويل ويهڻ جي

منان ٿيئي اونداهه پير نه لهين پرين.

گرمی ہو یا سردی تو چلنا وہ کیونکہ یہ وقت بیٹھنے کا نہیں ہے

جب تاریکی چھا جائے گی تو تم محبوب کے پاؤں کے نشان نہ دیکھ سکو گے۔

جرأت ایک فطرت نگار شاعر بھی تھے تو تصوف کے شاعر بھی تھے۔ ان کے دو شعر دیئے جاتے ہیں جن میں انہوں نے محبوب کے دیدار کے لئے کہے ہیں۔ کہتے ہیں:

جس طرف دیکھتا ہوں میں اس میں

ہے نہیں جانتا کدھر دیکھنا۔

درد کی طرح جان جرأت کو

تو ہی آیا نظر جدھر دیکھنا

دوسری مثال ہے:-

اپنا جب کوئی تصور میں گذر آئے نظر

جس طرف دیکھیں ادھر یار آئے نظر۔

اس خیال کو شاہ لطیف بھٹائی نے بھی پیش کیا ہے۔

ايڪ قصر در لک خوبين جي ڪنس پڙليون

جيڏانهن ڪري ڌيان پرک، تيڏانهن صاحب سامهون

ایک محل جس میں لاکھوں کھڑکیاں اور دروازہ موجود ہیں

جس طرف بھی دیکھتا ہوں ادھر (صاحب) یار نظر آتے

رنگین

رنگین کا اسم گرامی سعادت حسین ارحان تھا۔ ان کے والد طباطبائی شاہ عالم کی فوج کے ساتھ دہلی سے ہندوستان میں آئے تھے۔ رنگین کی ولادت ۱۱۵۱ھ کو سرہند میں ہوئی۔ رنگین اپنے دور کے مشہور شاعر تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۵۱ھ میں لکھنؤ میں ہوا۔ رنگین کی شاعری کی مثال یہ ہے

رنگین:

حمد کریم کی سب سے پہلے۔ دھوکے زبان رنگین کہہ دے

کیونکہ وہ خلاق جہان کا واقف ہے پنہاں و عیاں کا

سب مخلوق میں خالق ہے وہ سب کا دائم رزاق ہے وہ۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں:

اوّل اللہ علیمہ اعلیٰ، عالم جو ذیٰ،

قادر پنھنجي قدرت سين قائم آھ قديم

واحد، وحدہٗ۔ رازق ربّ رحيم

سو سائھ سچو ڈيٺ۔ چئي حمد حکيم

ھري پاڻ ڪريم، جو ٿيون ھوڻ جھان جي۔

سب سے پہلے اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات گرامی ہے جو علیم اعلیٰ اور اس جہان کا دشمن ہے

اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی قدرت سے قائم ہے قدیم۔

مالک واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے رزاق اور رحیم ہے

اس کی تعریف کر جو سچا دھنی۔ اس کی حمد و ثنا کر۔

وہ کریم تو خود بہ خود اس عالم کا نظام چلاتا ہے۔

رنگین:

دریا رواں یہ موجۂ عدم دیکھتے ہیں ہم

مثل حباب ہوں کوئی دم دیکھتے ہیں ہم

شاہ لطیفؒ

جر تي ڦٽو جٽين لھر ڀري اڌ تبٽ

تون ڀڻ آھين۔ تڏين کوڏ ٻنسن جھان ۾۔

پانی پر حباب لہر گنبد سے آدھا ہو جاتا ہے

اے انسان تو بھی مثل حباب ہو کوئی دم اس جہان میں۔

رنگین

ہر چند گناہ میں ہے تو غرق پر اس کی نہ بندگی میں کر فرق۔

شاہ لطیفؒ

ڇڇ ڪمايم ڪوٽ، پڳمبر عھد الله جا،

ڀيرو جو پاپن جو، سو چوٽيءَ تائين چور

معلوم آئيتي مون، گوڙھا اڻيءَ ڳالھ جو۔

میں نے جھوٹے کام کیئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑا ہے

یہ پورا جسم ہر چند گناہوں سے بھرپور ہے

اے میرے پروردگار تجھے ہر چیز کا علم ہے تیری عنایت کے بغیر چھٹکارا نہیں

ناسخ :-

شیخ امام بخش ناسخ اپنے دور کے بڑے شاعر تھے۔ اُن کی ولادت لاہور میں غالباً ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۴ء میں ہوئی۔ فارسی اور عربی زبانوں پر بڑی مہارت تھی۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ بنے۔ آخر میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں وفات کی۔

ناسخ

ناسخ وطن میں دیکھئے، دیکھیں گے گھر کو کب
غربت میں مدتوں سے ہے اپنا مکان
سنسان مثل وادیٔ غربت ہے لکھنؤ
شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ فرماتے ہیں:-

وڃائي وطن کي آئون جي هت ڀياس
گوري منجهي سومره اچيج پنهارن پاس
ڏج ڏاڙائي ڏيه جي منجهان ولوڻي واس۔
مُياڻي جياس جي وڃي مڙه ملير ڏي۔

وطن کو یاد کرکے اگر میں یہاں مر جاؤں
تو میری قبر میرے عزیزوں کے پاس جا کر بنانا
میرے آباؤ اجداد کے دیس کی بھاڑیوں کا دوہا دینا
تو میری لاش میں پھر سے جان آجائے گی۔

ناسخ

صبح بختی میں کوئی کب کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انسان سے ہوتا ہے۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں:-

سوڪي پاڻين سيڪو، اوڪي توڙي توڻ
مولا مٿان مون پڙهو لاهه ۽ پاڻ جو۔

آسان بات ہر ایک اپنی طرف سے سمجھتا ہے لیکن مشکل تیری طرف
میرے رب تو میرے اوپر سے رحم کی نظر نہ ہٹا دے۔

ناسخ نے گور کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں:-

گور آتی ہے نظر جب مجھکو گھر آتا ہے یاد
اس سفر میں ہاتھ دنیا سے سفر آتا ہے یاد

شاہ لطیفؒ اس عامل انسان کو تلقین کرتا ہے کہ دنیا چند ساعت کے برابر ہے۔ تجھے تو آرام [illegible] وقت سلگھ فرماتے ہیں

هيڏا ٿان ٿوريون جي توڻ پوها پسي پلڻين
راتيون پيون گهڻيون، جي تو اينديون صحيلون۔

یہ وقت (دنیا) بہت تھوڑا ہے اگر اے نادان تو سمجھے
بہت سی راتیں تجھے قبر کی تنہائی میں ملینگی آرام کرنے کے لئے۔

آتش ۔

آتش کا نام حیدر علی تھا۔ ان کے آباء اجداد دہلی کے قدیم باشندے تھے آتش کے والد خواجہ علی بخش وہاں سے فیض آباد چلے گئے تھے آتش کی ولادت ۱۷۶۷ء میں ہوئی۔ آتش غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد تھے ناسخ سے شاعری میں مقابلہ ہوتا تھا جس کی وجہ سے ان کے کلام میں بڑی پختگی موجود ہے ان کی وفات ۱۸۴۷ء میں ہوئی آتش کا کلام آج بھی بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

آتش

ہوا ہے عشق ہم کو اُسکے حسنِ پاک سے پیدا۔
کیا ہے نور کے بکوں کو جس نے خاک سے پیدا
ظہور آدمِ خاکی سے یہ ہم کو بدن آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشین آیا۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں۔

سہ

سپرياں جي سوهڻ جي ڳالهه ڪجن ويجي
وهي در دوستي جي سوڀ سڀ سڀجي۔
عاشق آکيان هر هڪ ساڻ ڪجي
پڇيج پوءِ پرينءَ ڏانهن پڇجي۔
عاقل ٿي اوچون ٿيا، پوءِ ڪين پڇي

محبوب کے پاک حسن کی کیا تعریف کروں جس سے ہم کو عشق ہوا ہے
اس کے دروازہ پر سولی کی طرح سر قربان کریں۔
عاشق ہی سولی پر چڑھ کر شہادت قبول کرتے ہیں۔
اپنے سر کو اسکی طلب سے پہلے دینا چاہئے۔
اس معمہ کو سمجھنے سے عاقل بھی حیران رہ گئے ہیں۔

اس کے ہیں

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں ہم کو
کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا۔

شاہ لطیف بھٹائی

هوتڙين هاڻون تنهنجون ڪيئن لک هزارين۔
جيءُ سڀڪنهن جيءُ ۾ ڏسن ڏاهون ڏاهر
بيرم تنهنجا پار هڪڙا چيتي هڪڙا چوان۔

یا رب تیری تعریف ہزاروں اور لاکھوں انسانوں نے کی ہے
ہر ایک نے اپنی نظر سے تیرا دیدار مختلف طریقے سے کیا ہے
اے میرے پروردگار تیری کون کون سی ثنا کروں کروں۔

شاہ نصیر دہلوی

شاہ نصیر الدین نصیر کے والد کا نام شاہ عرب تھا اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ نصیر اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے اس لئے بڑے ناز و نعم سے پرورش پائی۔ نصیر کو شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ اور شاہ محمد مائل کے شاگرد ہوئے۔ شاہ نصیر نے اپنے شاعرانہ عہد سے دہلی میں شعر و شاعری کے شہرہ سے آوازہ کیا۔ شاہ نصیر دہلی سے کسی طرف چلے گئے تھے وہاں ۱۸۳۸ء میں وفات پائی۔ کسی شاگرد نے "چراغ گل" سے اعداد سے تاریخ نکالی ہے

شاہ نصیر فرماتے ہیں :-

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

شاہ نصیر نے اپنے عصر کلام کے [illegible] شاعروں کی تعداد میں [illegible] اس شعر میں انہوں نے [illegible] فرمایا ہے

جز نبشتوں نہ لکھی، کھئی ہوں نہ ہوں

ساربو سپرین کی لڑکے گلن تی بون

سی مرہوئیو ہوں جن مسافر سپرین

عاشق کے صحیفہ چشم تر رہتے ہیں چاہے آسمان پر بادل موجود نہ ہو۔

محبوب کو یاد کر کے آنسوؤں گالوں پر تھم جاتے ہیں

وہ کیوں نہیں روئینگے جن کے محبوب مسافر ہوں۔

شاہ نصیر کا ایک اور شعر ہے :-

ہر دم نصیر رہ تو امیدوار رحمت۔

تیری زبان پہ کس دن لا تقنطوا نہ آیا۔

اس قبیل میں شاہ عشاق فرماتے ہیں

[illegible]

لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَتِ اللّٰہِ، پرین جو پاٹ

اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا سجوای پرپاٹ

آدلون عبداللطیف چئی، اِحْرُو آھي اِگواٹ۔

اس غمزدہ کو اللہ کے واسطے وہ نشان بتا دینگے

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ یہ تو محبوب کا خود فرمان ہے

بیشک (یقین) اللہ تعالیٰ سب گناہ معاف کرتا ہے، یہ سچی بات ہے

شاہ لطیف فرماتے ہیں میرا رب بڑا کریم اور رحم والا ہے۔

ذوق ۱۷۸۹ء - ۱۸۵۴ء

شیخ محمد ابراہیم ذوق ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے۔ ذوق ۱۲۰۲ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں ایک استاد حافظ غلام رسول کی صحبت میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ آخر شہزادہ ظفر کے اشارے اور حاذق خان کے لقب ملا۔ ذوق غزل اور قصیدہ کے بادشاہ مانے گئے۔ ان کی شاعری میں سادگی اور دلفریبی موجود ہے۔ چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

ذوق کا ایک شعر ہے۔

جھوٹ ہی جانو کلام اس دشمن ایمان کا
پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا۔

شاہ لطیف سچے مسلمان اور منافق میں فرق بتاتے ہوئے منافق کو ظاہر کرتا ہے فرماتے ہیں۔

اِن پرنہ ایمانُ، جئن ھلمی گوھوتابُن۔
دغا تنھنجی دل ۾، شرک ۽ شیطان۔
منھن ۾ مسلمان، اندر آذرُ آھین۔

اس طرح یہ تیرا ایمان نہیں ہے، جس طرح تو اپنے آپ کو کلمہ گو کہلاتا ہو
تیرے دل میں دغا ہے اور شرک و شیطانیت سمائی ہوئی ہے۔
ظاہر صورت میں تو مسلمان ہے، لیکن باطن میں آذرؑ ہو۔

ذوق کا ایک اور شعر ہے۔ دنیا نے کس کا راہ فنا میں دیا ہے ساتھ۔
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔

شاہ لطیف اس خیال کو انسان زندگی کی کامیابی بہم کوشش پر مدار کرتے ہوئے اس مصرعہ کو تو شرح کے ساتھ بیان کرتا ہے فرماتے ہیں

جان جیئن تان جل، جو کانھي جاءِ جلڻ جي
تتي ٿئي ٿل، جو کانھي جاءِ ويھڻ جي۔

جب تک زندگی ہے جیتے میں چلتا رہ جو چلنے کے بغیر کوئی راہ نہیں ہے
گرمی ہو یا سردی تو چلتا رہ، جو چلنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

ذوق نے فرمایا ہے۔ نہ ہوتا گر وہ شوخ خود نما سرگرم آرائش۔ اٹھاتا خورشید فلک آئینہ دار سے

شاہ لطیف فرماتے ہیں۔ وحدت تا کثرت ۾ کثرت وحدت کل

حق حقیقي ھیڪڙو ٻولي ٻي نہ ڪل
سو ھلا ھو ھل با تہ سندو سچئين

وحدت ہی سے کثرت ہے اور وحدت کل کثرت سے ہے
ایک ہی معبود حقیقی ہے اس کے سوا اور کوئی چیز زبان پر نہ لا۔
یہ دنیا کا شور و غل اس قادر مطلق کی مظہر قدرت کا ہے

مومن

حکیم محمد مومن خاں مومن دہلی کے رہنے والے تھے۔ مومن کی ولادت ۱۲۱۵ھ کو دہلی میں ہوئی۔ مومن کی ابتدائی تعلیم اچھی طرح سے ہوئی۔ وہ پڑھے لکھے اور دکی دماغ تھے۔ ان کے کلام میں ان کی ملازمت کی داستان میں قصائد اور مدح نظر آتی ہیں۔ غزل میں انکی انفرادی حیثیت تھی۔ مومن ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں ہوئی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

مومن کا شعر ہے

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ
آرزو ہائے دل رشک، اشنا کہتے ہیں۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ فرماتے ہیں:۔

ڈر سین وجھو کھاڈ کر سین کٹ پاٹیئن
پوري! منت آچاڻ ڪڻ چڏيو تہ ميڙين۔

دوست سے لڑائی مول لیتی ہو، اور رقیب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہو
اے نادان عورت تو تو آناج کو چھوڑ کر اُنکے چھلکے جمع کر رہی ہے۔

مومن کا ایک اور شعر ہے:۔

موسعیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن
نیند آتی ہے بآرام وگر آخر شب۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔

غافل غفلت چھوڑ تون ڪين آٽا سين اوجھرين
هو چپاٽا چڙهي وبا وجي پٽا توڙ۔
نئين نند اکوڙ، جم ورن جو واڳ ڪرين۔

اے غافل تو غفلت کو چھوڑ دے تو نے کیوں کمر مستی بری ہے۔
جس کو منزل کی طرف جانا تھا وہ خاموشی سے منزل مقصود پر پہنچے
اپنی آنکھوں سے نیند کو اکھوڑ دیں ورنہ بیابان میں بھٹکنا پڑے گا۔

مومن کہتے ہیں:۔

نالہ دوستے ہیں جو لکھا تو بھیگا کاغذ
کہ بتا ہم گھر صبح تو دریا کاغذ۔

شاہ لطیفؒ کا شعر ہے:۔

آلا! اوني آئين جي نيا پا نين
اوڻ اُهي هن آسمان، لوڻ مڙهن
مس منصبي مٽ ۾ ڪاغذ کي آئين
لڙڪ نہ لکن ڏيئن ڪڍو پوين قلم ۾۔

یا اللہ! اس قاصد کو بھیجدے جو میرے عزیزوں کا پیغام لائیں
میں تو اُن کی ہوں وہ چاہیے مجھے اپنا نہ بنائیں۔
سیاہی تو میرے ہاتھ میں ہے وہ کوئی کاغذ لائیں
میرے آنسو مجھے لکھنے نہیں دیتے اور قلم پر گر جاتے ہیں۔

ظفر ۱۷۷۵ء - ۱۸۶۲ء

سراج الدین محمد ابوالمظفر بہادر شاہ ظفر ۱۷۷۵ء میں تولد ہوئے۔ تیموری سلاطین کے آخری تاجدار تھے۔ ظفر ۶۲ برس کی عمر میں ۱۸۳۷ء میں اپنے والد اکبر شاہ ثانی کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے۔ لیکن حکمران کے لئے ہیں۔ سلطنت تو فرنگیوں کے ہاتھ میں جا چکی تھی۔ ظفر تاج سلطنت کا بادشاہ نہ ہوا لیکن سخن سنج کا بادشاہ تو تھا۔ ظفر کو دہلی میں شعر و شاعری کا ماحول ملا۔ اس طرح بچپن میں ہی شاعری سے شغف پیدا ہوا۔ شروع میں شیخ محمد ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتے رہے۔ بعد میں مرزا غالب سے بھی اصلاح لی۔ ظفر نے اپنی آنکھوں سے سامنے اپنے آباؤ اجداد کی عظیم سلطنت کو اجڑتے ہوئے دیکھا۔ اور دنیا کی ناپائداری کا رونا رویا۔ یہی وجہ ہے کہ ظفر کی شاعری میں رنج و الم یاس و حسرت کے جذبات موجود ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد فرنگیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر رنگون میں نظر بند ہوئے جہاں ۹۰ برس کی عمر میں کسمپرسی کے عالم میں وفات پائی۔ ظفر کے کلام میں بڑا سوز و گداز موجود ہے۔

ظفر کا شعر ہے

لطف سے کن کے ہوئے کیسے ہیں دونوں عالم
لطف سے روح ہوئی داخل جسم آدم

شاہ لطیفؒ کا شعر ہے۔

فیکون فدا کری عجیا ئین سین سکن۔
تعظیماً تمام کری، پوءِ پنہ پائین ہی

فیکون فرما کر اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کن
دنیا کے نظام کی تعظیم کرکے پھر اس دنیا کو بچایا۔

ظفر کہتے ہیں۔

لطف سے گرچہ ہو معشوق بھرے عشق کا دم
لطف سے غیر بنے بندہ ہے دام و درم
لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

شاہ لطیف فرماتے ہیں

جیکي منجھ جان سو تاري ڀگي تنھنجي
لطف جي لطف ڀي تو وٽ ھمہ کان
عدل پٺان آئون نہ ھو فیر و حج فضل ھو

جو بچھ بھی اس عدل میں موجود ہے وہ تیرے سہارے پر چلتا ہے
لطیف کہتا ہے، میرے رب لطف و کرم کی تجھ میں کمی نہیں ہے۔
میں گنہگار ہوں انصاف کرنے سے چھٹکارا نہ ہوگا جب تک تو رحم نہ فرمائیگا۔

ظفر کا ایک اور شعر ہے۔

نماز و روزہ و تسبیح و حج
یہ سب باقی نہیں تو باقی نہیں ہے

شاہ لطیف بھٹائیؒ نے روزہ اور نماز کے ساتھ ایک اور فہم کو بھی دیا ہے وہ فہم کون سا ہے، وہ عقیدت میں عمل ہے جو انسان کی تخلیق کے ساتھ اسکو ودیعت کیا گیا ہے جو انکی زندگی کا ایک جز ہے فرمایا ہے:۔

روزہ ۽ نمازون، اي ڀڻ ڳالھ ڪم
پر آو کو ٻيو فھم، جنھن ڀيڻي پرين کي۔

روزے اور نمازیں، یہ بھی بہتر کام ہے
اور ہیں وہ افہام، جس سے دیکھیں دوست کو۔

ظفر معلم اخلاق کی حد سے جب ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے تو وہ خدا پرست صوفی کی طرح محبوب حقیقی کی لگن میں سرشار ہو کر فرماتا ہے

تیرا حسن ہم جلوہ گر دیکھتے ہیں۔

جہاں دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں۔

شاہ لطیف بھٹائی کا مشاہدہ جمال دوست سے محروم نہیں ہوتا وہ جمال طور سوز اور حسن عالم افروز کا دیدار خودی کا پردہ اٹھا کر فرماتا ہے۔

جیڈاھن حریان پرک تیڈاھن صاحب ساھوں۔

جس سمت کو دیکھتا ہوں اس سمت دیدار یار ہوتا ہے۔

ظفر محبوب کی تعریف میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے فرماتے ہیں

اے معدن کرم تری صحبت کے روبرو — کم تر ہے سنگ ریزہ سے قدر رنگین جم

صدقہ زمین کے ہوتا نہ پھر بوسے آسماں — رکھتا سر زمین نہ اگر اپنا تو قدم

محروم ترے دست مبارک سے رہ گیا — کیوں کر نہ چاک اپنا گریبان کرے قلم

قرآن میں جبکہ خود ہو ثنا خواں ترا خدا — کیا طب پھر قلم کو جو کچھ کر سکے قلم۔

شاہ لطیف بھٹائی اس قبیل میں فرماتے ہیں

ناز منجھاں نکری، منھنجی پرین کری تو پنڈ

پون پئی بسم اللہ چئی راہ چھپی تی رنڈ

آپیون کئی ادب سین حورون جیرت سنڈ

ساڻین جو سوگنڈ، منھنجو ساجن سینھاں سنڈو۔

میرا محبوب جب ناز سے باہر نکل کر قدم رنجہ فرماتا ہے

تو یہ زمین ان کو دیکھ کر بسم اللہ کہہ کر راہ کو بوسے دیتی ہے۔

بڑی حیرت اور احترام سے حوریں ایک طرف کھڑی رہتی ہیں

میرے محبوب کی خوشبو کتنی پیاری ہے وہ تو سب سے زیادہ حسین ہے

ظفر کہتے ہیں — ظاہر پرست پوچھتا کیا ہے خدا کی راہ — ہے وہ بہت قریب

شاہ لطیف اسی خیال پیش کرتا ہے — وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ — وطن آن دینہ یاس

مارئی کی ملنہ یاس کونیون چڈی ھئہ ھن۔

اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں بندے میں تیری شہ رگ سے بھی قریب ہوں۔ اس قید و بند کو چھوڑ کر اصل وطن جاؤں گی۔

ظفر کا شعر ہے۔ — ظفر اوی اس کو نہ پائے گا وہ کتنا ہی صاحب فہم و ذکا — جسے عیش میں یاد خدا رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہے

شاہ لطیف بھٹائی فرماتے ہیں — قربا پسی قیڈ کریں کیرنہ چکیو۔

دنیا ڪاڻہ دین، وڃائی وڃائیا۔

بکڑے ہوئے لوگوں نے گھاٹ کی صرف دیکھا ہے انہوں نے سودہ کی لذت حاصل نہ کی

انہوں نے تو دنیا کے واسطے اپنا دین و ایمان گنوا دیا۔

مرزا غالب

دبیر الملک نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خان غالب۔ اردو ادب کے درخشاں ستارے اردو ادب میں جو مرتبہ انکو حاصل ہوا وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہوگا۔ مرزا غالب کی ولادت ۸ رجب ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۶ء حضرت شاہ عبداللطیف کاظمی کی وفات سے ۲۸ سال بعد آگرہ میں ہوئی۔ مرزا صاحب کے دادا معظم سفیشاہ شاہ عالم کے زمانے میں توران سے ہجرت کرکے ہندوستان میں آئے تھے۔ مرزا غالب کے والد کا نام مرزا عبداللہ عرف مرزا دولہا تھا جن کی سن جوانی کے عالم میں وفات ہوئی۔ غالب کی پرورش انکے چچا نصراللہ بیگ نے کی تھی۔ مولوی مرزا کو بڑے اچھے تعلیم دلوائی۔ غالب کو بچپن سے شعر و شاعری سے شوق تھا۔ شادی کے بعد آپ نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ غالب کے کلام پر امیر مینائی شاعر کا بڑا اثر ہوا۔ شروع میں عرفی کے قصائد کی تقلید کرتے تھے۔ اسد میں اسد تخلص کرتے تھے۔ بعد میں غالب اختیار کیا۔ غالب کے شاگرد ہو کر شمس شاہ معارف شاہ نصیر نے اپنی اولاد کا نام رکھا۔ وہ نجم الدولہ دبیر الملک کا خطاب دیا۔ مرزا غالب بڑے دھن اور نکتہ مزاج تھے۔ ایک عام مصائب جو زندگی درپیش آئے۔ اپنی نہایت صبر اور شکر سے برداشت کیئے۔ مرزا غالب نے ۷۲ سال کی عمر میں ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء دہلی میں وفات کی۔ شاہ لطیفؒ اور مرزا غالب کے کلام میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اُن کی مثال دی جاتی ہے

مرزا غالب نے رب کی رضا پر راضی رہنے کے لئے فرماتے ہیں :

گو مئے تلخ و تند بر ساقی ہے دلربا

اے شیخ جی پڑیگی نہ کچھ ہاں کئے بغیر۔

قضا کے معمہ کو حل کرنا مشکل ہے اس لئے رضا اور تسلیم کی راہ پر چلنا چاہیے۔ اس کے لئے شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں ،

حد میں خبر نہ دھونڈن چٹیو لہیا ہی ارواح

الف اگمین لکھو ، منصنجو۔ مینا تھا

وڈندن تہ وٹ کنڈا نہ تہ اگن جی اختیار

سرکشی سردار سین۔ مونہ کھیتی ظفر۔

جب اللہ تعالیٰ نے کُنْ فَیَکُوْنُ فرمایا اور معدوم کو پیدا کیا

اس میثاق کے دن میری تقدیر میں جو کچھ لکھنا تھا لکھ دیا۔

اب ان کی مرضی پر ہے چاہے تو رحم فرمائیں۔

میں کم تر کی سرکشی سردار کے آگے کیا بنے گا بس اسکی رضا چاہیے۔

غالب کا شعر ہے ۔ ہر چند سبک دست ہوئے ہم بت شکنی میں ۔

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

شاہ لطیف فرماتے ہیں ۔ نکی پاٹ کٹن پاٹ سین نکی ساٹن پاٹ

پرس دھن پرچیام ، لُڈ جنھن اُٹ گئی۔

وہ نہ تو اپنے ساتھ کچھ لیتے ہیں نہ تو کوئی چیز اُن کے ساتھ ہوتی ہے

محبوب کو اس وقت راضی نہ ہوئے میں اٹھ کر چلا گیا

جب انسان کامل ہوتا ہے تو وہ خداوند تعالیٰ کا رنگ حاصل کرتا ہے ۔ یہ کائنات اسکی جلی و عکس ہے ہر چیز اس جلی سے مختلف صورتیں اختیار کرتی ہیں غالب کہتے ہیں

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں ۔

شاہ لطیف بھٹائی اس قبیل میں فرماتے ہیں ۔

جوتو مین کیانون تنھنجو، لکی لک ھزار
جیئ سب ڪنھن جیئ سین درشن ڏيکاريون ڏار
پريم تنھنجا پار ڪري چئي ڪھڙا چوان ۔

تیرے ذات صفات کے لکھنے والے نے لاکھوں صفات لکھ دیئے ہیں ۔
ہر ایک نے اپنی اپنی نظر سے مختلف درشن کئے ہیں ۔
میرے محبوب میں تیرے کن کن صفات کا ذکر کروں ۔

غالب کہتے ہیں ۔۔ وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو ۔

شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں ۔۔ عاشق عزازيل ہيا مڙوئي سڀ تريا ۔
منجھان سڀ سبيل لعنتي لعل ٿيو ۔

جو عاشق ہے تو عزازیل ہے، دوسرے کہنے کے عاشق ہیں ۔
عشق کی انتہا کی وجہ سے وہ لعنت کے مستحق ہوئے

غالب کہتے ہیں ۔۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے اہل نظر گئی ۔

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں ۔۔ لڙ هئي لنڊون نہ سڃاتو راند پانيائين راز کي ۔
رلي پائين راند، پانيءَ عشق پروٽ جو ۔
لڑکی بہت کو سمجھ نہ سکی، اسکو بچوں کا کھیل سمجھا ۔
وہ بلوچ کے عشق کے راز کو سمجھ نہ سکی اور کھیل سمجھتے رہی ۔

غالب کہتے ہیں ۔۔ میں اور صد ہزار نوا ہائے دل خراش
تو اور وہ یک نہ شنیدن کہ کیا کہوں ۔

اس خیال کو حافظ شیرازی نے بھی کہا ہے حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس
در بند این مباش کہ شنید یا نہ شنید ۔

شاہ لطیف بھٹائی فرماتے ہیں ۔۔ حد سڀ جي حد، حد پرين پرواهه ناهه ڪا
جہاں محبت حد سے زیادہ ہے وہاں محبوب کو کوئی پرواہ بھی نہیں ہے ۔

غالب کا ایک شعر ہے۔ نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے

بے صدا ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایک دن۔

شاہ لطیف بھٹائی فرماتے ہیں۔ ڈیکارین ڈکی کو سندو کس پرین جو

سو ڈھائی سومن ڈھئی۔ میکا ندیا ہوت سان۔

غم کی تکلیف نے محبوب کی طرف جانے کا راستہ بتایا

غم نے ہی تو دستگیری کی اس محبوب سے ملنے کی۔

غالب کہتے ہیں۔ درد منت کش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا۔

شاہ بھٹائیؒ اس خیال پیش کرتا ہے

سورجنیں کی سربو۔ سری تن صحت۔

منی مصیبت اصل عاشقوں کی۔

جن کو عشق کا درد بدا ہوا اُن کو صحت ملی۔

یہ میٹھی میٹھی مصیبت اصل عاشقوں کا حصہ ہے۔

غالب ——— جب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں

خاک میں کیا صورتیں ہونگیں کہ پنہاں ہوگئیں

شاہ لطیف فرماتے ہیں۔ ڈھڈھن ڈکا تو صو گھوٹ، ڈھڈھن مڑہ مقام جیہ

ڈاری منہ و کوٹ آڈی آڈینڈی کیتھرو۔

کبھی تو دولھا بن تا ہے۔ تو کبھی میت بن کر قبر میں دفن کئے جاتے ہو۔

اے بندہ تو دنیا کے عمل کب تک بناتے رہو گے

غالب فرماتے ہیں۔ زندگی اپنی جو اس طرح سے گذری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے ہیں۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ نے فرمایا ہے۔ نہ کو کفر جین نکا مسلمان من

نکا دل دوزخ ڈی نہ کو بہشت گھرن

آپا آئین چون تہ پرین عجو پنھنو

میرا کام نہ تو کفر سے ہے نہ ہی مسلمان سے سروکار ہے

نہ تو دل دوزخ کی طرف مائل ہے نہ بہشت کی تقاضا کرتے ہیں

لیکن پھر بھی کہتا ہے اے میرے محبوب تو مجھے اپنا بنا دے۔

غالب کا شعر ہے — اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے یاورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

شاہ لطیف بھٹائی — سو هيڏي سو هوڏي، سوئي من وسي

[illegible]

وہ ہی ادھر ہے وہ ہی ادھر ہے وہ ہی دل کے اندر بستا ہے

وہ ہی دیکھتا ہے اس کی روشنی کو۔

غالب — دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

شاہ لطیف — پيهي جا پاڻ ۾ ڪيم روح رهاڻ۔

نکو ڏونگر ڏيهه ۾ نڪا ڪيچن ڪاڻ۔

پنهون ٿيس پاڻ، سڃي تان سوه سڏا۔

اپنے آپ جب اپنے دل سے باتیں کی (روح کو پکارا)

نہ تو مجھے پہاڑوں نظر آئے نہ ہی مجھے کیچوں اپنوں کے عزیزوں کی پرواہ ہوئی

پنہوں تو میں خود ہوں وہ تکلیفیں تو سہنی پڑیں۔

غالب — یوں تو کہتے ہو کہ شہ رگ سے بھی نزدیک ہیں

جانے حیرت ہے کہ پھر آنکھ سے کیوں دور ہوئے۔

مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں۔ — آنکہ حق است اقرب از حبل الورید

تو گمانت [illegible]

شاہ لطیف فرماتے ہیں۔ — جو اکين آڏو سو سپرين پراهون ۾ چوٽ

صوت تنهنجي صنج ۾ ٻيين ڪوه ٻيو۔

جو محبوب آنکھوں کے سامنے ہی انکو دور نہ کہو۔

محبوب تو تیری گود میں ہے پھر تو کیوں دور کی پوچھتے ہو۔

غالب فرماتے ہیں۔ — طاعت میں تا نہ رہے مے و انگبیں کی لاگ

دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو۔

شاہ لطیف — اگر پڙهي آيا گياه، قاضي ٿيه ڪيا۔

ان سرڪي سنڌو ساوڻ پڇج اعزائيل کان

حرف ایک پڑھ کر تو اپنے آپ کو قاضی کہلاتے ہو۔

اس محبت کی لذت اگر پوچھنی ہے تو اعزائیل سے پوچھو۔

غالب کا شعر ہے ..

آتا ہے داغِ حسرت کا شمار یاد
مجھ سے میری گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

شاہ لطیف فرماتے ہیں ..

عدل چنان نہ آؤ ھو قیہہ صبح فضل
میرے رب تو انصاف کرے گا تو میں گنہگار نجات حاصل نہ کر سکوں گا
اگر اپنے رحم و کرم کی نظر فرمائیگا تو نجات ہوگی

مرزا غالب کا شعر ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

شاہ لطیف فرماتے ہیں

ھوني اُت کوسیار، جت تو پوري پانئون
پندیہ کر چھاڙ تي، اتي وجودئي وٽ ڪلہ
تاریاں پانئج تا اُس ھیچ پریان کر ہاڻ تو
اے نادان جہاں تو محبوب (پنھوں) کو ڈھونڈتی ہے وہ تو وہاں نہیں ہے
بھائیوں کے کشمیں راستے کی طرف کیوں جاتی ہو، وہ راہ (شکار) تیرے وجود میں ہے
غیر کو تو نے غیر سمجھا تو خود اپنے آپ کو محبوب بنا دے

مرزا غالب

محیط دہر میں بالیدن از ہستی گذشتن
کہ یاں ہر ایک حباب اسما شکست آمادہ آتا ہے

شاہ لطیف فرماتے ہیں

جرئي ڪوٽو جئين ھرين ڳي اُڪتئي
تونڀڻ آئين تئين دنيا جي ڏينھن
پانی کی سطح پر حباب ابھر کے کتنے سے ادھا ہو جاتا ہے
اے بندہ تو بھی حباب کی طرح چند دن کے مہمان ہو اس جہان میں

غالب ..

اس کو کون دیکھ سکتا ہے کہ یکتا ہے وہ
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں ..

جنبم احوال او بکے دمدن نفس
ناظر شرک است در ملک توحید من

شاہ لطیف فرماتے ہیں ..

بنوں کی دنیا میں حاجی ہا سی سبھ
وہ سعی دیکھ لوں نیند ھو تو نیند ھا لوٹ کی
دوسروں کی محبت کو چھوڑ کر ایک طرف چل وہ تجھے کوئی بھی راہ نظر نہ آئیگی ابھی تا تھا دیکھ

باب ششم

شاہ عبداللطیف بھٹائی اور اُردو شعرا کے کلام کا تقابلی موازنہ

فن تنقید میں موازنہ کے فن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک دلچسپ صنف ہے۔ جس کے ذریعہ مختلف شعرا کے متعلق تقابل کرکے ایک رائے قائم کی جاتی ہے جس سے کافی حد تک مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ فارسی ادب کے نقادوں نے اس فن کو خوب چمکایا۔ اکثر تذکروں میں فارسی۔ اردو اور سندھی زبانوں میں ہر دور کے شعرا کے کلام کا تقابلی موازنہ نظر آتا ہے۔ تذکرہ نگاروں نے شعرا کے کلام کو باہمی طور پر مدمقابل لا کر اُن کا موازنہ کرکے دکھایا ہے۔ یہ موازنہ کہیں تو بہت درست نظر آتا ہے جو اجمالی طور پر بلیسان نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں منقول ہے[1]

"جب حضرت رسالت پناہ صلعم معراج کو تشریف لے گئے تو زیر عرش ایک نفیس و مجلل مکان دیکھا۔ اندفسار پر جبرئیلؑ نے عرض کیا کہ یہ مکان مخزن معانی ہے اور آپ کی اُمت کی السنہ اس کی کنجیاں ہیں۔ اس پر دو شعر لے لئے گئے اور قلب منور میں رکھ لیا۔ ایک روز حسان بن ثابتؓ کو آپ نے ایک سادہ کاغذ عطا کرنے حکم دیا کہ یوم الجمعہ کو ایک قصیدہ لکھکر لائیں۔ اُدھر انتظاماً مبہوت ہو گیا اور جب حضورؐ نے قصیدہ پڑھنے کو فرمایا تو پاس ادب سے عبارت انکار۔ دیکھکر ہاتھ میں کاغذ لیا۔ اور بی البدیہہ پڑھنا شروع کیا۔ اسی دوران میں وہ دو اشعار بھی زبان حسانؓ سے صادر ہوئے جن کو بجز رسالت پناہ صلعم کے کوئی نہ جانتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ان دو اشعار سے کوئی واقف نہ تھا۔ بالضرور یہ قصیدہ بدیہہ کہا گیا ہے اور دونوں شعر جبرئیلؑ نے القا کئے ہیں۔ پھر حسانؓ کو تحسین و آفرین کے بعد دعائے خیر دی اور زبان فیض ترجمان سے ارشاد ہوا کہ شاعر کی طبیعت میں معنی کا پیدا ہونا الہام غیبی ہے۔ جس کا حصول بغیر تائید ایزدی محال ہے"

مگر بعض اوقات یہ محض ایسے ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے جو برائے موازنہ کے مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے جو خود بخود شعرا کے کلام میں نظر آتا ہے بعض متقدمین میں سے منقول ہوتا ہے۔ یا تو بزرگوں، بادشاہوں اور شہزادوں کے ادبی مناقشہ اور شعری معرکوں کی یادگار ہیں۔ ان میں ادبی و تعلیمی دلچسپیوں میں تیموری شہزادوں نے جو حصہ لیا ہے۔ اُن کی مثالیں اکثر تذکروں سے دستیاب ہوتی ہیں۔

یہاں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور اُردو شعرا کے کلام کا تقابلی موازنہ کیا جاتا ہے۔ شاہ بھٹائیؒ سندھ کے سب سے بڑے عوامی شاعر تھے اس موازنہ سے مراد یہ ہے کہ شاہ بھٹائیؒ کے کلام کو اُردو کے کلام کے نزدیک لایا جائے اور خیالات کی ہم آہنگی دیکھی جائے اور تخیل کی بلندیوں کو دیکھا جائے۔ جو شخص مواقع کلام سے آگاہ نہ ہوگا وہ ناقص اور کامل کلام میں فرق کر نہیں سکتا۔ یہ اہلیت اسوقت حاصل ہو سکتی ہے جب دو شعرا کے کلام کا "متحد المعنی" اور مختلف الفاظ ہوں۔ یہ فرق طبائع انسانی کی لطافت و کثافت پر موقوف ہے۔ امام عبدالقاہر جرجانی نے اپنی تصنیف "دلائل الاعجاز" میں اس کی تشریح یوں کی ہے "لطافتِ کلام روحانی معنوں کی قسم ہے"

حیرت کی بات یہ ہے کہ قدیم شعراء پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں رہتے تھے جو ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور بہت دور رہتے تھے۔ ہر ایک کی ثقافت علیحدہ علیحدہ، زبان مختلف، رنگ اور لباس بھی مختلف۔ نقل و حرکت کے وسیلے بھی محدود ملاقات کے امکانات کم اس طرح شعر و سخن کا اظہار بھی

---

[1] "دردِ شعری" مقالہ نگار مولانا شریف احمد صاحب مارہروی رسالہ "نخزن" مدیر احسان اللہ تاجور نجیب آبادی ماہ نومبر ۱۹۱۸ء صفحہ ۴۔

علیحدہ لیکن کسی حد تک خیالات میں مماثلت نظر آتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بزرگ ایک ہی چشمہ سے سرشار ہے جس نے اپنی زبان میں تصوف کی باریکیوں، خدا تعالیٰ اور رسول صلعم سے عشق اور اخلاقِ حسنہ کو پیش کیا ہے۔ شاہ عنایتؒ کی شاعری دوہوں کی شاعری ہے۔ لیکن اردو زبان کے قدیم وحدہ شعراء کی شاعری غزل کی صنف میں ہیں۔ اگرچہ شاہ عنایتؒ نے جس زبان میں شاعری کی ہے، وہ لاشبہ ایک خاص علاقہ تک محدود ہے لیکن انہوں نے جس اُنس و محبت، اخوت، وحدانیت، رسالت مآب کی محبت کا پیغام دیا ہے۔ اس کی افادیت، وسعت اور عالمگیر اثر مسلّم ہے زبان، رنگ اور لباس کے اختلاف کے باوجود اُن کے احساسات اور رجحانات کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سندھی شعراء کے سرتاج ہیں آپ کا کلام سندھی بولنے والے عوام میں اس حیثیت کا حامل ہے، جیسے مولانا جلال الدین رومیؒ کا کلام فارسی داں طبقہ میں۔ اور میر تقی میرؔ اور خواجہ میر دردؔ کا کلام اردو زبان والوں کے لیئے۔ شاہ عنایتؒ کی شاعری اپنی قدیم روایتی خصوصیات کی بنا پر سندھی ادب میں ایک امتیازی شان و شوکت رکھتی ہیں الفاظ کا مناسب استعمال زبان میں موسیقیت پیدا کرتی ہیں فطرتی نغمگی ہے اس کے ساتھ ہی سادگی اور پرکاری ہی شاعری کی طبع نازک کو میسر ہو تو شاعری کی چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اور ایسا سوز و گداز پیدا ہوتا ہے جو ہر پڑھنے اور سننے والے کو بے اختیار ایک چوٹ سی لگتی ہے۔ ان کی اس ہمہ گیر مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی شاعری جو سراسر آمد ہے دلی واردات کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ اور حقیقت و مجاز کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی، اُن کا بے پناہ اور اثر آفریں سوز و گداز، ایک محبت سے سرشار اور زخم خوردہ دل کی غمگساری کرتا ہے۔ عشق کے بعض نازک معاملات کو اس فنکارانہ انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ایک بے اختیار پکار اُٹھتا ہے:۔

"میں یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

شاہ لطیفؒ کی شاعری میں زبان کی فصاحت و سادگی، خیالات کی نزاکت، وسعت و جدت، تشبیہ و استعارہ، کنایہ، یہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ہر ایک دیہاتی شاعر کو نصیب نہیں۔ شاہ صاحبؒ رنگ سخن فلسفیانہ، نکات، حکیمانہ اقوال، تصوف اور عاشقانہ اُمنگ اپنے مخصوص انداز میں نہایت سادگی اور حسن طرز سے ادا کیئے ہیں، خیالات کی پاکیزگی، نزاکت و لطافت، شاہ صاحب کے کلام کا خاص جوہر ہے۔ آپ کا زیادہ تر کلام درد سے لبریز ہے۔ شاہ عنایتؒ کو غریب عوام کے درد کا احساس تھا اور طبیعت میں درد سمایا ہوا تھا۔ آپ کے والد بزرگوار سید حبیب شاہ بڑے دردمند انسان تھے۔ اور درویش سادات خاندان سے تعلق تھا، سچی وجہ یہ ہے کہ عنایتؒ بچپن سے ہی تارک دنیا تھے۔ شاہ لطیفؒ کی سوانح اور پاکیزہ کلام نے مل کر اُن کا سندھی ادب میں بڑا مقام ہوا۔ بلاشبہ ایسی یکتائے زمان ہستیاں صدیوں بعد عالم وجود میں آتی ہیں، اور اپنا نقش حیات اس قدر گہرا اور دائمی چھوڑ جاتی ہیں کہ زمانہ اگر چاہے بھی تو اُنہیں مٹا نہیں سکتا۔ شاہ لطیفؒ کا کلام عالمگیر حیثیت حاصل کر چکا ہے اور اُن کا کلام قیامت تک ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا۔

شاہ لطیفؒ تصوف کے شاعر تھے۔ اور تصوف کے باریک مسائل کو کھول کر پیش کیا ہے۔ خاص طور پر وحدت الوجود اور ثمرہ اُوست کو کا موازنہ کرتے وقت دونوں پہلوؤں کا ذکر کرنا ہے۔ ایسے حالات میں وہ ایجاز و اختصار کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیئے، مگر ایسا ایجاز و اختصار جو تفصیل و تشریح کے برابر ہے۔ بلکہ دلچسپی کے لحاظ سے بہتر ثابت ہوگا۔ اس سلسلے میں اُردو ادب کے مشہور نقاد وقار عظیم کی یہ رائے ہے:۔ جسکو بڑی اہمیت حاصل ہے لکھتے ہیں۔

---

[1] سندھ کا عوامی شاعر "مقالہ نگار وقار عظیم، رسالہ "روح ادب" شمارہ ۱۵-۱۶ ش۔ جون ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۰۸

"شاہ عبداللطیف کے کلام کی بنیاد اُن کا صوفیانہ انداز نظر ہے۔ لیکن اس صوفیانہ فکر کے لئے انہوں نے سترھویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی کے شروع کی دیہاتی زندگی کے مادی اور جسمانی پہلوؤں کے تذکرے سے مدد لی ہے اور اس عہد کی زندگی میں ظاہری اور باطنی جسمی اور روحانی جذبے رچ رہے ہیں۔ سب پر نظر رکھکر اپنے گیتوں کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ اس لئے گو اُن کے خیالات سراسر صوفیانہ ہیں لیکن ان صوفیانہ خیالات میں تصوف کی خشکی کی بجائے ایک صحت مند تازگی، شگفتگی اور سچے عشق کی ولولہ انگیزی موجود ہے ان کے تصوف میں فلسفہ نہیں رومان ہے۔"

شاہ لطائفؒ ہی ایک صوفی اور عالم تھے۔ شعر نے دروازے عالموں پر کبھی بند نہیں ہوئے۔ اور شاعروں نے علم کو کبھی ایک ایک منطقہ حفظ قرار نہیں دیا۔ ہماری گذشتہ تعلیمات میں شعر کو بھی گہری جگہ حاصل ہے پرانے لوگ شعر کو شائستگی کا جز سمجھتے تھے۔ اس لئے بقدر ضرورت شاعری سے ہر موضوع میں کام لیتے تھے۔ صحیح یہ ہے کہ شعراء اپنے مقصود میں وسائل اور ذرائع سے کامیاب ہوتے ہیں۔ ان میں علم بھی ایک اہم وسیلہ ہے۔ شاعر کو فطری طور پر ایک ایسی وجدان فطرت سے آراستہ ہونا چاہئے جو عام انسان میں نہیں ہوتی شاعر کا احساس نازک اور طبیعت لطیف ہوتی ہے۔ دل دردمند اور متحمل نقاش، وہ ایسا شخص ہوتا ہے جو دنیا پر کاروباری قسم کی نگاہ نہیں ڈالتا بلکہ ایسی ایسی معمولی باتیں ایسے مناظر کرلیتی ہیں جو دوسروں کو محسوس تک نہیں ہوتیں وہ دوسروں کے درد کو اپنا لیتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ

سارے جہان کا درد ہمارے ہی دل میں ہے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کے متعلق مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؒ نے فرمایا ہے۔

مثنوی مولوی معنوی

ہست قرآن در زبان پہلوی۔

مرزا اسد اللہ غالبؔ نے اپنے کلام کے لیئے خود فرمایا ہے۔

گر شعر و سخن بدہر آئین بودے

دیوان مرا شہرت پرویں بودے

غالبؔ اگر این قبا سخن دین بودے

آن دین را ایزدی کتاب این بودے

اگر شعر و سخن کی دنیا میں قانون ہوتا، تو میرا کلام دیوان کمال شہرت کا حامل ہوتا۔

غالبؔ کی قبا سخن دین ہوتا، تو میرا دیوان خدائی کتاب ہوتا۔

جدید دور میں علامہ اقبال مرحوم کو اُردو شاعری کا نیچرل شاعر کہتے ہیں ان کا کلام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کے متقدمین خواہ متاخرین میں کوئی بھی اُردو یا فارسی شاعری میں ہمعصری کر نہیں سکتا۔ اپنے کلام کیلئے فرمایا ہے

محمدؐ بھی تیرا جبریل بھی، قرآن بھی تیرا

مگر یہ حرف شیریں ترجمان تیرا ہے یا میرا

ایک اور جگہ اپنے کلام کے لئے کہتے ہیں۔

خوش آگئی ہے جہان کو قلندری میری
وگرنہ شعر میرا کیا ہے شاعری کیا ہے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومی دنیا کے شاعروں کا استاد مانا گیا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم۔ مولانا رومی کو اپنا روحانی مرشد مانتے ہیں اور یہاں تک کہا جاتا ہے کہ تخیل سخن جو مولانا رومی نے آدھورا چھوڑا۔ اس کا بہت کچھ حصہ علامہ اقبال نے مکمل کیا۔ لیکن حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے علامہ اقبال سے دو صدیاں پہلے جو عقیدت تھی اس بنا پر دیکھا جاتا ہے کہ ان کے نامکمل تخیل کو شاہ بھٹائی نے مکمل کر دیا تھا۔

شاہ بھٹائی اپنے کلام کے لئے فرمایا ہے:۔

جي تون بيت پائين ، سي آيتون آمين ۔
نيو من لائين پريان سندي پاس ڏي ۔

جنکو تم ابیات سمجھتے ہو، وہ آیتیں ہیں
جو دل کو محبوب حقیقی کی طرف لے جاتے ہیں

شیخ امام بخش ناسخ اپنے کلام کے لئے کہتا ہے:۔

ہر بیت میں اک شاید معنی کی ہے تصویر
ناسخ ہے مرقع نہیں دیوان ہمارا۔

صوفیانہ شاعری میں چاند کا حسن ایک مرکزی خیال رہا ہے۔ کیوں کہ کائنات میں چاند جیسی حسین چیز قدرت نے پیدا نہیں کی لیکن صوفی شعراء نے اپنے محبوب کے حسن کی تعریف کے آگے چاند کے حسن کو ہیچ سمجھا ہے۔ چنانچہ اکثر شعراء نے چاند کو مخاطب ہو کر کہا ہے۔ مولانا جامیؒ فرماتے ہیں

عارض تست این یا لالہ احمر تست این
یا شعاع شمس یا آئینہ دل تست این ۔

حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں

حسن تو با ماہ سنجیدم بہ میزان قیاس
پلۂ او برتر آمد و تو ماندی بر زمیں ۔

اردو زبان کے قدیم شاعر سراج الدین خان آرزوؔ نے چاند کو مخاطب ہو کر کہا ہے ۔

آتا ہے مر سحر اللہ تیری برابری کو ،
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو ۔

سید انشاء اللہ انشاؔ نے فرمایا ہے

بال زلف یار کے رخ پر بل کھانے لگے
چشمۂ خورشید میں بھی سانپ لہرانے لگے ۔

میر انیس کہتے ہیں:۔

رخسار کو قمر جو کہوں اس میں داغ ہے ۔
خورشید ہے تو کیا ہے دن کا چراغ ہے ۔

علامہ اقبال مرحوم نے چاند کے حسن سے متاثر ہو کر ہے :-

اے چاند حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے
طوف حریم خاکی ، تیرے قدیم خو ہے
یہ داغ سا جو تیرے سینے میں نمایاں
عاشق ہے تو کسی کا یہ داغ آرزو ہے
میں مطرب زمین پر ، بیتاب تو فلک پر
تجھکو بھی جستجو ہے مجکو بھی جستجو ہے ۔

علامہ اقبال نے چاند کے حسن کی جو تصویر کھینچی ہے ، اس میں ان کی نکھار صاف نظر آتی ہے ۔ لیکن اس میں اتنی جاذبیت نظر نہیں آتی

حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ نے چاند کے حسن کی نکھار کرنے میں استطاعت رکھتے ہیں ، لیکن اس کے حسن کو محبوب کے حسن کے مدمقابل نہیں لا سکتے فرمایا ہے

چنڊ تنھنجي ذات پاڻياں تان نہ پسين سين
تو اچو منجھ رات ، سچڻ منت سوجھود ۔

اے چاند ! تیرے حسن کو میں اپنے محبوب کے حسن کے برابر نہیں سمجھتا
تو صرف رات کے وقت چمکتا ہے ، لیکن میرا محبوب تو ہمیشہ روشن ہے ۔

ایک جگہ چاند کے حسن کو محبوب کے حسن کے آگے اسطرح کمتر سمجھتا ہے ، فرماتے ہیں ۔

پيشاني ۾ پرينءَ جي پلائي جا پيس
اڳ اُهنڌين جي ڏسي پاڻوهي پيس
قمر پاڙي ڪين ، شمس سپرين سين ۔

میرے محبوب کی پیشانی میں نیکیوں کے خزانے ہیں ۔
انکی یہ مہربانی ہے کہ مجھ جیسے منتظر کے گھر میں آنے سے گریز نہیں کرتے ۔
چاند اور سورج کو کیا مجال ہے کہ وہ میرے محبوب کی ہمسری کریں ۔

ایک اور جگہ سر کنبھات میں فرماتے ہیں ۔

چوڏهين چنڊ تون اُپرين سمهين ڪرين سينگار
پلڪ پرياں جي نہ پرين جي ڇيلا ڪرين هزار
جڏہ تون سپ چماءِ ، تڏہ دم دوست جو ۔

اے چودھویں کے چاند تو سو مرتبہ سنگار کرکے آسمان پر کھڑا ہوا لیکن میں تیرے حسن کی نکھار کو محبوب کی ایک ساعت کے برابر بھی نہ سمجھونگا ۔
تیری پوری زندگی ، میرے محبوب کے ایک دم کے برابر بھی نہیں ہو سکتی ۔

ایک جگہ چاند کو مخاطب ہو کر کہتا ہے، اے چاند میرا محبوب راستے میں، جب تک وہ میرے پاس نہ پہنچ جائے تو نہ اُترنا

چنڈ تنھنجي ذات، سب مڙھيان سون سين

آئين پريين پنڌ ۾، ڳڻ سچيائي رات

اچين جنھن ساعت پوءِ لهي وڃ لطيف چي.

اے چاند تیرے وجود کو سونے سے جڑا دوں تو پوری رات روشن رہنا، میرا محبوب راستے میں ہے

جس وقت وہ میرے پاس آجائے پھر تو اُتر جانا

اُردو شاعری میں نظیر اکبرآبادی کو مشرق کا شیکسپیئر سمجھا جاتا ہے۔ ان جیسی منظر نگاری کسی اور اُردو شاعر نے نہیں کی، انہوں نے چاندنی رات کے منظر کو بڑے جاذب انداز سے پیش کیا:

صحن چمن میں واہ واہ زور بچھی تھی چاندنی۔

چاند بلوریں لبتا تھا، اور کھلی تھی چاندنی۔

آیا تھا یار گلبدن پہن کے بادل زری

چمکی تھی تار تار میں مدکی جھمک ذری ذری۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اسی طرح چاندنی رات کا منظر کتنا سنجیدہ اور سنجیدگی سے پیش کیا ہے، جس میں جدت اور خیال آفرینی سے کام لیا ہے۔ سندھ میں شتر سواری ایک روایتی امر ہے۔ شاہ بھٹائیؒ نے اس شعر میں محبت و جذبہ پرور کیفیت بیان فرمائی ہے، اونٹ پر سوار ہو کر بیابان کا سفر طے کر کے محبوب کی مجلس میں پہنچنا ہے۔ فرماتے ہیں:

رات سماڻي پون ڪئين، پنڌ ڏڪو پنڌ

هلندي حبيب ڏي، هرها موڙ نه هنڌ.

پنڌ سوڻي پنڌ، جو پهنچائي پرين ڪي.

سہانی رات ہے، راستہ بھی سیدھا ہے، لیکن بیابان کا دشوار سفر

اے اُونٹ میرے محبوب کی طرف چل اور اپنا رخ نہ موڑ

تو اپنے دل میں وہی خیال رکھ جو جلدی حبیب کی طرف پہنچا دے۔

نظیر اکبرآبادی نے اپنی ایک نظم میں آگرہ کے نزدیک جمنا ندی کے کنارے کا منظر دیا ہے، جس میں لوگوں کا ندی میں تیرنے کا دلکش نظارہ دیا ہے

جب پیرن کی رُت میں دلدار پیرتے ہیں

عاشق بھی ساتھ اُن کے غمخوار پیرتے ہیں۔

بوڑھے سیانے، ناداں ہوشیار پیرتے ہیں

پیر و جوان لڑکے، عیار پیرتے ہیں۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے سرسوہنی میں دریا مناظر اور سوہنی کے تیرنے کا دلکش انداز میں بیان فرمایا ہے

وشن ویٹا ھانگ ، دچین تي ویلا ھوي .

گھڑي گھڑو ھت ھري ، سٹي سا نھوئ پانگ

سیٹي ڈونڈي سانگ ، جتي ساھڑ سیرین .

شام کا وقت گذر رہا ہے ، درختوں پر کلنگ جا بیٹھے ہیں .

سوھنی مغرب کی آذان سن کر گھڑا ہاتھوں لے کر دریا میں کودتی ہے .

وہ ان سب جگہوں کو دیکھتی رہتی ہے جہاں اُسکا محبوب ساتھ موجود رہتا ہے .

بھگت تلسی داس ھندی دوہوں کے خالق سمجھے جاتے ہیں اُنھوں نے اپنی مصنف رامائن میں رام اور سیتا کی محبت کا منظر پیش کیا ہے .

لوچن مگھ رامہ اراآنی دینھی پلک کپاٹ سیان

رام کو سیتا نے اپنی انکھوں میں رکھکر ، اپنی پلکیں بند کر دیں .

بھگت کبیر نے اس کیفیت کو اس طرح پیش کیا گیا ہے

آو پیارے نین ماں ، موند پلک توی لیون

نا میں دیکھوں اُور کو نا توھی دیکن دیون

میرے محبوب تو میرے آنکھوں میں آکر بیٹھ ، اور میں آنکھیں بند کر لوں

تاکہ نہ میں کسی اور کو دیکھوں نہ اور کسی کو تجھے دیکھنے دوں

ایک اور ھندی شاعر نے اس خیال کو اپنی طرز سے پیش کیا ہے [1]

آؤ پریتم نین میں پلک ڈھانپ تو لون

نا میں دیکھوں اور کو ، نا توھی دیکھن دون :

ھندی زبان کے مشہور شاعر ملک جاسی نے بھی اس خیال کو پیش کیا ہے .

نینوں آئتر آئیو نین جھانپ توھی لیون

نا میں دیکھوں اور کو ، نا توھی دیکھن دون

اس خیال کو اکثر فارسی شاعری میں بھی دیکھا گیا ہے . ایک فارسی شاعر نے کہا ہے :-

جانا بیا در چشم من تا چشم را برھم زنم .

نہ من پسینم سوئی کس نہ بکس ترا دیدن دھم .

ایک اور شاعر نے کہا ہے .

جانا بیا در چشم من تا چشم را برھم زنم

ھرگز نہ بیند کس دگر نہ کس ترا دیدن دھم .

منتخب ھندی کلام مقالہ نگار ڈاکٹر جعفر حسین . رسالہ نگار ماہ جنوری ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۵۸ .

فارسی زبان کے ایک مشہور شاعر آذری نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے۔

بیا بنشین بہ چشم نم بیو ساغر

من تو بے نیاز طوبیٰ را غبار توان باید

اس خیال کو جس خوبی سے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اپنے عظیم فن سے پیش کیا ہے وہ میں ادب اور مختصر حروف میں جامع ہے

اکین جہ ڈی ویسہ تہ آءُ واري وچیان

توکي ڈسي نہ ڈیسہ، آءُ ڈسان ھو بیو۔

میرے محبوب تو میری آنکھوں میں آکر بیٹھو۔ تو میں اپنی پلکیں بند کرلوں

تاکہ تجھے جہاں نہ دیکھے اور میں بھی کسی اور کو نہ دیکھ سکوں۔

اردو کے شاعر کاظمی نے شاہ بھٹائیؒ کے اس شعر کا اردو زبان میں اس طرح ترجمہ کیا ہے۔

آنکھوں میں آ بیٹھو ساجن، آنکھیں موندوں میں

تم کو دیکھے پھر کوئی نہ کسی کو دیکھوں میں۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے دوہوں اور ھندی دوہوں، سرائیکی دوہوں میں یکسانیت نظر آتی ہے۔ ان دوہوں میں جو حال بیتی کچھ گئے ہیں

ان میں مماثلت موجود ہے۔ حضرت خواجہ غلام فرید نے سلسانی (سرائیکی) شاعری کو عروج پر پہنچایا۔ صوفیانہ اور مذہبی شاعری کے لئے وہ مشہور ہیں شاہ بھٹائیؒ

کے مداحوں میں سے تھے، اور شاہ لطیفؒ کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔ کہا ہے ،،

کالا گانہیں نکال دوں، اور پی کے رکھ لے جائے۔

پہلے درس دکھائے کے، تو پاچھے لیجئے کھائے

کوے میں اپنی آنکھیں تجھے نکال کے دوں، تو اے میرے محبوب کی طرف لے جا

پہلے انہیں محبوب کا دیدار کرانا، پھر تو انہیں کھا لینا

ھندی زبان کی مشہور شاعرہ میراں بائی نے اس زمین میں کہا ہے

کاڈھ کلیجا میں ھروں کوڈا تو لے جا،

ساجن میڈا دیس بہت ہے، وہ دیکھت تو کھا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے بھی اسی خیال کو بڑے جاذب انداز سے پیش کیا ہے فرماتے ہیں ،،

کیڈي ھانگا تو ڈیان، ھئیون ساڈ ھتن

ویڙي کاڏ ولایت ۾ اگیان سجیسن

پرین ماڻ پچن تہ ھئي قربان عذس ڏي۔

کوے میں اپنے ہاتھوں سے تجھے اپنا دل نکال کے دوں تو اُسے پردیس میں لے جاکر میرے محبوب کے سامنے کھاؤ

تاکہ وہ تجھے پوچھے کہ یہ قربانی کس نے دی

دیوان فرید کلام خواجہ غلام فریدؒ مرتب محمد عزیز الرحمٰن سامیہ بہاولپوری۔

ہزاروں شعراء آج تک پیدا ہوئے ہیں، اکثر شعراء نے محبوب کا وصال اور ہجر کی کیفیت کو بڑے دلسوز انداز میں بیان کیا ہے وصل کے لئے موت کو ترجیح دی
اُردو کے مایہ ناز شاعر سید ظہور الدین شاہ حاتم نے اس خیال کو اس طرح پیش کیا ہے۔

ہجر کی زندگی سے مرگ بھلی
کہ جہاں سب کہتے ہیں وصال ہوا

شاعر نعیم نے کہا ہے:

کہتے ہیں مرگ کو وصال نعیم
نہ ہوا وصل تو ہم نے مر دیکھا

اردو کے ایک اور شاعر نے بھی اپنی اس جذبات کو اس طرح پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں:

مرنے کو بھی لوگ کہتے ہیں وصال
یہ اگرچہ سچ ہے تو مرجاتے ہیں ہم۔

محمد حفیظ جونپوری، جو حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ انکا کلام سوز و گداز سے لبریز نظر آتا ہے۔ اس خیال کی زمین میں کہتے ہیں

نہیں مرتے ہیں تو ایذا نہیں جھیلی جاتی
اور مرتے ہیں تو پیمان شکنی ہوتی ہے۔

شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی نے بھی اس طرح اپنے خیالات پیش کیئے ہیں:

موت کو اصل دل سمجھتے ہیں
زندگانی عشق کا آغاز

مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد نے کہا ہے

کون مرتا ہے کون مرتا ہے
موت جو ہے وہ فقط ہے ایک حجاب۔

منشی برج نرائن چکبست نے کہا ہے:

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشان ہونا۔

شیخ عبداللطیف تپش نے کہا ہے:

آرزو میں موت کی مرتا ہوں میں زندگی میری فنا آغوش ہے۔

اُردو کے شعراء نے اس خیال کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جذبات کی پاکیزگی جو شاہ بدایونی نے پیش کی ہے وہ ملاحظہ ہو،

جی قیامت تک تو کر اودا سپیرین۔
تھان پری سچ، واذایوں وصال جون۔

اگر قیامت کے دن بھی دوست کا وصال ہوا تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی لیکن وصل موت تو نہیں ہے وہ تو قیامت سے بھی دور ہے

اس مستعار زندگی کے لئے حضرت خواجہ حافظ شیرازیؒ نے فرمایا ہے۔

جگر نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

نظیری نے کہا ہے۔

روزم تو بر فروز و شبم را تو نور دہ
ایں کار بیت کار مہ و آفتاب نیست

صائبؔ نے کہا ہے۔

ماہ ہر چند خوش آیندہ نہ باشد در رو نہ
حسن مہتابی دلدار تماشائی کرد۔

خواجہ میر درد نے اپنی جذبات کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔

موت کیا آکے فقیروں سے تجھے لینا ہے
مرنے سے پہلے ہی یہ لوگ تو مرجاتے ہیں۔

مرزا اسد اللہ غالبؔ فرماتے ہیں

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی۔

شاہ بھٹائیؒ اس جذبات کی ترجمانی یوں کرتے ہیں۔

مرڻا اڳي جي مڻا، مري ٿين نہ مات
موندا سے حیات، جیئا آگي جي جیئا

موت سے پہلے جو مرجاتے ہیں وہ مرتے نہیں۔ وہ ہمیشہ زندہ رہینگے جو کہ حیات سے پہلے زندہ تھے۔

انسان کی فانی زندگی پر کوئی اعتبار نہیں۔ شاعر کی اصطلاح میں زندگی ایک پانی کے بلبلے کے مثل ہے۔ آب کا سایہ "ہوا" کے ایک جھونکے سے ختم ہوجاتا ہے۔ اکثر شعراء نے اس خیال کو موضوع کیا ہے۔ اور انسان کو خبردار کرتے ہیں کہ اس عارضی زندگی پر اعتبار نہ کیا۔ ملک کبیر ہندی زبان کے قدیم شاعر تھے، کہا ہے۔

پانی کیرا بلبلا اس مانس کی ذات۔
دیکھت ہی چھپ جائیگی جیوں تارا پربھات۔

انسان کی زندگی پانی کے بلبلے کی طرح ہے
جو دیکھتے دیکھتے صبح کے ستارے کی طرح گم ہو جاتا ہے۔

خواجہ میر درد اردو زبان میں صوفی شاعر تھے۔ فرماتے ہیں۔

مانند حباب آنکھ اے دردؔ کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا۔

ایک شاعر نے انسانی زندگی کی بے ثباتی پر تشبیہ پیش کی ہے

آدمی بلبلہ ہے پانی کا کیا بھروسہ ہے زندگانی کا۔

مرزا غالب نے خوب کہا ہے:۔

محیط دہر میں بالیدن از ہستی گذشتن ہے

کہ یاں ہر ایک حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے۔

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ نے زندگی کو حباب سے تشبیہ دی کر پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں

ھرنی تو نو ھئیں، لھرن لگندی اڈ تئی۔

تون پڻ آھین تئین، دنیا جی کو ڈینھن ڏو۔

پانی پر مسطرح بلبلہ ہوا کے جھونکے لگنے سے ختم ہوجاتا ہے اے انسان تو بھی اس حباب کی طرح دنیا میں چند روز کے لئے ہے

زندگی اور موت کی حقیقت کے فلسفہ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے، دنیا کے شعراء نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اس فلسفہ کو سمجھانے میں قاصر رہے ہیں، میر انیس یہ کہکر خاموش رہے ہیں

خاموش کہ یہاں سخن کو بھی راہ نہیں۔

مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں۔

تو ازاں روزی کہ در ہست آمدہ۔

اتشی یا خاک یا بادی بدی

از مبدل ہستی اول نماند ہستی بجائے او نشاند

این بقاہا از فناہا یافتی، از فنا ہم رو چرا برتافتی۔

در فناہا این بقاہا دیدہ بر بقائے جسم چون چسپیدہ

حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں:۔

این جان عاریت کہ بحافظ سپردہ دوست

روزی بینم آورا، تسلیم وی کنیم

یہ مستعار جان جو حافظ کو دوست نے سپرد کی تھی، ایک دن اسکو دیکھتے دیکھتے دوست کو واپس کردونگا۔

عرفی فرماتے ہیں

مشورہ شدہ از خواب عدم چشم کشودیم

دیدیم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم۔

مرزا غالب نے کہا ہے:۔

فنا کو سونپ مشتاق ہے اپنی حقیقت کا

فروغ طالع خاشاک ہے گلخن پر۔

شاہ بھٹائیؒ کا تخیل ملاحظہ ہو فرماتے ہیں :-

او نجو اُتاھون گھٹو، جیئڻ کي جبل

مرڻ موں سنو هل، پنڌ تو پنڌ هريان.

"پہاڑ کی اونچائی زندہ رہنے کے لائق ہے۔ اے موت تو میرے ساتھ چل میں تیری پیٹھ پر سوار ہو کر چلوں۔"

مرزا غالب فرماتے ہیں :-

ہوں خراب اگر غم ہی دیکھ لو دو چار

یہ شیشہ و قدح و ساغر و سبو کیا ہے۔

شاہ بھٹائیؒ نے اس خیال کو مرزا غالب سے پہلے پیش کر چکے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

گھٹن ۾ گھٽجن، وٽيون پيين وه گاڏيون.

برخبر بدمه ساقي پيار کي پيرين

پڪين نہ پرچن مٽ ڏکياڻن منجهان.

حکیم امت اور شاعر فطرت علامہ اقبال اس قبل میں فرماتے ہیں :-

وہ فریب خوردہ شاہین جو بلا ہو کر گسوں میں

اُسے کیا خبر کہ کیا ہے وہ رسم شاہبازی

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں :-

مائٽ چوٽو جن جو هنج حضور سي،

چڙي چهنب مٿي ڀيي کين نہ اڀي

لوڪ نہ لکياڻي جهو، پشن پکين گڏ يا.

جنس پرندے کی غذا سچے موتی ہوتی ہیں وہ کیچڑ میں چونچ ڈال کر پھل نہیں کھاتا۔

دوسروں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ کس جگہ پر وہ جمع ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال نے عبادت اور شان کریمی، اپنی حالت کو عرق انفعال کہا ہے جس کے لئے کہا ہے۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے

قطرے جو تھے میرے عرق انفعال کے

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اپنی پوری زندگی کو (کچھ) کچا شیشا سمجھا۔ آپ نے اپنی عبادت کرنے میں بڑی انکساری سے کام لیا ہے۔ پوری زندگی کی عبادت کو اپنے رب کے سامنے پیش کرتے ہوئے بہت شرم محسوس کرتے ہیں کہ میری عبادت اللہ پاک قبول فرماتے ہیں یا نہیں۔ لیکن پھر بھی ناامید نہیں ہوتے کیوں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے تو کچھ نہیں تھا ہی قبول فرمائے ورنہ موتی ہی واپس کر دیں

فرماتے ہیں :-

اکیو کائو شیح ماشکن موت ڈي.

پلٹ پايو سچ . اپينءِ ڀچ مران .

رب پاک کے ہاں قبول ہو تو کچا شیشہ بھی قبول ہوتا ہے ، ورنہ سچے موتی بھی واپس ہوتے ہیں .

میں اپنی سچی عبادت کو اللہ تعالیٰ کے آگے پیش کرتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہوں .

مرزا اسد اللہ غالب دوست کی رضامندی اس بات میں دیکھتا ہے کہ وہ انہیں ہر وقت یاد رکھے جیسے پروانہ شمع کا شیدائی ہے ، اس لیئے شمع بھی اس کی حالت پر رات سے لیکر سحر تک جلتی رہتی ہے . مرزا غالب نے فرمایا ہے :-

پروانہ کا نہ ہو غم تو پھر اس لئے اسد ،

ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

لیکن اس زمین میں حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کا تخیل کتنا بلند ہے . وہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کو اپنے سامنے رکھتے "فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ"

تو جنجن ڀي تانت، تن پڻ آهي تنهنجي .

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ، اي ڀروڙج ٻات

"جن کو تجھے یاد ہے ، اُن کو تیرا بھی یاد ہے . تو مجھے یاد کر ، تو میں تجھے یاد کروں یہ بات سمجھ لے"

وفاداری ایمان کا جز ہے . انہیں ہمیشہ دوست سے ملنے کی تمنا رہتی ہے جس کے لئے وہ کوشاں رہا ہے . مرزا رفیع سودا نے کتنی عمدہ مثال دی ہے :-

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن

بازی اگرچہ پان سکا ، سر تو کھو سکا

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشقباز

اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا .

خواجہ میر دردؔ نے اس خیال کو یوں پیش کیا ہے :-

مثل حباب کہ نظر سے گیا گیا ،

میں وہ غریق ہوں کہ نہ ڈوبا اچھل سکے .

شاہ شاہؒ فرماتے ہیں :-

اول آخر آهه هلڻ منهنجو موت ڈي ،

پو رهيو هن پورهيت جو والي ڪيم وڃاءِ

سو هون ڏوريو لاهه تہ جيئري ملان جت کي .

اول اور آخر مجھے اپنے دوست کی طرف جانا ہے

اس محنتی کی محنت کو میرے مالک ضائع نہ کردیں

میں اوپر سر کی نظر کرتا کہ میں اپنے محبوب سے جا کر ملوں

جب دوست روٹھ جائے تو اسکے منانے کے لئے بڑی منت و حمایت کرنی پڑتی ہے۔ خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں :-

اے شب بیا تا در چمن سازیم پر پیمانہ را تو شمع و گل را داغ کن من بلبل و پروانہ را

پروانہ، شمع و گل و بلبل جمع اند اے دوست بیا رحم بہ تنہائی ما کن۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ نے سرسوہنی راگ میں محبوب کی جدائی کے جذبات کو بڑی رقت آموز انداز میں پیش کیا ہے۔

سر سوہنی گھوٹیو، چتا ساٹھ رسدائی۔

منصبی مبت میندرا توں عاقل اکلائی،

لیبنج لطیف جی، مسمنی کامل سچائی۔

ھر معاف مائی تہ سودا سکیائی ثیان۔

اے! راز غم کو چھوڑ دے مجھ سے روٹھ نہ جا بخش دے میری خطاؤں کو تو سمجھدار ہے

میری خطاؤں سے درگذر ہو جا، میری تقصیر معاف کر، تو مجھے معاف کریگا، تو مجھے سکون ہو جائے گا۔

پروانہ، شمع کی روشنی پر فدا ہوتا ہے، جب تک خود کو شمع کے شعلہ میں جلا کر ختم نہیں کرتا، تب تک اسے سکون نہیں ہوتا صوفی شعراء پروانہ کو سچے عاشق سے تشبیہ دیتے ہیں، جو محبوب حقیقی کے نور میں خود کو نابود کرتے ہیں۔ پروانہ شمع کا عاشق اپنی تقصیر میں تغیرات کی صورت پنہاں رکھتا ہے اس کی زندگی کا سبب اس کی موت کا باعث ہے۔ ظاہر میں آنکھ اس راز کو نہیں سمجھ سکتی کہ پروانہ کی فنا میں، اس کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس لئے افسوس ہوتا ہے کہ اگر پروانہ شمع کے حسن کا شیدا نہ ہوتا۔ اگر شمع تک اس کی رسائی نہ ہوتی تو بیچارہ ناحق اپنی جان کیوں دیتا اس کی موت کا الزام ہے پروانہ کی طاقت پرواز پر یہی طاقت پرواز ہے جو اسے معشوق کا قرب مہیا کرتی ہے، اور اس کی ہلاکت کا ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ خواجہ میر درد کی ایک غزل ہے۔

کاش تا شمع نہ ہوتا گزر پروانہ تم نے کیا قہر کیا بال و پر پروانہ

شمع کے صدقے تو ہوتے اسے دیکھا تا بھی پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثر پروانہ

کیوں اسے آتش سوزاں میں لئے جاتی ہے سوجھتا بھی ہے تجھے کچھ نظر پروانہ۔

ایک ہی جست میں لی منزل مقصود اسنے راہرو رشک کی جا ہے سفر پروانہ۔

شمع تو جل بجھی اور صبح نمودار ہوئی پوچھوں اے درد میں کس سے خبر پروانہ۔

پروانہ اپنی منزل سے باخبر ہے اور منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن ایک ہی جست میں اس کی مشکل آسان ہو جاتی ہے، تب اسی مشاہدہ میں گذرتی، صبح کو نہ شمع تھی نہ پروانہ۔ شمع تو جل بجھی اور پروانہ کی خبر کسے معلوم۔ میر تقی میر نے خوب کہا ہے :-

جوں شمع صبح گاہی اک بار بجھ گئے ہم

اس شعلہ خو نے ہم کو مارا جلا جلا کر

ایک اور جگہ فرمایا ہے

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب

شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا۔

مرزا محمد رفیع سودا نے فرمایا ہے :-

پروانہ اور شمع کی الفت نہ مجھ سے پوچھ
اپنی نہ کہہ سکا تو کہوں کیا پرائی بات

ظہور الدین حاتم فرماتے ہیں :-

جلتا لگن میں شمع صفت سخت کام ہے ۔
پروانہ جوں شدنا سے عبث جی دیا تو کیا ۔

حفیظ جونپوری کہتے ہیں :-

تیرے آگے یہ پتنگے گرے گرد شمع جل کر
دل بیوفا کا کبھی رکھ کے جام لینا ۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس خیال کو اپنے صوفیانہ نظر سے بڑے موثر انداز سے سر بعن کلیان میں دیا ہے :- فرماتے ہیں :-

پُنڑ پتنگن کی ، سندیون کامڻ خبرون
آئیو وِجھن اَگ ۾ ، جیئَ ینصنجو جي ۔
جیئرپ جنین کي ۔ سگا نینرا نیه جا ۔

" پتنگے سے پوچھو جلنے کی خبریں ، وہ آگ میں آکر اپنی جان ڈال دیتے ہیں ۔ انکو تو حیات میں محنت سے نبھ گئے ۔"

پتنگ چائین پاڻ کي ، تہ اپي آگ اُجھاءِ ،
پچڻ گهڻا پسچايا ، تون پچڻ کي نہ پچاءِ ،
واقف ٿي وساءِ ، آگ نہ ڏيج عام کي ۔

تو اگر اپنے آپ کو پروانہ کیلا تا ہے ، تو اگر آگ کو بجھادے ، آگ نے تو سب کو جلایا ہے ، تو اگر خود آگ کو بھی جلا دے
خاموش رہ کر عشق کے راز کو سمجھ عام کو اس راز سے واقف نہ کر ۔

پتنگ چائین پاڻ کي ، تہ جيري پوءِ جاڻي
تان تان تاڻي تو ڏي ، جان آگ نہ اُجهاڻي
ديئہ وهاڻي ، آگ نہ ڏجي عام کي ۔

تو اگر اپنے کو پروانہ کیلا تا ہے ، تو آگ کی طرف جان توڑ کر بڑھ ، تب تک آگ کی طرف بڑھتے رہو جب تک آگ بجھ نہ جائے ۔
اس پر اعتبار کرو اور اپنے راز کو عام سے واقف نہ کر ۔

انسان اپنی جنت سے آگے نہ بڑھے ، انکو اپنی ہمت سے دنیا کے تلخ واقعات اور مصائب سے مقابلہ کرنا چاہئے ، کیوں نہ مکتب میں کوئی کسی کا ساتھ ہی دیتا

اُردو کے مشہور شاعر شیخ امام بخش ناسخ نے خوب کہا ہے :-

صید عشق میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انسان سے ہوتا ہے ۔

ایک فارسی شاعر نے اس خیال دیا ہے :-

بوقت تنگ دستی آشنا بیگانہ می گردد

صراحی چون شود خالی، جدا پیمانہ می گردد

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں :-

سوکي پائين سچو، اوکي تون ئي تون

مولا مٿان موت پيرو لاهه ۾ پاجهه جو .

چیز آسان ہر ایک اپنی طرف سے سمجھتا ہے اور مشکل خدا کی طرف ، اے میرے خدا میرے اوپر رحم کی نظر نہ اٹھا دے

دوست کو اپنے گھر میں دیکھکر مرزا غالب کہتے ہیں :-

وہ آئے گھر ہمارے خدا کی قدرت

کبھی انکو کبھی ہم اپنے گھر کو دیکھتے ہیں .

سر کاموڈ میں شاہ بھٹائی فرماتے ہیں :

گند جنين جي گوڻ پا پوڙا پوشاڪ

انهن جي اوطاق راجا ريجهي آيو .

ماہ گیر جن کے تہہ بند میلے اور انکی پوشاکیں کیں کے لبنے ہیں. انکے گھر میں راجا راضی ہوکر آئے

ولی دکنی کے زمانہ میں شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کی شاعری شباب پر تھی ، جو آج تک شباب پر ہے اور اسے زوال نہ ہوا لیکن ولی کی شاعری سے دلی کے شعراء نے اردو شاعری کی بنیاد رکھی، انکا کلام ہر لحاظ سے قابل قدر اور مقبول عام ہے ، خیالات کی پاکیزگی اور شستگی موجود ہے ، ایک جگہ پر محبوب کی محبت میں سب کچھ قربان کرنے کا ذکر کیا ہے ، سب کچھ لٹانے کے بعد دوست کے دروازہ چھوڑنا گوارا نہیں کرتے ، کہتے ہیں .

دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے

زخمی ہے، شکار کیونکہ جاوے

دشمن دین کا، دین دشمن ہے

راہزن کا چراغ ، رہزن ہے .

شاہ عبد اللطیف بھٹائی جس خوبی سے اس خیال کو پیش کرتا ہے وہ آپکے کلام کا اعجاز ہے :-

جت جي ميدان ۾، ڪي پتراڏو پٽ

سر سوري، ڏڙ ڪنڪرين، متان هيچين هٽ .

عشق نانگ نپٽ، خبر ڪاڏن ڪي پوي .

محبت کے میدان میں دل کو صداقت بازگشت کر جبکہ سر سولی پر ہو اور جسم پتھروں اور کنکریوں پر ، سر کٹنے پر کف نہ کرنا

عشق خطرناک سانپ ہے ، جسکو اس نے ڈسا ہے اس سے جاکر خبر لے

محبوب حقیقی کی طرف سے جو بھی حاصل ہو اس پر شکر کرنا لازمی امر ہے ، سالک و بزرگ کا سر جھکجاتا ہے بھگت کبیر کہتے ہیں .

سمرن سرت لگائے کے مکھ سے کچھ نہ بول

باہر کے پٹ دیئے کے، اَنتر کے پٹ کھول

(خدا کی (سرت) سمجھ رکھ، مگر زبان سے کچھ نہ بول۔ باہر کے دروازہ بند کرکے اندر کے دروازہ کھول دے)

علامہ اقبالؒ اس مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر

کہ زہر بھی کرتا ہے کار تریاقی۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اور علامہ اقبال مرحوم کے پرواز فکر کا مقصد ایک ہے۔ مگر ان کی انداز بیان مختلف ہیں شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں عجز و نیاز صبر و تحمل ہے جو کہ اُنکی شاعری کا بڑا جز ہے۔ شاہ بھٹائی فرماتے ہیں۔

پریان سندي پاس جي مٺي مٺائي۔

حافيءَ حڙائي چکين جي چيت ڪري۔

(محبوب کی طرف سے جو بھی حاصل ہو وہ مٹھائی ہے۔ وہ کڑوی ہیں ہے جس نے چکھ لی اس نے لذت حاصل کی)

دوسری جگہ صبر کرنے کا انتہا سبق دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

نسائين کان نيمن، سک منجا سپرين

سٽي سارو ڏينهن، باهر پاڻ نہ نکري۔

(محبت سیکھنی ہے تو کنہار کی آواز سے سیکھ وہ سارا دن ملتا رہتا ہے، لیکن دھواں باہر ہی ہوتا)

سالک کے یہاں خدا تعالیٰ کا نام ہمیشہ ورد زباں ہوتا ہے سوائے خدا تعالیٰ کی عبادت کے اور کوئی بات اُنہیں نہیں موافق۔ سوگند کبیر کہتے ہیں۔

نام بھجو، من کرو بھی بات سے تنت

کاہی کو پڑھ بیچ، مرد کوئن گیان گرنتھ۔

(خدا تعالیٰ کا نام یاد رکھو اور دل کو قابو میں رکھ یہ ہی جھوٹے کتاب پڑھنے سے کیا حاصل ہوگا)

شاہ صاحب کہتے ہیں۔

اگر پڑھو الف جو ورق سپ وسار

آندر سو اجار، پنا پڑھندين ڪيترا۔

(الف کا حرف پڑھ اور دوسرے اوراق بھول جا۔ اپنے وجود کو صاف کردے۔ ایسے کاغذ کتنے پڑھو گے)

ایک اور جگہ پر فرماتے ہیں۔

سامٺ نہ سامين، الف جنهن ي اڳ ڇ

ناحق نماين پنا پيا پڙهڻ لاءِ۔

اس سطر کو یاد نہیں کرتے، جن کا پہلا حرف "الف" ہے

دوسرے اوراق پڑھنے کا قصد کیوں کرتے ہو۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے اس قبیل میں فرماتے ہیں :-

صد کتاب و صد ورق در نار کن

روئے دل را یک دمے بیدار کن ۔

بھگت کبیر حکیم کے متعلق کہتے ہیں

کبیرا بید بلائیا، پکڑ کے دیکھے ہاتھ

بید نہ بیدن جانئے، کرک کریجے ماتھ

(کبیر تو نے حکیم کو بلایا وہ نبض دیکھکر مرض کی تشخیص کریں، لیکن حکیم کو کیا خبر کہ درد دل میں ہے)

شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں

آج پڑ ھوڑی ہانھ دایو وڑکیو منھن ۔

ویج ورائی ہانھ چوریو، چاھ چکائیا ۔

(آج ہی زخمی کے جھونپڑی سے آہ و فغاں ہونے لگی، حکیم نے بازو پکڑا کر دیکھا کہ وہ درد تو دل کے غم کی ماری ہے)

اردو کے مشہور شاعر نذیر الہ آبادی دین کے لئے کہتے ہیں :-

دین ہوتا ہے بزرگوں کے نظر سے پیدا

شاہ بھٹائیؒ نے کہا ہے :-

ھوڑین کتابن ۾ حرف مڙوئي ھڪ

جي نظر، تو نيڪ تہ بسم الله ئي بس ئي.

(فروڑیں کتابوں میں حرف ایک ہی نظر آتا ہے ۔ اگر تیری نظر نیک ہے تو بسم اللہ ہی کافی ہے)

ظفر علی خان خوبؔ نے کہا ہے :-

جو نکتہ وروں سے کھل نہ سکا، جو فلسفوں سے حل نہ ہوا ۔

وہ راز اک کملی والے نے، بتلا دیا چند اشاروں میں ۔

اس قبیل میں شاہ بھٹائیؒ نے فرمایا ہے

هنن قدوري قافيه، هڪڙين ڪونہ پڙهيوم

جتان پرين لڏوم، اوپاڙو ئي ڪو پيو.

(فقہ کی کتابیں اور قافیہ پیئے کبھی نہیں پڑھے ۔ جہاں سے میرے محبوب نے ہجرت کی وہ کھائی اور ہے)

عشق ایک عام انسانی جذبہ ہے، جس سے ہر دل آشنا ہے ۔ عشق حقیقی بہت نایاب ہے ۔ ہر شخص کے بس کی بات نہیں بہت کم لوگ ہیں جو اس سے باخبر ہیں، اس لئے جن اشعار میں عشق حقیقی پنہاں ہے، وہ زود اثر نہیں ہوتے ۔ لیکن پاکیزہ جذبات کا اثر عوام پر بہت جلدی ہوتا ہے کیوں کہ عشق حقیقی کا مرتبہ عشق مجازی سے بلند تر ہوتا ہے ۔ اردو شاعری میں اسکی چاشنی موجود ہے ۔ لیکن جو اثر شاہ لطیفؒ کے پیغام سے ہے وہ انفرادی ہے ۔ عشق ہے پھر سب کچھ ہے، دین بھی ہے تو ایمان بھی ۔ اگر عشق نہیں ہے تو پھر مسلمان بکفر ہے ۔ علامہ اقبالؔ مرحوم فرماتے ہیں ۔

اگر ہے عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی

نہ ہو تو مرد مسلمان بھی کافر و زندیق

عشق حقیقی کی پہلی شرط ہے عبادت الٰہی، جس میں دل کی حضوری ہو۔ لیکن عبادت کے علاوہ ایک اور عشق کا قسم ہو۔ شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں

روزہ و نمازون اي پڻ چگو ڪم

اوهو پيو قسم، جنهن سان پڻ پرين جو۔

(روزہ اور نماز ادا کرنا تو فرض ہے اور ضروری امر ہے، لیکن وہ کوئی اور قسم ہے جس ذریعہ محبوب کا دیدار ہو)

علامہ اقبالؒ مرحوم نے اس ملا جس کے دل میں غیر ہوتا ہے، اس کی تصویر کھینچی ہے:۔

مسجدوں میں مرثیہ خواں ہیں کہ غازی نہ رہے۔

یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

منهن ۾ موسيٰ جهڙو، اندر ۾ ابليس

اهڙو خام خبيث ڪيئن ڇوڻ پوراڪرين

(صورت تو حضرت موسیٰ جیسی ہے لیکن دل میں ابلیسیت ہے ایسے خام اور خبیث کو ٹکڑے کیونکر کرو)

اس خیال کو حافظ شیرازیؒ نے فرمایا ہے:۔

واعظين چون جلوه بر محراب و منبر مي کنند

چون به خلوت مي روند، آن کار ديگر مي کنند

علامہ اقبالؒ نے اس خیال کے پیش نظر حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور آذر کو رکھا ہے۔ لیکن شاہ لطیفؒ کا رنگ کچھ اور ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں،

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے۔

ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنا لیتی ہے تصویریں

شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں

ان پر نہ ايمان جئن حلمي گو هوتا ڀڻن

دغا تنهنجي دل ۾ شرڪ ۽ شيطان

منهن ۾ مسلمان۔ اندر آذر آهين۔

(اس پر ایمان نہیں ہے جیسے تو اپنے آپ کو کلمہ گو کہلاتے ہو۔ تیرے دل میں دغا ہو اور شرک و شیطانیت سمائی ہو)

(صورت میں تو مسلمان لگتے ہو لیکن اندر میں آذر ہو۔)

شعراء کرام کے یہاں محبوب کی طرف پیغام بھیجنے کا تخیل بھی عجیب ہوتا ہے۔ کوئی صبا کو پیغامبر بناتا ہے، کوئی کبوتر کو، کسی کو چمن کی خوشبو یا ندی کے بہاؤ کو لیکن حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اس تخیل میں بھی وطن پرستی کو مقدم جانا، اور کوئل کو پیغام رساں کر کے محبوب کی طرف بھیجتا ہے، کوئل خالص دیسی پرندا ہے:۔

مرزا مظہر جان جاناں اپنے محبوب کا پیغام صبا سے حاصل کرتا ہے۔ جس میں چمن کے پھولوں کی خوشبو رچی بسی ہے فرماتے ہیں:۔

اس گل کو بھیجتا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ۔
اس واسطے نگاہوں، چمن کی ہوا کے ساتھ۔

عرب کے مشہور شاعر مسلم بن ولید نے اپنے محبوب کی تلاش میں فرات ندی کے پانی سے دریافت کرتا ہے۔ کہتا ہے:۔

یا لیت ماء الفرات یخبرنا — این توات با هلها السفن
ما احسن الموت عند فرقتهم — واقبح العیش بعد ما ظعنوا۔

اے فرات کے پانی مجھے خبر دے کہ میرے محبوب کی ناؤ کون سے شہر کو گئی۔ ان کی جدائی میں موت کتنی میٹھی لگ رہی ہے۔ ان کی جدائی نے زندگی زہر کر دی ہے۔

حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں:۔

صبا وقت سحر بوئے زلف یار می آورد
دل شوریدہ ما را بلو در کاری آورد۔

(صبا، صبح کے وقت محبوب کے زلفوں کی خوشبو لے کر آتی ہے تو میری بیقرار دل کو نئی زندگی اور تازگی دے کر کام پر لگا دیتی ہے)

خواجہ میر دردؔ اس خیال کو بڑے جاذب انداز میں پیش کرتا ہے:۔

پھرتی ہے میری خاک، صبا در بدر لیے۔
اے چشم آشکبار یہ تجھ کو کیا ہوا۔

مرزا غالبؔ نے کہا ہے:۔

پھر تیرے کوچے کو جاتا ہے خیال
دل گم گشتہ مگر یاد آیا۔

شاہ بشاقیؒ نے کس خوبی اس خیال کو پیش کیا ہے اور کوئے سے اپنے محبوب کی خبر پوچھتا ہے۔

پرین جی پردیس یہ تنی جانگا کج خبر
تہ سب مٹھاہیاں سون سین پکی تنصجا پر
گھمی مٹان گھر ڈج پاڑنیا پرین کی۔

کوا۔ میرے محبوب جو پردیس میں ہیں۔ انکی خبر بتادے۔ تو تیرے پَر اور پرندے سب سونے سے جڑادوں
محبوب کے گھر کے اوپر گھوم کر، انکو میرا پیغام دیدے

اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس عظم وعالیٰ ہے ولی دکنی اپنے حمدیہ کلام میں حمد و توصیف کرتے ہیں:۔

الٰہی یا الٰہی تجھ سا ہے جگت کی بادشاہی
ولی ہے یو سبب خالی بہانہ
اُسی کا کام ہے دنیا دلانا۔

شاہ بھٹائی ؒ کے حمد و توصیف میں نازک خیالی اور اسلوب بیان ولی دکنی سے بہتر نظر آ رہا ہے فرماتے ہیں :۔

اللہ جئین نالو، تئین سون وڈو آسرو

خاوند تنھنجي کا نہ جو پرو پانہ نہ کو .

نالو رب سندو، رھيو آھم روح ۾ .

یا اللہ جتنا تیرا بڑا نام ہے، اتنا ہے مجھے بڑا آسرا ہے خالق تیرے صبر کی کوئی انتہا نہیں ہے نہ کوئی نشان

میرے رب تیرا ہی نام میری روح میں بسا ہوا ہے

علامہ اقبال نے حمد و نعت میں خالص اخلاقی حقائق اور نکات خوبصورت انداز میں بیان فرمائے ہیں ، خدا تعالیٰ اور انسان کے باہمی روابط کے متعلق کہا ہے

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا

مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا .

اس کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن

زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا .

فارسی زبان میں بڑی بڑی خوبصورت نعتیں کہی ہیں ۔اور بعض نعتیہ کلام تو ضرب المثل ہیں . مثال

تا حشر اے دل ارتنا گفتی ھمہ گفتی چو مصطفیٰ گفتی .

بصورت تو بتے کمتر از بت خدا .

ترا کشیدہ و دوست از قلم کشیدہ خدا .

یعنی تو اردو میں میر، سودا ، خواجہ میر درد اور دوسرے کلاسیکی شعراء نے عمدہ منقبت اور نعت کہیں ہیں لیکن ظفر علی خان کا یہ مطلع تو خواص اور عام کی زبان پر ہے جو بہت مشہور ہے .

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

اک روز چمکنے والی تھی ، سب دنیا کے درباروں میں .

شاہ لطیف بھٹائی ؒ کے کلام میں ہر جگہ حمد، نعت، مذہبی، اخلاقی، ناصحانہ حقائق اور نکات ایسے خوبصورت انداز سے ملتے ہیں جن کا بدل کسی اور شاعری میں نظر نہیں آتا ۔ شاہ بھٹائی کا کلام اپنی افادیت کی وجہ سے کامیاب ہے پورا کلام حمد و توصیف سے بھرپور ہے :۔

جيڪي منجھ جھان، سو تاريءَ تگي تنھنجي

لطف ۾ لطيف چي، قوت ڪمي ڪانہ

عدل چئان آءِ نہ ڪو ڦيرو ڪيج فضل جو .

جو کچھ بھی اس جہان میں کل موجودات ہیں ، وہ تیرے ہی سہارے پر چلتا ہے

شاہ لطیف کہتا ہے ، یا رب تیرے لطف و کرم کی کوئی کمی نہیں ہے

اگر انصاف فرمائیں گے تو میں گنہگار بچ نہ سکوں گا ۔ علاوہ فضل و کرم کی نظر کے .

اردو شاعری میں اکثر تشبیہ و استعارہ افراط سے نظر آتے ہیں، مبارک علی خان آبرو تو اردو شاعری میں تشبیہ اور استعارہ کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے ان کی شاعری بڑی جاذب ہے آبرو کے غزل میں تشبیہ کے علاوہ ایہام اور رعایت لفظی بھی موجود ہے۔

عزت ہے جوہری کی جو قیمتی ہو جوہر
ہے آبرو ہمیں کوں جگ میں سخن ہمارا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام میں جو تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور ایہام نظر آتے ہیں وہ مشکل سے کسی شاعر کے کلام میں نظر آئینگے فرماتے ہیں۔

جھوٹ نہ سچائی، سچ کی دیکھ تنہیں وت
امل کی اَدھری، پاٹان ھٹندا پت۔
مھر تنہیں وت، مَٹ بی پاکو پاہیں جا

جو سچ کو سمجھ نہ سکے ان کی صحبت میں نہ بیٹھو۔ جو اس انمول چیز کو توڑ کر زمین پر مارتا ہے (برباد کرتا ہے)
جو اس انمول چیز کی قدر کرتا ہے، ان کے پاس ہی محبت ہوتی ہے

اشرف خان غفار، اردو زبان کے اولین شعراء میں سے تھے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز کی خاص کیفیت پائی جاتی ہے، اور کلام میں صبر اور شکر کے جذبے موجود ہیں کہتے ہیں۔

مجھ سے جو پوچھتے ہو حال شکر ہے
دن بھی گذر گئی۔ وہ بھی گذر گئی۔

شاہ صاحب صبر و شکر اور تقدیر کے قائل تھے۔ محبوب کے لطف و کرم کو اپنے لئے عام سمجھتے تھے فرماتے ہیں

نہ جاتی نہ جانہ، نہو ڈوہ قلم جو۔
انگ آئیتی لکیو، جت نہ رسی پانہ
عنصن کی ذیاۃ مانہ، قضا قلم جا بو۔

نہ کاتی کا نہ کاس کا کوئی دوش ہے نہ ہی قلم (تقدیر) کا۔ میری تقدیر وہیں لکھی گئی جہاں کو میں نہیں چلتا
کسی جا کر کیوں میری تقدیر قضا کے قلم نے لکھدی۔

چودھویں کا چاند اپنے آب و تاب سے جلوہ افروز ہے، ستارے اس ماہتاب کے حسن کا تاب نہ لا کر فلک کی نیلی چادر میں چھپ جاتے ہیں۔ مگر فراق و درد کا ستایا ہوا نالہ کش یہ رہا ہے۔ اس یاس کی تصویر اردو کے مشہور شاعر تنویر نے اس طرح کھینچی ہے:۔

یہ ستارے ہیں موتیے کے پھول کسکی مالا خزاں میں ٹوٹ گئی
چاند ٹیکا ہے کسکے ماتھے کا، رات کسکا سہاگ لوٹ گئی۔

آنکھوں سے آنسوں کے دھارے جاری ہیں لب نالاں، فراق کی رات، پریشانی اور اداسی، ہر طرف سے نا امیدی نظر آ رہی ہے، حسرت و یاس، آتش فراق میں جلیل دل جذبات و احساسات سے متاثر ہو کر شاعر لکھنوی کہتا ہے:۔

کر دیا دل کو تیرے درد نے نازک ایسا
سانس بھی لی تو نکل آئے ہمارے آنسو۔

محبوب کے فراق میں رونے روتے رات ختم ہوگئی اور سحر نمودار ہوا مرحومہ راند میں اس فراق کی تصویر شاہ لطیف بھٹائیؒ نے کھینچی ہے جس میں راند کی فراق میں مومل نے اپنی حالت بیان کرتی ہے فرماتے ہیں :-

وٺ سومريندي ولها ! ديو تيل ڀري.

موٺ مسافر سپرين ! چانگي تي چتهي.

ساڻي لاه ڪڙي ، ويٺي وهلي راتڙي.

چراغ کی بتی کو اوپر سرکاتے سرکاتے اس کا تیل ختم ہوگیا. میرے محبوب (راند) مسافر اونٹ پر سوار ہوکر واپس آجا

راند کے لئے روتے روتے، رات ختم ہوگئی .

تقدیر کا قید (دام پانی) کا قید) لوہے کے قید سے شدید ہے عربی زبان میں مقولہ ہے قَيْدُ الْمَاءِ أَشَدُّ مِنْ قَيْدِ الْحَدِيدِ پانی کا قید لوہے کے قید سے سخت ہے. اس خیال کو خواجہ میر دردؔ نے بیان کیا ہے .

گر قید ہی قسمت میں ، کچھ اور ہو یا رب

پر دل کو دی ہے تو گرفتار نہ ہووے

اسی طرح شاہ بھٹائیؒ نے سر مارئی میں اپنا عظیم تخیل بیان فرمایا ہے :-

قَيْدُ الْمَاءِ، ٿيوم ، هٿ آڙائي گهاريان .

جُنَاحَ جِسْمِي وَالْفُؤَادُ لَدَيْكُمْ ، هنئون هٿ سندوم

قادر ٿال هندوم ، ميڙائو سين ماڻين .

راند پانی کا قید مجھے یہاں کھینچ کر لایا. جس کی وجہ سے میں یہاں بڑی تکلیف دن کاٹ رہی ہوں

میرا جسم تو یہاں ہے (عمر کے قید میں) مگر دل وہاں (عزیزوں) ہے

اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے مجھے اپنے مارئوں (عزیزوں) سے ملائیگا .

کوشش کے بغیر مقصد میں کامیاب ہونا ممکن نہیں ہے . خدا تعالیٰ کی عبادت سے انسان کو راہ نجات ملحاق ہے ، کشتی میں سوار ناخدا اگر آرام سے سو جائے. تو کس طرح کشتی دریا کو عبور کرے گی . محنت کے بغیر انسان کچھ بھی حاصل کر نہیں سکتا ، اس خیال کو بڑے جاذب انداز سے واجد حسین یاسؔ نے پیش کیا ہے :-

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو سر دکھانا ہے .

بہانہ کرکے تنہا پار اُتر جانا نہیں آتا .

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اس تخیل کو بڑے موثر انداز سے بیان فرمایا ہے ، جس میں نصیحت کے علاوہ عملی زندگی کا حل بھی موجود ہے

ڀيڙائتا پٺي تون قيدن يون ڳالهيون .

سڄيون راتيون سمهين پر سکان ڏيٺي.

سهان سيٺي، پار پهندئ هنبرون .

اے ناخدا تجھے یہ دونوں باتیں کبھی حاصل ہونگی پوری رات پتوار کے نزدیک سوئی اور دریا پار اُترنے کی امید بھی رکھی
کل تجھے اس غفلت کی باز پرس ہوگی .

اردو زبان کے ایک ہندو شاعر ہری چند اختر نے کہا ہے

میرا دنیا سے غرض تھی سو دنیا کر دیا ،

جیسے کیا چاہا ، میرے اللہ نے کیا کر دیا ۔

شاہ بھٹائی سر سریراگ میں فرماتے ہیں :-

میکی پانی چتے ہی ہی سنی صاحب ،

سچی اوٹی سن مان ، ای اگی جو عجب

ای سائین جو سبب ، جن پنا اتاری پار پیان ۔

انسان کے دل میں ایک بات ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کچھ اور کر دیتا ہے ۔ رب پاک کی عجیب قدرت ہے کہ گرداب میں پھنسے ہوئے کو نکالتے ہیں

یہ رب پاک کا سبب ہے جو ڈوبتے ہوئے جہاز سلامتی سے پار ہو جاتے ہیں ۔

دنیا کی بے ثباتی پر نظیر اکبر آبادی نے کتنا دلآویز انداز سے بیان فرمایا ہے ۔

تاب اس کے دیکھنے کی نہ لا کے چلے گئے

کیا کیا بڑے جوان تھے آ کے چلے گئے

دارا رہا نہ جم نہ سکندر سا بادشاہ ۔

تخت زمیں پہ سیکڑوں ، لا کے چلے گئے ۔

مرزا غالب نے کیا سچ کہا ہے :-

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہونگیں کہ پنہاں ہو گئیں

اردو کے بزرگ شاعر خلیفہ عبدالحکیم نے فرمایا ہے

نوبت جمشید و دارا و سکندر اب کہاں

خاک تک چھانو نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے ۔

شاہ بھٹائی نے بڑے جامع انداز میں اس خیال کو پیش کیا ہے فرماتے ہیں ۔

عقدن ہاڑ سو گھوٹ ، عقدن مڑہ معان ہی

واری سندو موت آڈی ، اڈیندی عبرت ۔

(انسان کبھی دوھا بنتا ہے کبھی میت ہو کر دفن ہوتا ہے ۔ اے بندے تو کب تک اس دنیا میں رہت کے محل بناؤ گے)

سمندر کی گہرائی میں صدف پیدا ہوتے ہیں ، لیکن وہ ہمیشہ پیاسا رہتا ہے ۔ انکا مہرا بارش کے پانی پر ہوتا ہے ۔ جب بارش ہوتی ہے تب وہ اپنا منہ سا موہ سمندر کی سطح پر کھولا رکھتا ہے اتفاق بارش کا قطرہ اسکے موہ میں جاتا ہے تو اس کی پیاس بجھتی ہے ۔ آغا ظفر بیکر کہتے ہیں

آفتاد زمانہ پہ پڑی ہے ایسی — ہر سانس کی آواز ہے نفسا نفسی

بیگانگی دہر کو دیکھو تو ذرا — رہ کر بھی سمندر میں رہتی ہے مچھلی پیاسی ۔

شاہ بدھن سرمارفی میں فرماتے ہیں ۔

سپ سمندر جن سیبی ، ابر آسا ہوس

پاڑو پئی نہ پیئی ، منو منعن لگو ہی

مانک تی مڑیوس جنی تنگ کیو پائین تاری

صدف سمندر کی پیداوار ہے ، لیکن اسکو ابر باراں پر نظر ہوتی ہے ۔ سمندر کا نمکین پانی نہیں پیتی ، اسے میٹھا پانی پسند ہے

اس صبر و انتظار کے عیوض وہ قطرہ جو اسکے پیٹ میں جاتا ہے نمونہ بن جاتا ہے ۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ جب وہ اپنے محبوب کو آنکھوں کے سامنے ہی دیکھتا تو ہزار برس کا فراق محسوس کرتا ہے اس مراق میں یوں کہہ دیتا ہے

ساجن گئے دو دن بیتے ، جیو جانوں پچاس

بھولی پوچھے پنڈتا ، دن میں کتنے ماس

میر حسین خان تسکین فرماتے ہیں ۔

جس کا رفیق جس سے جدا ہو گیا ہو یار

وہ اپنی بے کسی پہ نہ روئے تو کیا کرے ۔

نواب سیاء الدین احمد خان فیروز خان دہلی کے اردو اور فارسی شعراء میں سے تھے ۔ اس خیال کو پیش کرتے ہیں

شب نہ آئے جو اپنے وعدہ پر

گذرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں ۔

شاہ شرف الدین بٹالوی نے کہا ہے ۔

اکیاں میریاں دکھ پریاں ، دیکھن یار سانوں

ڈٹی باجھوں رہن نہ مولی ، لگی چوٹ نینانوں

جی تن بگی سوتن جاتی ، گجھی دیدن اسانوں

شاہ شرف دل درد گھیڑی ، معلوم حال ستراں نوں

حضرت امیر خسرو ریختہ میں اپنا خیال بڑے جاذب انداز میں بیان کیا ہے

زحال مسکین مکن تغافل ، دراے نینا ، بنائے بتیاں

کہ تاب ہجران ندارم ، اے جان نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبان ہجران دراز چون زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

مرزا مظہر جان جاناں نے فراق و یاس کی تصویر یوں پیش کی ہے ۔

الٰہی مت کسو کے پیش رنج و انتظار آوے

ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے فراق کی تصویر بڑی رقت نگار انداز سے کھینچی ہے جس میں سوز و گداز کی عجیب کیفیت موجود ہے۔ فرماتے ہیں:۔

آج ہِن اکڑین۔ سجڻ پنھنجا سارياں۔

گلن تان ڳوڙھن جوڻ بوندیون بن ٻھن

سندي سک پرين لوڪ ڏٺي نہ لھي۔

آج بھی میری آنکھوں نے دوست کو یاد کیا اور میری آنکھوں اور گالوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں بن تھم تھیں

اس دوست کی یاد لوگوں کو دیکھنے سے بھی پوری نہیں ہوتی۔

مرزا غالب بوالہوس عاشق کے لئے کہتا ہے ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی،

اب آبروئے اہل نظر خاک میں ملی۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔

عشق نہ آھي ساڻ، جو کيڏن ڳيرو

جيڏ جسي ۽ جان کي، پيي جو صيکان

جسي نيرہ پان، اچل تہ اڏ تئي۔

عشق کوئی کھیل نہیں ہے جو نوجوان کھیلتے ہیں، یہ جسم و جان اور دل کو پرزہ پرزہ کرتا ہے۔

سر کو نیزہ کے آگے پھینک تو وہ اُچھا ہو جائے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں "وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" مرزا اسداللہ غالب نے کہا ہے۔

ہمیں تو کہتے ہو کہ شہ رگ سے بھی نزدیک ہیں ہم

جانے حیرت ہے کہ پھر آنکھ سے کیوں دور ہوئے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:۔

آنکہ حق است اَقْرَبُ از حَبْلِ الْوَرِيْد

تو فگندی تیر فکرت را بعید۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔

جو اکين اُوڏا۔ سو سيرين پراھون ھو چو،

موت تنھنجي منج ۾، پيچين ڪوہ پيو۔

جو دوست آنکھوں کے سامنے ہے اسکو دور نہ کہو، جو سب تو تیرے ساتھ ہیں پھر تو

ظفر کہتا ہے:۔

ظاہر پرست پوچھتا کیا ہے خدا کی راہ

ہے وہ بہت قریب۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات اقدس، موجود و قائم قدیم ہے نہ کسی کے محتاج ہیں نہ احتیاج کی ضرورت ہے جس وقت اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی اکیلی تھی اور کوئی مخلوق کا آمر نہ کیا تھا، تب کل موجودات عدم میں تھے۔ لیکن کائنات کے تخلیق کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے تصور میں تھی جو ممکن وجود میں تھے۔ آپ کے امر عظیم سے یہ بات واضح ہیں کہ سب چیزیں عدم سے وجود میں آئیں اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ کن و مکون کے حکم پر مکمل ہوئے۔ خدا تعالیٰ کا وجود واحد ہے۔ اور کائنات میں واحد ہے۔ اس طرح وحدت الوجود میں خدا تعالیٰ کی ذات ہی شامل ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہر چیز میں بستی ہے۔ جو یہی وحدت الوجود ہے۔ صوفی و سالک اسکا مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ ذکر و فکر، عبادت و ریاضت پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ اپنی جان کو تکالیف میں ڈال کر نفس کو فنا کرکے دل کو آئینہ کی طرح صاف کرتا ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:۔

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک
نقشہا بینی برون از آب و خاک

شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

اندر آئینو کری، پرین سو پیچ
اینمیؒ راہ رہیج تہ مشاہدو ماثین۔

(اپنے دل کو آئینہ کی طرح صاف و پاک کرکے اپنے محبوب کا دیدار کر۔ اس راہ پر چل تو محبوب کا مشاہدہ حاصل ہوگا)

تصوف کا مقصد ہے اللہ تعالیٰ سے عشق وہ عشق حقیقی ہے کا زیادہ تر واسطہ معشوق حقیقی سے ہو تصوف میں عشق کی بھرمار ہوتی ہے۔ عشق کی ماہیت پر اگر غور کیا جائے تو وہ ایک فطری جبلت ہے جس کی تکمیل لازمی ہے چاہے وہ رندی ہو یا لوالیوسی۔ عشق کے منازل بہت کٹھن ہوتی ہیں ہر ایک کی توفیق نہیں ہے صکو رب چاہے وہ مصیبتوں کو جھیلنے کے بعد کہیں منزل پر پہنچتا ہے۔ تصوف کے باعث اس قبیل میں اکثر قدیم شعراء نے لاتعداد اشعار کہے ہیں بعض شعراء رواجاً اس قسم کی کاوش کرتے ہیں۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے یہاں اس قسم کے اشعار آپ کے رسالہ میں کثرت سے موجود ہیں چونکہ آپ صوفی مشرب صاحب سلسلہ میں سے تھے، اس لئے اس قسم کی شاعری کے امام کہے جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں بھی کثرت شعراء نے تصوف پر اشعار کہے ہیں جن خاص طور پر میر تقی میر۔ اور خواجہ میر درد، غالب مصحفی، ظفر، راسخ اور مرزا مظہر جان جاناں قابل ذکر ہیں

خواجہ حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں:۔

در کشی جان فروشان ہنر و فضل نہ گنجد
این جا نسب گنجد این جا حسب نہ باشد۔

اس میں کسی خاندان ہونے کا امتیاز نہیں ہے۔ شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں:۔

ذات نہ اکھی ذات تی، جو وصی سو لھی۔

حسب و نسب پر بزرگی نہیں ہے جو محنت کریگا اسکو حاصل ہوگی۔

انسانی ذہن اور وجدان کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ مجاز و حقیقت کو ایک دوسرے جدا کرنا دشوار ہے حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم
ای بیخبر ز لذت شرب مدام ما۔

مرزا غالب نے بھی صوفیانہ خیالات کی اکثر ترجمانی کی ہے وہ عشق سے واقف تھے یا نہ تھے لیکن عشق حقیقی سے ضرور آشنا تھے۔ مرزا غالب فرماتے ہیں

جب و جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز آپ ہی نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

ایک اور جگہ پر کہا ہے ۔۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں ۔

ظفر نے کہا ہے ۔۔

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا ۔
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا ۔

میر تقی میرؔ کبھی کبھی رسماً عشقِ حقیقی کے رمزوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں ۔۔

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں ،
اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے ہیں اس رمز کو وہ لیکن معدود جانتے ہیں

سوداؔ نے فرمایا ہے

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہ طور کا ۔

خواجہ میر دردؔ کا کلام عشقِ حقیقی میں رنگا ہوا ہے اُن کا کلام مربوط عجیب لذت رکھتا ہے، وہ تک جان ہے اسی کی جستجو ہے، زبان ہے تو اُن کی گفتگو ہے ۔۔ فرماتے ہیں ۔۔

مرا جی ہے جب تک تری جستجو ہے
زباں جب تک ہے یہی گفتگو ہے ۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ۔۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا ۔

اصغر گونڈوی نے کہا ہے :

پھر میں نظر آیا نہ تماشا نظر آیا
جب تو نظر آیا، مجھے تنہا نظر آیا ۔

شاہ بشاقؒ فرماتے ہیں ۔۔

ایک قصرِ دلِ لک، کوئیں شیش گڑ کیوں
جیڈانی کریاں پرک، تیڈانی صاحب ساموں ۔

شیفتہ نے خوب کہا ہے ۔۔

سب اس میں محو اور وہ سب سے علاحدہ آئینے میں ہے آب، نہ آئینہ آب میں ۔

شاہ بھٹائیؒ کے کلام سے مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ایک قصر ہزار لک، کوٹرین کھڑکیون

جیڈانھن ھریان پرک، تیڈانھن صاحب سامھون۔

(ایک محل جسکے لاکھ دروازے اور کروڑوں کھڑکیاں ہیں۔ جس طرف بھی نظر کرتا ہوں ادھر محبوب کا دیدار ہوتا ہے)

کوٹرین کیائون تنھنجون، لکن لک ھزار

جیڈ سپکھنھن جیئ بین، درسن ڈارھن ڈار

پریم تنھنجا پار، ھقڑا چئي ھڪڙا چوان۔

سرسہ رب تیرے صفات کو لاکھوں بندوں نے لکھا ہے ہر ایک نے تیرے جلوہ کو مختلف طرح دیدار کیا ہے۔

سرسہ محبوب تیری صفات اور خوبیاں کس کس بیان کروں۔

اہل نظر کو مجاز سے حقیقت اور وحدت میں کثرت کا پرتو نظر آتا ہے کیونکہ معرفت الٰہی بغیر نفس اور معرفت کائنات ممکن نہیں مرزا غالب نے کہا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ملا بدایونی نے اس خیال کو بھی پیش کیا ہے۔

کثرت میں دیکھتا جا، تکرار حسن وحدت

مجبور یک نظر آ مختیار صد نظر جا۔

خواجہ میر درد نے کہا ہے

تجھ کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا

برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا۔

عالم کثرت کا مسکن ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھو تو اس کثرت میں وحدت کا جلوہ نظر آتا ہے:

جمع ہیں افراد عالم ایک ہیں — گل کے سب اوراق برہم ایک ہیں،

ہو وے کب کثرت سے وحدت میں خلل — جسم و جان گو دو ہیں باہم ایک ہیں۔

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں۔

وحدت تان کثرت ڀي، کثرت وحدت ڳل

حق حقيقي هيڪڙو ٻولي ڀر ٻيل

هو ملا چو ٿل، ٻا الله سندو سچائين۔

وحدت سے ہی کثرت ہے، اور وحدت ہی کل کثرت ہے

خدا تعالیٰ کی ذات حقیقی ایک ہے، اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے

رب پاک کی قسم ہر جگہ پر جو حق کا شور و غل ہے۔

مرزا غالب نے کہا ہے

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا۔

شوکت میرٹھی کہتے ہیں:۔

قدرت مہ و انجم آفرین تیری ہے — یہ مہر مبین مہر نگین تیری ہے
ہے تو بلک و مالک و ملکوت — خاکی ہے بشر بھی۔ کل زمین تیری ہے۔

آغا شاعر نے بھی خوب کہا ہے:۔

وحدت ہی میں تنہا ہیں شاہی تیری — کثرت میں بھی ہے نیم نگاہی تیری
ذرے ہیں آئینہ ہی سوئے مہر مبین — انگشت غبار ہے گواہی تیری۔

شاہ بشائی فرماتے ہیں:۔

سو صوفیٔ سو ھو، سو اجل سو اللہ،
سو پیرین سو پیماہ، سو دسری سو دلدرو۔

مرزا غالب کے کلام میں مجاز اور حقیقت دونوں کو بڑی خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔ جس کے لئے فرمایا ہے:

خموشی کا عالم ہے اپنا مقام
نہیں آشنا بحث و تکرار کے
مبارک ہے تجھکو واعظ بہشت
میاں ہم تو طالب ہیں دیدار کے

بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں

دل کا آئینہ جب صفا دیکھا — وہ جو پنہاں تھا برملا دیکھا۔
کیا کہوں بتکدہ میں کیا دیکھا — جلوہ قدرت خدا دیکھا۔

میر تقی میر نے فرمایا ہے:۔

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں — آپ سوائے کس کو معبود جانتے ہیں۔
اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے — اس رمز کو ولیکن موجود جانتے ہیں۔

اس اشعار کی زبان اور اسلوب، تصوف کے اسرار و رموز کو بیان کرنیکے لئے خاص طور پر موزوں تھے۔ مجازی عشق کے معاملوں کی طرح حقیقی عشق کی کیفیت بھی تفصیل سے پیش کی ہے مرزا غالب نے کہا ہے

کہیں ہے بادشاہ تخت نشین — کہیں کاسہ لئے گدا دیکھا۔
کہیں عابد بنا کہیں زاہد — کہیں رندوں کا پیشوا دیکھا۔

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں:

پاڻھ جَلّ جَلالُہٗ، پاڻھ جان جمال

پاڻھ صورت پريَ جي، پاڻھ حسن ڪمال

پاڻھ پير مُريدُ ٿيي، پاڻھ پاڻ خيال

سڀ ڪيوئي حال، منجھائي معلوم ٿئي.

خدا تعالیٰ جَلّ جلالُہٗ خود ہی جان جمال ہے محبوب کی صورت بھی خود ہے، خود ہی حسن کمال ہے

خود پیر و مرید ہے تو اپنا خیال بھی خود ہے۔ سب حقائق اُن کو خود ہی معلوم ہوتے ہیں۔

غیب الغیب سے تصوف کی اصطلاح میں احدیت ذات مراد ہے، جو عقل و ادراک کی حدود سے دور ہے شاہ عنایتؒ نے وحدت الوجود کے مسئلہ کو بیان فرمایا ہے، اس نظریہ سے دیکھا جائے تو خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے، کیوں کہ کسی چیز کو اپنا وجود نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیض کرم سے وجود حاصل ہے جو چیز میں حقیقت خدا کا نور سمایا ہے قرآن پاک کا قول مبارک ہے "اللہ نور السموات والارض"

مرزا محمد رفیع سودا نے فرمایا ہے:۔

میں عاشق اپنا معشوق اپنا آپ ہوں پیارے

گہے پروانہ اس مجلس میں، گاہے شمع محفل ہوں

میر تقی میر نے فرمایا ہے:۔

سراپا میں اس کے نظر کر کے تم،

جہاں دیکھو اللہ ہی اللہ ہے۔

اُردو زبان کے ایک مشہور شاعر اکبر حسین نے کہا ہے:۔

کرم حق پہ رکھ نظر اپنی

جو عقیدہ ترا نہ چوڈھیلا

آسرا کا چھوڑ دے اکبرؔ

وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا

شاہ بھٹائی فرماتے ہیں:۔

پاڻھ بسي پاڻ کي پاڻھ ئي محبوب

پاڻھ خلقي خوب، پاڻھ طالب تن جو.

خدا تعالیٰ خود ہی اپنے آپ کو دیکھتا ہے، اور خود ہی محبوب ہے

خود ہی پیدا کیا اور خود ہی اس کے طالب ہوئے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام کا اردو شعراء کے کلام سے حتی المقدور موازنہ کیا گیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے خیالات سے اردو، ہندی اور فارسی شعراء کے کلام میں کسی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔

شاہ لطیف کی شاعری سندھی زبان اور سندھی کلچر (CULTURE) میں موجود ہے جب تک سندھی زبان اور سندھی تہذیب کا علم نہ ہوگا۔ تب تک شاہ بھٹائی کے کلام و خیالات کو سمجھنا دشوار ہوگا۔ آپ کی شاعری کی بنیاد مذہب اسلام اور تصوف ہے، اسلئے عوام کے لئے مشعل راہ اور ذریعہ تسکین بھی ہے۔ شاہ لطیف کی شاعری تخلیقی (CREATIVE) ہے، یہی وجہ ہے کہ عوام، شاہ بھٹائیؒ کے رسالہ کو بڑی عزت سے اور کلام کو بڑی توقیر سے دیکھتے ہیں۔

شاہ لطیف کے کلام کا ترجمہ کرنا آسان بھی ہے تو دشوار بھی ہے لفظی ترجمہ تو ہو سکتا ہے لیکن آپ کے تخیل کا شعر میں ترجمہ کرنا مشکل ہے، کیونکہ پورا کلام استعاروں، تشبیہات، کنایہ اور تمثیل و مثالوں سے پُر ہے شیخ مبارک علی آیاز رسالہ کے مقدمہ میں لکھا ہے

> شاہ لطیف سندھی کے وہ پہلے اور شاید آخری شاعر تھے، جن کے کلام میں سندھی زبان کی قریب قریب تمام خوبیاں موجود ہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ سندھی زبان صرف اس لئے زندہ رہی ہے اور رہے گی کہ اس میں شاہ جیسے عدیم المثال کا دل آویز کلام موجود ہے اس کلام کی دل آویزی کو کسی دوسری زبان میں منتقل کردینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

ایک غیرفانی شاعر اور اُسکے کلام کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے وجود کا خود ثبوت ہوتا ہے۔ بعض اصنافِ شاعری یا شعرا کی تخصیص کو تقدس کا جامہ پہنا کر ہر طرح کی نکتہ چینی سے بالا و برتر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ صحیح حقیقت ہے کہ شاہ بھٹائی کا کلام ہر لحاظ سے بالاتر ہے جو قدیم اور صدیوں سے اپنی غیرفانی ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی (اردو ترجمہ) مترجم شیخ مبارک علی آیاز صفحہ ۹۴

ضميمة

ضمیمہ

شاہ بھٹائیؒ کے سوانح نگار، مترجم اور انکی تصنیفات

۱۔ تاریخ تحفۃ الکرام (فارسی)

تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف میر علی شیر قانع نے یہ تاریخ ۱۱۸۱ھ مطابق ۱۷۶۷ء میں یعنی شاہ بھٹائیؒ کی وفات ۱۶ سال بعد لکھی تھی میر علی شیر قانع شاہ بھٹائیؒ کے معاصر تھے، شاہ بھٹائیؒ نے ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء میں وفات فرمائی تھی۔ یہ تاریخ سب سے قدیم اور مستند ہے، کیونکہ انہوں نے شاہ بھٹائیؒ کو دیکھا تھا، اور انکی محفلوں میں بھی شریک ہوئے تھے۔ شاہ بھٹائیؒ، مخدوم بلاول اور مخدوم معین ٹھٹھوی سے بڑے دوستانہ تعلقات تھے، مخدوم صاحب میر علی شیر قانع کے استاد تھے، شاہ بھٹائیؒ اکثر مخدوم صاحب کے مجلس میں رہتے تھے۔ میر علی شیر قانع نے شاہ بھٹائیؒ کا مختصر ذکر کیا ہے، لیکن اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے، میر قانع نے اپنی ایک اور مشہور تصنیف مکالات الشعراء میں بھی مختلف جگہوں پر ذکر کیا ہے، اس طرح لکھتے ہیں:۔

"آنجناب لطیف الرچہ اُمی بودند، اما علم و عالم متمام بر لوح محفوظ دل شان منتقش بودہ الحق این بندہ قابل لایق شان شانست"

چو طفلِ غنچہ نا دیدہ دبستان
بسر سے پارۂ اسرارِ مرحبا

۲۔ مرغوب احباب (فارسی)

نظر علی بلوچ، لنواری شریف کے بزرگ خواہ محمد زمان ثانیؒ کے مرید اور عقیدتمند تھے انہوں نے ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۵ء میں یہ کتاب لکھی تھی، اس کتاب میں لنواری شریف کے بزرگوں کے حالات زندگی لکھے تھے۔ نظر علی بلوچ کے آباؤ اجداد لیچ مکران سے ہجرت کر کے سندھ میں آئے تھے ان کے دادا اپنے وقت کے اچھے فارسی کے شاعر تھے اور "زندہ بہار" تخلص کرتے تھے۔ نظر علی بلوچ خود بھی فارسی کے شاعر تھے۔ انہوں نے یہ کتاب فارسی زبان میں لکھی، جس کی شروعات نقشبندی طریقہ کے مشائخ کا تفصیل سے احوال دیا ہے۔ صوفیاء طریقہ کے بانی حضرت شیخ خواجہ بہاؤ الدین ذکریا نقشبندی کا احوال دیا ہے۔ اس کے بعد لنواری شریف کے بزرگوں کی حالات زندگی دی ہے۔ حضرت خواجہ محمد زمان صاحب کے حالات زندگی حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور خواجہ صاحب کی ملاقات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، جسکا ذکر اس کتاب کے پہلے صفحات پر دیچکا ہوں۔ اس ملاقات کا ذکر سب سے پہلے اعجاز ڈاکٹر گربخشانی نے رسالہ "سندھو" میں دیا تھا، جسکے بعد اپنی تصنیف "لنواری کے لعل" میں تفصیل سے ذکر کیا ہے شمس العلماء مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ صاحب نے اپنی تصنیف "ابیات سندھی" حضرت خواجہ محمد زمان لنواری بزرگ کے کلام اور سوانح میں بھی ذکر کیا ہے۔

۳۔ احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی:۔

سندھ کے مشہور عالم و فاضل مرحوم شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ نے ۱۸۸۷ء میں بھٹ شاہ کی درگاہ کے مقبروں، مریدوں سے حالات زندگی حضرت شاہ بھٹائیؒ کی جمع کر کے ایک کتاب لکھی جس میں سوانح کے علاوہ، آپ کے کلام کا فلسفہ، کرامتوں اور کرامات پر تفصیل سے لکھا ہے غالباً یہ پہلی کتاب ہے جس میں شاہ بھٹائیؒ کی سوانح تفصیل سے ملتی ہے یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی، لیکن بعد میں اسکا سندھی زبان میں خود مصنف نے ترجمہ کیا۔ مرزا صاحب کی یہ خوش نصیبی تھی جو انہیں وہ روایتیں حاصل ہوئیں، جن فقیروں نے ان عقیدتمندوں سے سنی تھی جنہوں نے شاہ بھٹائیؒ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ان کی قرابت حاصل تھی۔ اس لئے مرزا صاحب کی پیش کردہ روایتوں میں صداقت نظر آتی ہے

مکالات الشعراء فارسی میر علی شیر قانع، تصحیح سید پیر حسام الدین شاہ راشدی، سندھی ادبی بورڈ صفحہ ۴۲۹۔

لطائف لطیفی (فارسی)

سندھ کے آخری تالپر تاجدار میر محمد نصیر خان شہداد انی کے نواسے اور میر عباس علی خان کے فرزند میر عبدالحسین خان سانگی حضرت شاہ بھٹائی کے بڑے عقیدتمند تھے۔ اور اپنا روحانی مرشد سمجھتے تھے۔ انہوں نے آپ کی سوانح فارسی میں "لطائف لطیفی" کے نام سے ۱۸۸۸ء میں لکھی۔ بہت عرصہ تک یہ کتاب مسودہ کی صورت میں رکھا رہا۔ آخر ۱۳ اپریل ۱۹۶۷ء میں انجمن ثقافتی مرکز شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی طرف سے جناب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے شایع کرادی۔ یہ کتاب مرتب نے بڑی عقیدت و احترام سے لکھی، جس میں شاہ بھٹائی کی حالات زندگی، کرامات اور دیگر حالات دیئے ہیں۔

سوانح: میر عبدالحسین خان سانگی سندھ کے شہزادے تھے، ان کے والد میر عباس علی خان اپنے والد میر محمد نصیر خان کے ساتھ انگریزوں کی فتح سندھ کے بعد قیدی بن کر کلکتہ بھیجے گئے۔ میر عباس علی خان کی بہادری کو دیکھ کر ایک انگریز خاتون نے ان سے شادی کی، جس کی بطن سے ۱۸۵۱ء میں میر عبدالحسین خان وہیں تولد ہوئے۔ ایام طفلی میں والدہ کا انتقال ہوا اور تھوڑے عرصے کے بعد ان کے والد بھی کسی حادثے میں وفات کی، اس طرح یہ بچہ مکمل طور پر یتیم بن گیا۔[2] دس برس کی عمر میں اپنے وطن حیدرآباد آنے کی اجازت ہوئی۔ ان کی نگرانی اپنے چچا میر حسن علی خان کے ذمے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کلکتہ میں ہوئی۔ اردو فارسی تعلیم اچھی ہوئی۔ سندھی زبان وطن واپس ہو کر ہوئی۔ بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا، فارسی اور سندھی شاعری آخوند احمد عبدالحلیم حالائی سے ہوئی۔ اردو اور فارسی میں مولانا ابوالحسن ابن مولانا ہدی حسن لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے۔ سانگی کو اپنے استادوں سے بڑی عقیدت تھی۔ ایک جگہ انکی تعریف اردو شعر میں کی ہے:

مولوی سید ابوالحسن مقدس القاب شکر و شکر ہوا آپ کا اشعار لذیذ۔

انگریز سرکار کی طرف سے میر عبدالحسین خان سانگی کو فرسٹ کلاس اسپیشل مجسٹریٹ مقرر کیا۔ یہ عہدہ بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ میر صاحب کو شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ دیوان سانگی میں مرشد کرکے یاد کرتے ہیں۔ ایک جگہ عقیدت سے کہتے ہیں۔

لطف لطیف شامل حالم اگر نہ ہو تو شاہراہ عشق میں میرا گذر نہ ہو۔

میر عبدالحسین خان سانگی آخر عمر میں معمولی بیماری کے بعد ۱۲ جون ۱۹۱۴ء مطابق ۸ ذیقعد ۱۳۳۲ ہجری جمعرات کو وفات کی۔ ان کی مزار ان کی خواہش کے مطابق حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی درگاہ میں بنائی گئی۔

(سندھ اور وادی سندھ میں بسنے والی قومیں: Sind and the races that inhabite in the valley of Indus)

سر رچرڈ برٹن نے اپنی یہ تصنیف میں مختلف جگہوں پر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا ذکر کیا ہے لکھتا ہے۔

"یہ ولی سید حبیب شاہ کے فرزند تھے بارھویں صدی ہجری کی اول میں ۱۶۸۹ء میں تولد ہوئے۔ وہ اپنی زیارت کے لئے مشہور، انہوں نے اگرچہ تعلیم حاصل نہ کی تب بھی وہ علوم و فنون کے مالک تھے۔ ان کے بیشمار مرید تھے۔ فن کو آپ سے بڑی محبت تھی، آپ کی وفات کے وقت کیتنے مرید جان بحق ہوئے۔ ان میں بہت سے اپنے وقت کے ولی بن گئے۔ شاہ لطیف اس جہان سے ۱۱۶۱ء ہجری میں وفات کی۔ آپ کی مزار بھٹ شاہ پر ہے جو ایک مقدس جگہ ہے۔ جہاں ماہ صفر میں سالیانہ عرس کا میلہ لگتا ہے"

---

[1] لطائف لطیفی فارسی۔ شایع کردہ انجمن مرکز ثقافت شاہ عبداللطیف بھٹائی۔ بھٹ شاہ ضلع حیدرآباد ۱۹۶۷ء

[2] سانگی شخصیت فن اور کلام مرتب مرحوم پروفیسر اسلم احمد بدوی کراچی۔ ۱۹۶۵ء

[3] دیوان سانگی مطبوعہ مسلم ایجنسی پریس حیدرآباد ۱۹۵۲ء

Sind & the races that inhabit inhabit in the valley of Indus by (Richard Francis Burton)

رچرڈ فرسنر برٹن :- برٹن انگلنڈ کے ایک شہر ہرفرڈ شائر میں پیدا ہوئے۔ انکا باپ ایک فوجی افسر تھا، جسکو فوج سے نکالا گیا تھا۔ برٹن کی ابتدائی تعلیم انگلنڈ اور فرانس میں ہوئی۔ آکسفوڈ یونیورسٹی سے ۱۸۴۳ء تعلیم مکمل کرکے ایسٹ انڈیا کمپنی میں نوکری کی اور بعد میں ہندوستان بھیجے گئے سندھ میں ۱۸ رجمینٹ میں کیپٹن مقرر ہوکر آئے۔ سفر کے دوران جہاز میں ان کی ملاقات ایک انجینئر کیپٹن والٹر اسکاٹ سے ہوئی، جو سندھ میں سر چارلس نیپئر کے کہنے پر سندھ کی سرزمین اور دریاؤں کے سروے کرنے آئے تھے۔ برٹن نے اسکا ساتھ دیکر کام کیا۔ سندھ کی معاشرتی اور تمدنی حالات کو سمجھنے کا انہیں بڑا موقعہ ملا جس کی وجہ سے انہیں سندھ کے حالات پر بہت سی کتابیں لکھی۔ برٹن بڑے عیاش ہونے کے باوجود محنتی آدمی تھے۔ دنیا کی کم بیش پچیس زبانیں جانتے تھے۔ برٹن ۲۰ اکتوبر ۱۸۹۰ء میں ٹریسٹ شہر میں مر گئے اور انگلنڈ میں دفن کئے گئے۔

۶۔ احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی :-

سندھ کے کمشنر سر بارٹل فریئر (۱۸۵۱ء تا ۱۸۵۹ء) نے اپنی بیٹی کی تفریح کے لئے شاہ بھٹائی کی زندگی پر کہانیاں لکھادی، یہ کتاب پہلے انگریزی میں لکھی گئی۔ بعد میں سندھی میں ترجمہ کرایا۔ یہ دونوں مسودے کمشنر سندھ کے دفتر کتب خانہ میں موجود تھیں

۷۔ Some thing about Sind (سندھ کے متعلق تھوڑا احوال)

دیوان دیارام گدومل سگمل نے ایک مختصر رسالہ سندھ کے متعلق تھوڑا احوال کے عنوان سے ۱۸۸۳ء میں انگریزی زبان میں شایع کیا۔ اس رسالے میں شاہ بھٹائی کے حالات زندگی پر جامع روشنی ڈالی گئی تھی۔

۸۔ Shah Latif (شاہ لطیف)

دیوان لیلارام وطن مل لالوانی نے شاہ لطیف بھٹائی کی سوانح مذہب اور کلام پر دو حصوں میں کتاب لکھی۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے اور ۱۸۹۰ء میں شایع کرائی۔ دیباچہ میں لکھتا ہے :-

> میں نے اس کتاب کے لکھنے پر بڑی محنت کی ہے۔ آٹھ سال کے طویل عرصہ میں جو بھی مجھے فرصت کا وقت ملتا تھا، کام میں لگ جاتا تھا۔ دو سال مسلسل قرآن پاک کے پڑھنے میں صرف کئے۔ جو انگریزی، ہندوستانی اور فارسی زبانوں کی مدد سے قرآن پاک کو سمجھا۔ اسکے علاوہ ہندی اور انگریزی گرامر اور بہت سے ہندوستانی زبان کی کتابیں پڑھیں۔ قرآن پاک پڑھنے میں میرا مقصد یہ تھا کہ میں شاہ بھٹائی کے کلام میں جو آیات پاک موجود ہیں سمجھوں اور شاہ بھٹائی کے کلام کو قرآن پاک کی روشنی سمجھوں

دیوان لیلارام وطن مل کی یہ کتاب مستند سمجھی جاتی ہے، جس میں شاعری کی سوانح، تصوف ویدانت، کلام پاک کی آیات اور آخر میں مشکل الفاظوں کی معنی دی ہے۔

۹۔ SHAH ABDUL LATIF OF BHIT (شاہ عبداللطیف آف بھٹ)

ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے، سندھی زبان کے محسن اور شاہ عبداللطیف کے شیدائی تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء میں شاہ بھٹائی کی سوانح، کلام اور اس وقت کے سیاسی، تمدنی، معاشی اور ثقافتی حالات پر مکمل تحقیق کی۔ اس تحقیقی مقالہ پر آکسفوڈ یونیورسٹی لنڈن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی، اور یہ کتاب آکسفوڈ یونیورسٹی پریس لنڈن سے ۱۹۴۰ء میں شایع کرائی۔ کتاب میں اٹھارویں صدی عیسوی کی تاریخ اور معاشرتی حالت کے بعد، ادب اور تنقید، سوانح، کلام، کلام پر عربی فارسی اور ہندی زبانوں کا اثر اور علاقائی اردو زبانوں کا اثر، رسالہ، تصوف مذہب، رسالہ کی کہانیاں، آخر میں دیوان پوکرداس کے مطبوعہ انتخاب رسالہ کا انگریزی نظم میں ترجمہ دیا ہے

سوانح :- یہ عالم اور محقق، انڈین سروس (سول) میں شامل ہوکر سندھ کے مختلف شعبوں میں محکمہ مال میں رہکر آخر سکھر کے کلیکٹر مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہایت خاموشی سے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ پر تحقیق کی ان کی محنت کو دیکھکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے بڑے ادیب اور شاعر تھے۔ پاکستان ہونے سے پہلے انگلینڈ چلے گئے تھے۔ لیکن بعد میں ریونیو بورڈ کے میمبر مقرر ہوکر آئے تھے۔ انہوں نے سندھی زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ سندھی زبان کے متعلق ان کی رائے اپنی جگہ پر اہمیت رکھتی ہے۔

"دنیا کے کسی بھی زبان کا تلفظ سندھی زبان کی رسم الخط میں صحیح طور پر لکھا جاتا ہے"

ڈاکٹر سورلے پہلے محقق ہیں جنہوں نے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے فلسفہ کو یورپ کے لوگوں سے روشناس کرایا۔ سندھ اور سندھی زبان پر انکا بڑا احسان ہے۔ ڈاکٹر سورلے یہ کام مکمل کرکے بڑا فخر محسوس کرتے تھے۔ شاہ صاحب کے متعلق کہتے ہیں

"شاہ بھٹائیؒ جیسا بلند پایہ شاعر کا پیدا ہونا، یا پیدا ہونے کی توقع کرنا اسکی ہے۔ جیسے انگلینڈ کے ادب میں ڈون اور ملٹن"

ڈاکٹر سورلے نے شاہ عبداللطیف اف بھٹ کے بعد ۱۹۵۳ء میں ایک تصنیف موسیٰ پروگس "Musa Peravagans" کے نام سے لکھی ہے یہ کتاب بھی انگریزی زبان میں ہے۔ جس میں دنیا کے سات زبانوں۔ یونانی۔ لاطینی، فرانسیسی، اطالوی، عربی، اردو اور سندھی کے مشہور شعراء کی غنائی شاعری (Lyrical) کو پیش کیا ہے۔ جس میں شاہ لطیف بھٹائیؒ کے متعلق لکھتے ہیں :-

شاہ بھٹائیؒ اٹھارویں صدی میں شعر کہتے تھے۔ سامی اور آرائی زبانوں میں اپنے خیالات کا ایسا مثال چھوڑا ہے۔ جسکا نظیر برصغیر ہند و پاک میں ملنا مشکل ہے۔ یہ ایک قابل قدر حقیقت ہے کہ سندھ کے ہندو بھی مسلمانوں کی طرح شاہ لطیفؒ کے تصوف کو بڑی عقیدت سے مانتے ہیں۔ شاہ بھٹائیؒ نے اپنی شاعری کا موضوع ان لوک کہانیوں کو بنایا ہے جو سندھی عورتیں اپنے بچوں کو جھولے میں بیٹھ کرانے کے وقت لوری کی طرح گاتی ہیں ان کہانیوں کو وطنی شعر میں لاکر تصوف کے رنگ میں ڈبوکر پانی سے تر کرتے ہوئے، رستم جیسی چمک دیتا ہے۔ سندھی طرح اگر دیکھا جائے تو شاہ بھٹائیؒ فارسی زبان کے عظیم شعراء، رومی اور جامیؒ کی صف میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس طرح کہنے میں کوئی زیادتی نہ ہوگی کہ شاہ صاحب دنیا کے بڑے میں بڑے شاعر ہیں۔

10. A Battle Scene at Karbala کیڈارو

شکارپور سندھ کے ایک ہندو سرت سوھدت۔ بی۔ گاجرہ نے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے رسالے سے سر کیڈارو کے ابیات کا انگریزی زبان میں نہایت بحتر ترجمہ کیا ہے یہ کتاب کی صورت میں شکارپور سے شائع ہوئی تھی۔ جسکی مثال دی جاتی ہے۔

1. گھوڑن ۽ گھوتن جيئن ٿورا ڏينهڙا

هڏمن منجھ ڪوٽن، هڏمن ماڻهو رڻ جا.

Horses and heroes have short a leave — گھوڑوں اور بہادروں کا جینا مختصر ہوتا ہے

Some times they dwell in cities some times function on the Fields. — کبھی قلعوں کے اندر رہتے ہیں، تو کبھی بیابان کے راہی۔

2. حسن ۽ حسين کي رنو ٿن ٿوٽن. — اردو ترجمہ :- امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی شہادت پر تین حلقوں نے رو لیا،

گهر ماڻهون جنگ مرون ۽ اڻ ڀڙڪن. — گھروں میں لوگ۔ جنگل میں جانوروں نے اور آسمان پر ملائکوں نے۔

Hasan and Mir Husain were wept by there groups, Men in houses, beasts in the field and hosts in heaven.

Risalo of Shah Abdul Latif

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے منتخب کلام کا انگریزی میں ترجمہ مرحومہ ایلسا قاضی نے کیا ہے جسے سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۶۵ء میں شایع کیا۔ ابیات کے ترجمے کو دیکھکر مترجمہ کی علمی لیاقت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ترجمہ میں جاذبیت اور اصلیت نظر آتی ہے۔ اور شاہ بھٹائیؒ کے تخیل تک پہنچی ہے۔ کتاب کے شروع میں سندھ کی مایہ ناز شخصیت، ادیب و فلسفہ ایم۔ کے۔ بروہی نے عالمانہ تعارف لکھا ہے

مرحومہ ایلسا قاضی، مرحوم علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی کی رفیق حیات تھی، وہ جرمنی نسل کی تھی اور جرمن کے ایک شہر روڈل اسٹاٹ میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئی۔ اُنکا والد مشہور جرمن موسیقار تھا۔ وہ جرمنی سے انگلینڈ چلے گئے تھے۔ لنڈن کے نزدیک ڈلوچ شہر میں مقیم ہوئے جہاں قاضی صاحب بھی تعلیم کے سلسلے میں رہتے تھے۔ وہاں ان کی ملاقات ایلسا سے ملاقات ہوئی۔ کچھ عرصے کے بعد شادی ہوئی ۱۹۱۱ء میں سندھ میں آئی قاضی صاحب صحبت میں بڑی ادیبہ بن گئی خاص طور پر انگریزی تصنیفات مشہور ہیں:۔

1. Old English Garden Symphony (Novel) 2. Temptation (Drama of Sindhi Life) 3. Civilization through the Ages. 4 Terrestrial and Celestiale Chose (5) Resalo of Shah Latif.

ایلسا قاضی کو ادب اور مصوری سے، موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی۔ یہ مشہور ادیبہ ۲۸ مئی ۱۹۶۷ء کو حیدرآباد سندھ میں وفات کی۔ جناب قدری ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی نے انکی تاریخ وفات اس مطلع سے نکالی ہے۔

رافت و شفقت بہ ہر کس داشتہ — بود برخورد و کلاں ہر دم رحیم
مثلما لم یخلق است از روئی امر — ایلسا قاضی بہ جنت شد مقیم

۱۳۸۷ ہجری — ۱۹۶۷ عیسوی

RISALO OF SHAH ABDUL LATIF.

سندھ کے خاموش اور گوشہ نشین بزرگ آغا محمد یعقوب خاں نے شاہ بھٹائیؒ سے عقیدت ہونے کی وجہ سے، رسالہ کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں اور اس وقت رسالہ کے ۲۳ سروں کا ترجمہ مکمل کر چکے ہیں اپنے ترجمہ میں فارسی شعراء کے کلام سے موازنہ بھی کرتے ہیں۔ یقین یہ کام ایک شاہکار کی حیثیت ادب رکھے گا۔

آغا محمد یعقوب خاں شکارپور کی مردم خیز سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ کڑی عطا محمد خاں کے مشہور محلہ کے رہنے والے ہیں۔ بی۔ اے انرس انگریزی اور فارسی میں کرنے کے بعد محکمہ مال میں ملازمت کا آغاز کیا سندھ کے مختلف ضلعوں میں ڈپٹی کمشنر ہو کر رہے آخر میں مغربی پاکستان پبلک سروس کمیشن لاہور سے ۱۹۶۴ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔ عربی۔ فارسی۔ سندھی اور انگریزی میں یکساں دسترس رکھتے ہیں شاہ بھٹائیؒ کے رسالہ کے علاوہ قرآن پاک کے ۱۵ پاروں کا انگریزی میں تفسیر و ترجمہ کر چکے ہیں۔

بڑے ہمدرد، غریب نواز اور احسان دوست ہیں۔ آج کل حیدرآباد سندھ لطیف آباد میں مستقل سکونت ہے۔

LATIF and the Modern world.

شاہ بھٹائیؒ کے کلام کا فارسی ترجمہ :-

شاہ بھٹائیؒ کے کلام کا فارسی زبان میں ترجمہ سندھ کے مشہور عالم عبادت اللہ حالائی نے کیا۔ اس ترجمہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ کلام فارسی میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ مولوی صاحب خود بھی فارسی کے بہترین شاعر تھے۔ انہوں نے شاہ بھٹائیؒ کے کلام ترجمہ کا نام "النظم الشریف الکلام السید عبد اللطیف" رکھا تھا۔ مولوی صاحب کی ولادت ۱۲۱۵ھ میں ہوئی اور وفات ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ مولوی صاحب بڑے فقیہ تھے۔ انہوں نے شاہ بھٹائیؒ کے رسالہ کی سندھی زبان میں شرح بھی لکھی تھی۔ ٹھٹھہ میں سید کمال شاہ کی زیارت کے لئے گئے تھے تو وہاں کسی نے وہ کتاب چرالی۔ علاوہ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کی اس ترجمہ کے متعلق یہ رائے ہے

فارسی کا ترجمہ سندھی سے بھی زیادہ فصیح اور روان سے پُر ہے۔ ترجمہ کی لطافت اور بلند خیالی شاہ لطیفؒ کے مطالب پر حاوی ہے، اور اہل ذوق کے لئے ایک بے بہا تحفہ ہے۔

ترجمہ کا نمونہ دیا جاتا ہے :-

هوت تنهنجي هنج ۾ پيچين ڪوه پرياڻ ،

سوتان توهين ساڻ ، جيئن لاهه جيل ڳولين ،

مسکن او در حضور تو قریب، از دگر پرسش چه کردی سبب

هست با تو نزد تو در تو مدام ، آنکه گردی دو پئے او هر مقام ،

وڃين ڇو وٽڪاڻ ، هت نه ڳولين هوت کي ،

لطيفين لطيف ۾ ، ٻاهر ڇو ٻي ٻاهر

ڀي ستي ٻڌ سندرو ، پرت پنهون سين پاهر

ناڀي نيڻ نهار ، تو ڇه ديس ۽ دوست جو ،

از پے دلبر چه گردی کو بکو، در وجود خود کن او را جستجو

دلبر تو از وجود درد نیست، درد گر اطراف آن مستور نیست

مخلص اندر جیب و شو بستہ میان ، هم وفاکن خوجب جا نجان

چشم خود را نیست دار و کن نگاه، هست او را در وجودت جایگاه ،

شاہ لطیفؒ کے کلام کا منظوم ترجمہ :-

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام فارسی میں منظوم ترجمہ سندھ کے نوجوان شاعر نیاز ہمایونی نے بھی کیا ہے۔ انہوں نے رسالہ کے چند سروں کا ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ کو دیکھکر اصل میں کوئی تفاوت نظر نہیں آتا۔ چونکہ نیاز ہمایونی خود بھی شاعر ہیں، ان کی شاعری میں جدید رجحان پائے جاتے ہیں۔ شاہ بھٹائیؒ کے کلام کو فارسی منظوم شعر منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن نیاز ہمایونی نے اپنی علمی و فنی

شاہ لطیف کے کلام کا فارسی ترجمہ مقالہ نگار جیمن کریم بخش خالد رسالہ نئی زندگی (سندھی) ماہ نومبر ۱۹۵۱ء

ارمغان لطیف کلام کا فارسی ترجمہ مترجم نیاز ہمایونی (شکارپور) سہ ماہی رسالہ مہران ۱۔ ۱۹۷۲ء۔

علامتوں کو یک جا جمع کرنے یہ بڑا کام سرانجام دیا ہے۔ نیاز ہمایوں اگر ہمت سے کام لے کر رسالہ کا مکمل ترجمہ کرے تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔ ترجمہ میں ان کے لحاظ سے وہی سادگی اور پختگی موجود ہے جو شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں موجود ہے۔ مثال دی جاتی ہے۔

تون حبیب تون طبیب! تون درد جي دوا
جانب منهنجي جهڙ ۾ آزار جا انواع
صاحب ڏج شفا، ميان مريضن کي.

حبیب من، طبیب من! دوائے درد پیاسۂ من،
همی خواهم مدد از تو که ناخوش زندگی دادم
بجانِ زار من افتاد آزاری زهر نو عی
مریض استم مغاثے ده که تا خوش زندگی دادم

* * *

سائين سدائين ڪرين متي سنڌ سڪار
دوست تو دلدار، عالم سڀ آباد ڪرين.

خداوندا بود بارانِ رحمت بر دیارِ سندھ — نماند خشک سالی، سایہ گستر ابر نیسان باد
تو ئی دلدار خویش و غیر، پاسِ دوستی از تو، — بہ امن و آشتی، عالم همه آباد و شادان باد.

شاعر جو سرتاج (سندھی)

یہ کتاب محترمہ بیگم خدیجہ داؤدپوتہ نے ۱۹۶۳ء میں مرتب کیا۔ پاکستان پبلیکیشن کی طرف سے شایع ہوا اس مجموعہ میں سندھ کے بڑے عالم جنہوں نے نیز زندگی کے رسالہ میں شاہ بھٹائیؒ کے متعلق مقالہ دیئے ان کا مقالوں کا مجموعہ ہے جس میں انتیس معیاری مقالے موجود ہیں۔ اس کتاب نے ادب میں اچھا اضافا ہے۔

کامل جو کلام:

شاہ بھٹائیؒ کے رسالہ سے انداز ایک ہزار ابیات منتخب کرکے کتاب کی صورت میں "کامل کا کلام" کے نام سے ایک ہندو محقق پروفیسر جھٹمل جو چند ہمایونی نے ۱۹۵۴ء میں ہندوستان سے شایع کیا جنکو ہندوستان ساہتیہ اکادمی نے طبع کیا۔ شاہ بھٹائیؒ کے کلام کو مختلف عنوانات سے پیش کیا ہے

شاہ عبداللطیف بھٹائی اور انکا کلام و فکر:۔

یہ کتاب عبدالغفار بلوچ نے ۱۹۶۰ء میں، شاہ لطیف بھٹائی کے شعر و فکر کو پیش کیا ہے کلام کا تقابل مولانا رومیؒ، حافظ شیرازی، غالب اور اقبال سے کیا ہے۔ اور تصوف کے حقائق کو پیش کیا ہے۔ شاہ بھٹائی کی شاعری کا تجزیہ بھی کیا ہے، اور کلام کو قرآن اور حدیث کی روشنی سے ثابت کیا ہے کہ شاہ بھٹائی کا کلام روحانیت سے مالا مال ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک انوکھی تصنیف ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی برسی:۔

سندھی ادبی مرکزی طلاعکار بورڈ کراچی کی طرف سے ایک خوبصورت کتابچی ۱۹۴۳ء کو شایع کیا گیا۔ جس میں سندھ کے بزرگوں اور دانشوروں کے تقاریر اور مقالوں کو جمع کیا گیا۔ جو شاہ بھٹائیؒ کے مختلف پہلوں پر ہیں۔

شاہ جو سورمیوں :-

یہ کتاب مارا شداس میوارام بھنبھانی نے شاہ لطیفؒ کے رسالہ کی عورتوں کے کردار پر لکھی ہے۔ جو آپ کے کلام کی روشنی میں دیئے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تصویریں بھی دی ہیں، جس سے ایک کردار کی عکاسی نظر آتی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۴ء کو کراچی سے شایع ہوا۔

شاہانہ کلام :-

شکارپور سندھ کے مورخ و عالم مرحوم مولانا عبدالکریم چشتی صاحب نے ۱۹۵۹ء میں شاہ لطیفؒ کے کلام کی تشریح شایع کی تھی۔ اس کتاب میں مختلف عنوان اور مضمون کے لحاظ سے تقسیم کرکے دیا ہے۔

کارنی (کارنی = سبب)

یہ تصنیف شاہ لطیفؒ کی حقیقت تحقیقی کے فلسفہ پر مختصر تصنیف ہے۔ سندھ کے مشہور ادیب سرور علی سرور نے ۱۹۶۰ء میں مکمل کرکے شایع کی۔ تصوف کے حقائق اور جامع اصولوں پر عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ۳۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

روح رہاٹ :-

ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی نے اپنے مرتب کئے ہوئے رسالہ میں جن جن عورتوں کی کہانیوں کو پیش کیا ہے۔ ان کہانیوں کو علیحدہ کتاب کی صورت میں شایع کرایا تھا۔

فرائیڈ اور شاہ :-

یہ تصنیف عبدالکریم لغاری نے شاہ لطیفؒ کے ایک مقالہ فرائیڈ اور شاہ پر کڑی تنقید کی۔ ان دلائل کو کتاب کی صورت میں شایع کیا۔

شاہ کے گم شدہ ابیات :-

محمد سومار شیخ نے تحقیق کرکے شاہ لطیفؒ کے گم شدہ کلام کو جمع کرکے شایع کرایا ہے۔

کمر لطیف :-

یہ کتاب شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے مختلف چند رسالوں پر تنقید کی ہے۔ اس کتاب عبدالجبار ہوسجو نے تصنیف کیا ہے۔ نور ۱۹۶۱ء میں شایع ہوا۔

شاہ کا پیغام :-

جناب حافظ محمد امین نے ۱۹۵۸ء میں یہ کتاب شایع کی تھی۔ جس میں شاہ لطیفؒ کے کلام کی تصنیفات میں ان کی تعلیم اور پیغام کو پیش کیا ہے۔ جو نثر مقفیٰ اور تجنیس حرف میں لکھا ہے۔

سندھ کی ادبی تاریخ حصہ اول

یہ کتاب دو حصوں میں سندھ کے مایہ ناز ادیب مرحوم محمد صدیق میمن نے لکھی۔ پہلی جلد میں قدیم شعراء سے ساتھ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے سوانح اور کلام پر تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ شاہ لطیفؒ کے متعلق اپنے تاثر اس دیتے ہیں :-

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سندھ کے سرتاج شعراء ہیں۔ جنکو دنیا کا بہترین شاعر کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ جن عالموں نے مغرب کے شعراء مثلاً شیکسپیئر، چاسر، گیٹے کو پڑھا ہے وہ بغیر کسی شک و شبہ کے اقرار کرتے ہیں کہ شاہ عظیم شاعر ہیں۔

سندھ کی ادبی تاریخ حصہ اول مصنف خانبہادر محمد صدیق میمن۔ مطبع ار ایچ احمد برادرس حیدرآباد سندھ۔

ان تصنیفات کے علاوہ مختلف جریدوں، رسالوں اور درسی کتابوں میں شاہ بھٹائیؒ کے کلام اور فلسفہ کے متعلق ذکر ملتا ہے۔ شاہ لطیف کی سالگرہ (عرس) کے مواقع پر جریدہ شایع کیئے جاتے ہیں۔ جن کی تفصیل دی جاتی ہے:۔

رسالہ مہران	مرکزی سندھی ادبی سلاھکار انجمن۔	سالگرہ نمبر ۱۳۲۰ھ مرتب الحاج محمد صدیق میمن۔
رسالہ مہران	" " " " "	" " " " " " 1949ء
مخزن شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ	لطیف یادگار مرکز	1954ء
مخزن فردوس لطیف نمبر	مرتب محبوب علی چنہ	1956ء
عرفانِ لطیف	مرتب مولانا غلام محمد گرامیؔ	1949ء
یادگار لطیف ۲۴۵ سالگرہ نمبر	مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ	1953ء یادگار لطیف کا جشن۔
یادگار لطیف ۲۴۶ " "	" " " "	1954ء " ایضاً "
یادگار لطیف ۲۴۷ " "	مرتب بیگم زینت عبداللہ چنہ۔	1956ء " ایضاً "
یادگار لطیف	مرتب اسد اللہ شاہ حسینی۔	1960ء " ایضاً "
لطیفی لنو	مولف محبوب علی چنہ۔	1951ء جرم لطیف گورنمنٹ کالج حیدرآباد
نئی زندگی رسالہ	مدیر عبدالواحد سندھی اور شمشیر الحیدری	1950ء ـ 1953ء

محکمہ اطلاعات مغربی پاکستان اور سندھ کی طرف سے شایع کردہ:۔

عرفانِ لطیف، یادِ لطیف، دردِ لطیف، تحفۂ لطیف، گلستانِ لطیف، معرفت کے موتی، بہارِ لطیف، عشقِ لطیف، نئی نئی پیامِ لطیف

Sind_To day. Payam-e-Latif - Poet Loureate of Sind -- ASARILATIF

اردو:۔

ایک مقالہ رسالہ پیام لاہور کی ۱۶ اپریل ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں مکمل محمد فاروق خان ایمن آبادی نے لکھا ہے۔ اس افسوس ہے کہ انہوں نے حقائق کو افسانوی رنگ میں دبا دیا ہے، جو اصل حقیقت سے دور ہے اور عشقیہ داستان شاہ لطیف سے ارتباط ولی سے منسوب کیا ہے۔

خیابان پاک:۔

ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی کی طرف سے شاہ بھٹائیؒ کے کلام کا مشہور ادیبوں و شاعروں نے منظوم ترجمہ کیا ہے۔ جن میں رشید لاشاری شیخ ایاز، ابن انشا، مرحوم پروفیسر لطف اللہ مدوی، مرحوم حفیظ ہوشیارپوری، جمیل نقوی نے کلام ترجمہ کیا۔

کراچی یونیورسٹی میگزین 1956ء

اس میگزین کے نگران ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب تھے۔ ادارہ تحریر اردو کے ادیب خواجہ نیر ہیں۔ ابن انشا اور مستفق حوالہ تھے۔ میگزین کے ۴۶ صفحہ پر ایک تحقیقاتی مقالہ بعنوان "شاہ عبداللطیف بھٹائی اور اردو شعراء کے مشترک صوفیانہ خیالات" محترمہ شمس صدیقی نے لکھا جس میں شاہ بھٹائی کے صوفیانہ خیالات کی وضاحت کی گئی ہے۔

روح ادب:۔

ماہنامہ رسالہ روح شمارہ نمبر ۱۵۔۱۶۔ جون 1953ء، مرتب مختار حسن، ادارہ فروغ ادب اردو کی طرف سے شایع ہوا۔ اس شمارہ

کے صفحہ ۱۰۴ سے ۱۲۵ تک شاہ لطیفؒ پر دو عالمانہ مقالے "سندھ کا صوفی شاعر" مقالہ نگار اردو کے عظیم نقاد سید وقار عظیم کی قلم سے اور "شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ پر ایک تحقیقی نظر" مقالہ نگار سندھ محکمہ ادب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ سے لکھا۔ اور شاہ لطیفؒ کے کلام کا معلوم مرحوم "شاہ جو راگ" مترجم شہاب رفعت۔ یہ مقالے لطیفیات ادب میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

منکر مہران

مصنف اختر انصاری اکبرآبادی نے بڑی محنت اور تحقیق سے یہ کتاب بیاد رفتہ محکمہ اطلاعات حیدرآباد سندھ کی طرف سے شایع کیا۔ جس شاہ بھٹائیؒ کے ہر پہلو پر تحقیقاتی اور معلوماتی مواد جمع کیا ہوا ہے۔

ارمغان لطیف

مرحوم رشید احمد لاشاری نے شاہ لطیفؒ کی سوانح اور سرگلیان کی تشریح اور ترجمہ دا ... کتاب سنہ ۱۹۴۱ء میں شایع ہوئی۔

عکس لطیف:

مرحوم آغا تاج محمد نے شاہ بھٹائیؒ کی سوانح اور سرگلیان کی نثر میں تشریح لکھی اور ۱۹۵۱ء میں شایع کی۔

سندھی ادب

مرتب پیر حسام الدین شاہ راشدی نے ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی کی طرف سے مرتب کیا اس کتابچہ میں ۴۳ صفحہ پر شاہ بھٹائیؒ کی سوانح اور کلام کے متعلق مختصر احوال دیا ہے۔

مغربی پاکستان کے صوفی شعرا۔

اس کتاب میں بھی شاہ لطیف کا احوال دیا گیا ہے اور دوسرے شعراء سے تقابلی موازنہ بھی نظر آتا ہے۔

تاریخ ادبیات سندھ (اردو) باب سوم حصہ اول۔

یہ تاریخ ادب کے دو حصے مرحوم پروفیسر اللہ دتہ دوی، پیر حسام گروپ کیچ سندھ فاضل محمود، ناظم و جنرل ایڈیٹر شعبہ تاریخ ادبیات، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ... مرتب کیا حصہ اول کے ۱۸ صفحہ سے ۲۷ صفحہ تک تفصیل سے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی سوانح کلام اور ہمعصر بزرگوں کے احوال کو لکھا ہے۔

روح لطیف:

یہ کتاب بھی مرحوم رشید احمد لاشاری کا اردو شعر میں منظوم ترجمہ ہے۔ جو آپ نے ۱۹۵۴ء میں کیا تھا۔ جس میں سرکلیان اور سیئی کلیان ہے

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شاعری:

جناب اے ... نے ۱۹۵۴ء میں ایک محققانہ تقریر شاہ بھٹائیؒ کے عرس پر ریڈیو پاکستان سے نشر کی تھی۔ جسے اردو زبان میں ترجمہ کتابچہ کی صورت میں محکمہ مطبوعات فلم و اشتہارات حکومت پاکستان کی طرف سے شایع ہوئی۔

نئی قدریں (سندھی ادب نمبر)

اختر انصاری اکبرآبادی نے ۱۹۷۳ء میں نئی قدریں کا خاص نمبر سندھی ادب پر شایع کیا۔ جس میں شاہ بھٹائیؒ کی شخصیت و کلام مضامین موجود ہیں

عکس لطیف

ایرسندہ کے مشہور ادیب و شاعر آغا صدیقی تعارف کے محتاج ہیں۔ انہوں نے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام اور شخصیت کا پچیس سال

سے مطالعہ کرتے آئیں ہیں۔ اور شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کے کلام کا اردو زبان میں منظوم ترجمہ کرنے میں ماہر ہیں۔ یہ ان کی شاہ عبداللطیف رح سے عقیدت ہے کہ اپنے فکر اور نکتہ سنجی سے شاہ عبداللطیف رح پر ایک جامع تصنیف پیش کردی جو اہل قابل قدر عمل ہے۔

ان تصانیف کے علاوہ بہت سے مقالات اور تقاریر شایع ہو چکی ہیں۔ اور بہت سے جریدہ میں نظر آتے ہیں جو مختلف کی طرف شایع ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں گلستان لطیف۔ مرتب کریم بخش خالد۔ نغمات لطیف مرتب احمد انصاری اکبرآبادی۔ نذر لطیف مرتب مرحوم ڈاکٹر عارف شاہ گیلانی۔ اور پیام لطیف قابل ذکر ہیں۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کے شارح

مرحوم شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ کی ذات گرامی سندھ کو ہمیشہ فخر رہیگا۔ اس برگزیدہ شخصیت کے علمی و ادبی کارنامہ سندھ کی ادبی تاریخ محفوظ ہیں جو ہمیشہ نشان راہ رہینگی۔ علامہ صاحب ایک غریب خاندان کے فرد تھے۔ انہوں نے علمی درجات کو طے کرتے ہوئے۔ اس منزل پر پہنچے جہاں بہت کم پہنچتے ہیں۔ علامہ موصوف کی ولادت ۹ شوال ۱۳۱۳ھ مطابق ۲۵ مارچ ۱۸۹۹ء کو تعلقہ سیہون کے ایک تاریخی بستی ٹلٹی میں ہوئی۔ اگرچہ انکا خاندان زراعت پیشہ تھا۔ لیکن وہ سندھ کے عباسی (داؤد پوتہ) خاندان کی عظمت کے یادگار تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں ہوئی۔ ثانوی تعلیم مدرسۃ الاسلام کراچی میں ہوئی۔ ۱۹۱۸ء میں۔ ڈی۔ جے۔ سندھ کالج میں داخل ہوئے ۱۹۲۱ء میں بی۔اے آنرس کی سند فرسٹ کلاس میں حاصل کرنے کے بعد بمبئی چلے گئے۔ جہاں ایم۔اے انگریزی اور عربی میں پاس کیا اور اسی کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد سندھ واپس چلے آئے اور ڈی۔ جے۔ سندھ کالج کراچی میں پہلے سندھی ادب کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر گرفتانی کے معرکۃ الآرا تصنیف شاہ کے رسالہ کی ترتیب و تدوین میں مدد کی۔ دو حصے چھپنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا کی انسٹیٹیوٹ اسکالرشپ پر کنگز کالج لندن جا کر پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے مقالہ لکھا "فارسی شاعری پر عربی شاعری کا اثر"[1] یہ کتاب انگریزی، عربی اور فارسی ادب کی ایک شاہکار ہے۔ ۱۹۲۷ء میں لندن سے واپس وطن آئے۔ تو انہیں سندھ مدرسہ کے پرنسپال مقرر کئے گئے۔ اس عہدے کے دوران سندھ کے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی۔ تھوڑے عرصہ میں اندھیری کالج بمبئی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو کر گئے۔ سندھ سرکار نے ۱۹۳۶ء میں انہیں ڈی۔پی۔آئی مقرر کیا۔ آپ نے محکمہ تعلیمات سندھ میں بڑی اصلاحات کی اس طرح ۱۹۵۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ سندھ اور مغربی پاکستان پبلک سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں حکومت سرکار نے ان کی علمی خدمات کے پیش نظر شمس العلماء کا خطاب دیا۔ یہ علم ادب کا شمس ۲۲ نومبر ۱۹۵۸ء میں غروب ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب شاہ عبداللطیف رح کے بڑے شارح تھے۔ اور بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ انہوں نے شاہ عبداللطیف رح کے کلام، فلسفہ، تصوف، سماع، رسالہ پر بیش بہا مقالے لکھے جو تحقیق کے بہترین نمونے ہیں۔ بھٹ شاہ کی درگاہ پر جا کر رسالہ کے صحیح نسخہ کو تیار کرنے میں بڑی محنت کی۔ ۱۹۵۶ء میں سندھی ادبی بورڈ نے شاہ عبداللطیف رح کے صحیح نسخہ مرتب کرنے کا کام آپ کے سپرد کیا۔ بڑی محنت سے کافی کام مکمل کیا تھا۔ لیکن اچانک وفات کی وجہ سے یہ عظیم کام رہ گیا۔ وہ مسودہ مولانا قاضی صاحب کے سپرد کیا گیا۔ شاہ عبداللطیف رح پر بہترین مقالہ تحریر کئے۔ ان میں شاہ کی عظمت کے اسباب انسان کامل شاہ کی نظر میں، شاہ لطیف اور روحی، سرمد سارنگ، عبداللطیف کے کلام میں وحدت الوجود کا مسئلہ، شاہ کے رسالہ کی شاعری بحر مشہور ہیں۔

سید میران محمد شاہ

سید میران محمد شاہ سندھ کی مشہور شخصیت، شاعر، ادیب اور سیاستدان تھے۔ سید میران محمد شاہ ۱۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو ٹکھر شہر میں

---

[1] The Influence of Arabic Poetry on the Development of Persian Poetry.

حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار سید زین العابدین شاہ متعلوی سادات میں سے تھے۔ شاہ موصوف کے دادا کا نام سید میراں محمد شاہ تھا، یہ بزرگ انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت میں سر باٹل فریئر کے مقرر کردہ سندھی رسم الخط کمیٹی کے ایک رکن تھے۔ انہوں نے قدیم سندھی زبان میں دو مشہور ناول "سدھا تورو" اور "کدھا تورو" "مفید الصبیان" لکھے تھے۔

سید میراں محمد شاہ کی ابتدائی تعلیم ٹھٹھہ میں حافظ محمد یوسف کے مدرسہ میں ہوئی۔ سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی سے ۱۹۱۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرکے ڈی۔ جے سندھ کالج میں سے ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج بمبئی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا اور حیدرآباد میں آکر وکالت شروع کی اور سیاست میں حصہ لیا۔ ۱۹۳۶ء میں سندھ بمبئی سے علیحدہ کرنے کی تحریک میں حصہ لیا۔ ۱۹۴۷ء میں پہلی سندھ لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر اور پھر اسپیکر چنے گئے۔ ۱۹۵۳ء میں پاکستان سرکار کی طرف سے اسپین کے سفیر مقرر ہوئے۔

مرحوم شاہ صاحب کی ادبی خدمات قابل القدر ہیں۔ سندھی ادبی مرکزی بورڈ قائم کرنے میں بڑی کوشش کی۔ سندھی ادبی بورڈ کے شروع سے آخر تک ممبر اور چیئرمین رہے۔ اپنے اقتدار کے دور میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی ساگرد منانے کے لئے لطیف یادگار کاؤنسل کا قیام کیا، جس کے چیئرمین رہے۔ سندھ کے عالموں، ادیبوں، شعراء، فنکاروں کو ایک مرکز پر اکٹھا کیا۔ ابھی شاہ بھٹائیؒ کی عقیدت میں بے شمار مقالے اور تقاریر کی ہیں جو

۳۔ دیوان بھیرومل مہرچند آڈوانی:۔

شاہ بھٹائیؒ کے شیدائی، اور سندھ کے مشہور نثر نویس دیوان بھیرومل مہرچند آڈوانی ۱۸۷۶ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں میٹرک پاس کرکے ایکسائز کے محکمہ میں نوکری شروع کی جہاں سے ۱۹۲۲ء میں انسپیکٹر ہوکر ریٹائرڈ ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں سندھ یونیورسٹی نے سندھی زبان کالج میں شروع کی اور اس کے پہلے لیکچرر مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ مقرر ہوئے۔ جب ڈاکٹر صاحب پی ایچ ڈی کے لئے لندن گئے تو اس خالی جگہ پر دیوان بھیرومل کو لیکچرر مقرر کئے گئے۔ آپ بچپن سے سندھی ادب سے بڑی محبت تھی، اور بہت سی تصنیفات لکھی تھیں۔ شاہ لطیفؒ کی سیر و سیاحت پر ایک مستند تصنیف "لطیفی سیر" کے نام سے لکھی۔ اس کتاب کی وجہ سے دیوان صاحب نے وہ دشوار راستوں کا سفر کیا جہاں جہاں شاہ بھٹائیؒ نے سفر کیا تھا۔ اس موضوع پر آج تک پھر کسی نے قلم نہ اٹھایا۔ یہ کتاب ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ جب ڈاکٹر گرشانی نے رسالہ مرتب کیا تو اس پر شکارپور سندھ کے مشہور جریدہ "سندھو" میں تنقید کا سلسلہ آٹھ قسط لکھے۔ یہ مستند سندھی ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ دیوان بھیرومل ۱۹۵۳ء میں سرگواس ہوئے۔

مرحوم محمد بخش "واصف"

سندھی زبان کے باکمال شاعر مرحوم محمد بخش بن محمد عثمان "واصف" کی والدت ۱۸۲۲ء کو سکرنڈ، ضلع نواب شاہ میں ہوئی۔ لیکن ان کے والد کسی وجہ سے حیدرآباد منتقل ہوئے۔ واصف نے اپنی ابتدائی تعلیم ختم کرکے لنٹو رکاڈ آفس حیدرآباد میں ملازمت شروع کی۔ انکو شروع سے ہی ادب اور شاعری سے دلچسپی تھی، اور اسلامی علوم سے پورا لگاؤ تھا۔ عربی، فارسی، ہندی، سندھی اور سنسکرت زبانوں پر کامل قدرت رکھتے تھے۔ شاعری میں صاحب دیوان تھے۔ اس کے علاوہ رباعیات واصف اور علامہ اقبال کی مثنوی اسرار و رموز کا بھی منظوم ترجمہ کیا۔ واصف صاحب نے "شرح لطیفی" کے نام سے شاہ بھٹائیؒ کے رسالے پر تفصیلی شرح لکھنی چاہی، سر طلبیاں سے ابتدائی پچیس ابیات کی شرح لکھی جس میں ہر ایک بیت کو اسلامی نقطہ نظر اور تصوف کے مطابق قرآن و حدیث اور اقوال صوفیائے کرام کی روشنی میں لکھی۔ شاید ایسی شرح کسی اور عالم نے شاہ بھٹائیؒ کے کلام کی نہ لکھی۔ واصف صاحب نے کن وجوہات کے بنا پر یہ عظیم کام چھوڑ دیا، شاید پوری حوصلہ افزائی نہ ہوئی۔ بہرحال اس مستند شرح سے سندھ محروم رہ گئی۔

مولانا دین محمد وفائی مرحوم :-

سندھ کی برگزیدہ شخصیت مولانا دین محمد وفائی مرحوم کی قومی اور ادبی خدمات کو آج بھی نوفرسے دیکھا جاتا ہے ادب اور صحافت کے میدان میں یکتا روزگار تھے۔ انہوں اپنی زندگی کو با ادب اور عوام کی اصلاح میں صرف کردی اپنی زندگی کا بڑا عرصہ سندھ کی مشہور روزنامہ اخبار "الوحید" کے مدیر رہے۔ جسکے ذریعہ سندھ میں دینی، علمی، تعلیمی، اخلاقی فلاح بہبود کے لئے کوشاں رہے۔ مولانا صاحب کی ولادت ۲۰ رمضان ۱۳۱۱ھ کو تعلقہ گڑھی یاسین کی ایک بستی تنی آباد میں ہوئی ان کے والد بزرگوار خلیفہ گل محمد ٹھٹی ایک مسجد کے بزرگ تھے۔ انہوں مولانا صاحب کی تعلیم پر خاص توجہ کی تھی لیکن جب مولانا صاحب ۹ برس کے ہوئے تو ان کی وفات ہوئی۔ اس طرح نونہال بچہ کی تعلیم انکی والدہ کے ذمے ہوئی۔ اس نیک سیرت خاتون نے مولانا کو وقت کے رواج کے مطابق عربی و فارسی کی اعلیٰ تعلیم دلائی۔ جوانی کے زمانہ میں دو سال سندھ مدرسۃ السلام کراچی میں عربی و فارسی کے استاد بھی رہے۔ اس زمانے میں جمعیت العلماء سندھ کے ناظم مقرر ہوئے، اور توحید رسالہ جاری کیا جو آخری عمر تک جاری رہا۔

مولانا وفائی مرحوم صاحب کثیر التصانیف تھے انہوں نے اندازاً ۲۲ کتابیں تصنیف کیئے۔ مولانا نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، اس جذبہ کے تحت شاہ بھٹائیؒ کی سوانح پر ایک کتاب "لطف اللطیف" یہ تصنیف مولانا صاحب کی آخری تصنیف تھی، جو وفات کے بعد شائع ہوئی۔ انکی وفات ۲۲ جمادالثانی ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ "لطف اللطیف" کتاب سندھ میں اتنی ہی مشہور ہے جتنی ڈاکٹر گربخشانی کی تصنیف "مقدمہ لطیفی" مولانا نے شاہ بھٹائیؒ کی سوانح پر بڑی تحقیق کی ہے۔ جو لطیفیات میں سنگ میل حیثیت رکھتی ہے۔

مرحوم عثمان علی انصاری :-

سندھ کے زندہ دل ادیب اور ماہر تعلیمات۔ شاہ بھٹائیؒ کے شیدائی اور بڑے شارح تھے مرحوم انصاری صاحب کے والد میاں ہدایت علی انصاری سہارنپور ضلع کی ایک بستی عنب آباد (الہ) ہندوستان سے ہجرت کرکے سندھ میں آئے اور شکارپور کو مستقل کے لئے مکونت گاہ بنایا اور پولیس محکمہ کی ملازمت اختیار کی ۱۹۰۱ء میں مرحوم عثمان علی انصاری کی ولادت ہوئی ان کی ابتدائی تعلیم شکارپور میں ہوئی ثانوی تعلیم نازمیاء اسکول خیرپور سے شروع کی لیکن پانچویں جماعت سے تعلیم کورسیٹ ہائی اسکول شکارپور مکمل کرکے ۱۹۱۸ء میں میٹرک پاس کی ۱۹۲۱ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انگلینڈ چلے گئے ۱۹۲۵ء میں ایم۔ اے اور ڈپلوما جسٹرنلزم میں کرکے سندھ کو واپس ہوئے۔ ۲۷ نومبر ۱۹۲۵ء میں میرپور خاص کے مدرسہ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے ۱۹۲۸ء میں کراچی کے ایڈیشنل انسپیکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں سندھ کے آخری ڈی پی آئی مقرر ہوئے ۱۹۵۷ء میں سرکاری نوکری سے سبکدوش ہوئے۔

انصاری صاحب نے شاہ بھٹائیؒ کی شخصیت اور کلام پر بڑی تحقیق، شرح لکھی اور ایک رسالہ میں مرتب کیا ہے شاہ بھٹائیؒ پر لکھے ہوئے مقالات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی

سندھ کے باکمال شخصیتوں میں سے مرحوم بدوی پروفیسر لطف اللہ بدوی کی ذات گرامی تو بڑی عزت اور توقیر حاصل ہے۔ مرحوم بدوی صاحب سندھی زبان کے عظیم شاعر، ادیب، مورخ اور فلسفی تھے۔ آپ نے اردو زبان کی بھی بے لوث خدمت کی ہے۔ شیخ علم کے صحیح معنوں میں پروانہ تھے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے شیدائی اور انکے کلام کے بڑے شارح تھے۔ تو دوسری طرف علامہ اقبال کے بڑے مداح تھے۔ سندھی ادب کے اگرچہ مایہ ناز ادیب تھے تو دوسری طرف اردو اور فارسی زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ اس دور مصیبت میں آپ کا دم غنیمت تھا، آپ دو مختلف انسان قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں معاون ثابت ہوئے۔ آپ کی خوش خط مشہور ہے۔

مخدومی بدوی صاحب کی ولادت ۴ جولائی ۱۹۰۲ء کو شکارپور میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار مرحوم حاجی امام بخش خادم، اپنے دور کے بڑے

عالم فاضل اور بزرگ ادیب و شاعر تھے، اور اپنے وقت کے سندھی اردو، فارسی اور عربی زبانوں کے عالم مانے جاتے تھے۔ مرحوم قلندر بدوی صاحب کی ابتدائی تعلیم عربی فارسی اور انگریزی اپنے والد کے زیر نگرانی میں ہوئی۔ بچپن میں والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا تھا۔ اس طرح پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے تو والد کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور بے یار و مددگار اس دنیا میں رہ گئے۔ تعلیم منقطع کرکے محکمہ تعلیم میں ملازمت شروع کی بعد میں ادھوری چھوڑی ہوئی تعلیم مکمل کرلی بچپن سے تھیں تھے۔ اس لئے علم ادب و شاعری سے بڑا شوق تھا، جو آگے چل کر نمایاں ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ کالج نوشہرو میں سندھی ادب کے استاد مقرر ہوئے، اور ۴ جولائی ۱۹۵۸ء میں پروفیسر ہوکر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ آپ کے علمی ادبی خدمات کا دور ۱۹۲۰ء سے لے کر آخری گھڑی تک تھا۔

آپ کثیر تعداد میں تصنیفات چھوڑی ہیں جن میں ۴۵ کے قریب شائع ہو چکی ہیں اور ایک سو دس کے قریب مسودے موجود ہیں جو چھوڑے ہیں آپ نے اپنی قابلیت سے بڑا امتیاز مقام حاصل کیا۔ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ کے بعد آپ کا اسم گرامی ادب کے بیلوث خدمتگاروں میں آتا ہے آپ کی مشہور تصنیفات تذکرہ لطیفی "تاریخ ادبیات سندھ" تین حصے میں ہیں اور علامہ اقبال کی پوری فارسی تصنیفات کا سندھی زبان میں منظوم ترجمہ ہے جو اقبال اکیڈمی نے شائع کیئے ہیں۔ جن میں جاوید نامہ، اسرار و رموز، ارمغان حجاز اور "مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" شمس العلماء علامہ ڈاکٹر داؤد پوتہ آپ کو "جوان فکر شاعر اور ادیب" کہتے تھے۔ پیر علی محمد شاہ راشدی نے آپ کی وفات پر اپنے تاثر یوں بیان کیئے،

> جوگی ایک محقق اور عظیم اہل قلم ثابت ہوئے۔ اس سے زیادہ جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا کہ وہ بڑا انسان ثابت ہوا۔ انسان میں جو خصلتیں اور خوبیاں ہونی چاہئیں، وہ سب ان میں موجود تھیں، مرحوم نے کبھی کسی جاندار کو بھی دکھ نہیں پہنچایا۔ اور نہ کسی امیر کے آگے نہ چھوٹے، تابع، عاجز اور خوددار زندگی بسر کی۔

آخر عمر میں آپ کے جواں سال فرزند پروفیسر احسان احمد بدوی کی شہادت کا انکو بڑا صدمہ ہوا اس سانحے کے تین سال بعد یعنی ۱۹ نومبر ۱۹۶۸ء کی شام کو داعی اجل کو لبیک کہکر اپنے رب حقیقی سے جا ملے۔

قلندر بدوی صاحب نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی پر بڑی تحقیق کی تھی، عقیدت کے بنا پر بہت سے نفس اپنی تصنیف تذکرہ لطیفی میں بڑے تفصیل سے شاہ بھٹائی کی سوانح، فلسفہ، تصوف، کلام اور معاصر شعراء مرید وغیرہ پر لکھا ہے ۳۲۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اردو زبان میں بھی سوانح لکھنی شروع کی تھی لیکن افسوس کہ یہ کارنامہ نصف ادھوری رہ گئی۔ بھٹائی پر مواد بہت کے قریب ۳۰۰ تک مقالات کے اور کلام کا اردو زبان میں بھی ترجمہ کرنا جس میں سرمارٹ بہت مقبول ہوا۔ سرموہل رانہ کے ابیات کا بھی منظوم ترجمہ کیا تھا جس کے چند اشعار دیئے جاتے ہیں، یہ ترجمہ کتنا جاذب اور شاہ بھٹائی کے تخیل سے کتنا قریب ہے۔

سرموہل رانہ

داستان اول

۱۔ ایک جوگی راہ میں کل مل گیا۔	۲۔ ایک جوگی راہ میں کل مل گیا۔
سر پر تھی پیچیدہ پگڑی دلپذیر	چاند سے روشن تھا چہرہ برملا
اس پہ طرہ موتیوں کی تھی لڑی	وہ جگا کر دل میں فیض عشق کا
کر گیا زخمی نگہ سے دل فقیر	دے گیا، سر پر جدائی کی بلا۔

لہ شروع کے زمانے میں بدوی صاحب اپنے شعر میں "جوگی" تخلص رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں اپنے نام سے "لطیف" تخلص اختیار کیا تھا۔

راہ میں کل مل گیا اک کاپڑی
جس کے چہرے سے نمایاں تھا جلال
اُس رخِ زیبا کا جلوہ دیکھ کر
چھا گیا منظر پہ اک رنج و ملال
سچ ہے موہل کے گیا جو سامنے
لوٹنا منزل پہ اُس کا ہے محال

۴

مل گیا کل راہ میں اک کاپڑی
جسم پر تھا غازۂ خاکستری
بازوؤں میں تھی، چمکتی سبز شال
اور سونے کی تھی گردن میں تری
کس قدر موہل کا دلکش ہے جاز
کچھ بتا دے اس کا شانِ دلبری؟

۵

مل گیا کل راہ میں اک کاپڑی
جسم پر اُن کے نمایاں تھا بصبوت
اس عبیدہ ذات سے حاصل ہوا
بیقراروں، دردمندوں کو سکوت

۶

اس گدا پر چڑھ گیا جنگل میں کیف
"کاک" کی باتیں سناتے رو پڑا
زخم اندر جو لگے تھے کھل پڑے
مٹ نہیں سکتا قضا نے جو لکھا

۷

جیسے صادق کی طرح جاذب ترین
روح پاکیزہ تھی جوگی کی صفا
تاج سے آتی تھی خوشبو کی شمیم
عطر کی کثرت نے بھر دی تھی فضا

مرکزِ عشق و محبت کا نشان
دیدیا کس سادگی سے رہنما۔

۸

جس طرح جاذب طلوعِ آفتاب
بخش دیتا ہے سحر کو روشنی
اس طرح جوگی کے چہرے کی نمود
دیکھنے والوں کی تھی ابدی خوشی
اس کے چہرے کی تجلی دیکھ کر
خیرہ ہو جاتی تھی نظریں اک گھڑی
پان کی سرخی یا لالی موم کی
کہہ نہیں سکتا کہ کیا تھی دلکشی
اس قدر موہل کی الفت تھی عظیم
جس طرح سیلاب میں چڑھتی ندی

وائی

فکر کر ساتھی تیاری کا سدا — رہ ہمیشہ تو تیار
کاک چلنا ہے کبھی۔
راہرو کتنے لڈھنے کو گئے — ہو نہیں سکتا شمار
کاک چلنا ہے کبھی۔
ہو گیا ہے لوٹ کر آیا نہیں — موت پر کیا اختیار
کاک چلنا ہے کبھی۔
ایک دن آئے گا پیغام رحیل — یہ حیاتِ مستعار
کاک چلنا ہے کبھی۔
موت آکر تجھکو لے جائیگا — کوچ کا کر انتظار۔
کاک چلنا ہے کبھی۔
سوئے دلبر آب چلا عبداللطیف — چھوڑ کر سب انتشار
کاک چلنا ہے کبھی۔

مرحوم آغا تاج محمد خان۔

آغا تاج محمد بن آغا عبدالمجید خان ۱۹۰۴ء کو ناگرجی گاؤں ضلع سکھر میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں ہوئی ثانوی تعلیم سکھر میونسپل ہائی اسکول میں ہوئی۔ بچپن سے ہی بڑے ذہین اور سمجھدار تھے، تقریر کرنے کا بے حد شوق تھا، ۱۹۲۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ڈی۔ جے۔ سندھ کالج سے ۱۹۲۹ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۳۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ ٹی پاس کرکے ۱۹۳۵ء میں سکھر ڈسٹرکٹ اسکول بورڈ میں پہلا ایجوکیشنل سپروائزر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے بعد لاڑکانہ ضلع کے ایڈمنسٹریٹو افسر مقرر ہوئے ان نمایاں خدمات کی بنا پر آپ کو ریاست کا ڈی۔ پی۔ آئی مقرر کیا گیا ۱۹۴۵ء میں آپ کو خان صاحب کا لقب ملا ۱۹۴۷ء میں سندھ یونیورسٹی وجود میں آئی تو آغا صاحب ان کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ آغا صاحب نے بہت مرتبہ امریکا کا سرکاری دورہ کیا۔ آغا تاج محمد خان حضرت شاہ لطیفؒ کے شیدائی تھے، شاہ لطیفؒ کی سالگرہ منانے اور ان کے کلام کو فروغ دینے میں بڑی کوشش کی لطیف یادگار کمیٹی کی بنیاد رکھی، شاہ لطیفؒ پر تحقیقی مقالہ اور تقاریر کی اس کے علاوہ ایک کتاب ارمغان لطیف کے نام سے اردو زبان میں لکھی، جس میں سرکلیان کے ابیات کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔

رشید احمد لاشاری مرحوم۔

مرحوم رشید احمد لاشاری سندھی اور اردو ادب کے نوجوان ادیب تھے، سندھی زبان کے مانے ہوئے شاعر تھے۔ ان کے والد کا نام رزک خان لاشاری تھا۔ رشید کی ولادت ۱۹۲۲ء کو تعلقہ مگسی نصیر آباد ضلع سبی بلوچستان میں ہوئی ابتدائی تعلیم چار درجہ اردو پڑھنے کے بعد آبائی گاؤں تعلقہ کنڈ کوٹ میں مڈل کا امتحان پاس کیا اس دوران ایک والد کا انتقال ہوگیا ۱۹۴۱ء میں عربی فارسی کی تحصیل کے لئے شکارپور سندھ میں مدرسہ اشرف العلوم داخل ہوئے۔ شکارپور میں چند دوستوں کی صحبت میں رہکر شعر و شاعری شروع کی، جن میں لعل محمد لعل، مرحوم احسان احمد بدوی، ڈاکٹر نعیم صدیقی اور شیخ ایاز تھے۔ ۱۹۴۴ء میں پرائمری استاد ہوئے ذہانت کی وجہ سے ۱۹۵۲ء میں ٹریننگ کالج حیدرآباد میں استاد مقرر ہوئے، کچھ عرصے کے بعد کراچی چلے گئے جہاں رسالہ نئی زندگی کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اسکے ساتھ سندھی فلموں کے ڈائلاگ اور گیت لکھنے شروع کیئے آخر جامعہ ملیہ کراچی میں سندھی ادب کے لیکچرر مقرر ہوئے۔

رشید لاشاری نے شاہ لطیفؒ پر بڑا کام کیا ہے مختلف سروں کی سندھی زبان میں تشریح اور اردو زبان میں کلام کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے جو اکثر شایع ہوا ہے

اختتامہ

ہر عمل تکیہ مکن خواجہ کہ در روز ازل
تو چو دانی قلم صنع بنامت چہ نوشت

(اے خواجہ اپنے عمل پر بھروسہ مت کر۔ اس لئے کہ تجھے معلوم نہیں ہے کہ بنانے والے قلم نے روز ازل تیرے نام پر کیا لکھ دیا ہے)

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور اُنکے معاصر اُردو شعرا نے تذکرہ کو بڑی سرگرمی کے ساتھ شروع کیا تھا۔ جسے محنت سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا چاہو اپنی ناچیز استعداد اور ذہانت کی تمام تر صلاحیتوں کو انتہائی سعی و جہد کی حد تک بروئے کار لایا۔ جس کی تکمیل میں مجھے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا جو اپنی جگہ پر ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ سب قدسی نفس حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے عقیدتمندی اور آپ کے دیئے ہوئے اسباق کا نتیجہ ہے۔ جو جذبہ محبت سے اس دشوار کام کو اختتام پر پہنچایا۔

حقیقت سے دیکھا جائے تو شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ شاعر سے بڑھ کر برگزیدہ، ولی اور صاحب دل عالم تھے۔ جنہوں نے اپنے عظیم پیغام سے سندھ کے معصوم عوام کو سیدھی راہ پر لانے میں کامیاب ہوئے جسکا فیض آج تک جاری ہے۔ آپ کے کلام پر نظر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری محبت اور امید، خوشی اور حسن کا ایک ایسا پرکیف اور پرسکر نغمہ ہے جس کے ذریعے آپ نے انسانوں کی زندگی میں خوش دلی پیدا کی اور اس طرح ان کے دلوں میں روحانیت اور مسرت کا اضافہ کیا۔ شاہ بھٹائیؒ کی شاعرانہ عظمت یہ ہے کہ انہوں نے محض ایک نقطہ نظر پیش کرکے زندگی کی تنقید ہی نہیں کی بلکہ زندگی کو ایک خاص طریقہ سے بسر کرنے کی ترغیب دی، جس نظریہ اور زندگی کے اسلوب کا پیغام دیا۔ اس کا رس اور آہنگ اُن کے کلام میں سما ہوا ہے۔ جو سننے یا پڑھنے والے کے جذبات میں وہی شیریں احساسات اور وہی معنی کے شرگوں کھلتے ہیں۔

کسی شاعر کی اہمیت اور اُسکا مقام، اُس وقت ہی معلوم ہو سکتا ہے، جب کہ ہم اُسکے زمانے کے معاصر شعرا سے مقابلہ کریں پھر اسکے ماقبل اور مابعد کے دوروں میں شعر تخیل کا مطالعہ کریں، اُسے دیکھیں اور مجموعی طور پر اُن کی باریکیوں کے مدمقابل اس شاعر کے متعلق اظہار نظر کریں اور فیصلہ دیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے متعلق اگر ہمارا مقصد صحیح اور فیصلہ کن ہو تو یہ ضروری ہے کہ اُن کے کلام کا روحانی طور پر مطالعہ کریں اور اُن کے شعر کی لفظی اور معنوی خصوصیتوں سے واقفیت حاصل کرکے، اُن کا آپس میں مقابلہ کریں۔ اس ترتیب سے شاہ بھٹائیؒ کے زمانے اور اُنکے شعر تک رسائی حاصل کریں پھر انکی شاعری پر دو پہلوؤں سے نظر ڈالیں پہلے دیکھیں کہ استعمال شدہ الفاظ عبارت کے لحاظ سے کلمات و ترکیبوں کی صاف اور کلام میں ظاہری حسن پیدا کرنے میں حاصل کیئے ہیں۔ دوسرا معنوی لحاظ سے شاعر نے مقاصد میں مقصد بیان کس مناسب الفاظ کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ مختلف انواع شاعری کے فنوں میں ماہر تھے۔ وہ قدیم اسلوب شعر سندھی اور فارسی زبانوں کو خوب سمجھتے تھے ان زبانوں کا کبھی اقتباس بھی کرتے تھے۔ لیکن وہ نئی طرز اسلوب اور ہیئت کا موجد اور بانی تھے۔ اُن کی شاعری سندھی اشائیل کے مشابہ ہے جس کی تقلید بعد کے شعرا نے کی اور اس قدیم اسلوب کی شاعری نے دوبارہ عروج حاصل کیا۔ اپنے کلام کی وجہ سے لافانی شہرت کے مالک ہوئے۔ نئی خوبیوں اور شاعرانہ تخیلات میں سندھی شعرا سے بڑھ کر ہیں۔ بلکہ دوسری زبانوں کے شعرا سے بھی سبقت حاصل ہے۔ شاہ لطیف نے سندھی زبان کو زندہ کیا اور اُسے نئی رونق بخشی اپنے کلام کے ذریعے ہم وطنوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے روحانی تعلق کو تازگی عطا کی۔ آپ کے کلام میں جو کچھ موجود ہے، وہ آیات قرآن سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جس نے خدا تعالیٰ اور اُنکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ کو اپنے سامنے رکھا، انکی نجات

لابدی ہے۔ شاہ بھٹائیؒ کے رسالہ میں ایران کی شاعری طرح گل و بلبل، گل و خار کی شاعری نہیں ہے بلکہ انہوں نے وطن کے خس و خاشاک کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ مولانا جلال الدین رومی کی طرح بنی نوع انسان کو تصوف کے شاہراہ پر لے آنا چاہا جس میں امن و سلامتی، عشق و محبت، دلسوزی اور جذبہ اصلاح موجود ہے دوسری طرف انسان تخلیق کی مراد اپنے خالق سے وابستگی و لو لگانا ہے۔ عارفوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ "الدنیا سجن المومنین" ہے۔ دنیا میں اگر انکے زیب و سنگار پر اپنے خالق کو مٹانا دانشمندی نہیں ہے۔ شاہ بھٹائیؒ نے اس حقیقت کا بار بار اعادہ کیا ہے فرماتے ہیں۔

سونھن وجایم سومرا، میرو منھن تیوھ

وجیٹ تت پیوم، جت صلاح ناہ حسن سریٔ

ترجمہ (بادشاہ) میں یہاں اگر اپنا من گنوایا ہے اور میری صورت مولی ہو گئی ہے۔

تو اس جگہ جانا ہے، جہاں حسن کے بغیر چلنا ممکن نہیں ہے۔

یہ ہی سبب ہے کہ سرزمین سندھ کو شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شخصیت اور پیغام پر فخر حاصل ہے۔ شاہ بھٹائی کا کلام شریعت اور مذہب، افادیت اور مقصدیت کی حیثیت سے دنیا کے شعرا میں بلند مقام رکھتا ہے۔

جناب اختر حسن سابق گورنر نے شاہ بھٹائیؒ دو سو تاسیسی سالگرہ ۱۹۵۹ء میں بھٹ شاہ پر اپنی تقریر میں فرمایا تھا۔

"حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے تمام سلیس اور دلنشیں رنگ میں اخلاقیات اور روحانیت کے منازل طی کرادیں اس بزرگ نے انسانی فلاح اور بہبود کے لئے ناقابل فراموش کارنامہ سرانجام دیئے، انکا روحانی پیغام زندہ اور زندگی بخش ہے، انکے کلام کا کیف اور ذوق ہمارے دلوں پر طاری ہے۔ یہاں تک کہ ہم کوئی بھی اخلاقی اور روحانی سبق اس بزرگ کے بغیر مکمل کر نہیں سکتے۔ شاہ صاحب نے ادب، تصوف اور بصیرت کی ہم آہنگی سے انسانی فکر کے لئے ایسا سرمایہ جمع کیا ہے، جس سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتے، شریعت و طریقت کے الفاظ اور حقیقی معنیٰ کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ ان خدمتوں کے باعث انہیں حیات جاودان عطا ہوئی ہے۔"

ہندوستان کے اکثر شعرا کے کلام میں تضمین کا وجود کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے یہ صنف اس لئے ناگزیر ہے کہ شعرا نے اپنے متقدمین کے کلاسیکی ادب یا مصاحف قدیم کا سہارا لیتے ہیں۔ فارسی زبان کے شعرا میں عربی زبان کی عبارتوں اور قرآن پاک و حدیث کے فقروں یا اُن کے اشاروں سے استفادہ کرتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ جیسے بزرگ شاعر نے عرب کے شاعر متنبی کے مضامین اور انداز بیان سے استفادہ کیا ہے، خواجہ حافظ شیرازیؒ نے قرآن پاک و حدیث کے مطالب کو کمال حسن کے ساتھ اپنے اشعار میں داخل کیا ہے۔ اس طرح شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں جابجا تضمین کے خوش تراش نگینے اپنی تابانی سے موجود ہیں اور بڑی خوبی سے قرآن پاک کی آیتوں، حدیث اور عربی مقولوں کو اپنے کلام میں استعمال کیا ہے۔ اور اپنے عالمانہ فکر سے اُن کی معنیٰ بھی شعر کی صورت میں پیش کرنے جانتے ہیں۔

اُردو شعرا نے بھی اکثر اپنے کلام میں فارسی، عربی اور ہندی شعرا کے کلام کے اشعار کو تضمین کے طور پر استعمال کیا ہے یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ اردو زبان کی نشو و نما دکن میں ہوئی۔ اس دور کے ادبی سرمائے کا بڑا حصہ مذہبی، عشق الٰہیات اور تصوف پر مشتمل ہے۔ خواجہ میر دردؔ کی ایک مثال دی جاتی ہے

درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست

تو نے سنا نہیں ہے، یہ مصرع مگر کہیں۔

ایک اور شاعر کی مثال ہے :-

صنما برتب کریم یاں وہ ہر ایک تیرا ہے مبتلا
یہ اگر الست بربکم ، تو کہے تو کہہ ابھی "بلیٰ"

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے سرمارئی کے شروع بیت میں اس خیال کو دیا ہے ۔

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ، جڈھن ڪن پيو م
ٿالو اَبَلیٰ ، قلب مين ، تڏھن تِتِ چيو م
تنھين ويرڪيو م ، وِچن ، ويترچن سين ۔

اس بیت کا اُردو زبان میں ترجمہ جناب پروفیسر لطف اللہ بدوی مرحوم کا دیا جاتا ہے ۔

کان میں بانگ الستی کی پڑی جس دم صدا
قلب نے صدق و صفا سے کہدیا قالوا بلیٰ ۔
اور یارانِ وطن سے باکمالِ ذوق و شوق
میں نے فوراً عہد و پیمانِ محبت کر لیا ۔

سندھ کا صوبہ اس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ یہاں کی سرزمین کو تصوف کی اسرہوا سے صدیوں ایک خاص تعلق رہا ہے ۔ ان مسلمان صوفیاء کرام کا اثر و اقتدار لوگوں پر برابر ہوتا رہا ۔ اسلام کی تبلیغ اور مسلمان کے عروج کو ، تصوف کی تاریخ کی مدد سے مرتب کیا جا سکتا ہے ، جس سے لوگوں میں محبت ، حسن اخلاق ، سچائی اور انسانیت کا جذبہ پیدا کیا جاتا تھا ۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ ایک سچے صوفی تھے ، جن کے اوپر خالص شریعت کا بڑا اثر تھا ۔ اُردو داں حضرات شاہ بھٹائی کی صوفیانہ شاعری اور شخصیت کے متعلق سنتے ہیں تو اُن کا خیال ایک روایتی تصوف کی طرف جاتا ہے ، جس کے لئے فارسی اور اُردو ، دنیا سے تارک ہونے کی تلقین کرتے ہیں ، لیکن شاہ بھٹائیؒ کا عمل حقیقی اور روحانی قدروں میں سے ہیں ، جو عمل کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت دیتے ہیں ۔ سچا صوفی وہ ہے جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور شریعت کے احکامون پر پورا عمل کریں اور دل کو صاف اور پاک رکھیں ۔

علامہ ڈاکٹر عمری محمد داؤد پوتہ نے اپنے ایک مقالہ میں لکھا ہے :-

حضرت مولانا جلال الدین رومی اور شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اس بات پر علامہ اقبال سے اختلاف رکھتے ہیں علامہ اقبالؒ کہتے ہیں ، مسلم قوم اپنی خودی کو اتنا بلند کردے کہ وہ پوری کائنات پر قابض ہو جائے لیکن مولانا رومی اور شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں ، خودی کو مار دین تو دوست کا دیدار نصیب ہو ، اور پوری کائنات پر قدرت حاصل کر سکیں "

سچ بھی یہی ہے کہ خودی اور خدا کبھی اکٹھے رہ نہیں سکتے ۔

وَلَا تَجْعَلْهُ غَاضِبًا عَلَيْنَا ۝ وَاغْفِرْ لَنَا وَلِوَالِدِيْنَا وَلِجَمِيْعِ الْمُسْلِمِيْنَ الْاَحْيَآءِ مِنْهُمْ وَالْمَيِّتِيْنَ
وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ماخذات

سندھی کتب

نمبر	مصنف کا نام	کتاب کا نام	ناشر	سال
۱	احسان احمد بدوی پروفیسر	تنقید و تنقید نگاری	انٹرنیشنل پریس میکلوڈ روڈ کراچی	۱۹۵۹ء
۲	احسان احمد بدوی پروفیسر	ساگی شخصیت اور کلام	ٹیکنیکل پرنٹرس میکلوڈ روڈ کراچی	۱۹۶۵ء
۳	امداد علی امام علی قاضی علامہ	رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ	سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ	
۴	ارنیسٹ ٹرمپ	رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ		
۵	بھیرومل مہرچند آڈوانی	لطیفی سیر	کرٹون الیکٹرک پرنٹنگ ورکس حیدرآباد	۱۹۴۴ء
۶	عبدالکریم ملڑیجؒ سیّد	بیان العارفین وسنہ العاشقین (مترجم عبدالرحمٰن)	مرتب محمد رضا عبدالواسع ٹھٹوی	۱۹۰۹ء
۷	عبدالغفار خان بلوچ	شاہ لطیف بھٹائی اسٹ ظاہر و فکر	وینا سینٹ ہاؤس کراچی	۱۹۵۱ء
۸	عبدالجبار جونیجو	کنز اللطیف حصہ اول	ابراہیم پریس حیدرآباد سندھ	۱۹۶۱ء
۹	عمر بن محمد داؤد پوتہ شمس العلماء ڈاکٹر	کلام شاہ عبدالکریم بلڑیجؒ	مولوی عبدالصمد شرف الدین لمیٹڈ	
۱۰	عمر بن محمد داؤد پوتہ	ادبیات سندھی	انڈیو کیشنل پبلشنگ ہاؤس کراچی	۱۹۳۹ء
۱۱	عمر بن محمد داؤد پوتہ	کلام گرو ہوڑی	سندھی ادبی بورڈ سوسائٹی کراچی	۱۹۵۹ء
۱۲	غلام مرتضیٰ ۔ ایم ۔ سید	بیجام لطیف	ادارۂ اشاعت حیدرآباد سندھ	۱۹۵۳ء
۱۳	غلام محمد شاہوانی	رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ	ایچ ۔ ایم ۔ احمد برادرس حیدرآباد	۱۹۵۴ء
۱۴	قلیچ بیگ مرزا	احوال شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ		
۱۵	قلیچ بیگ مرزا	لغات لطیفی		
۱۶	قاسمی غلام مصطفیٰ مولانا	رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ		
۱۷	کلیان آڈوانی پروفیسر	رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ	ہندوستانی کتاب گھر انڈیا	۱۹۵۸
۱۸	کلیان آڈوانی	شاہ	چیتن لیکراج ماڑیوالا مبئی کالج بمبئی	
۱۹	رچرڈ برٹن مترجم (مصنف صدیقی)	سندھ اور سندھو ماہری میں بسنے والی قوم	سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ	۱۹۷۱ء
۲۰	سرور علی سرور	کارنی (شاہ بھٹائیؒ کا فلسفہ)	ایچ احمد برادرس حیدرآباد سندھ	۱۹۵۹ء
۲۱	لطف اللہ بدوی پروفیسر	تذکرہ لطیفی (تاریخ ادبیات سندھ حصہ اول)	ایچ ۔ ایم ۔ احمد برادرس حیدرآباد	۱۹۱۳ء
۲۲	لطف اللہ بدوی پروفیسر	کنڈری والوں کا کلام	سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ	۱۹۶۴ء
۲۳	لطف اللہ بدوی پروفیسر	سندھ میں تصوف اور صوفیانہ شاعری	مسودہ	
۲۴	لطف اللہ بدوی پروفیسر	بیاض لطیفی	مسودہ	
۲۵	مولوی دین محمد وفائی	لطف اللطیف		
۲۶	مخدوم ابوالحسن سندھی	مقدم الصلوٰۃ		

۲۷۔ محمد بخش واصف ... شرح لطیفی ... حارج پریس حیدرآباد سندھ ۱۹۳۵ء

۲۸۔ مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ ... کافی

۲۹۔ محمد صدیق میمن ... سندھی ادبی تاریخ ... سندھی مسلم ادبی سوسائٹی حیدرآباد

۳۰۔ نبی بخش خان بلوچ ڈاکٹر ... رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی ... شاہ لطیف ثقافتی مرکزی کمیٹی بھٹ شاہ ۱۹۵۱ء

۳۱۔ نبی بخش خان بلوچ ... بیلاڑ ما بول ... سردار علی شاہ بخاری الوحید پریس کراچی ۱۹۵۱ء

۳۲۔ نبی بخش خان بلوچ ... میون شاہ عنایت ... سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد

۳۳۔ موتچند مولچند گرمختانی ڈاکٹر ... رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی ... کمشر صاحب کا پریس کراچی ۱۹۳۲ء

۳۴۔ موتچند مولچند گرمختانی ... لنواری جا لعل ... ایڈیوکیشنل سلیکشن کراچی ۱۹۳۴ء

۳۵۔ موتچند مولچند گرمختانی ... مقدمہ لطیفی

سندھی جریدہ

۳۶۔ افکار قلندری ... محکمہ تعلقات عامہ مغربی پاکستان

۳۷۔ اخبار الوحید (آزاد خبر) ... الوحید پریس کراچی ۱۹۳۶ء

۳۸۔ الرحیم (سندھی) رسالہ ... مدیر مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی ۱۹۶۱ء

۳۹۔ بہار اخلاق رسالہ ... مدیر

۴۰۔ پیام لطیف جریدہ ... ساگر شاہ لطیف محکمہ تعلقات عامہ سندھ

۴۱۔ تحفۃ لطیف ... ڈاکٹر عارف شاہ صلاح محکمہ مغربی پاکستان کراچی

۴۲۔ ستار سندھ رسالہ ... مدیر پیر علی محمد شاہ راشدی

۴۳۔ سندھو رسالہ ... مدیر بولچند مراجپال

۴۴۔ عام راء رسالہ ... مدیر قاضی فیض محمد الوحید پریس کراچی ۱۹۵۰ء

۴۵۔ گلستان لطیف جریدہ ... کریم بخش میمن محکمہ مغربی پاکستان کراچی

۴۶۔ شاعرہ جو سرتاج ... مرتب بیگم خدیجہ حاؤ، پوتہ پاکستان پبلیکیشن کراچی ۱۹۶۳

۴۷۔ مہران رسالہ ... سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ

۴۸۔ مہران رسالہ ... سندھی ادبی بورڈ کراچی

۴۹۔ مہران ... محمد صدیق میمن لطیف یادگار کمیٹی

۵۰۔ مخزن شاہ لطیف ... لطیف کمیٹی

۵۱۔ نئی زندگی رسالہ ... مدیر مولانا عبدالواحد سندھی

۵۲۔ یاد لطیف ... ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ

۵۳۔ یاد لطیف ... بیگم زینت عبداللہ چنہ

۵۴۔ نخلستان مخزن ... گورنمنٹ کالج سکھر پور سندھ 1969ء

اُردو کتب

۵۵۔ ابواللیث صدیقی ڈاکٹر	..	لکھنؤ کا دبستانی شاعری	.. اردو اکیڈمی سندھ
۵۶۔ ابوالکلام آزاد مولانا	..	حیات سرمد	..
۵۷۔ آیاز شیخ مبارک علی	..	رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ	.. سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۶۳ء
۵۸۔ اعجاز الحق قدوسی	..	تذکرہ صوفیائے سندھ	.. اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۵۹ء
۵۹۔ امان اللہ خاں ظلائم الجونپوری	..	غوث اعظم	.. شیخ غلام علی سنز لاہور ۔ مترجم ارمان سرحدی
۶۰۔ اربری۔ جی۔ ار	..	تاریخ تصوف	..
۶۱۔ ارسطو ۔ مترجم مرزا احمد	..	فن شاعری	.. انجمن ترقی اُردو دہلی ۱۹۳۱ء
۶۲۔ اظہر حسن نظیر لدھیانوی	..	تذکرہ شعراء اُردو	.. عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور ۱۹۵۳ء
۶۳۔ احمد حسین منشی	..	حالات سودا	.. خادم التعلیم لاہور ۱۸۹۶ء
۶۴۔ آغا محمد باقر	..	تاریخ نظم نثر	.. شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور ۱۹۳۵ء
۶۵۔ ابوسعید نورالدین ڈاکٹر	..	اسلامی تصوف اور اقبال	.. اقبال اکادمی کراچی ۔ ۱۹۵۹ء
۶۶۔ اُمہ عامیہ خاتون	..	حیات ابدی	..
۶۷۔ ابوظفر ندوی سید	..	تاریخ سندھ	.. معارف اعظم گڈھ دکن ۱۹۴۷ء
۶۸۔ دلیل الرحمان داؤدی	..	دیوان درد	.. مجلس ترقی اردو لاہور
۶۹۔ خواجہ غلام فریدؒ	..	دیوان فرید	.. عزیز پریس بہاولپور ۔ مولانا عزیز الرحمٰن صاحب
۷۰۔ دارا شکوہ شہزادہ	..	سفینۃ الاولیا	.. نفیس اکیڈمی کراچی ۔ مترجم محمد علی لطیف
۷۱۔ رام بابو سکسینہ	..	تاریخ ادب اردو	.. گلوب پبلشرز لاہور ۔ مترجم محمد عسکری
۷۲۔ راگھوون ۔ ڈبلیو ۔ ایس ۔ مجلم	..	ویدکی ہند رگ وید	.. مترجم مولوی حمید احمد انصاری
۷۳۔ سلیمان ندوی سید مولانا	..	نقوش سلیمان	.. اردو اکیڈمی سندھ حیدرآباد ۱۹۶۷ء
۷۴۔ سدھیشور ورما	..	آریائی زبانیں	.. مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۶۰ء
۷۵۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ	..	شاہ ولی اللہ کی تعلیم	.. سندھ یونیورسٹی حیدرآباد مترجم غلام حسین ملتانی ۱۹۶۳ء
۷۶۔ سید محمد عباس	..	سفینۂ غزل	.. تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور ۱۹۵۸ء
۷۷۔ طٰہٰ حسین ڈاکٹر	..	ابن خلدون	.. مترجم عبدالسلام ندوی
۷۸۔ طٰہٰ حسین ڈاکٹر	..	تنقیدات طٰہٰ حسین	.. مترجم عبدالصمد جامع مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۱ء
۷۹۔ عابد علی عابد سید	..	اصول انتقادِ ادبیات	.. مجلس ترقی ادب لاہور
۸۰۔ عباس محمود الغقاد	..	حضرت علی شخصیت اور کردار	.. مترجم منہاج الدین اسدی
۸۱۔ عبدالرحمٰن ابن خلدون	..	مقدمہ تاریخ ابن خلدون	.. مترجم مولانا سعد حسن طٰہٰ یوسفی
۸۲۔ عبدالحق محدث دہلوی	..	اخبار الاخیار	.. دارالاشاعت کراچی ۱۹۶۳ء

۸۳۔ عبد السلام ندوی مولانا .. شعر الہند حصہ دوم .. معارف۔ اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء

۸۴۔ عبد العجیب سالک .. مسلم ثقافت ہندوستان میں .. ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان ۱۹۵۷ء

۸۵۔ عبد اللہ سید ڈاکٹر .. ولی سے اقبال تک .. مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۸ء

۸۶۔ عبد الرحمٰن .. مراۃ الشعرا .. جید برق پریس دہلی

۸۷۔ عبد الوحید ڈاکٹر .. شعرائے اردو .. فیروز سنز لاہور

۸۸۔ علامہ شبلی نعمانی .. الغزالی .. معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء

۸۹۔ غلام رسول مہر .. تاریخ سندھ کلہوڑہ دور .. سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۸ء

۹۰۔ فتح محمد سیوانی حکیم .. آئینہ سکندر لال شہباز قلندر .. منشی رام اگروال تاجر کتب لاہور

۹۱۔ فرید الدین عطارؒ شیخ .. تذکرۃ الاولیا .. مترجم علامہ عبد الرحمٰن شوق۔ مکتبہ سراج الدین منز لاہور

۹۲۔ گب پروفیسر .. مقدمہ تاریخ ادبیات عرب .. مترجم سید محمد اولاد علی گیلانی۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۵۹ء

۹۳۔ گستاؤلی بان .. تمدن عرب .. مترجم۔ شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی۔ اعظم پریس مکھنؤ ۱۹۲۹ء

۹۴۔ جعفر علی صاحب نشتر .. آب بقا .. الشہیر مہادیو پرشاد ورما نظیر آباد لکھنؤ ۱۹۱۸ء

۹۵۔ لطف اللہ بدوی پروفیسر .. تاریخ ادبیات سندھ۔ (مسودہ) .. شعبۂ تاریخ ادبیات پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۸ء

۹۶۔ لطف مرزا علی .. گلشن ہند (مدابراہیم کے فارسی تذکرہ کا اضافہ) عبد اللہ خان دار الاشاعت پنجاب ۱۹۰۶ء

۹۷۔ محمد انوار الحسن .. حیات امداد .. شعبہ تصنیف و تالیف مدرسہ عربی کراچی ۱۹۶۵ء

۹۸۔ محمد اقبال ڈاکٹر .. زبور عجم .. شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور ۱۹۴۴ء

۹۹۔ محمد اقبال ڈاکٹر .. پیام مشرق .. " " " " ۱۹۴۸ء

۱۰۰۔ محمد اقبال ڈاکٹر .. اسرار و رموز .. " " " " ۱۹۴۴ء

۱۰۱۔ محمد عزیز الرحمٰن بہاولپوری .. تاریخ قلعہ مروٹ .. عزیز المطابع پریس بہاولپور ۱۹۵۳ء

۱۰۲۔ محمد عزیز الرحمٰن بہاولپوری .. صبح صادق طبع ثانی .. عزیز المطابع پریس بہاولپور ۱۹۴۳ء

۱۰۳۔ محمد مبارک العلوی الکرمانی سید .. سیرۃ الاولیا .. مترجم غلام احمد بریانی۔ مسلم پریس دہلی ۱۳۲۰ء

۱۰۴۔ محمد نجم الغنی .. بحر الفصاحت .. منشی نولکشور واہ لکھنؤ ۱۹۲۶ء

۱۰۵۔ محمد یحییٰ تنہا مولوی .. سیر المصنفین .. شیخ مبارک علی تاجران کتب لاہور ۱۹۴۸ء

۱۰۶۔ محمد مصطفیٰ خان شیفتہ نواب .. گلشن بے خار .. نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۳ء

۱۰۷۔ محمد حسین آزاد مولانا .. آب حیات .. شیخ مبارک علی تاجران کتب لاہور

۱۰۸۔ محمد نصیر الدین ہاشمی .. دکنی کلچر .. مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳

۱۰۹۔ محمد نصیر الدین ہاشمی .. دکنی میں اردو .. مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۵۲ء

۱۱۰۔ محمود خان شیرانی حافظ .. پنجاب میں اردو .. مکتبہ معین الادب لاہور

۱۱۱۔ مصطفیٰ حلیمی پاشا .. تاریخ اسلام .. مترجم رئیس احمد جعفری لاہور ۱۹۵۰ء

۱۱۲۔ مصطفیٰ حلیمی پاشا ۔ ــــــــ .. تاریخ تصوف اسلام .. مترجم ۔ رئیس احمد جعفری ــــــــ

۱۱۳ ۔ ملک محمد جاسی .. بدھاوت بھاکھا ــــــــ .. مترجم ۔ پنڈت بھگوت پرشاد ۔ منشی نولکشور راہ لکھنو

۱۱۴ ۔ محی الدین زور ۔ سید ڈاکٹر ۔ .. ہندوستانی لسانیات .. مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۶۱ء

۱۱۵ ۔ مجدد الف ثانی حضرت امام ربانی رح .. مکتوب امام ربانی .. مترجم ۔ قاضی عالم الدین ۔ ملک فضل الدین لاہور ۱۹۱۳ء

۱۱۶ ۔ مسعود حسین ڈاکٹر .. مقدمہ تاریخ زبان اردو ــــــــ .. مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۱۷ ۔ محبوب عالم منشی .. اسلامی سائکلوپیڈیا

۱۱۸ ۔ میر امن دہلوی .. باغ بہار .. مترجم ۔ عطا حسین خان ۔ نیا ادارہ ادب لاہور ۱۹۵۷ء

۱۱۹ ۔ میر تقی میر .. دیوان ولی دکنی

۱۲۰ ۔ نورالدین عبدالرحمٰن جامی رح مولانا .. نفحات الانس (اردو ترجمہ) .. مترجم مولانا حافظ علی احمد چشتی ۔ منشی نولکشور راہ لکھنو ۱۹۰۲ء

۱۲۱ ۔ نبی بخش خان بلوچ ڈاکٹر .. سندھ میں اردو شاعری .. مہران آرٹس کائونسل حیدرآباد سندھ ــــــــ

۱۲۲ ۔ نورالحسن ہاشمی ڈاکٹر .. دلی کا دبستان شاعری .. ترقی اردو ادب دہلی

۱۲۳ ۔ کلیم الدین احمد .. اردو شاعری پر ایک نظر

۱۲۴ ۔ شوکت حسین سبزواری ڈاکٹر .. اردو زبان کی ارتقاء .. گیلانی ادب ڈھاکہ ۱۹۵۶ء

۱۲۵ ۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ .. مدیر ۔ ڈاکٹر محمد وحید مرزا ۔ پنجاب یونیورسٹی پریس لاہور ــــــــ

۱۲۶ ۔ محمد قاسم فرشتہ ۔ تاریخ فرشتہ .. منشی نولکشور راہ لکھنو ۱۹۳۲ء ــــــــ

۱۲۷ ۔ تاریخ ادب اردو ــــــــ .. ادارہ ادبیات اردو لاہور ــــــــ

۱۲۸ ۔ مغربی پاکستان کے صوفی شعراء .. شعبہ مطبوعات محکمہ اطلاعات مغربی پاکستان

۱۲۹ ۔ اردو جریدے

۱۳۰ ۔ مفکر مہران .. اختر انصاری اکبرآبادی ۔ محکمہ اطلاعات حیدرآباد ۱۹۶۳ء

۱۳۱ ۔ نغمات لطیف .. اختر انصاری اکبرآبادی .. اطلاعات حیدرآباد ۱۹۶۰ء

۱۳۲ ۔ نغمہ لطیف .. مرحوم ڈاکٹر سید محمد عارف گیلانی .. گورنمنٹ پریس کراچی

۱۳۳ ۔ رسالہ بزم صوفیہ ..

۱۳۴ ۔ رسالہ خیام لاہور .. مدیر حافظ محمد عالم ۱۶ اپریل ۱۹۲۸ء

۱۳۵ ۔ رسالہ صوفی .. مدیر ۔ خواجہ حسن نظامی

۱۳۶ ۔ رسالہ روح ادب .. مئی جون ۔ ۱۹۵۳ء ۔ ۱۹۵۷ء

۱۳۷ ۔ رسالہ ماہنو کراچی ۔ پاکستان سلیکٹس کراچی

۱۳۸ ۔ رسالہ مخزن نومبر ۱۹۱۸ء مدیر احسان اللہ ناجور نجیب آبادی ۔

۱۳۹ ۔ ۱۳۸ ۔ رسالہ نظام المشائخ جلد دوم حرم الحرام ۔ رسالہ نیرنگ خیال اقبال نمبر ۱۹۳۸ء ۔

۱۴۰ ۔ ۱۴۲ ۔ رسالہ نقش قدری سندھی ادب نمبر ۔ ۱۹۷۳ء ۔ رسالہ نگار ماہ جنوری ۱۹۳۹ء ۔ رسالہ ساقی ۔ ماہ جنوری ۱۹۳۹ء

فارسی کتب

۱۴۳ ـ اسد علی خان تمنا	..	گل مجانب	.. ترتیب ـ مولوی عبدالحق صاحب ـ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۳ء
۱۴۴ ـ امام بخش خادم بدوی صابی	..	بیاض خادمی	ـ (مسودہ) ..
۱۴۵ ـ جمال الدین علوی شکارپوری	..	بیاض	ـ (مسودہ) ..
۱۴۶ ـ جلال الدین رومیؒ مولانا	..	مثنوی ـ مفتاح العلوم	.. ـ مولانا محمد نذیر عرشی .. قریشی بک ایجنسی لاہور
۱۴۷ ـ جلال الدین رومیؒ مولانا	..	رسالہ شمس تبریز	
۱۴۸ ـ سید فتح علی حسینی گردیزی	..	تذکرہ ریختہ گویان	.. مولوی عبدالحق صاحب .. انجمن ترقی اردو دکن ۱۹۳۲ء
۱۴۹ ـ سید عبدالقادر بن سید محمد ہاشم تتوی	..	حدیقۃ الاولیاء	.. پیر حسام الدین شاہ راشدی ـ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد
۱۵۰ ـ سپہ سالار	..	رسالہ فریدون ابن احمد	.. .. چاپ تہران
۱۵۱ ـ شیخ سعدیؒ	..	گلستان	.. .. ملک دین محمد سنز لاہور ۱۹۲۰ء
۱۵۲ ـ شیخ سعدیؒ	..	بوستان	.. .. ملک دین محمد سنز لاہور
۱۵۳ ـ شیخ محمد اعظم تتوی	..	تاریخ تحفۃ الطاہری	.. .. سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد
۱۵۴ ـ شمس الدین محمد خواجہ حافظ شیرازی	..	دیوان حافظ	.. .. موسسہ وانتشارات امیرکبیر .
۱۵۵ ـ شبلی نعمانی شمس العلماء	..	سوانح مولانا رومی	.. .. مجلس ترقی ادب لاہور .
۱۵۶ ـ عبدالحکیم عطا تتوی	..	دیوان عطا	.. .. سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ
۱۵۷ ـ عبدالوہاب فاروقی سچل سرمست	..	دیوان آشکار	.. .. منشی بشن لال لکھنو .
۱۵۸ ـ علی بن عثمان ہجویریؒ داتا گنج بخش	..	کشف المحجوب	.. .. شیخ ظفر محمد اینڈ سنز تاجران کتب لاہور
۱۵۹ ـ قمبر اللہ صاحب علوی	..	مکتوبات	.. .. مولوی کریم بخش ـ اسلام پریس لاہور .
۱۶۰ ـ قادر بخش بیدل روہڑی سندھی	..	پنج گنج مسودہ	.. ..
۱۶۱ ـ محمد اقبال ڈاکٹر	..	پیام مشرق	.. ..
۱۶۲ ـ محمد عوفی	..	لباب الالباب	.. ..
۱۶۳ ـ محمد علی ابراہیم خان خلیل	..	تذکرہ گلزار ابراہیم	.. ڈاکٹر سید محی الدین قادری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۳ء
۱۶۴ ـ محمد ابراہیم خلیل	..	تکملہ مقالات الشعراء	.. پیر حسام الدین شاہ راشدی .. سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۸
۱۶۵ ـ میر علی شیر قانع	..	تاریخ تحفۃ الکرام ۱۱۸۱ھ	.. ناصری دہلی ۱۸۷۳ء
۱۶۶ ـ میر علی شیر قانع	..	مقالات الشعرا	ـ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ
۱۶۷ ـ میر عبدالحسین خان سانگی	ـ	لطائف الطیف	.. ـ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ
۱۶۸ ـ میر تقی میر	..	نکات الشعرا	.. ـ .. انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۵ء
۱۶۹ ـ مفتی غلام سرور لاہوری	ـ	خزینۃ الاصفیا دو حصہ	.. منشی نولکشور لاہ لکھنو
۱۷۰ ـ میر حسن دہلوی		تذکرۂ شعراء اردو	ـ مولوی عبدالحق .. انجمن ترقی اردو دکن ۱۹۲۰

عربی کتب

۱۷۱ - قرآن پاک .. تیسواں پارہ آسان تفسیر - ابو سعید محمد عبدالحی .. مکتبہ الحسنات رامپور یو-پی انڈیا

۱۷۲ - ابی القاسم عبدالکریم بن ہوزان القشیری .. الرسائل القشیریہ الدکتور محمد حسن .. المعہد المرکزی الاسلامی شاہ اسلام پاکستان

۱۷۳ - محمد بن عبدہ اللہ محمد شیخ ولی الدین اکمال فی اسماء الرجال

۱۷۴ - سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ. چھل کاف (مسودہ) بیاض خادمی - حاجی امام بخش خادم

۱۷۵ - الیاس انطوف الیاس قاموس الجیب انگلیزی

BIBLIOGRAPHY.

176 - Arberry, A. J. .. Sufism .. George Allen & Union, London 56

177 - AL - Beruni's India .. Alberuni's India .. Authority of Govt of west Pak. Lahore 1962

178 - Bailey, T. Grahame. .. Urdu Literature. .. Association Press Culcutta 32

179 - Daudpota Umar Muhammad .. The Influence of Arabi poetry on the Persian Poetry. The Fort Printing Press Bombay 34

180 - Gibb. J. H. .. The Encyclopaedia of Islam. VOL I. AR - The Luzac & Co: London 56

181 - Goldsmd. F G (Captain) .. Selections from the records of Bombay Govt Education Society Press Bombay 1855.

182. Hunter. W W. .. The Imperial Gazetter of India .. Trubner & Co: London 1887

183 - John Grierson, George Abraham Linguistic Seirvey of India. VOL - VIII .. Superintendent Govt: Press Culcatta India 1919.

184 - Kazi Elsa :. .. Risalo of Shah Abdul Latif .. Sindhi Adabi Board: Hyd

185. Lalwani, Lilaram Watanmal Shah Latif: .. Phanix Press Karachi 1867

186 - Lazarus. E. J .. Hindutani Proverbs .. Medical Hall Press Banaras.

187 - Muhammad Sadiq History of Urdu Literature .. Oxford University Press Karachi - 1964

188 - Nicholson. Reynold. A. .. Rumi, Poet and Mystic .. George Allen and Union London 50

189 - Sadarangani. H. I Dr: .. Persian poets of Sind. .. Sindhi Adabi Board Hyd:

190 - Schimmel Annemarie Dr .. Ernst Trumpp .. The Pakistan German Forum Karachi

191 - Smyth, J. W. .. Gazetteer of the Province of Sind Sukkur. Govt: Central Press Bombay 1919

192 - Smyth. J. W. .. Gazetteer of the Province of Sind. Larkana. " " "

193 - Sorley H. T. .. Shah Abdul Latif of Bhit. .. Oxford University Press London 1940.

DICTIONARIES.

194 Abdul Haq Mulavi .. Students Standard English - Urdu Anjuman Press Karachi 50

195 Fallon's .. English & Hindustani Dictionary Medical Hall Press Banaras

196. Parmanad Mewaram .. Sindhi English - Dictionary .. Kaiseria Press. Hyderabad. 1910

197 Platt - J One. I. .. Urdu, Classical, Hindi & English .. Humphry Milford Oxford
Dictionary 5th (impression) University Press London

198 Ram Narain Lal Students Practical English & Urdu .. National Press Allahabad. 1913
Dictionary

199 Tryon Edwards. D.D. The New Dictionary of Thoughts. .. Classic Publishing Company
London - New-York.

SHAH ABDUL LATIF OF BHIT
And
HIS CONTEMPORARY URDU POETS.

❋

❋ Dissertation For Ph.D. Degree. ❋

❋

Ghulam Ahmed L. Badwi.
B.A. (Hons), M.A.
Professor.
C & S. GOVERNMENT COLLEGE, SHIKARPUR.

❋

UNDER THE SUPERVISION OF

Dr. Ghulam Mustafa Khan.
M.A. LLB Ph.D. D.LITT.
Head Of The Department Of Urdu
UNIVERSITY OF SIND.

❋

UNIVERSITY OF SIND,
JAMSHORO.
1975

1

Cuttle always.

Gestetner®

PAPER

GHULAM AHMED L. BADWI

FOR GOOD IMPRESSIONS

GHULAM AHMED L. BADWI.
B.A. (Hons) M.A. P.E.S. I
Assistant Professor,
C & S. Government College Shikarpur Sind

5

GHULAM AHMED L. BADVI
B.A. (Hons) M.A. P.E.S. (II)
Lecturer,
Government College, Shikarpur.

PACKED PAPER REQUIRE SEPARATING TO ENSURE REGULARITY OF FEEDING

Proceed as follows

Take the most convenient number of paper that can be handled easily

Bend paper across width and length without gripping

Bend paper again across length, grip with *left* hand and release *right* hand

With paper still gripped in *left* hand, place on Feed board of Machine, allowing it to fall between guides.

4

9

(6)

10

[illegible]

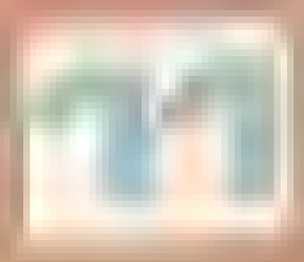

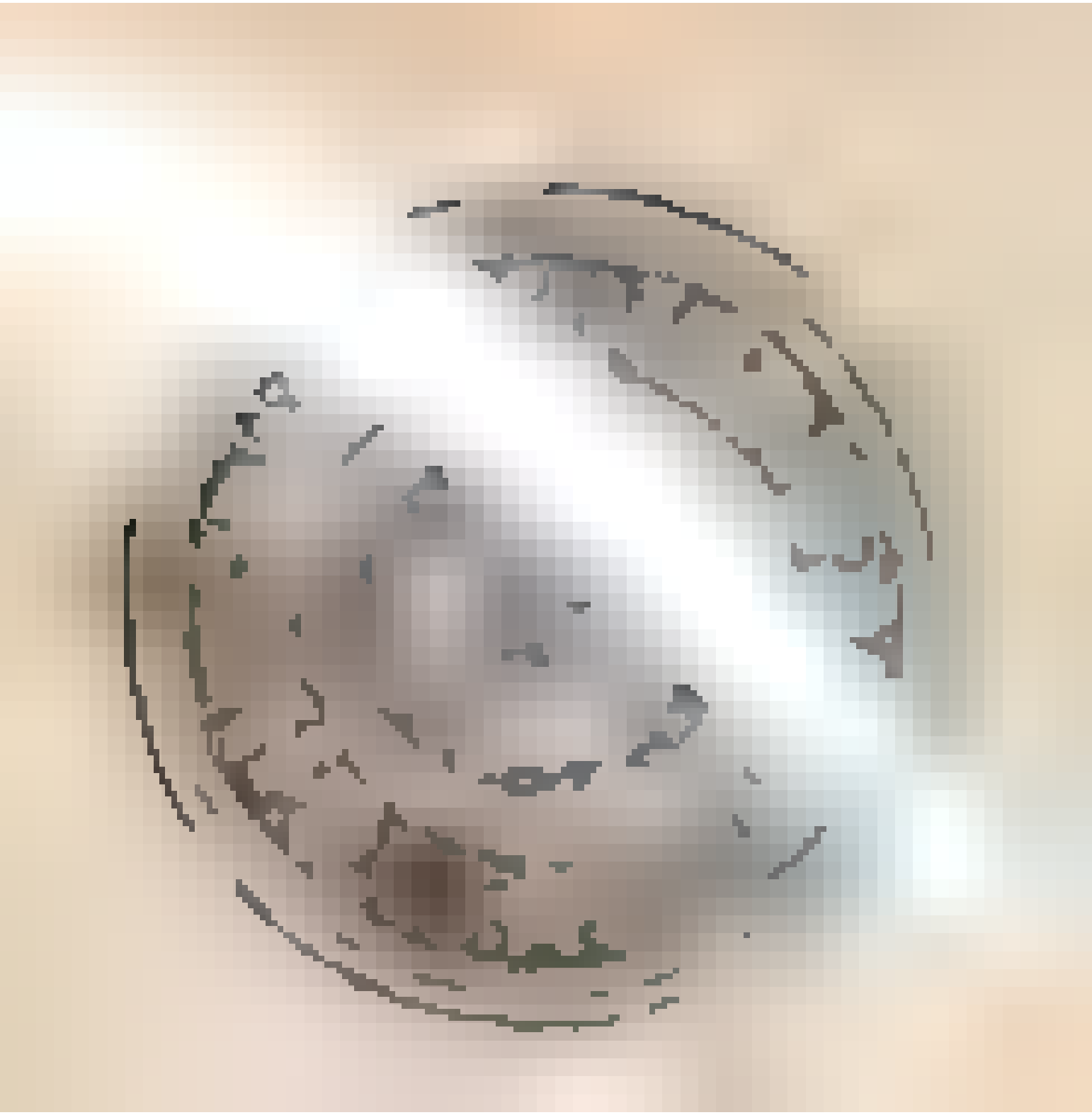

GHULAM AHMED L. BADWI
B.A (Hons) M.A.S.Sc.(1)
Out Side Bath Gate Bhiharpur Sind

2

1

1

CHUKAN MUHED BADVI

2

3